ہمارا یہ یقین ہے کہ آنے والا وقت تصوف کا ہے۔ شدت پسندی کی ڈوبتی ہوئی نبض سست سے سست تر ہوتی جارہی ہے۔ دہشت گردی وشدت پسندی سے بیزار مسلمانوں کی نئی نسل ایک متبادل کی تلاش میں ہے اور وہ متبادل تصوف کے سوا کچھ نہیں ہے، جس پر بدقسمتی سے تحریفات وتوہمات کا غبار چھایا ہوا ہے، جس نے روحانیت کی اس دولت کو عامۃ الناس کی نظروں سے محجوب کر رکھا ہے۔ آج کشف محجوب کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی تصوف کی طرف لوگوں کی واپسی ہو سکے۔ آج تصوف کے تزکیے کی ضرورت ہے تاکہ مادہ پرستی کی آلودگیوں میں گرفتار قلوب کا تزکیہ کیا جاسکے اور تصوف کے تزکیے کے اس عمل سے جتنی جلدی عہدہ برآ ہوا جاسکے اتنا ہی اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر ہے۔ آج ہماری دنیا کے دو سب سے زیادہ مہلک امراض مادہ پرستی اور شدت پسندی ہیں اور تصوف ان دونوں امراض کا ماہر ہے، بلکہ تیسرے بڑے گروہ یعنی نفس پرستوں اور بے عملوں کے لیے بھی یہ ایک مفید دوا ہے۔ مشرق ومغرب میں تصوف کی واپسی کی آہٹ محسوس کی جارہی ہے۔ شاید کاتب تقدیر نے ہندوستان جنت نشان میں تصوف کے عہد نو کے لیے تمہید اور راہ ہمواری کا اعزاز خانقاہ عارفیہ کے لیے مختص کر دیا ہے۔ ”ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء“ اس سبقت ومبادرت کے لیے میں مجلّہ الاحسان کے مدیر، مرتبین، معاونین اور ان کے مربی وہادی صاحب سجادہ داعی اسلام شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دامت فیوضہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حضرت والا کی توجیہات وتوجہات کا یہ سلسلہ دراز رہے گا۔ الاحسان کے مرتبین ومعاونین سے مجھے کسی قدر شناسائی حاصل ہے۔ یہ تمام افراد نوجوانوں کے جوش وخروش اور بوڑھوں کے حکمت وتدبر سے آراستہ ہیں۔ ان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اصالت اور عصریت دونوں کے جامع ہیں اور دعاۃ ومصلحین کا یہی بہترین رخت سفر ہے۔ فکر میں اصالت اور پیش کش میں عصریت کامیابی کی ضمانت ہے۔ فکر کا غیر اصیل ہونا جس قدر نقصان دہ ہے، پیش کش کا غیر عصری ہونا بھی اتنا ہی ضرر رساں ہے۔ بلاشبہ مجلّہ الاحسان موضوع اور ہدف کی اصالت اور تقدیم وپیش کش کی عصریت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ”إلی التصوف من جدید“ کی مہم میں یہ مجلّہ ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد

تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مجلّہ

کتابی سلسلہ **الاحسان** الٰہ آباد

زیر سرپرستی: داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی

مدیر: حسن سعید صفوی

مرتبین

مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری

معاونین

محمد عمران ثقافی، عارف اقبال مصباحی، کتاب الدین رضوی

ناشر

شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الٰہ آباد (یوپی)

E-mail :alehsaan.yearly@gmail.com

shahsafiacademy@gmail.com

سلسلۂ مطبوعات شاہ صفی اکیڈمی نمبر (۴)

کتابی سلسلہ:	الاحسان (شمارہ نمبر-۳)
مدیر:	حسن سعید صفوی
ترتیب:	مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری
سال اشاعت:	مارچ ۲۰۱۲ء/ ربیع الآخر ۱۴۳۳ھ
قیمت:	۲۲۵/روپے
کمپوزنگ:	عبد الرحمٰن سعیدی، صاحب حسین سعیدی
ناشر:	شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الٰہ آباد (یوپی)
تقسیم کار:	مکتبہ امام اعظم، ۲/۴۲۵ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی- 9958423551

Alehsaan (*A Journal on Islamic Spirituality*)
Published by: **Shah Safi Academy**, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)211001
Ph:08081898965.09026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

In Association With:
Asiatic Publishing House
Laxmi Nagar, New Delhi

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

انتساب

امام ربانی، شیخ لاثانی، مجدد الف ثانی

مصلح دین وامت، قاطع دین اکبری، شارح نظریۂ وحدۃ الشہود

حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی قدس سرہٗ

(پیدائش: شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء - وفات: ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء)

کے نام

جن کو ڈاکٹر اقبال نے ان گراں قدر لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

مشمولات

بادہ و ساغر

07-12

احوال

13-24

بادۂ کہنہ

25-32

تذکیر

33-64

تحقیق وتنقید

65-189

بحث ونظر

عصر حاضر میں احیائے تصوف کا کام کن اصولوں کے تحت ممکن ہے؟

191-199

شناسائی

201-248

صوفی ادب

249-270

زاویہ

حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں پر خصوصی گوشہ

271-366

پیمانہ

367-372

مکتوبات

373-406

بادہ وساغر

حضرت آسی غازی پوری

غزل

حسن کی کم نہ ہوئی گرمی بازار ہنوز
نقد جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

طائر جاں قفسِ تن سے تو چھوٹا لیکن
دامِ گیسو میں کسی کے ہے گرفتار ہنوز

ساتھ چھوڑا سفرِ ملکِ عدم میں سب نے
ساتھ لپٹی ہی رہی حسرت دیدار ہنوز

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشمِ بیمار کے بیمار، ہیں بیمار ہنوز

ہم بھی تھے روزِ ازل صحبتیِ بزمِ الست
بھولتی ہی نہیں وہ لذتِ گفتار ہنوز

کیا خراباتیوں کو حضرت آسی نہ ملے
کہ سلامت ہے وہی جبّہ و دستار ہنوز

حضرت عزیز صفی پوری

غزل

بانگ تکبیر بلند است زبت خانۂ ما
لوحش اللہ زہے مشرب رندانۂ ما

بادۂ ناب ببر کز مئے عشق صنمے
ساقیا روز ازل پر شدہ پیمانۂ ما

خرقہ سوزیم بنوشیم شراب گلگوں
محتسب کرد طواف در کاشانۂ ما

می شود روشن اگر سرمہ کند یک دو شبے
دیدۂ شمع ز خاکسترِ پروانۂ ما

آب بر خاک نہ ریزد چو سحاب کرمش
کے شود سبز ولایت بہ زمیں دانۂ ما

حضرت اصغر گونڈوی

غزل

یاد وہ تیری کیا کہ جو گردشِ خوں بڑھا نہ دے
ذکر وہ تیرا کیا کہ جو ہر بُنِ مو جلا نہ دے

میرے سرِ نیاز کی محویتیں مٹا نہ دے
موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے

اُف رے مری فتادگی، اُف رے کمالِ خستگی
آئے وہ فرش خاک پر عرش پہ جو پتا نہ دے

اس کی حریم ناز میں موج نفس بھی روک لے
ہوش کو بھی خبر نہ ہو عقل کو بھی ہوا نہ دے

غزل

اس آستاں پہ جبیں رکھ کے پھر اٹھا نہ سکے
ہم ایک در کے سوا سر کہیں جھکا نہ سے

دل غریب میں آکر سما گئے دیکھو
وہی جو عرصۂ کونین میں سما نہ سکے

ازل سے جو کہ ہیں محو بلندی پرواز
عروج پیکر خاکی کو وہ بھی پا نہ سکے

عجب نہیں کہ وہاں اک قدم میں پہنچا ہوں
جہاں کہ حضرت جبریل آپ جا نہ سکے

بشر کے پردے میں جلوہ نما تھے وہ لیکن
ہم عالم بشریت سے آگے جا نہ سکے

طریق فقر میں کافر ہے وہ خدا کی قسم
جو اپنی ہستی موہوم کو مٹا نہ سکے

ادب نہ ہوتا جو حائل تو ہم گزر جاتے
اسی مقام سے آگے جہاں کہ جا نہ سکے

اٹھایا ہے تو ہمیں نے بصد نیاز سعیدؔ
وہ بار غم کہ فرشتے جسے اٹھا نہ سکے

غزل

محبت کو سراپا حسن پنہانی سمجھتے ہیں
ہمیں ہیں جو کچھ اپنی فتنہ سامانی سمجھتے ہیں

نہ ہو پینا تو جینا سخت نادانی سمجھتے ہیں
جو مٹتے ہیں یہیں، دنیا کو وہ فانی سمجھتے ہیں

نگاہ شوق پر سب کو گماں ہے بے زبانی کا
مگر وہ عشق کی باتیں بہ آسانی سمجھتے ہیں

یہ دنیا اور تیرے درد سے نا آشنا دنیا
یہ آبادی نہیں ہم اس کو ویرانی سمجھتے ہیں

بہت باریک پردے ہیں تبسم کے ترنم کے
مگر ہم اضطراب دل کی عریانی سمجھتے ہیں

چلی جاتی ہے بحر زندگی میں عشق کی کشتی
سکوں سے ہے غرض ہم کو نہ طغیانی سمجھتے ہیں

خدا محفوظ رکھے میکدے کی رسم مستی کو
یہیں کچھ عاقلوں کی لوگ نادانی سمجھتے ہیں

بہت پردے میں ہے ہر چند تیری میکشی صہباؔ
مگر اہل نظر چہرے کی تابانی سمجھتے ہیں

احوال

ابتدائیہ

انسان چاہے جس قدر باصلاحیت اور خوب صورت ہو، اسی وقت تک وہ کارآمد ہے جب تک اس کے جسم اور اس کی روح دونوں میں اتفاق واتحاد ہے- اگر روح نے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیا تو اب اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جائے گا- یوں ہی اگر انسان کی روح اور اس کے جسم میں اتفاق و اتحاد ہو مگر جسم کسی عارضے کی وجہ سے لاغر اور کم زور ہو چکا ہو، حرکت کی سکت بھی باقی نہ ہو، اپنے روزمرہ کے معمولات کو بھی انجام نہ دے پاتا ہو، تو ایسا شخص انسانوں کی صف میں شمار تو کیا جائے گا مگر ایسا انسان کسی کام کا نہیں ہوگا- معلوم ہوا کہ روح اپنے ظاہری اور خارجی وجود میں جسم کی محتاج ہے اور جسم اپنی حقیقت و ماہیت میں روح کا حاجت مند ہے-

شریعت اور طریقت کا رشتہ بھی روح اور جسم ہی کی طرح ہے- طریقت بے شریعت کے ناقص ہے اور شریعت بغیر طریقت کے ناتمام- بقول حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی:

بے شریعت کے طریقت ہے حرام
بے طریقت کے شریعت ناتمام

شریعت نام ہے جسم کا اور طریقت نام ہے روح کا- ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا گیا تو یہ عمل غیر دانش مندانہ ہوگا- ان دونوں کی صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہی اصل زندگی ہے- شریعت بغیر طریقت کے ریا ہے اور طریقت بغیر شریعت کے منافقت اور بد دینی ہے اور ان دونوں کی حفاظت کرنا اور ان دونوں طریقوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کا نام ہی تصوف ہے- صوفیۂ اسلام نے اسی تصوف کی تبلیغ و اشاعت کی ہے اور کر رہے ہیں-

....

''الاحسان''، تصوف اور اہل تصوف کا علمی، فکری اور دعوتی ترجمان ہے- اس کے ذریعے تزکیہ واحسان کے قرآنی اور حدیثی نظریات کو افراط وتفریط سے بچاتے ہوئے صالح تحقیقی معیار کے مطابق موافقین وحاملین تصوف کے ساتھ منکرین تصوف اور ناقدین تصوف تک پہنچانا، اس کی اشاعت کا خاص مقصد ہے- یہی وجہ ہے کہ ''الاحسان'' موافقین ومخالفین دونوں کے درد دل کو صرف سنتا ہی نہیں بلکہ اس کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی بھی کرتا ہے- دوسرے لفظوں میں ''الاحسان'' تصوف کے تعلق سے مختلف نقطۂ نظر کے حاملین کے لیے علمی وتحقیقی اور سنجیدہ مکالمے کی راہ فراہم کرتا ہے- اصحاب علم اپنے نظریات وخیالات کو علمی اسلوب میں بے لاگ انداز سے پیش کرتے ہیں اور فراخ دلی کے ساتھ دوسروں کی باتیں سنتے ہیں- تصوف یہی سکھاتا بھی ہے- تصوف نام ہے ایک ایسے آلے کا جو انسان کے سامنے اس کے اپنے عیب وہنر کو ظاہر کرتا ہے اور دل ودماغ کو حق قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے- امید ہے کہ ''الاحسان'' کے ذریعے بہت سارے نظری بت سرنگوں ہوں گے اور بہت سارے صالح خیالات ونظریات اہل علم ودانش کے دل ودماغ میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے-

....

الاحسان کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے- پچھلے دونوں شماروں کی طرح اس شمارے کو بھی حتی الوسع بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے- اس بار کئی نئے چہرے اپنے نئے افکار و پیغامات کے ساتھ آپ کے روبرو ہیں- جناب محمد ساحل سعیدی (سروجیت سنگھ) اور محترمہ رابعہ خاتون (رجنی) کے سفر ایمان کی داستان، ایمان افروز بھی ہے اور عبرت آموز بھی- تحقیق وتنقید کے کالم میں اس بار مولانا طفیل احمد مصباحی، پروفیسر بدیع الدین صابری، ڈاکٹر ارشاد احمد ساحل شہسرامی، مولانا ساجد رضا مصباحی اور مولانا وارث مظہری پہلی بار ''الاحسان'' کے مے کدے میں حاضر ہوئے ہیں- ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں- صدر شعبۂ افتا، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، مفتی محمد نظام الدین رضوی نے بھی پہلی بار اس مے خانۂ روحانیت کو شرف بخشا ہے اور بحث ونظر کے کالم کی توقیر بڑھائی ہے- ہمارے پیہم اصرار پر اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی نے بھی بالآخر اس بار شرکت فرما کر ہمارا حوصلہ بڑھایا ہے- اسی طرح پہلی بار پروفیسر عبد الحمید اکبر اور مولانا ارشاد عالم نعمانی نے صوفی ادب میں شرکت کے ساتھ اپنی آمد کا احساس دلایا ہے- مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صاحب بھی پہلی بار بزم ''الاحسان'' میں اپنے طویل مکتوب کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں، جو کئی مقالوں پر بھاری ہے- ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں- ساتھ ہی یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ''الاحسان'' مناظرے کا نہیں دعوت واصلاح

اور مکالمے کا پلیٹ فارم ہے- اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ مکتوبات کے کالم میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی اور دیگر اہل علم کے معروضات کو ہمارے محسن اہل قلم سنجیدگی سے لیں گے اور کوشش کریں گے کہ ''الاحسان'' دعوت سے جدال اور اختلاف سے مخالفت کی طرف گامزن نہ ہو-

''شناسائی'' کے کالم میں ہندوستان کے قدیم دینی وروحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مدظلہ العالی کا تحریری انٹرویو اور ''خانقاہ رشیدیہ جون پور: تاریخ اور کارنامے'' کے عنوان سے مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کی تحریر زینت شمارہ ہے جو اس قدیم خانقاہ کی تاریخ، اہمیت اور دعوتی وتبلیغی خدمات سے آگاہ کرتی ہے-

اس بار ''زاویہ'' کا کالم قاطع دین الٰہی، امام ربانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے لیے خاص ہے- اس کالم میں ۶ مقالات شامل ہیں اور ہر مقالہ اپنے موضوع پر اہم اور وقیع ہے- پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، مولانا رفعت رضا نوری، ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی اور مولانا ابرار رضا مصباحی نے اپنے اپنے عنوان پر گراں قدر تحریریں سپرد قلم کی ہیں- آخر الذکر تینوں اہل قلم بھی ''الاحسان'' کے لیے نئے ہیں- ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے علمی تعاون کا سلسلہ قائم رہے گا-

مولانا عبد المبین نعمانی، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ''الاحسان'' ٹیم کی طرف سے خصوصی تشکر کے مستحق ہیں کہ مذکورہ تینوں حضرات ''الاحسان'' کو پہلے شمارے سے اپنی علمی وفکری اور اصلاحی نگارشات سے مستقل نواز رہے ہیں- ہم آیندہ بھی ان کی علمی نوازشات کے امیدوار ہیں- اللہ انہیں صحت وسلامتی سے رکھے اور احسان وتزکیے کی اس علمی، فکری اور دعوتی تحریک کو ان سے تقویت بخشے- آمین!

تصوف کے تعلق سے علامہ ابن جوزی اور شیخ ابن تیمیہ کے خیالات کو پیش کرنے کے بعد مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی حافظ ابن قیم کے ذوق تصوف کے ساتھ شریک بزم ہیں- گزشتہ دونوں تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی عالمانہ اور جانبین کو چونکا دینے والی ہے- اس بار مختلف اسباب کے تحت ''حاصل مطالعہ'' کا کالم حذف کرنا پڑا- مجموعی طور پر ادارہ ''الاحسان'' نے تیسرے شمارے کو زیادہ سے زیادہ علمی اور معلوماتی بنانے اور اغلاط سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے- ادارہ اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ اب قارئین کے حوالے ہے- ویسے یہ شمارہ اور بھی وقیع ہوتا اگر ہمیں وہ مقالات مل جاتے جن کو حاصل کرنے میں ہم اپنی توقع اور اصرار مسلسل کے باوجود ناکام رہے- ظاہر ہے قلم کاروں کی شدید مصروفیت یا ہمارے خلوص میں کمی کے سوا اس کی وجہ اور کیا ہوگی!

....

ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنے تمام قلم کاروں کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور اپنے علمی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات ومکتوبات سے نواز کر ہمارا تحریری وعلمی تعاون کیا- بہت افسوس کے ساتھ یہ بات بھی عرض ہے کہ اس وقت جب ہم ''الاحسان'' کا تیسرا شمارہ پیش کر رہے ہیں ادارہ اپنا ایک اہم قلم کار کھو چکا ہے جس کی تحریر ادارہ کو سب سے پہلے موصول ہوا کرتی تھی- تیسرے شمارے کے لیے بھی ان کی خدمت میں دعوت نامہ پیش کیا جا چکا تھا، امید تھی کہ ان کی تحریر بھی جلد ہی موصول ہو جائے گی کہ اچانک یہ خبر ملی کہ حضرت علامہ شاہ اشتیاق عالم ضیا شہبازی زیب آستانہ عالیہ شہبازیہ بھاگل پور بہار، اس دار فانی کو الوداع کہہ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے- انا لله و انا اليه راجعون- ادارہ ''الاحسان'' کو شدید صدمہ ہوا، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اہل وعیال، خویش واقارب اور مریدین ومتوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے- (آمین!)

....

آخر میں ادارہ ''الاحسان'' اپنے سرپرست اعلیٰ داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنا اپنے لیے باعث افتخار خیال کرتا ہے جن کی سرپرستی میں ''الاحسان'' جیسا تحقیقی اور علمی رسالہ پیش کرنے میں ہم کامیاب ہو رہے ہیں- دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ ان کی قیادت وتربیت میں علمی تصوف کی تصحیح سے عملی تصوف کی تعمیل تک ہم سب کی رسائی فرمائے اور ہمارے سروں پر ان کے سایۂ عاطفت کو تا دیر قائم رکھے- (آمین!)

حسن سعید صفوی

واردات

تصوف اپنے حامیوں کے بقول تصور قرآنی ''تزکیہ'' اور تعبیر حدیث ''احسان'' کے ہم معنی ہے اور اپنے مخالفین کی نظر میں عجم کی پیداوار، فلسفۂ ویدانت کی صوفیانہ تعبیر اور ایک غیر اسلامی طرز فکر و عمل ہے- یہ بات ایک عرصے سے کہی جا رہی ہے- دونوں طرف اپنی بات کی صداقت پر اصرار تواتر سے کیا جاتا رہا ہے، مناظرانہ انداز میں بھی اور جارحانہ وناقدانہ انداز میں بھی- یہ گفتگو ابھی مزید جاری رہنی چاہیے، فقط انداز بدل کر، اب اس کا انداز نہ تو مناظرانہ ہونا چاہیے اور نہ ہی جارحانہ، بلکہ یہ بحث مکالمے کی شکل میں آگے بڑھ سکتی ہے- مکالمہ موجودہ تکثیری معاشرے کی ضرورت ہے- مکالمہ صرف بولنا نہیں سکھاتا، سننا بھی سکھاتا ہے- ہمارے بیشتر مسائل حل ہونے کی بجائے پیچیدہ اس لیے ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنی بات کہنے کا فن تو آتا ہے، دوسرے کی بات سننے کا ہنر نہیں آتا- ''الاحسان'' کا پہلا شمارہ آج سے دو سال پہلے ۲۰۱۰ء میں آیا تھا اور اس میں اس کے دیگر مقاصد کے ساتھ یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ ''الاحسان'' دراصل تصوف پر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اہل علم کے لیے ایک مکالمے کی میز کی طرح ہے جہاں ہر کوئی شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکے گا اور دوسرے کی بات سن سکے گا- ''الاحسان'' کے گذشتہ دونوں شمارے اس بات کی شہادت ہیں کہ اس کو اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ملی ہے، لیکن تصوف کے حوالے سے جس وسیع سطح پر غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں اور تصوف کے نام پر جن کثیر گمراہیوں کا بازار گرم ہے، ان کی اصلاح وازالے کے لیے اور تصوف کے حامیوں اور مخالفوں کو جادۂ اعتدال پر لانے کے لیے ابھی اس سلسلے کو مزید جاری رکھنا ہوگا، پوری توانائی کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، علمیت کے ساتھ اور توسع وتفکر کے ساتھ، ایک طویل مدت تک-

....

شریعت وطریقت میں نسبت کیا ہے؟ ماضی میں اس پر طویل بحثیں ہو چکی ہیں- یہ بحث آج بھی جاری ہے- اکابر سے اصاغر تک سب نے اس پر اظہار خیال کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں- اس نسبت کو بیان کرتے ہوئے باطنیت زدہ افراد نے شریعت کی اہمیت کو کم ثابت کرنے کی پرزور کوشش کی ہے جب کہ ظاہر پرستوں نے شریعت اور طریقت کو اس طور پر دیکھا ہے کہ جیسے شریعت پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا نظام ہو اور طریقت بعد کے ادوار میں صوفیہ کا ایجاد کردہ نظام- کسی نے شریعت کو کل کہا اور طریقت کو جز کہا تو کسی نے شریعت کو قشر اور طریقت کو مغز بتایا اور کسی نے شریعت اور طریقت دونوں کو دین کا جز بتایا اور دین کو ایک کل نظام قرار دیا- یہ اور اس طرح کے اختلافات میں بعض اختلافات وہ ہیں جو واقعی ہیں اور بعض لفظی اور تعبیری ہیں- اس حوالے سے حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف کے بڑے بڑے محققین کا تصور بھی واضح نہیں ہے- وہ ان اختلافات کو صحیح طور سے نہیں سمجھ پاتے اور جہاں اختلاف لفظ وتعبیر کا ہوتا ہے اس کو واقعی سمجھ لیتے ہیں اور جہاں واقعی اختلاف ہوتا ہے وہاں اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے-

دراصل شریعت کا اطلاق الگ الگ دو معنوں پر کیا جاتا ہے- کبھی شریعت سے اسلام کا پورا نظام دین مراد ہوتا ہے- اس وقت طریقت اس کا ایک جز ہوتا ہے- اس لحاظ سے جس طرح ایمانیات اور فقہیات، عقائد واعمال سب شریعت اسلامی کے اجزا ہیں اسی طرح طریقت بھی شریعت کا ایک جز ہے، جو عقائد واعمال میں حسن اور اخلاص کی بات کرتا ہے- ظاہر ہے کہ جس طرح ایمان لانا اور نیک عمل کرنا شریعت کی تعلیمات کا حصہ ہیں، اسی طرح ایمان میں اخلاص اور عمل میں احسان لانے کی جو تدابیر ہیں یہ سب بھی شریعت کی تعلیمات کا ہی حصہ ہیں-

کبھی شریعت بول کر اسلام کے ظاہری یا فقہی احکام مراد لیتے ہیں- اس وقت شریعت اور طریقت دونوں دین کا حصہ ہوتے ہیں اور آپس میں اسی طرح الگ الگ ہوتے ہیں جس طرح شریعت/ فقہ اسلامی اور عقائد/ مسائل کلام، دین کا حصہ ہوتے ہوئے بھی آپس میں الگ الگ ہیں اور دونوں کی الگ الگ اپنی اہمیت ہے- یہ بات مزید آسانی کے ساتھ اس وقت سمجھ میں آئے گی جب ہم حدیث جبریل کو اپنے سامنے رکھیں جس میں ایمان، اسلام اور احسان کی الگ الگ تشریح کی گئی ہے اور تینوں کے مجموعے پر لفظ ''دین'' کا اطلاق کیا گیا ہے-

شریعت پہلے اطلاق میں کل ہے اور طریقت اس کا جز ہے، جب کہ دوسرے اطلاق میں دونوں باہم قسیم ہیں اور یہ دونوں بشمول عقائد کے، دین کا حصہ ہیں اور تینوں کا مجموعہ دین ہے؛ اور تینوں کی اہمیت اس طور سے ہے کہ ایمان (عقائد قبول کرنے) کے بعد بندہ دائرۂ اسلام میں داخل

ہوتا ہے، اسلام (شریعت کی پابندی) کے بعد عام نگاہوں میں وہ ایک نیک مسلمان بنتا ہے اور احسان (طریقت) کے بعد وہ عند اللہ مومن ومسلم ہوتا ہے اور درجات کا مستحق قرار پاتا ہے- اسی اعتبار سے طریقت کو عین شریعت، یعنی حاصل شریعت، مغز شریعت اور مطلوب شریعت کہا جا سکتا ہے- طریقت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت کی پابندی بتمام وکمال اور باحسن وجوہ کی جائے تا کہ رضائے مولیٰ حاصل ہو- جو لوگ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کا تصور رکھتے ہیں یا طریقت کو شریعت کے بالمقابل ایک متوازی نظام (Parallel System) کے طور پر دیکھتے ہیں وہ تصور دین سے ناآشنا سخت گم رہی کا شکار ہیں-

....

تصوف عمل سے علم، علم سے فن اور فن سے فلسفہ؛ مختلف مدارج طے کر چکا ہے- اس کے اندر بڑی وسعت، ہمہ گیریت، رنگا رنگی، تکثیریت اور ہمہ جہتیت وآفاقیت پیدا ہو چکی ہے- اس کی اتنی جہات ہیں، تصوف کے نام پر ایسے ایسے بت تراشے گئے ہیں، اس کے مسائل میں اس قدر تنوع وتکثر پیدا ہوا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص پر تصوف کے حامی یا مخالف ہونے کا لیبل لگانا بڑا مشکل ہے- آج کسی کو اس اصطلاح سے اختلاف ہے، کوئی اسے قرآنی وحدیثی تعبیر تک درست مانتا ہے، کوئی اسے صرف عملی اور شخصی وداخلی کیفیت تک محدود کرتا ہے، کسی کو تصوف سے تو بیر نہیں مگر فلسفۂ تصوف سے خدا واسطے بیر ہے، بعض وہ لوگ ہیں جو یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہیں لیکن تصوف کی اس شکل کے منکر ہیں جو گریز، رہبانیت اور ترک دنیا سے متعلق ہے، بعض افراد کو یہ سب بھی تسلیم ہے لیکن تصوف کے نام پر جو آج دکان داری چل رہی ہے، وہ اس کے خلاف ہیں؛ ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص کو تصوف کا حامی یا مخالف کہنا ایک مبہم بات ہے- آج تصوف پر کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے- صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص تصوف کا مخالف ہے، کلی انصاف نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اسے تصوف سے اختلاف ہے تو کس جہت سے ہے-

....

ابن جوزی، ابن تیمیہ اور ابن قیم، تصوف کے مخالفین میں بڑی شہرت رکھتے ہیں- ایک طبقہ وہ ہے جو ان کو بالکلیہ مسترد کرتا ہے، اس خیال میں کہ یہ حضرات تصوف کے مخالف ہیں اور ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو بالکلیہ تصوف کو مسترد کرتا ہے، اس خیال میں کہ وہ ان شخصیات کو اپنے لیے آئیڈیل تصور کرتا ہے اور انہیں مخالف تصوف سمجھتا ہے- میرے دوست اور ''الاحسان'' کے شریک مرتب مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی نے مذکورہ بالا اصول کے تحت کہ کسی کو کلی طور پر تصوف کا حامی

کہنا یا کلی طور پر تصوف کا مخالف کہنا ایک غیر منصفانہ اور غیر واضح بات ہے، ان تینوں شخصیات کے تصوف واحسان سے متعلق افکار کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا اور وہ بات لکھی جو ان کے اپنے مطالعہ وتحقیق سے ثابت ہوئی- ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ تینوں شخصیتیں نہ تصوف کو کلی طور پر مسترد کرتی ہیں اور نہ ہی کلی طور پر قبول کرتی ہیں- وہ تصوف کے بعض پہلوؤں کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان پر عامل بھی ہیں، البتہ بعض امور میں انہیں اختلاف رائے ہے اور وہ دلائل کی بنیاد پر ان سے اختلاف رکھتے ہیں- تفصیل کے لیے مولانا کی تینوں تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں-

مولانا ضیاءالرحمٰن کی تحقیق اس طبقے کے لیے موت کا پیغام ہے جو تصوف کو کلی طور پر مسترد کرتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے آئیڈیل علما اس کے مخالف ہیں- ظاہر ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مذکورہ تینوں علما تصوف کے کلی مخالف نہیں ہیں تو اب ان کی ہم نوائی کا دم بھرتے ہوئے تصوف کو کلی طور سے مسترد کرنا ممکن نہیں رہا- ہمیں خوشی ہے کہ اس حوالے سے تحریر بہت موثر ومفید ثابت ہوئی ہے- کچھ بت بھی گرے ہیں، کچھ میں ابھی لرزش ہے، یہ بحث یوں ہی جاری رہی تو ان شاءاللہ اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے اور تصوف کے تعلق سے یک طرفہ غلط بیانی اور ہوا خیزی کا ماحول کم ہوگا-

ضیاءالرحمٰن صاحب کی تحقیق اس طبقے کے لیے سراپا مسرت اور شادمانی رہی جو تصوف کے تو حامی ہیں مگر مذکورہ بالا علما کو تصوف مخالف سمجھتے ہیں- ظاہر ہے کہ جب کسی کو یہ معلوم ہو کہ ہمارا مخالف بھی ہماری بات سے کسی حد تک اتفاق رکھتا ہے تو اس کا خوش ہونا تو فطری ہے ہی- مگر اس حوالے سے ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے بعض تصوف نواز احباب کو ہم سے شکایت ہے کہ ان علما کو اس رسالے میں کوریج کیوں دیا گیا ہے اور اگر دیا گیا تو ان کا رد بلیغ کیوں نہیں کیا گیا؟ ہمیں ایسے مخلصوں سے ہم دردی ہے- ان حضرات نے یا تو ضیاء صاحب کی تحقیقات کا مطالعہ نہیں کیا ہے، یا مطالعہ کیا ہے تو اسے کلی طور سے سمجھا نہیں ہے، یا سمجھا ہے لیکن اس تحقیق کے جو مثبت اثرات ہیں وہ ان سے بے خبر ہیں، یا وہ اپنے مخالفین کی مخالفت میں اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ انہیں اپنے مخالف کے منہ سے اپنی حمایت میں بھی کچھ سننا گوارا نہیں ہے-

....

شیخ یوسف القرضاوی موجودہ اسلامی علمی دنیا کا ایک متعارف نام ہے- موصوف کا ایک انٹرویو کسی عربی جریدے میں میں نے پڑھا تھا جس میں ان کے اس بیان کو شہ سرخی بنایا گیا تھا:

''ہماری دعوت یہ ہے کہ صوفی سلفی بن جائیں اور سلفی صوفی بن جائیں-''

"ندعو إلى تصويف السلفية وتسليف الصوفية."

موصوف کا اس سے اپنا مقصود کیا ہے، یہ وہ جانیں، اس کا جو بہتر مفہوم اور اچھی تاویل

میرے ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں اہل سنت وجماعت سے اپنا انتساب کرنے والے دو گروپ میں بٹے ہوئے ہیں- ایک بڑی جماعت ہے، جسے صوفی کہا جاتا ہے جب کہ اس کے بالمقابل ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو خود کو سلفی اور اس کے مخالف اسے وہابی کہتے ہیں اور یہ خود جماعت صوفیہ کو بدعتی کہتا ہے- صوفیہ باہمہ زہد وپارسائی، رواداری اور زندہ دلی بالعموم تحقیقات کی بجائے روایات پر اور نصوص کی بجائے ملفوظات پر ارتکاز کیے ہوئے ہیں، جب کہ سلفی حضرات ظواہر نصوص کو تھامے ہوئے ہیں، ان کے دل سخت ہیں اور دماغ پر اصرار وتشدد سوار ہے- ایسے میں قرضاوی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ سلفی لفظوں کی فصیل سے آگے بڑھ کر معانی کے قلعے میں اتریں اور دماغ کی زرخیزی کے ساتھ قلب کی شادابی پیدا کریں، عقل کی روشنی کے ساتھ عشق کی رہبری سے استفادہ کریں اور دوسری طرف صوفی حضرات روایات کے ساتھ اسانید کی طرف بھی متوجہ ہوں، شب زندہ داری کی اہمیت مسلم ہے مگر یہ عمل اگر علم کی روشنی کے بغیر کیا گیا تو گم راہی میں دور تک نکل جانے کا اندیشہ ہے- دل کے ساتھ عقل کی پاسبانی اور طریقت کے ساتھ شریعت کی ناگزیریت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟؟

اگر قرضاوی صاحب کا اپنی دعوت سے مقصود یہی ہے تو ان کے ساتھ اتفاق کیا جانا چاہیے؛ کیوں کہ عصر حاضر کا جبری تقاضا ہے کہ صوفیانہ بصیرت کے ساتھ محدثانہ بصارت بھی ہو، موجودہ عہد کے علما اگر صوفی القلب اور فقیہ النظر ہو گئے تو دین ودنیا کے سارے معرکے سر ہو سکتے ہیں- اس سے آخرت بھی آباد ہوگی اور دنیا بھی شاداب ہوگی- یہی رویہ عصر حاضر کے علمی وروحانی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور اصلاح فکر وعمل، اتحاد بین المسلمین اور صلاح دین وفلاح دنیا کے لیے ضمانت بھی-

....

تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر میں الاحسان ہے- الاحسان بارگاہ خداوندی میں حضوری کی کیفیت ہے جس کی تشریح **ان تعبد الله كانك تراه وان لم تكن تراه فانه يراك** سے کی گئی ہے، یعنی:

''عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے-''

یہ مقام؛ ایمان، یعنی عقائد اسلامی کو قبول کرنے، اسلام، یعنی اعمال اسلامی کے بجالانے کے بعد کا ہے- تصوف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عقاید اسلامی کو قبول کر لینے کے بعد اسلامی احکام کا اتباع کیے جانا، صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم نے اول مرحلہ میں جس جامع صفات خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے اسے احکام اسلامی اور اعمال شریعت

انجام دیتے وقت ہمہ وقت یاد رکھیں- اس کے تصور سے لمحہ بھر بھی غافل نہ ہوں تا کہ ہمارے اعمال میں حسن واخلاص پیدا ہو اور وہ احسن طور پر انجام پائیں- گویا تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے نیت میں حسن واخلاص اور عمل میں کمال واحسنیت کا تقاضا کرتا ہے- ظاہر ہے کہ ہمارے آباد خرابے میں حسن نیت اور حسن عمل کے سوا سب کچھ ہے- ہماری دنیا میں جو کچھ بھی بگاڑ ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہمارے عقاید واعمال سے اخلاص اور حسن نیت مفقود ہو گئے ہیں- اگر اس گنج مفقود کو حاصل کر لیا گیا تو ہمارے تمام مسائل بڑی حد تک از خود حل ہو جائیں گے- اس طرح حقیقی تصوف کی بازیابی اپنے آپ میں معاصر دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے-

....

ترتیب کے لحاظ سے الاحسان یا تصوف کا نمبر ایمان اور اسلام کے بعد آتا ہے؛ لیکن صوفیۂ کرام نے اپنی حکیمانہ دعوت میں اس ترتیب کو پلٹ دیا اور ایمان واسلام کی تفصیلات اور کلام وفقہ کے دقائق اور مغلقات کو پیش کرنے کی بجائے سب سے پہلے نیت کی اصلاح اور دلوں کے تزکیے کی طرف متوجہ ہوئے- چوں کہ صورت حال یہ تھی کہ لوگوں کے پاس علم الکتاب بھی تھا اور حکمت وبصیرت بھی تھی لیکن دنیاوی اغراض نے نیتوں کو فاسد کر دیا تھا- اس لیے اصل کام نیتوں کی اصلاح اور دلوں کے تزکیے کا تھا جس فریضے کو بحسن وخوبی صوفیۂ کرام نے انجام دیا- یہ کام عملی طور پر بھی آسان اور موثر تھا، کیوں کہ اگر کسی کو ایمان کی دعوت دی جائے اور اس کو کہا جائے کہ اپنے عقیدے کو اس طور پر کر لو جس طرح ہمارا ہے تو وہ آسانی کے ساتھ اپنے عقاید وتصورات کو غلط تسلیم نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے تائب ہوگا- اگر ارکان اسلام؛ نماز، روزہ، حج وزکوۃ کے مسائل بتائیں تو اس میں بھی فقہا کے اختلافات ہیں اور مخاطب مناظرہ بازی پر اتر سکتا ہے- اسی لیے صوفیہ نے پہلے مرحلے میں تیسرے مرحلے کا کام کیا- دلوں میں خوف خدا پیدا کیا، نیتوں میں اخلاص کے جوت جگائے جس کے بعد انسان فطری طور پر بحث وجدال کی بجائے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کے ساتھ فکر وعمل کے لیے اس راہ کو اختیار کرتا ہے جس کی صداقت پر اس کا دل گواہی دیتا ہے- جہان فکر وعمل میں اصلاح وانقلاب کے لیے صوفیہ کا یہ اسلوب ماضی میں بے پناہ موثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر اس اسلوب کو ہم اختیار کرتے ہیں تو اس کے بے پناہ ثمرات حاصل ہوں گے- عصر حاضر کو اس اسلوب دعوت کی ضرورت ہے-

....

تصوف کی روح اور تصوف وصوفیہ کا مقصود الاحسان ہے؛ جسے تزکیۂ قلب، اصلاح نفس، اخلاص نیت، کیفیت حضوری اور اسی طرح کے دوسرے نام بھی دیے جا سکتے ہیں- بعد کے ادوار

میں صوفیہ نے اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے جو روح دین اور عین شریعت ہے، اپنے اپنے زمانے میں مختلف طریقے، رسوم، مجاہدے، ریاضتیں اور فلسفے وضع کیے جو فی الجملہ سب کے سب تصوف کا حصہ اور قلب میں روح دین کو جاگزیں کرنے کے موثر تدابیر ہیں، لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان سب کا تعلق تصوف سے ثانوی ہے، اولین نہیں ہے- اس امر کو ملحوظ رکھا جائے تو کئی فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً:

۱- رسوم تصوف میں الجھ کر حقیقت تصوف سے غافل نہ ہوں گے اور اصل وفرع کی تمیز ہمیں ہر غلط فہمی وگم راہی سے محفوظ رکھے گی-

۲- ہماری طریقت، شریعت سے الگ نہ ہوگی، جیسا کہ موجودہ بیشتر مدعیان طریقت کا حال ہے، بلکہ شریعت کی اکمل اور احسن صورت ہوگی، جو ہمارے اکابر صوفیہ کے یہاں ملتی ہے-

۳- رسوم تصوف، حقیقت تصوف تک رسائی کا ذریعہ ہیں- اس لیے عصر حاضر میں ان رسوم کی پابندی کریں گے جو عصری تقاضوں کے مطابق حقیقت تصوف تک رسائی کا ذریعہ ہیں، بلکہ اگر عصری تقاضوں کے مطابق کچھ نئی رسموں کی وضع کی ضرورت پڑے جن سے حقیقت تصوف کا حصول ممکن ہو، تو ان کی وضع پر بھی غور کریں گے اور خواہی نہ خواہی رسموں کی پابندی کو اپنے اوپر اس طرح لازم نہیں کر لیں گے کہ وہ اصل پر غالب آ جائیں اور ہماری حالت یہ ہو جائے کہ روح تصوف جائے تو جائے رسوم تصوف ترک ہونے نہ پائیں، جیسا کہ اکثر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے-

۴- جو بعض رسوم تصوف کا مخالف ہو، اسے تصوف کا مخالف سمجھنے اور جو رسوم تصوف کے التزام کے ساتھ حقیقت تصوف سے بے بہرہ ہو، اسے تصوف کا موافق سمجھنے کی غلطی سے ہم محفوظ رہیں گے-

۵- اس سے تصوف کی تبلیغ واشاعت میں آسانی پیدا ہوگی- عصر حاضر روح تصوف کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے- اگر ہم نے رسموں پر زیادہ اصرار کیا تو شاید تصوف کی تبلیغ وترسیل میں ہم خود رکاوٹ بنیں گے-

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حقیقت تصوف، فلسفۂ تصوف اور رسوم تصوف کے فرق کو سمجھیں اور اس فرق کے جو تقاضے ہیں، انہیں ملحوظ رکھیں-

ذیشان احمد مصباحی

بادۂ کہنہ

شیخ ابو نصر سراج
ترجمہ:سید اسرار بخاری

صوفیہ کی نظر میں فقہ اور فقہا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ تعالیٰ بھلائی سے نوازنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے- حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فقیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''فقیہ دنیا سے دل نہ لگانے والے، آخرت کو چاہنے والے اور امور دین میں بصیرت رکھنے والے کو کہتے ہیں- قول باری تعالیٰ ہے: **فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین.** (تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کرے-)

مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ دین ظاہری و باطنی احکامات سے عبارت ہے- اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ احوال و مقامات سلوک کے احکامات و معانی کی سمجھ حاصل کرنا؛ طلاق، ظہار، قصاص، حدود اور غلاموں کو آزاد کرنے جیسے مسائل جان لینے اور سمجھ لینے سے کسی طرح کم فائدہ مند نہیں- یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ احکام ظاہری سے متعلق مسائل سمجھنے کی ضرورت اس قدر نہیں پڑتی جس قدر باطنی احکامات کے مسائل کی - کیوں کہ ظاہری احکامات کے مسائل ہر وقت پیش نہیں آتے بلکہ جب بھی اس طرح کی کوئی صورت واقع ہو تو کسی فقیہ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا جاتا ہے اور اس طرح اس مسئلے کے پھر واقع ہونے کے بعد سوال کرنے والا اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے- لیکن باطنی احکامات، احوال و مقامات سلوک کا جاننا عمر کے ہر حصے میں ہمہ وقت تمام مسلمانوں پر فرض ہے- جیسے صدق، اخلاص، ذکر الٰہی اور ترک غفلت جیسے احوال کو اختیار کرنے کے لیے کوئی معین وقت نہیں، بلکہ بندے پر ہر لمحہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان پر عمل پیرا رہے- صوفیہ کرام ان احوال و مقامات سے کامل آگہی رکھتے ہیں اور اس کی جملہ تفصیلات بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں-

بندے کو اس بات کا علم رکھنا چاہیے کہ اس کا ارادہ و خیال کیا ہے؟ اگر وہ حقوق سے تعلق

رکھتا ہوتو اسے پورا کرے اور کسی خواہش نفس سے متعلق ہوتو اسے ترک کرے-جیسا کہ رب کائنات جل جلالہ نے فخر رسل سید الکونین علیہ التحیۃ والسلام سے خطاب فرمایا: **ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه وکان امره فرطا** (اور اس کا کہانہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا-)

الغرض مذکورہ بالا احوال کا تارک وہی ہوسکتا ہے جس کے قلب پر غفلت کی تاریکیاں چھا گئی ہوں-موضوعات تصوف کی وسعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن وسنت سے جس قدر احکامات تصوف، صوفیہ کرام نے اخذ کیے وہ بہر حال فقہائے کرام کے مستنبط احکام سے کہیں بڑھ کر ہوں گے، کیونکہ علم تصوف کی وسعتوں کو محدود نہیں کیا جاسکتا-اس کے راستے لطیف اشارات، دشوار گزار صحراؤں، دل کش خیالات ،عطاو بخشش کے خزانوں سے بھرے پڑے ہیں، اور اس کا ادراک رکھنے والے ہر آن اہل طلب کی جھولیاں بھر رہے ہیں-

اس دنیا میں ہر علم کی ایک حد ہے اور یہ حد تصوف پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، جب کہ تصوف کی حد کسی دوسرے علم پر ختم نہیں ہوتی -اس کو کسی دوسرے علم کی احتیاج نہیں-اس کا یہ طریق ہے کہ سالک کو اپنے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جاتی ہے-اس علم کا کوئی کنارہ نہیں ، کیوں کہ اس کے مقصود کی کوئی حد نہیں اور علم تصوف کا وہ اعلیٰ ترین درجہ جسے علم الفتوح کہتے ہیں، اللہ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو ودیعت کیا جاتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس کے قلب کو اپنے کلام کی سمجھ عطا کر کے اپنے خطاب سے صحیح استنباط کا ملکہ عطا فرماتا ہے-ارشاد ہوتا ہے:

قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثله مددا (تم فرمادو، اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی ہوتو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی-اگر چہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لے آئیں-)

اور فرمایا: **لئن شکرتم لازید نکم** (اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دوں گا-)

بندوں پر اس کے فضل خاص کی کوئی نہایت نہیں-انہیں ہر حال میں شکر ادا کرتے رہنا چاہیے، کیوں کہ شکر ادا کرنا خود اپنی جگہ ایک نعمت ہے اور مستوجب شکر ہے اور اس کے بے پایاں لطف وکرم کا ضامن-

(کتاب اللمع فی التصوف، مترجم، ص:۴۷، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیوالان، نئی دہلی)

○○○

شیخ علی بن عثمان ھجویری

ترجمہ: کپتان واحد بخش سیال چشتی

شریعت اور حقیقت

یہ دونوں اصطلاحات اس قوم کی ہیں جو شریعت سے ظاہری اعمال کی صحت اور حقیقت سے باطنی احوال کی پختگی مراد لیتے ہیں-شریعت وحقیقت کے متعلق دو گروہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں-اول علمائے ظاہر جو شریعت وحقیقت میں فرق نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں کہ شریعت خود حقیقت ہے اور حقیقت شریعت ہے-دوسرا گروہ ان ملحدین کا ہے جو ایک کا دوسری کے بغیر قائم رہنا جائز رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت آشکارا ہوگئی تو شریعت اٹھ گئی-یہ عقیدہ فرقہ مشبہہ، قرامطہ، شیعہ اور متشککین کا ہے-ان کی دلیل یہ ہے کہ شریعت حقیقت سے جدا ہے جیسا کہ ایمان کے لیے زبان کے اقرار سے، دل کی تصدیق جدا ہے- ہماری یہ دلیل ہے کہ اصل میں دل کی تصدیق کے لیے زبان سے اقرار ضروری ہے-

بات یہ ہے کہ صرف دل کی تصدیق سے یعنی زبان کے اقرار کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی صرف زبان کے اقرار سے ،یعنی بغیر تصدیق قلب، انسان مومن بن سکتا ہے-لہٰذا قول اور تصدیق کے درمیان جو فرق ہے ،ظاہر ہے- چناں چہ حقیقت وہ چیز ہے جس کا نسخ ناممکن ہے-حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جہان کے فنا ہونے تک حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی -مثلاً حق تعالیٰ کی معرفت اور اعمال کی صحت خلوص نیت پر مبنی ہے اور شریعت وہ چیز ہے کہ جس کے اندر تبدیل وتغیر جائز ہے جیسا کہ احکام واوامر الٰہی (مثلاً قرآن میں بعض آیات ناسخ اور بعض منسوخ ہیں)-

پس شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت خدا تعالیٰ کی نگہبانی، حفاظت اور عصمت کا نام ہے- پس شریعت کا قیام حقیقت کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قائم کرنا شریعت کے بغیر محال ہے- مثال کے طور پر ہر شخص روح کے ساتھ زندہ ہے اور جب روح نکل جاتی ہے تو انسان مردہ ہو جاتا ہے-روح اور جسم کے اکٹھا ہونے سے انسان زندہ ہے-یہی شریعت وحقیقت کا باہمی تعلق

ہے-شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے-خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے: **والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا** (جو لوگ ہماری خاطر جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو اپنی طرف کی راہیں دکھاتے ہیں-) اس آیت میں مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت سے مراد حقیقت سے آگاہی ہے-شریعت فعل بندہ ہے یعنی اس کے ظاہری اعمال اور حقیقت فعل حق ہے، یعنی باطنی قرب حق کا عطا ہونا ہے- بالفاظ دیگر شریعت کا تعلق مکاسب (اعمال) سے ہے اور حقیقت کا تعلق مواہب سے ہے یعنی حق تعالیٰ کے انعامات اور عطیات سے ہے-

(شرح کشف المحجوب، ص:۹۰۶، اشاعت: ۱۹۵۷، مکتبہ رضویہ ۵۱۰، مٹیا محل، نئی دہلی ۶)

○○○

شیخ احمد سرہندی
ترجمہ: حسن سعید صفوی

علماے دنیا اور علماے آخرت

۳۳ واں مکتوب علمائے سو کی مذمت کے بیان میں ہے جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں اور جنہوں نے علم دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے، اور علمائے زاہدین کی مدح میں ہے جو دنیا سے بے رغبت ہیں-علما کے لیے دنیا کی محبت اور اس کی جانب رغبت ان کے رخ زیبا پر داغ ہے- لوگوں کو اگرچہ ان سے فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن ان کا علم خود ان کے حق میں سودمند نہیں ہوتا-یہ بات صحیح ہے کہ ان حضرات سے شریعت کو تائید و تقویت حاصل ہوتی ہے لیکن بسا اوقات اس طرح کی تائید و تقویت تو اہل فجور، ارباب فتور اور دین سے غافل لوگوں سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فاجر شخص سے دین کی تائید کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: **ان الله لیؤید هذا الدین بالرجل الفاجر** (بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کو فاجر شخص کے ذریعے تائید و تقویت عطا فرمائے گا-) پارس کی یہ خصوصیت ہے کہ تانبا اور لوہا جب اس سے چھو جاتا ہے تو سونا بن جاتا ہے، جب کہ وہ اپنی ذات میں پتھر ہی رہتا ہے-یوں ہی پتھر اور بانس میں جو آگ ودیعت کی ہوئی ہے اس سے لوگ تو نفع حاصل کرتے ہیں لیکن خود پتھر اور بانس اپنی اسی پوشیدہ آگ سے محروم رہتے ہیں، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان کے حق میں یہ علم نقصان دہ ہے، اس لیے کہ ان کے علم نے خود ان کے اوپر اتمام حجت کر دیا-**ان اشد الناس عذابا یوم القیمة عالم لم ینفعه الله بعلمه.** (قیامت کے روز سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جس کو اس کے علم سے نفع نہیں پہنچا-) بھلا وہ علم ان کے لیے ضرر رساں کیسے نہیں ہوگا کہ وہ علم جو اللہ عزوجل کے نزدیک عزت والا اور تمام موجودات میں سب سے زیادہ شرف والا ہے، اس کو ان لوگوں نے کمینی دنیا یعنی مال و جاہ اور ریا کا ذریعہ بنالیا ہے، جب کہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک ذلیل و خوار اور بدترین مخلوق ہے-چنانچہ رب تعالیٰ کے نزدیک معزز چیز کو ذلیل کرنا اور اس کی بارگاہ

میں ذلیل و بے وقعت چیز کو عزت دینا بہت ہی قبیح بات ہے اور درحقیقت حق تعالیٰ سے مقابلہ اور معارضہ کرنا ہے۔ تدریس وافتا اس وقت نفع بخش ہوتا ہے جب کہ وہ خالص رب تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور جاہ وریاست، مال ورفعت کی محبت کے شائبے سے پاک ہو، اور اس شائبے سے پاک ہونے کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے زہد اور دنیا وما فیہا سے بے رغبتی ہو، جو علما اس بلا میں مبتلا ہیں اور اس کمینی دنیا کی زلف محبت کے اسیر ہیں وہ علمائے دنیا ہیں، علمائے سو، بدترین خلائق اور دین کے چور ہیں، اور حال یہ ہے کہ خود کو یہ لوگ دین کا مقتدا اور مخلوق میں سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔
''ویحسبون انهم علی شئ ألا انهم هم الكاذبون استحوذ عليهم الشيطان فانسٰهم ذكر الله اولئک حزب الشيطٰن ألا ان حزب الشيطان هم الخٰسرون''
(یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کچھ کیا ہے۔ سن لو یہ جھوٹے ہیں، شیطان نے ان پر غالب آکر ذکر الٰہی کو بھلا دیا، یہ لوگ شیطان کے گروہ ہیں اور سن لو یقیناً شیطان کا گروہ ہی گھاٹے میں ہے۔)

اکابر میں سے کسی نے شیطان ملعون کو دیکھا کہ وہ گمراہ کرنے کی اپنی ذمہ داری سے بالکل مطمئن اور فارغ بیٹھا ہوا ہے، آں بزرگ نے اس کا راز پوچھا تو اس ملعون نے جواب دیا کہ اس وقت علمائے سو اس کام میں ہماری بڑی مدد کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھ کو اس ذمے داری سے فارغ کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس زمانے میں شرعی امور میں جو بھی سستی، مداہنت اور دین وملت کی ترویج واشاعت میں جو بھی فتور اور کوتاہی پائی جا رہی ہے، یہ سب علمائے سو کی شامت اور ان کی نیتوں کے فساد کی وجہ سے ہے۔ ہاں! وہ علما جو دنیا سے بے رغبت، جاہ وریاست اور مال ورفعت کی محبت سے آزاد ہیں، وہ لوگ علمائے آخرت ہیں، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے وارث اور مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلم کی سیاہی کو کل قیامت کے دن اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خون سے تولا جائے گا، اور ان کے قلم کی روشنائی شہدا کے خون پر غالب آجائے گی۔ حدیث پاک **''نوم العلماء عبادة.''** (علما کا سونا عبادت ہے۔) انہی لوگوں کے بارے میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نگاہوں کو آخرت کا جمال بھا گیا ہے اور دنیا کی قباحت و شناعت ان کے مشاہدے میں آ گئی ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ آخرت کے لیے بقا ہے اور دنیا کی پیشانی پر زوال کا دھبہ ہے۔ لہٰذا انہوں نے خود کو باقی کے حوالے کر دیا اور فانی سے منہ موڑ لیا۔ آخرت کی عظمت کا شہود درحقیقت ذات لایزال کی عظمت جلال کے شہود کا ثمرہ ہے۔ دنیا وما فیہا کو ذلیل سمجھنا عظمت آخرت کے مشاہدے کا لازمہ ہے۔ **لأن الدنيا والآخرة ضرتان ان رضيت احداهما سخطت الاخرى** (اس لیے کہ دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی طرح ہیں، اگر ایک خوش ہوگی تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔) اگر دنیا عزیز ہوگی تو آخرت خوار ہوگی اور اگر دنیا

خوار ہوگی تو آخرت عزیز ہوگی، ان دونوں کو جمع کرنا دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی قبیل سے ہے۔
ما احسن الدين والدنيا لو اجتمعا (دین اور دنیا اگر جمع ہو جائیں تو کیا ہی خوب ہو۔)

ہاں! مشائخ کی ایک جماعت جو اپنے نفس اور اپنے ارادے کی غلامی سے بالکل آزاد ہو چکی ہے، انہوں نے بعض حقانی نیتوں کے پیش نظر دنیا داروں کی صورت اختیار کی اور بظاہر دنیا کی طرف رغبت دکھائی، لیکن درحقیقت ان کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ تمام آلائشوں سے پاک رہے۔ **رجال لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله.** (اللہ کے بندے کچھ ایسے ہیں جنہیں تجارت اور خرید وفروخت، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔) تجارت اور خرید وفروخت ان لوگوں کے لیے ذکر الٰہی سے مانع نہیں ہوتی۔ ان امور سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ لاتعلق ہوتے ہیں۔ حضرت خواجہ نقش بند قدس اللہ سرہ نے فرمایا ہے کہ منٰی کے بازار میں ایک تاجر کو میں نے دیکھا کہ اس نے کم وبیش پچاس ہزار دینار کی خرید وفروخت کی لیکن ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔

(مکتوبات امام ربانی، ص: ۹۵ تا ۹۷، مطبوعہ سعید کمپنی، کراچی، ۱۹۷۷ء)

○○○

تذکیر

افادات:شیخ ابوسعید احسان اللہ صفوی
ترتیب:مجیب الرحمٰن علیمی

مقصد حیات انسانی-مقام احسان کا حصول

علم ایک نور ہے- اس کی روشنی میں انسان حلال وحرام، جائز وناجائز اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے-علم کا مقصد جس قدر اعلیٰ ہوگا اسی قدر علم بھی اعلی و افضل شمار کیا جائے گا- انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ، معرفت الٰہی کا حصول ہے- کائنات کے خالق کی طرف جو علم رہنمائی کرے اس کی ذات وصفات، اسماوافعال کا جو علم پتا بتائے، اس کے احکام سے جو علم آگاہ کرے، وہ علم سب سے اعلیٰ اور افضل قرار پائے گا-

اللہ رب العزت نے فرمایا:"**وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون**" حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق **لیعبدون** کی تفسیر **لیعرفون**" سے کی گئی ہے- یعنی ہم نے انسان وجنات کو اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا-معلوم ہوا کہ تخلیق انس وجن کا مقصد معرفت الٰہی کا حصول ہے- اب مخلوق اگر اپنے خالق ومالک کی معرفت حاصل کرتی ہے تو وہ کامیاب اور بامقصد قرار دی جائے گی، ورنہ ناکام اور بے مقصد کہی جائے گی-حضرت ابن عباس کی اس روایت کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں فرمایا-سوال کیا گیا:**ماالاحسان؟** تو آپ نے جواباً فرمایا:**ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک.** یعنی تمہارا اس طرح عبادت کرنا کہ تم اپنے رب کو دیکھ رہے ہو، یہی تصوف اور احسان ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم دل میں یہ یقین اور دماغ پر یہ تصور چھایا ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے- یعنی عبادت کرو تو تم کو اپنے خالق ومالک کی معرفت مشاہدہ حاصل ہو ورنہ اس کی معرفت استدلالی یقینی ضرور ہو- یہی احسان اور تصوف ہے- خالق کی یقینی معرفت ہی احسان ہے اور معرفت الٰہی ہی مقصد حیات ہے- دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ احسان تک رسائی ہی مقصد زندگی اور خلاصۂ حیات ہے-

احسان کے بارے میں اس سوال وجواب سے قبل بھی دوسوال اور بھی ہو چکے تھے- پہلا سوال اسلام کے بارے میں تھا اور دوسرا سوال ایمان کے متعلق تھا- یہ تیسرا سوال جو احسان و تصوف کے بارے میں کیا گیا تھا، اس کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور پھر اپنے صحابہ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: جانتے ہو یہ سائل کون تھے؟ یہ حضرت جبرئیل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے- تین سوالات ہوئے اور تینوں کے جوابات آپ نے ارشاد فرمائے اور پھر فرمایا کہ تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے- معلوم ہوا کہ اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعے کو دین کہا جاتا ہے- نہ صرف اسلام دین کامل ہے اور نہ ایمان دین کامل ہے اور نہ احسان ہی تنہا دین ہے، بلکہ دین نام ہے ان تینوں کے مجموعے کا- اسلام نام ہے ظاہر دین کا اور ایمان نام ہے باطن دین کا اور احسان نام ہے مقصد دین کا- دین کا مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک ظاہر وباطن دونوں یکساں نہ ہوجائیں- یعنی جس طرح انسان اپنی زندگی کے مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا، جب تک جسم وروح کی توانائی اس کو حاصل نہ ہو، یوں ہی مقصد دین تک اس وقت تک رسائی نہیں ہوسکتی جب تک اسلام وایمان کے مطالبات پورے نہ کرے اور ان دونوں کی خوبیوں کو اپنی زندگی میں نہ اتارے- جب کوئی انسان اسلام وایمان دونوں کے مطالبات کو پورا کرے گا تو اس کے لیے احسان تک رسائی ممکن ہوگی- دوسرے الفاظ میں جب انسان احکام اسلام کا پابند، قلب سے اللہ کی ربوبیت، رسول کی رسالت اور احکام الٰہی کی تصدیق کرنے والا ہوگا اور اپنے ظاہر وباطن میں یکسانیت رکھتا ہوگا تو اس کے لیے احسان یعنی دین کے مغز کا حصول آسان ہوسکتا ہے- ورنہ احسان یعنی مقصد حیات تک رسائی محال کی طرح ہے-

اپنے ظاہر وباطن کو یکساں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر احکام اسلام کے مطابق ہو، حلال وحرام کی تمیز کرنے، جائز وناجائز میں عملی طور پر فرق کرنے اور فرائض وواجبات کی پابندی کرنے والا ہو، اور باطن میں صفائی وتزکیہ رکھتا ہو یعنی بغض وحسد، کینہ وعداوت، عجب وریا، بدگمانی اور تکبر وتعصب جیسے مہلک وتباہ کن امراض سے اپنے قلب کو پاک رکھے-

یہ سب کو معلوم ہے کہ ظاہر نماز تک اور ہمارے درمیان موجود کاغذ پر مکتوب قرآن تک پہنچنے کے لیے جس طرح شریعت کے بتائے ہوئے مخصوص طریقے پر بدن کے بعض حصوں کو دھونا یعنی وضو کرنا ضروری ہے، اسی طرح کتاب مکنون، روح نماز اور حقیقت عبادت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے طریقت کے مطابق وضو کرنا ضروری ہے اور یہ دل کا وضو ہے- دل کو تمام تر ناپاک خیالات، بری خصلتوں، بغض وحسد، کبر وریا، کینہ وعداوت، بدگمانی وبدظنی اور خود بینی وخود پرستی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے-

ظاہری طہارت کا طریقہ اور اس کا علم جس طرح علم شریعت اور عالم شریعت کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح باطنی طہارت کا حصول علم طریقت اور عالم طریقت کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے، بلکہ طریقت اور تصوف تو ایک فن ہے اور کوئی بھی فن بغیر فن کار کی صحبت کے کیوں کر حاصل ہوسکتا ہے؟ اپنے آپ کو جو مرد خیال کرتا ہے اس کو چاہیے کہ مجاز سے ترقی کر کے حقیقت کی طرف آئے اور رسم عبادت سے عروج کر کے روح عبادت کی طرف پیش قدمی کرے- ظاہر نماز کے ساتھ باطن نماز اور حقیقت نماز تک پہنچنے کی کوشش کرے-

اے گرفتار مجاز، اے بے حیا
چھوڑ کر بغض و حسد، کبر وریا
جا کسی درویش کامل کے حضور
خاک پہ رکھ دے جبین پر غرور
پوچھ پھر اس مرد دانا سے یہ راز
کس طرح ہوتی ہے مستوں کی نماز

○○○

تکبر، تفاخر اور عصبیت کی تباہ کاریاں

خود کو اوروں سے اعلیٰ و افضل جاننا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا تکبر ہے۔ تکبر ایسی قبیح اور مذموم صفت ہے جو سخت حرام اور گناہ ہے، بلکہ ہزاروں گناہوں کا سبب۔ یہی وہ گناہ ہے جس نے ہمیشہ کے لیے ابلیس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال کر اس کو مردود بارگاہِ الٰہی بنا دیا:

خرابیاں

غرض تکبر بہت سی برائیوں کی جڑ ہے، بالخصوص اس سے یہ برائیاں پیدا ہوتی ہیں:

(۱) تکبر صرف خدا ہی کو زیبا ہے، لہٰذا تکبر کرنے والا گویا خدا کا مقابلہ کرتا ہے۔

(۲) تکبر کرنے والا اپنے آگے دوسرے مسلمان بھائیوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ جو ان کی ایذا کا سبب ہے اور مومن کو ایذا دینا خدا اور رسول کو ایذا دینے کے مترادف ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

"مَنْ اٰذیٰ مُسْلِمًا اٰذَانِی وَمَنْ آذَانِیْ اٰذیٰ اللّٰہ" (جامع الصغیر للسیوطی)

جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی، اس نے گویا مجھ کو ایذا دی اور جس نے مجھ کو ایذا دی گویا اس نے خدا کو ایذا دی۔

(۳) متکبر آدمی سے لوگ دور بھاگتے ہیں، اس سے ملنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

(۴) متکبر آدمی بے مروت اور سخت دل ہو جاتا ہے۔ دوسروں پر مروت نہیں کرتا۔

(۵) متکبر آدمی اپنی برائی کو باقی رکھنے کے لیے بہت سے دوسرے ناجائز کاموں کا بھی ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اس کی فکر صرف ایک ہوتی ہے کہ اس کی ناک اور شان اونچی رہے۔ اس کے لیے فضول خرچی، رشوت، دھوکا، ایذا رسانی آسان ہوتی ہے، حتیٰ کہ اپنے ہی بھائی کے قتل تک سے دریغ نہیں کرتا، اگرچہ کبھی خود ہی قتل ہو جاتا ہے۔

(۶) بعض گناہ چھپے رہتے ہیں صرف کرنے والا جانتا ہے اور خدائے علام الغیوب، یا کبھی

کبھی وہ دوسروں پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن تکبر ایسا گناہ ہے جو اندازِ گفتگو، مکان، دوکان، لباس، تقریبات حتیٰ کہ چال ڈھال سے بھی عیاں ہوتا ہے۔

(۷) بعض گناہ، بلکہ اکثر گناہ مومن چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن تکبر ایسا گناہ ہے جسے متکبر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتا، بلکہ ظاہر کرنے میں مسرت و لذت محسوس کرتا ہے جب کہ گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے۔ گویا یہ ایک ایسا متعدی گناہ ہے جو کئی گناہوں کا موجب ہے۔

(۸) تکبر ابلیس کی عادت ہے اور تواضع فرشتوں کا طریقہ ہے۔

(۹) متکبر کے دل پر اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق بات سنتا ہی نہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ. (المومن: ۴۰/۳۵)

اللہ یوں ہی مہر کر دیتا ہے متکبر سرکش کے سارے دل پر۔ (کنزالایمان)

(۱۰) تکبر سے آدمی شیطان کا ساتھی ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے تکبر شیطان ہی نے کیا۔

خلاصہ یہ کہ تکبر ایسا گناہ ہے جس کی برائی پر سب عقلاً متفق ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ تکبر کرنے والا تکبر تو شوق سے کرتا ہے لیکن جب کبھی اس کو کہہ دیا جاتا ہے کہ تو بڑا متکبر ہے، گھمنڈی ہے، شیخی باز ہے، تو ناراض بھی ہو جاتا ہے، بلکہ آگ بگولا ہو جاتا ہے، یعنی متکبر خود بھی اس کو برا ہی سمجھتا ہے لیکن بچنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس پر دنیا غالب ہوتی ہے اور شیطان مسلط۔

علاج

تکبر کا علاج یہ ہے کہ دنیا کی مذمت میں جو آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا مطالعہ کرے، بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی کثرت عبادت اور دنیا سے بے رغبتی کے واقعات پڑھے، غریبوں اور یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرے، ان کے احوال و کوائف کو جان کر عبرت حاصل کرے اور تکبر کی برائی میں جو آیات اور حدیثیں آئی ہیں ان کو بھی بار بار پڑھے، یا ان کو متکبرین کے سامنے بار بار پڑھا جائے تو امید ہے کہ جلد اس مرض روحانی سے نجات مل جائے گی اور آخرت برباد ہونے سے بچ جائے گی۔

اب ذیل میں تکبر کی برائی میں آیات و احادیث ملاحظہ ہوں:

آیاتِ قرآنیہ

(۱) ابلیس نے جب "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" (میں آدم سے بہتر ہوں) کہہ کر تکبر کی بنیاد ڈالی تو رب تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ

الصّٰغِرِیْنَ. (الاعراف:۷/۱۳)

تو یہاں (جنت) سے اتر جا، تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے، نکل، تو ہے ذلت والوں میں- (کنزالایمان)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت تکبر کرنے والوں کی جگہ نہیں، جنت تو تواضع کرنے والوں کا ٹھکانا ہے-

(۲) پھر آگے ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا. لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ. (الاعراف:۷/۱۸)

یہاں سے نکل جا، رد کیا گیا راندہ ہوا، ضرور جوان میں سے تیرے کہے پر چلا، میں تم سب سے جہنم بھر دوں گا- (کنزالایمان)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ متکبر بارگاہِ خداوندی کا راندہ ہوتا ہے بلکہ سب کی لعنت کا مستحق، اور یہ کہ جہنم تکبر والوں سے بھر دیا جائے گا-

(۳) قرآن نے متکبرین کا ٹھکانا جہنم بتایا ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ. (النحل:۱۶/۲۹)

تو کیا ہی برا ٹھکانا مغروروں کا- (کنزالایمان)

(۴) اَلَیْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ. (الزمر:۳۹/۶۰)

کیا مغروروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں؟ (کنزالایمان)

(۵) متکبر اللہ کو پسند نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے-

"اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ" (النحل:۱۶/۲۳)

بیشک وہ مغروروں کو پسند نہیں فرماتا- (کنزالایمان)

(۶) اللہ تعالیٰ کو تکبر کی چال بھی پسند نہیں- چناں چہ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا. كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَیِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا. (بنی اسرائیل:۱۷/۳۷،۳۸)

اور زمین میں اترا کر نہ چل، بے شک ہرگز تو زمین نہیں چیر ڈالے گا اور ہرگز بلندی میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا، یہ جو کچھ گزرا ان میں کی بری بات تیرے رب کو ناپسند ہے- (کنزالایمان)

(۷) تکبر کرنے والے قبولِ حق سے محروم رہتے ہیں، ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں- رب عزوجل فرماتا ہے:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (الاعراف:۷/۱۴۶)

میں اپنی آیتوں سے انھیں پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق اپنی بڑائی چاہتے ہیں-

(کنزالایمان)

قرآن میں بہت سی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جب انبیائے کرام علیہم السلام دین حق اور خدا کی آیات لے کر آئے تو کافروں نے از راہ تکبر انکار کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حق سے دوری اور آیات ربانیہ کا انکار زیادہ تر تکبر ہی کی وجہ سے واقع ہوا- آج بھی تجربہ ہے کہ کسی متواضع، متقی اور نیک آدمی کے سامنے شریعت اسلامیہ کا کوئی مسئلہ رکھا جاتا ہے تو وہ فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور حق بات قبول کر لیتا ہے، لیکن وہی مسئلہ جب کسی متکبر اور مغرور کے پاس پیش ہوتا ہے تو جھٹ انکار کر دیتا ہے اور عقلی و منطقی جواب دے کر کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کبھی الٹے نصیحت کرنے والوں ہی پر ناراض ہو کر اپنا غصہ اتارنے لگتا ہے اور کبھی تو صریح کفریات کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے- مثلاً یہ کہتا ہے کہ اپنا فتویٰ اپنے پاس رکھو، ہمیں شریعت کی ضرورت نہیں، اب شریعت پر عمل کا زمانہ نہیں- اس طرح وہ ایمان جیسی عظیم دولت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، جو تکبر کا سب سے بڑا نقصان ہے-

قرآن نے اس کی منظر کشی متعدد آیات میں کی ہے، یہاں ایک آیت مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

(۸) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ. قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ. (الاعراف:۷/۷۵،۷۶)

اس کی قوم کے تکبر والے، کمزور مسلمانوں سے بولے: کیا تم جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کے رسول ہیں، بولے وہ جو کچھ لے کر بھیجے گئے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، متکبر بولے: جس پر تم ایمان لائے ہمیں اس سے انکار ہے- (کنزالایمان)

(۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں ہے کہ انھوں نے متکبرین سے پناہ مانگی ہے- ارشاد باری ہے:

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ. (المومن:۴۰/۲۷)

اور موسیٰ نے کہا میں تمہارے اور اپنے رب کی پناہ لیتا ہوں ہر متکبر سے کہ حساب کے دن پر یقین نہیں لاتا- (کنزالایمان)

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کرنے والے بالعموم قیامت اور حساب و کتاب پر ایمان نہیں رکھتے یا رکھتے ہیں تو بھولے رہتے ہیں- اگر قیامت کا خوف ہوتو کوئی تکبر نہ کرے بلکہ تواضع کو اپنا شعار بنائے-

(۱۰) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ. (لقمان:۱۸/۳۱)

اور کسی سے بات کرنے میں اپنا رخسارہ کج نہ کر اور زمین میں اتراتا نہ چل، بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا فخر کرتا- (کنز الایمان)

جیسا کہ متکبر لوگ کسی عام آدمی سے بات کرتے وقت اپنی توجہ اس شخص کی طرف نہیں کرتے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، قرآن نے اس سے بھی منع کیا ہے، اترا کر چلنے کو بھی مذموم قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اللہ کو تکبر کرنے والے پسند نہیں، نہ فخر و غرور والے؛ اور جو اللہ کو پسند نہ ہوا سے سوچ لینا چاہیے کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا-

قرآنِ حکیم میں یہ مضمون بار بار بیان کیا گیا ہے کہ کافر محض مسلمانوں بالخصوص کم زور لوگوں کی جلن میں ایمان نہیں لائے کہ یہ کم زور اور گئے گزرے لوگ ایمان لائے ہیں تو ہم ان کے ساتھ کیوں ہوں، ہم تو اونچی ناک اور بلند شان والے ہیں، ہمارا معاملہ تو کچھ الگ ہی رہنا چاہیے- چناں چہ اسی روش پر آج کے متکبر لوگ بھی چل رہے ہیں- ان میں اکثر کا حال یہی ہے کہ علمائے دین، ائمۂ کرام، حفاظ قرآن اور دیگر دیندار لوگوں کو اپنے سامنے ہیچ سمجھتے ہیں اور اپنے بچوں کو عالم و حافظ و قاری بنانے میں ذلت محسوس کرتے ہیں- ہزاروں روپے دنیاوی تعلیم پر لگا دیتے ہیں لیکن قرآن اور دین پڑھنے پڑھانے پر کچھ خرچ کرنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں- یہ سب دنیا کی محبت اور تکبر کی کارفرمائی ہے- مولیٰ عزوجل اس بری بلا سے ہمیں نجات دے- آمین-

احادیثِ مبارکہ

اب ذیل میں تکبر کے سلسلے کی چند حدیثیں بھی ملاحظہ کرتے چلیں اور عبرت حاصل کریں:

(۱) حضرت حارثہ بن وہب سے مروی ہے، انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو جنت والوں کے بارے میں نہ بتادوں؟ (کہ وہ کون لوگ ہوں گے) ہر وہ کم زور اور لوگوں کی نظر میں حقیر کہ اگر اللہ پر قسم کھالے تو وہ اس کی قسم پوری فرمادے-

کیا میں تمھیں جہنمیوں کے بارے میں نہ بتادوں؟ (کہ کون لوگ ہوں گے) ہر سخت دل اور بخیل اور تکبر کرنے والے- (مشکوٰۃ المصابیح ص:۴۳۳، باب الغضب والکبر، بحوالہ بخاری و مسلم)

(۲) حضرت عبد اللہ ابن مسعود ہی سے مروی ہے کہ نبی معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا تو ایک شخص نے عرض کیا: آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کے جوتے عمدہ ہوں (تو کیا یہ تکبر ہے؟) اس پر سرکار نے ارشاد فرمایا:

اللہ جمیل ہے (یعنی وہ حسن و جمال کا خالق ہے یا صفات جمیلہ حسنہ کا مالک ہے) اور جمال کو پسند فرماتا ہے- (یعنی اسے پسند ہے کہ اس کے بندے حسب توفیق حسن و جمال کا اظہار کریں-) تکبر تو حق کی مخالفت، اس کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے-

(مسلم شریف ۳۶۵/۱، ترمذی ۲۱/۲، مشکوٰۃ ص:۴۳۳)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا (یعنی سخت ناراض ہوگا) اور نہ انھیں پاک فرمائے گا- ایک روایت میں ہے کہ نہ ہی ان کی طرف نظر کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ، تیسرا متکبر فقیر-

(مسلم شریف، مشکوٰۃ ۴۳۳)

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ تکبر صرف بڑے مال داروں کے ساتھ خاص ہے، نہیں جو محتاج ہوتا ہے وہ بھی تکبر کرتا ہے اور اس کا تکبر زیادہ برا ہے کہ بظاہر اس کے پاس تکبر کے اسباب بھی نہیں پھر بھی تکبر کرتا ہے جو اس کی انتہائی کمینگی پر دلالت کرتا ہے- بعض کم درجے کے لوگ شرفا کو بلا وجہ برا کہتے ہیں اور ان سے حسد کرتے ہیں، یہ بھی تکبر میں داخل ہے، مثلاً کہتے ہیں: ہم غریب ہیں تو کیا ہوا، کسی سے کم نہیں ہیں، یا ان بڑوں نے ہمیشہ ہمیں ذلیل سمجھا، اب موقع ہاتھ آیا ہے، ہم بھی ان کو ذلیل کیے بغیر نہ چھوڑیں گے- یہ سب تکبر کے جملے ہیں اور انتقام پر دلالت کرتے ہیں- اگر کوئی گالی دے تو الٹ کر اس کو گالی دینا عقل مندی اور دین داری نہیں، انھیں باتوں سے معاشرے میں تعصب جنم لیتا ہے، لہٰذا ان سے پرہیز کرنا چاہیے-

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کبریائی اور عظمت میری خاص صفتیں ہیں، مجھ کو ہی زیب دیتی ہیں، جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں مجھ سے جھگڑے گا (یعنی عظمت و کبریائی اپنے لیے ثابت کرے گا) میں اس کو آگ میں داخل کردوں گا- دوسری روایت میں ہے کہ میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا- (مسلم شریف، مشکوٰۃ: ص:۳۳)

(۵) حضرت سلمہ ابن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور انور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی اپنے آپ کو اونچا بناتا ہے (یعنی تکبر کرتا ہے) حتیٰ کہ وہ جبارین (سرکش متکبرین) میں لکھ دیا جاتا ہے، پھر جو عذاب ان کو پہنچتا ہے وہی اس کو بھی پہنچتا ہے۔

(ترمذی ۲۱/۲، رشیدیہ دہلی)

(۶) حضرت عَمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد گرامی، اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: متکبر لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح اٹھائے جائیں گے مُردوں کی صورت میں کہ ان پر ذلت ہی ذلت ہوگی، اور ان کو جہنم کے ایک قید خانے کی طرف ہانکا جائے گا، جس کا نام بُولَس ہے، ان پر آگ ہی آگ چھائے گی، جہنمیوں کا نچوڑ (پیپ) انھیں پلایا جائے گا، جس کو طِینَۃُ الخَبال کہتے ہیں۔ (ترمذی، مشکوٰۃ ۴۳۴)

(۷) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے منبر پر لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: تواضع کرو، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سنا، فرمارہے تھے: جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے، اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے۔ ایسا شخص اپنے نفس میں چھوٹا ہوگا مگر لوگوں کی نظر میں بڑا ہوگا اور جو غرور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کرتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے اگر چہ اپنے نفس میں وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور سور سے بھی ذلیل ہو جاتا ہے۔ (بیہقی، شعب الایمان، مشکوٰۃ ۴۳۴)

(۸) اب ایک ایسی حدیث پاک ملاحظہ کریں، جو تکبر کی رگوں کو کاٹ ڈالنے والی اور غرور کی عمارت ڈھادینے والی ہے:

حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

☆ برا بندہ وہ بندہ ہے جو غرور کرے اور اکڑ کر چلے، اور بڑی شان والے (رب) کو بھول جائے۔

☆ برا بندہ وہ بندہ ہے جو ظلم وزیادتی کرے اور قہار اعلیٰ (رب) کو بھول جائے۔

☆ برا بندہ وہ بندہ ہے جو غفلت سے کھیل میں لگ جائے اور قبر کو اور اس میں سڑنے گلنے کو بھول جائے۔

☆ کیا ہی برا ہے وہ بندہ جو حد سے گزرنے والا، متکبر اور سرکش ہو اور اپنی ابتدا اور انتہا کو (یعنی پیدائش اور موت کو) بھول جائے۔

☆ کیا ہی برا ہے وہ بندہ جو دنیا کو دین کے ذریعے دھوکہ دے۔ (یعنی دنیا والوں کو دھوکا دینے کے لیے دین پر عمل کرے، اور دین کو آڑ بنائے۔)

☆ کتنا ہی برا ہے وہ بندہ جو دین کو شبہات کے ذریعے دھوکہ دے۔ (یعنی متقی پرہیزگار بن کر دین داری ظاہری کرے کہ لوگوں میں مقبول ہو، حالاں کہ عمل خیر اللہ کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ بندوں کے لیے۔)

☆ کیا ہی برا ہے وہ بندہ جسے ہوس اور لالچ کھینچے لیے جارہی ہے۔ (یعنی وہ حرص وہوس کا پابند ہو گیا ہے۔)

☆ بڑا برا ہے وہ بندہ جسے خواہش نفس گمراہ کرے۔

☆ وہ بندہ بہت برا ہے جسے رغبتیں اور خواہشیں ذلیل کریں۔

(ترمذی شریف، بیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ ۴۳۴)

(۹) ایک شخص دو چادریں اوڑھے اِترا اِترا کر چل رہا تھا اور بہت گھمنڈ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی چلا جائے گا۔

(مشکوٰۃ: ص: ۴۰۴ باب الجلوس والنوم والمشی، بخاری ومسلم)

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ کی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے کہ گھمنڈ سے اپنے تہہ بند کو گھسیٹ رہا تھا۔ (مشکوٰۃ ص: ۳۷۴، کتاب اللباس)

اس سے وہ لوگ سبق لیں جو اپنے تہ بند اور پائجامے خوب نیچے کر کے اتراتے چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج ہی نہیں اور اس سے بدتر حکم اس پینٹ کا ہے جو وضع نصاریٰ بھی ہے اور خوب نیچا کر کے پہنا جاتا ہے اور چلنے کا انداز بھی متکبرانہ ہوتا ہے اور اگر پینٹ چست ہے تو اس میں بے حیائی کے مظاہرے کی قباحت مزید بڑھ جاتی ہے، اور حیا ایمان کا شعبہ ہے۔

(۱۰) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو گھمنڈ میں اپنے تہ بند کو کھینچتا ہے۔ (مشکوٰۃ ص: ۳۷۴)

(۱۱) حضرت ثابت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ کے سامنے عرض کیا گیا، فلاں شخص کتنا متکبر ہے!! تو سرکار نے ارشاد فرمایا: کیا اس کے پیچھے موت نہیں لگی ہوئی ہے۔

(شعب الایمان، حدیث: ۲۸۰۹، ج: ۶/۲۹۳)

یعنی جس کو مرنا ہے اس کو تکبر کسی طرح زیب نہیں دیتا کبریائی تو اس حی، قیوم کو زیبا ہے جو ساری کائنات کا رب ہے۔

تکبر کی قسمیں

تکبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تکبر کرنا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں تکبر کرنا۔
(۳) مخلوق خدا کے مقابلے میں تکبر کرنا۔

پہلا دونوں تکبر کفر ہے، اور تیسرا احرام، ہاں! کفار کے مقابلے کے وقت کفر کو ذلیل کرنے اور اسلام کو عزت دینے کی غرض سے جو تکبر ظاہر کیا جائے وہ جائز ہے۔ اس وقت بھی اپنی بڑائی مقصود ہو تو جائز نہیں۔

تکبر علما، امرا، حفاظ، ائمہ، خطبا، حکام اور تعلیم یافتہ سب میں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ تکبر کس قدر برا ہے اور جس قدر بھی تکبر کا احساس اپنے اندر ہو اس کو دور کرنے اور اس سے توبہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض علما اور سادات اپنے لیے خود تعظیم و امتیاز کے طالب ہوتے ہیں اور اگر عوام سے کچھ کوتاہی ہوتی ہے تو بہت زیادہ ناک بھوں سکوڑتے اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بھی تکبر میں داخل ہے۔ ہاں! عوام خود تعظیم و امتیاز کا برتاؤ کریں تو انھیں روا ہے۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری بریلوی قدس سرہ کا ارشاد ملاحظہ ہو:

”علما و سادات کو یہ ناجائز و ممنوع ہے کہ آپ اپنے لیے سب سے امتیاز چاہیں اور اپنے نفس کو اور مسلمانوں سے بڑا جانیں کہ یہ تکبر ہے اور تکبر ملک جبار جلّت عظمتہٗ کے سوا کسی کو لائق نہیں، بندہ کے حق میں گناہِ اکبر ہے۔ ”أَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ“ (الزمر: ۶۰/۳۹) کیا جہنم میں نہیں ہے ٹھکانا تکبر والوں کا۔ جب علما کے آقا، سب سادات کے باپ حضور انور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انتہا درجہ کی تواضع فرماتے اور مقام و مجلس و خوردش و روش (اٹھنے بیٹھنے، کھانے، چلنے) کسی امر میں اپنے بندگانِ (غلامانِ) بارگاہ پر امتیاز نہ چاہتے تو دوسرے کی کیا حقیقت ہے، مگر مسلمانوں کو حکم ہے کہ سب سے زائد علما و سادات کا اعزاز و امتیاز کریں۔ یہ ایسا ہے کہ کسی شخص کو لوگوں سے اپنے لیے طالب قیام (قیام تعظیمی کا طالب) ہونا مکروہ اور لوگوں کا معظم دینی (دین دار بزرگ) کے لیے قیام (تعظیمی) مندوب (پسندیدہ)۔ پھر جب اہل اسلام ان کے ساتھ امتیاز خاص کا برتاؤ کریں تو اس کو قبول انھیں ممنوع نہیں۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الاسنیٰ کہیں تشریف فرما ہوئے، صاحب خانہ نے حضرت کے لیے مسند حاضر کی، امیر المومنین اس پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا کہ کوئی گدھا ہی عزت کی بات قبول نہ کرے گا۔ (فتاویٰ رضویہ، امام احمد رضا قادری جلد: ۹/ ۴۷، رضا اکیڈمی، ممبئی)

لیکن اپنے کو دوسروں سے بہتر سمجھنا تکبر ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں:
رہا اپنے آپ کو بہتر سمجھنا تکبر ہے۔ (فتاویٰ رضویہ: ۱۳۸/۹)

لہٰذا ہمیں تکبر جیسی مذموم صفت سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، تاکہ تکبر کی نحوستوں سے نجات ملے اور تواضع و انکساری کر کے اللہ کی بارگاہ کے مقبول و محبوب بنیں۔

عصبیت یا تعصب بھی تکبر ہی کی پیداوار ہے، لہٰذا ذیل میں اس پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے:

عصبیت و تفاخر

معاشرے کو تباہیوں سے دوچار کرنے والی ایک بری خصلت خاندانی تفاخر، علاقائی اور برادرانہ عصبیت بھی ہے جس کی بنیاد پر آج بھی اکثر جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آ جایا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی حضور پیغمبر اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امت کو واضح رہنمائی سے نوازا ہے۔ ذیل میں مدنی آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنے نفس اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیں۔

(۱) حضرت عیاض بن حمّار مجاشعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی دوسرے پر ظلم کرے۔
(مسلم، مشکوٰۃ: ۴۱۷، باب المفاخرۃ والعصبیۃ)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ ضرور اپنے ان آبا و اجداد پر فخر کرنے سے باز رہیں جو مر چکے ہیں۔ وہ تو جہنم کے کوئلے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے کہ وہ گبریلا ہو جائیں جو نجاست کو اپنی ناک سے ڈھکیلتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آبا و اجداد پر فخر کرنا دور فرما دیا ہے۔ اب کوئی مومن متقی ہو یا فاسق و بد بخت، سب حضرت آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں۔
(ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۷)

(۳) حضرت عبد الرحمٰن بن ابی عقبہ حضرت عقبہ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: میں ایک فارسی غلام تھا، میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ احد میں شریک ہوا، مشرکین میں سے ایک شخص کو قتل کیا، پھر کہا یہ لے مجھ سے میں فارسی غلام ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہو کر بولے، تو نے یہ کیوں نہیں کہا، یہ لے مجھ سے میں ایک انصاری غلام ہوں۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یہ ابو عقبہ نسلاً فارسی تھے لیکن جبیر بن عتیق انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، اس لیے انصاری بھی ہوئے، رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کے نسل و وطن پر فخر کرنے کو ناپسند فرمایا: اور کہا، اگر فخر ہی کرنا ہے تو انصاری ہونے پر فخر کرو، کیوں کہ انصار کا تعلق کسی

نسب یا خاندان یا جگہ سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق نصرت اسلام و مسلمین سے ہے، لہٰذا اسلامی نسبت پر تو فخر کیا جا سکتا ہے مگر نسل و قوم اور وطن و ملک پر فخر جائز نہیں اور نہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش-

افسوس! آج اسلام کا نام لینے اور اپنا نام مسلمانوں جیسا بتانے میں لوگوں کو شرم آتی ہے، مگر نسبت اور قوم پر فخر طرۂ امتیاز بن گیا ہے- اسی کے خلاف علامہ جامی علیہ الرحمہ یوں آواز اٹھاتے ہیں:

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامؔی
کہ دریں راہ فُلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

(۴) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنی قوم کی مدد ناحق بات پر کرے تو گویا وہ ایسا ہے کہ اونٹ گڑھے میں گر گیا ہو اور یہ اس کی دُم پکڑ کر اسے اوپر کھینچ رہا ہے-(ابوداؤد، مشکوٰۃ:۴۱۸)

یعنی گرے ہوئے اونٹ کو جیسے دم پکڑ کر نہیں نکالا جا سکتا، اسی طرح کسی قوم کی ناحق مدد کر کے اسے عزت نہیں دی جا سکتی-عزت تو حق سے ہے اور حق میں ہے-حق پر رہو، حق کا ساتھ دو تو خدا کی طرف سے بھی مدد ہوگی، پھر کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا-

(۵) حضرت واثلہ ابن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟ سرکار نے فرمایا: عصبیت یہ ہے کہ تم اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرو-

(ابوداؤد، مشکوٰۃ ۴۱۸)

یہاں ظلم سے ہر گناہ مراد ہے یعنی کسی گناہ پر اپنی قوم کی مدد کرنا عصبیت ہے-افسوس! اس ارشادِ پاک کو آج پس پشت ڈال دیا گیا-آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنی قوم کا ہے تو ضرور اس کی مدد کی جاتی ہے، چاہے وہ ناحق پر ہی کیوں نہ ہو-حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ اپنی قوم کو ظلم و زیادتی سے بچایا جائے اور حق پر چلایا جائے-

(۶) حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، فرمایا: تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے کنبہ سے اس وقت تک دفاع کرے جب تک وہ گناہ نہ کرے-(ابوداؤد، مشکوٰۃ، ۴۱۸)

یعنی اپنے کنبہ کی طرف سے لڑنے اور ان کی حمایت کی اجازت ہے مگر اسی وقت تک کہ وہ حق پر ہوں اور گناہ پر اڑے نہ ہوں، اور جب حق سے ہٹ کر ناحق پر مدد چاہیں تو ان کی مدد نہیں کی جا سکتی، اگرچہ اپنے کیسے ہی قریبی کیوں نہ ہوں-گناہ کے معاملے میں یہ ہونا چاہیے کہ اپنے آدمیوں کو بشدت

گناہ سے روکیں، عذاب سے ڈرائیں اور نہ ماننے پر مقاطعہ کی دھمکی دیں-

(۷) حضرت جبیر بن معطم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے، وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بنیاد پر لڑے، وہ ہم میں سے نہیں جو تعصب پر مرے-(ابوداؤد، مشکوٰۃ ۴۱۸)

یعنی تعصب میں لڑ کر مرے، یا اس حالت میں مرے کہ اس کے اندر بے جا تعصب کا بیج موجود ہے تو سرکار فرماتے ہیں: وہ ہم میں سے نہیں-

(۸) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے، سرکار نے ارشاد فرمایا: نہیں! لیکن عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرے-

(احمد ابن ماجہ، مشکوٰۃ:۴۱۸)

یہ بیماری آج کل مسلمانوں میں بہت عام ہے-قومی تعصب، نسلی تعصب، صوبائی تعصب، ملکی تعصب حتیٰ کہ لسانی تعصب بہت پروان چڑھ رہا ہے-انہیں تعصّبات نے آج مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے، حالاں کہ سارے مسلمان ایک قوم اور آپس میں بھائی بھائی ہیں، شرط یہ ہے کہ ایمان سلامت ہو-

(۹) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے نسب تم میں سے کسی کو گالی دینے (برا کہنے) کے لیے نہیں ہیں-تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو، جیسے صاع کی چیز صاع سے، جس کو اس نے بھرا نہ ہو (یعنی جیسے ایک صاع کو دوسرے صاع میں ڈالنا اس کو نہیں بھرتا) کسی کو کسی پر بزرگی نہیں، مگر دین داری اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر، آدمی کی ذلت کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ بدزبان، بدخلق اور بخیل ہو-

(احمد، بیہقی، شعب الایمان، مشکوٰۃ شریف-۴۱۸)

یعنی کچھ کمی بیشی آدمی کے اندر ہوتی ہے، اس کی بنیاد پر کسی کو برا کہنا، طعنہ دینا، اس پر فضیلت جتانا جائز نہیں، آدمی کو تقویٰ سے آراستہ ہونا چاہیے اور بدگوئی، بدزبانی، بدخلقی اور بخل سے بچنا چاہیے کہ یہ خصلتیں باعث ذلت و عار ہیں-کسی کو برا سمجھا جا سکتا ہے تو ان شرعی عیوب کی بنیاد پر، نہ ذات و نسب پر-سرکار مدنی تاجدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یہ ارشادات آج کے ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہیں جو بات بات پر اپنے خاندانی تفاخر کو ظاہر کرتے رہتے ہیں-

حضرت شیخ محقق فرماتے ہیں: تعصب اگر حق کے لیے ہو، اس میں ظلم نہ ہو تو خوب ہے اور اگر باطل طریقے سے ہے تو مذموم ہے، اور اکثر تعصب کا اطلاق ناحق ہی پر ہوتا ہے-

(اشعۃ اللمعات)

تواضع

تکبر اور فخر ومباہات نیز عصبیت کے مقابلے میں جو صفت آتی ہے وہ تواضع وانکساری ہے، جو اللہ کو محبوب ہے-صوفیۂ کرام کے اندر یہ صفت بہت نمایاں ہوا کرتی ہے بلکہ بغیر تواضع کے کوئی صوفی ہو ہی نہیں سکتا-تواضع کی حدیثوں میں بھی بڑی فضیلت آئی ہے اور قرآنِ پاک میں بھی- ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِيْنَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِيْ الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ. (الحج:۲۲/۳۴،۳۵)

اے محبوب! خوشی سنا دو ان تواضع والوں کو کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو افتاد پڑے اس کے سہنے والے اور نماز بر پا رکھنے والے اور ہمارے دیے سے خرچ کرتے ہیں-(کنزالایمان)

"مُخبِت" سے مراد وہ مومن کامل ہے جو متواضع اور منکسر المزاج ہو، تکبر ونخوت اور تفاخر وتعصب سے اسے کچھ واسطہ ہی نہ ہو، پھر قرآن نے خود ہی ان کی بعض اہم صفات کو بیان کر دیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل پگھل جاتے ہیں- جو کچھ مشکلات آتی ہیں خندہ پیشانی کے ساتھ انھیں جھیل لیتے ہیں-نماز کی ادائیگی پر پورے طریقے سے کار بند رہتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی دولت میں بخل نہیں کرتے بلکہ اس کو ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں-

ان صفات میں سب سے اہم اور مقدم یہ ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے معمور رہتے ہیں اور خشیت ربانی سے نرم پڑ جاتے ہیں، اور جب بھی ان کے سامنے ذکر الٰہی ہوتا ہے تو سن کر ان کے دل کانپ جاتے ہیں-

رسولِ پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی تواضع کا حکم دیا گیا ہے- چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ." (الشعراء۲۶/۲۱۵،۲۱۶)

اور اپنی رحمت کا بازو بچھاؤ اپنے پیرو مسلمانوں کے لیے تو اگر وہ تمہارا حکم نہ مانیں تو فرما دو میں تمہارے کاموں سے بے علاقہ (بے تعلق) ہوں-(کنزالایمان)

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" (الحجر:۱۵/۸۸)

اور مسلمانوں کو اپنی رحمت کے پروں میں لے لو-(کنزالایمان)

یعنی ان کو اپنے کرم سے نوازو، انھیں اپنی صحبتوں سے شاد کام کرو، اپنے قرب میں جگہ دو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی نعمتوں کے جن خزانوں پر مامور فرمایا ہے ان سے انہیں بھی فیض یاب کرو، گرتوں کو تھام لو، دکھ درد کے ماروں کا مداوا کرو- چناں چہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تواضع کا یہ حال تھا کہ صحابہ کرام میں ایسے مل جل کر بیٹھتے کہ اپنا کچھ امتیاز نہ رکھتے-

اب ذرا بعض احادیث کی سیر کرتے چلیں- سرکار اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

صدقہ خیرات کرنے سے مال کم نہیں ہوتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ عزت ہی بڑھاتا ہے اور جو صرف اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتا ہے-

(ریاض الصالحین، امام نووی:ص:۲۸۲)

ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: اے لوگو! تواضع اختیار کرو کیوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے جس نے اللہ کے لیے خاکساری اختیار کی اللہ اسے بلند کر دے گا- وہ اپنی نظر میں چھوٹا ہوگا مگر عام بندگانِ حق کی نگاہ میں اونچا ہوگا، اور جو تکبر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نیچے گرا دے گا- وہ اپنے خیال میں بڑا ہوگا لیکن لوگوں کی نگاہ میں چھوٹا ہوگا یہاں تک کہ وہ (دوسروں کی نگاہ میں) کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوگا-(شعب الایمان بیہقی:۶/۲۷۶)

☆حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہایت سادہ تھی- تزک بھڑک، شان وشوکت کا اظہار حضور کی کسی ادا سے نہیں ہوتا تھا- تواضع کا یہ حال تھا کہ خالی چٹائی ہی پر سو جاتے- چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں سرکار رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور اس پر کوئی بستر نہیں جو آپ کے جسم پاک اور چٹائی کے درمیان حائل ہوتا، جس کی وجہ سے چٹائی کی بنائی کے نشانات آپ کے جسم اطہر پر پڑ گئے ہیں- چمڑے کی تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے وہ آپ کی امت پر وسعت فرمائے کیوں کہ فارس اور روم پر بڑی وسعت اور کشادگی ہے حالاں کہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے- فرمایا: اے ابن خطاب! تم کیا اس خیال میں ہو، یہ تو وہ قوم ہے کہ دنیاوی زندگی میں ان کی نعمتیں انہیں دے دی گئی ہیں- ایک روایت میں اتنا اور ہے: کیا تم اس سے راضی نہیں کہ دنیا ان کے لیے ہو اور آخرت ہمارے لیے-(بخاری ومسلم، مشکوٰۃ:۴۴۷، باب فضل الفقرا)

☆ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن دیکھا کہ

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تاریک گھر میں ایک گرم چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں- گھر کے گوشے میں چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا اور ایک دو پرانے برتن پڑے تھے، یہ دیکھ کر حضرت عمر ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے- سرکار نے فرمایا: اے ابن خطاب! کیوں روتے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے دیکھا کہ اللہ کا حبیب اس حال میں اور قیصر و کسریٰ ناز و نعمت میں ہیں- پھر اوپر والی حدیث کا وہ حصہ ہے جو مذکور ہوا- (اشعۃ اللمعات)

تکبر و تفاخر کی بیماری ایسی ہے کہ کم ہی کوئی اس سے بچا ہوگا- علما، پیرانِ کرام اور عوام سب کو اس برائی میں مبتلا دیکھا جا رہا ہے، الا ماشاء اللہ- لہٰذا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے اور اس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے؟ تو میں اپنی طرف سے کوئی تدبیر و تجویز نہ بتا کر حدیث پاک کے ہی ذخیرے سے اس کا علاج سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں- حدیث ملاحظہ کریں:

"آدمی زیادہ تر بڑے بننے، عیش و آرام پانے اور مصائب و مشکلات سے بچنے کے لیے ہی تکبر کرتا ہے- اگر کوئی قناعت پسند ہو جائے تو خود بخود اس کے اندر سے تکبر کی بلا دور بھاگ جائے گی اور تواضع و صبر کا خوگر ہو جائے گا-"

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو تکبر، تفاخر اور تعصب سے بچنے اور تواضع و انکساری اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے- آمین بجاہ سید المرسلین علیہم التحیۃ و التسلیم-

○○○

محمد ساحل سعیدی (سروبجیت سنگھ)

کفر سے ایمان تک

محمد ساحل سعیدی ۱۹۷۶ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے- پیدائشی نام سروبجیت سنگھ ہے- سید پور، ضلع کپورتھلہ میں آج بھی آپ کا خاندان آباد ہے- والد کا نام پیارا سنگھ ہے- اسلام قبول کرنے کے بعد آپ اپنے پیر و مرشد داعی اسلام حضرت شیخ ابو سعید دام ظلہ العالی کے خادم ہو گئے- آپ حضرت کی گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں- اپنے مرشد کے اشاروں کو بھی سمجھتے ہیں- حلم و بردباری آپ کی عادت ہے، مسکرانا اور خوش رہنا آپ کا شیوہ ہے، صبر و شکر آپ کی فطرت ہے اور آپ کی صحبت طالبین و سالکین کے لیے اکسیر ہے- "کفر سے ایمان تک" موصوف کی یہ داستان شوق قابل مطالعہ اور ایمان افروز ہے- (ادارہ)

میں سروبجیت سنگھ، باپ کا نام پیارا سنگھ، سید پور ضلع کپورتھلہ پنجاب کا رہنے والا ہوں- ۱۹۷۶ء میں سکھ گھرانے میں پیدا ہوا- میں چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں- میرا گھرانا میڈیم ہے، نہ بہت مال دار اور نہ بہت غریب- ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی- سید پور ہی میں سرکاری اسکول سے ۱۹۹۱ء میں ہائی اسکول پاس کیا، ۱۹۹۵ء میں موٹر میکینک میں ڈپلومہ کیا، پھر ۱۹۹۸ء تک جالندھر میں ماروتی ورک شاپ پر کام کیا- اس کے بعد انگلینڈ جانے کا ارادہ تھا- ساری تیاری ہو گئی تھی مگر کچھ رکاوٹ آ رہی تھی- میری ایک بہن جن کا نام جسوندر کور ہے، جو جالندھر میں رہتی ہیں، میں ان کے گھر جایا کرتا تھا- ان کے گھر ایک مسلم صوفی ڈاکٹر اصغر آیا کرتے تھے- چند بار ان سے میری بھی ملاقات تھی- جب انگلینڈ جانے میں رکاوٹ آئی تو میں دعا کروانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا- اس بار ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا- ان کی

باتوں میں مٹھاس تھی-دل کو سکون ملا اور اب ان سے محبت ہوگئی اور یہ محبت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ان کے کہنے پر رمضان کا روزہ بھی رکھنے لگا-پہلے بھی میں کسی مذہب سے نفرت نہیں رکھتا تھا، اگر چہ میں سکھ مذہب کا پابند اور مذہبی رسومات ادا کرنے والا تھا-ڈاکٹر صاحب سے جب کچھ سوال کرتا تو وہ اپنے پیر، گرو کے بارے میں کہتے کہ ان سے ملاقات کرواؤں گا، ان سے دعا کروانا-ایک بار ڈاکٹر صاحب کے پیر ہمارے سرکار شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی جالندھر میں میری بہن کے گھر بھی آئے، مگر میری ملاقات نہ ہوئی-دوسری بار ۱۹۹۹ء میں میرے سرکار انبالہ میں سبھاش چند (شہباز احمد علی) کے گھر آئے اور میں چند دوستوں کے ساتھ ملاقات کی غرض سے انبالہ گیا-امید لگا رکھی تھی کہ سرکار دعا فرمادیں گے اور انگلینڈ جانا کنفرم ہوجائے گا-مگر مالک کو کچھ اور ہی منظور تھا-

رات میں محفل سماع ہوئی، میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ محفل سماع میں بیٹھا رہا- سب لوگ سرکار کو نذرانہ پیش کررہے تھے، میں نے بھی لوگوں کی طرح سرکار کو بار بار نذرانہ پیش کیا-زندگی میں پہلی بار میں نے کسی قوم کو دیکھا کہ وہ اپنے ''ست گرو'' سے اس طرح محبت کرتی ہے-تمام لوگ اپنے امیر کے فرماں بردار اور جاں نثار ہیں-دوسرے دن ماسٹر نیاز حسن جو پہلے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس وقت انبالہ ہی میں ایک کٹیا میں رہتے تھے، ان کی کٹیا (خانقاہ) پر محفل سماع کا پروگرام ہوا، یہاں بھی میں حاضر تھا-اس بار بھی مجھ کو اچھا لگا اور دل کو سکون ملا-میں نے اسی محفل میں اسلام قبول کرنے کا ارادہ بنالیا-قل کی فاتحہ کے بعد سرکار کے ایک خادم قاسم بابا سے بات چیت ہورہی تھی، اس درمیان قاسم بابا نے مجھ کو نماز کی دعوت دی اور کہا کہ نماز پڑھا کرو تمہارا سکون باقی رہے گا-

انبالہ سے واپسی کے بعد میں نماز بھی پڑھنے لگا اور مکمل روزہ بھی رکھتا تھا-اب میرا ارادہ انگلینڈ جانے کا نہ تھا، اب یہ خیال تھا کہ کسی مسلم کنٹری میں جاؤں گا تا کہ دین اسلام کی پابندی بھی کرتا رہوں-ایک بار ڈاکٹر صاحب سے یہ ساری باتیں بتانے کے ساتھ ہی دعا کی درخواست کی اور اپنے ایمان کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کسی کے دباؤ یا لالچ میں تو اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، میں اپنی مرضی اور خوشی سے اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں-ڈاکٹر صاحب نے کلمہ پڑھایا اور غسل کرایا اور کچھ وظائف بتائے اور ہندی زبان میں ایک کتاب ''آفتاب عالم'' نام کی دی جو محمد ﷺ کی سیرت پر تھی-اس کے مطالعے کے بعد ایمان میں اور یقین پیدا ہوا-اس نعمت کے حاصل کرنے میں میری کوئی محنت نہ تھی-یہ سب ڈاکٹر اصغر مرحوم کی محبت اور انبالہ میں سرکار سے ملاقات کا نتیجہ تھا-اسلام قبول کرنے کا جو خیال محفل سماع میں پیدا ہوا تھا وہ

صرف ایک ہفتہ میں اقرار سے بدل گیا-ڈاکٹر صاحب سے محبت ہوئی تھی، اب اسلام سے محبت ہوگئی-یہ سب میرے سرکار کا کرم تھا-ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ ابدی نعمت-

اب میرے دل و دماغ میں صرف اسلام تھا-میرا خیال تھا کہ انگلینڈ کی جگہ کسی عرب کنٹری میں چلا جاؤں تا کہ اسلام پر عمل کرتا رہوں-یہ سب کچھ ہوا مگر میں نے اپنے گھر والوں کو نہ بتایا، کیوں کہ میرے گھر والے کٹر سکھ تھے-ڈاکٹر اصغر مرحوم سے اگر چہ وہ لوگ بھی محبت کرتے تھے، مگر مجھ کو منع کرتے اور کہتے کہ ان کے پاس مت جایا کرو-مت بیٹھا کرو-

۲۰۰۳ء کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی-پنجاب کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا-ڈاکٹر صاحب کی آخری خواہش تھی کہ وہ سید سراواں شریف الٰہ آباد میں اپنے سرکار کے قدموں میں دفن ہوں-پرائیویٹ گاڑی سے ان کو اسی حالت میں لے کر ہم الٰہ آباد آرہے تھے کہ کان پور میں ان کا انتقال ہوگیا-اللہ ان کے درجات کو بلند کرے-

اس سفر میں میرے ساتھ حاجی اقبال صاحب بھی تھے، جو پنجاب کے رہنے والے ہیں- آپ بھی پہلے سکھ تھے اور آپ بھی سرکار کے ہاتھ پر اسلام لاچکے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ایک اور دوست جو پنڈت تھے اور ڈاکٹر صاحب کی بہن جو ان کو لینے پنجاب گئی تھیں، یہ سب لوگ میرے ساتھ تھے-پنجاب سے چلتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تم رجنی جو تمہاری رشتہ دار بھی ہے اور تم سے پہلے اسلام قبول کیا ہے اور بہت نیک لڑکی ہے، جس کا اسلامی نام رابعہ ہے، اس کو کسی طرح الٰہ آباد سرکار کے پاس پہنچادینا، ورنہ اللہ کی بارگاہ میں ہم سب کو جواب دینا ہوگا-رابعہ، میری بہن جسوندر کور جو جالندر میں رہتی ہیں، کی نند ہے-

ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کی باڈی کو لے کر الٰہ آباد سرکار کے پاس حاضر ہوگئے، کفن دفن ہوا، دو روز کے بعد میں نے جب پنجاب جانے کا ارادہ کیا تو سرکار نے روکا کہ تم یہیں رہو مگر ڈاکٹر صاحب کے وعدے کو پورا کرنے کے لیے سرکار سے اجازت لی اور پنجاب واپس ہوگیا-۲۰۰۳ء ہی میں رمضان کے مہینے میں ۱۲؍رمضان کو رابعہ کو لے کر ٹرین سے چلا، ۱۳؍رمضان کو الٰہ آباد حاضر ہوا اور ۱۴؍رمضان کو سرکار نے ہم دونوں کا نکاح کردیا-اسلام قبول کرنے سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ رابعہ جو میری بہن کی نند ہوتی ہے، وہ میری بیوی ہوگی کیوں کہ سکھ مذہب کے مطابق یہ رشتہ نہیں ہوسکتا مگر وہی ہوا جو مالک اور مالک کے نیک بندوں کو منظور تھا-

الٰہ آباد کا شہر اگر چہ پسند نہ آتا تھا مگر خانقاہ کے اندر خوب دل لگتا تھا اور اب خانقاہ کی سوکھی روٹی اور چٹائی کا بستر ہی اچھا لگتا تھا-پنجاب سے چلتے وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ بھی ساتھ تھا- دل میں خیال آیا کہ ان روپیوں سے ضرورت کی کچھ چیزیں جیسے تخت وغیرہ کا انتظام کرلوں مگر سرکار

نے فرمایا کہ کیا فقیری میں سکون نہیں ہے؟ اس کے بعد جو روپیہ پنجاب سے لایا تھا اس کو دینی کاموں پر خرچ کر دیا اور اپنے سارے مسائل سرکار پر چھوڑ دیے- اللہ کا فضل اور سرکار کا کرم رہا کہ آج تک کبھی ایسی پریشانی نہ آئی جو ہم کو ہمارے دین سے الگ کرے- نماز تو پہلے بھی پڑھتا تھا مگر سرکار کی بارگاہ میں ایمان کی قوت اور شریعت کی پابندی کا جذبہ بڑھتا رہا- اللہ کا کرم ہے کہ خانقاہ میں آنے کے بعد جان بوجھ کر آج تک کوئی نماز قضا نہ کی، پیروں کا کرم ہے ورنہ میرے بس کا نہ تھا-

رابعہ سے شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، لوگوں نے بار بار کہا کہ سرکار سے گزارش کرو، دعا فرما دیں گے، یہاں سے تو غیر بھی خالی نہیں جاتے- مگر ہمیشہ یہ خیال آتا کہ ہوسکتا ہے کہ میری قسمت میں کوئی نیک اولاد نہ ہو، اس لیے سرکار دعا نہیں فرماتے- اللہ کا فضل اور پیروں کا کرم ہوا اور ۲۵ جولائی ۲۰۱۰ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا، سرکار نے اس کا نام محمد زکریا رکھا-

۲۰۰۳ء میں خانقاہ آنے کے بعد ایک دوبار کسب کے لیے کوشش بھی کی، مگر میں سکھ مذہب سے اسلام کی طرف آیا تھا- اس لیے کوئی مناسب کام ملنا تھوڑا دشوار ہوا- آخر میں سرکار نے اپنا خادم بنالیا- سرکار جس گاڑی پر سوار ہوتے ہیں اس کی صفائی ستھرائی اور ڈرائیونگ کرنا میرا کام ہے، جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں-

خانقاہ آنے کے بعد میرے گھر والوں نے کئی بار کوشش کی کہ میں اپنے گھر واپس چلا جاؤں، مگر میرے دل نے اس کو قبول نہ کیا اور نہ ہی سرکار کی اجازت ہوئی- دو بار تو میرے ماں باپ بھی مجھ کو لینے آئے، مگر نہ گیا- لوگوں کے کہنے اور سرکار کی اجازت سے ۲۰۱۱ء کے رمضان میں اپنے آبائی وطن گیا- اپنے والدین اور بھائیوں سے ملاقات کی- ایک ہفتہ قیام رہا- دوست اور رشتہ دار ملنے آئے- سب نے محبتوں کا اظہار کیا- نماز ان لوگوں کے سامنے اپنے گھر بلکہ اپنے بھائیوں کے گھر پر ادا کرتا رہا- کوئی پریشانی نہ ہوئی- ان لوگوں کو اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ سروجیت اب اسلام سے الگ نہیں ہوسکتا، اس لیے اب کوئی کوشش بھی نہیں کرتا، مگر میری کوشش ہے کہ وہ اسلام کی طرف آجائیں- ایک مالک کے بندے ہونے کا ثبوت دیں اور دین حق کے ماننے والے ہو جائیں تاکہ کل اللہ کی بارگاہ میں ہم سب اپنے سرکار ابو میاں کے ساتھ حاضر ہوں اور اللہ ہم سب سے راضی ہو جائے- ہمارے گھر والے اور دوست رشتہ دار بھی اللہ کے ابدی عذاب سے محفوظ ہو جائیں-

باتیں تو بہت ہیں- مگر میں آخر میں صرف ایک بات عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ میں اسلام کی طرف تو مسلم صوفیوں کو دیکھ کر مائل ہوا، سب سے پہلے میں نے اس اسلام کو دیکھا جو مسلم صوفیوں نے اپنے کردار سے پیش کیا- اسلام لانے کا سبب تو ان کی محبت، ان کا کردار اور

ان کی سچائی تھی- مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سچائی حقیقت میں اسلام کی سچائی ہے اور صوفیہ ہی اسلام کے سچے پرچارک اور مبلغ ہیں- انھوں نے اسلام کو اپنی زندگی میں ڈھال لیا جو ان کو دیکھتا ہے، جو ان سے ملتا ہے، وہ گویا اسلام سے مل جاتا ہے- بتایا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ انسانوں کی ہدایت کا کام ان صوفیوں ہی کے ذریعے ہوا ہے-

مجھے اسلام کی جو بات سب سے اچھی معلوم ہوئی، وہ یہ کہ یہاں ایک مالک کو مانا بھی جاتا ہے اور ایک ہی کی پوجا بھی کی جاتی ہے- یوں تو ''سب کا مالک ایک'' کا نعرہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب لگاتے ہیں، مگر وہ ایک مالک کون ہے، کیسا ہے، اس کو ڈیفائن کرنے سے اسلام کے علاوہ ہر مذہب عاجز ہے- قرآن کی ایک چھوٹی سورت سورۂ اخلاص نے ایک مالک کا جیسا تعارف پیش کیا ہے وہ دوسرے کسی مذہب میں نہیں ہے- **قل ھو اللہ احد** اللہ ایک ہے- **اللہ الصمد** اللہ بے نیاز ہے- **لم یلد و لم یولد** نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا، یعنی نہ وہ باپ ہے نہ بیٹا- اگر وہ باپ ہوتا تو اس کا بیٹا بھی خدا ہوتا اور یہ نسل جاری رہتی تو خداؤں کی بھیڑ لگ جاتی جیسا کہ ہندو مذہب میں ہے- اور اگر ایسا نہیں تو پھر وہ کامل خدا نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ عیب ہے کہ خدا کا بیٹا خدا نہ ہو، بلکہ انسان ہو، جیسے اگر کسی انسان کی اولاد جانور ہو تو یہ اس انسان کے لیے عیب کی بات ہوگی- اور اللہ ہر عیب و کمی سے پاک ہے- عیسائیوں نے خدا کو حضرت عیسیٰ روح اللہ کا باپ بنا کر عیب دار کیا اور گمراہ ہوئے- مگر اسلام، وہ اسلام جو ہم کو مسلم صوفیوں سے ملا، جس اسلام کو ہم نے اپنے پیر کے ذریعے حاصل کیا اور ان کی صحبت میں جو اسلامی تعلیمات حاصل ہوئیں، اس میں ایسا ہی تعارف کرایا گیا ہے، جو سورۂ اخلاص میں موجود ہے- اسی پر ہمارا ایمان و عقیدہ ہے- خدا ہر عیب و نقص سے پاک ہے اور کوئی بھی اس کے برابری کا نہیں ہے- **ولم یکن لہ کفوا احد** کوئی اس کا برابر اور ہمسر نہیں- وہ سب کا مالک ہے- اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں- وہ ہمیشہ سے ہے، وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، اس کو فنا نہیں ہے-

مسلم صوفیہ اسی بے عیب، بے نیاز اور مختار کل ایک مالک کی طرف انسانوں کو بلاتے ہیں- وہ جس طرح دوست کی ہدایت کے خواہش مند ہوتے ہیں، وہ اپنے دشمنوں کو بھی اسی مالک کی طرف دعوت دیتے ہیں- اصل اسلام اور حقیقی دین، نیک اعمال، پاک خیالات اور عمدہ عادات و اطوار کا مجموعہ ہے- دوسرے الفاظ میں اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعہ کو مذہب حق اور خدا کا دین کہتے ہیں اور صوفیہ بیک وقت ان تینوں کی نمائندگی کرتے ہیں- شریعت کی پابندی ان سے بہتر شاید ہی کوئی کرے- توحید اور عقیدہ کو ان سے زیادہ واضح شاید ہی کوئی دوسرا بیان کر سکے- انسانوں بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی ان سے بہتر سلوک کرنے والا دوسرا مشکل ہی سے نظر آئے گا-

یہ ساری چیزیں بس ہم کو ہمارے پیر و مرشد نے سکھایا اور سکھا رہے ہیں- ابھی تک میں جتنا ان کے قریب گیا اتنا حیران رہا اور جس قدر اللہ اور رسول اور ان کی تعلیمات کے بارے میں جانتا جا رہا ہوں اسی قدر میرے ایمان ویقین میں مضبوطی آ رہی ہے اور اسی قدر شریعت پر عمل کرنا میرے لیے آسان ہوتا چلا جا رہا ہے- میری دلی خواہش ہے کہ میرے پیر کا پیغام پوری دنیا میں عام ہو جائے اور لوگ جھگڑا، لڑائی، بغض وحسد، کینہ اور دشمنی سے باز آجائیں اور دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی جانیں اور ایک مالک سے اپنا رشتہ مضبوط کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں- اللہ کہنے سے زیادہ عمل کی توفیق عطا فرمائے- آمین

○○○

رجنی سے رابعہ: ایک ایمانی سفر

رابعہ خاتون ۱۹۷۸ء میں جالندھر، پنجاب میں پیدا ہوئیں- پیدائشی نام رجنی ہے- ۲۰۰۳ء میں خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد پہنچیں جب کہ اسلام کی دولت ان کو میسر آچکی تھی- داعی اسلام حضرت شیخ ابو سعید مدظلہ العالی نے ان کا اسلامی نام رابعہ رکھا- موصوفہ بہت ہی نیک اور باعمل خاتون ہیں- ان کی باتوں میں بلا کا اثر ہے- سیکڑوں مسلم عورتیں ان کے ذریعے تائب ہو چکی ہیں- جو بھی ان کی باتیں سنتا ہے وہ جذب وکیف کا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہتا- حضرت داعی اسلام نے ان کو عصر حاضر کی رابعہ بصریہ اور رابعہ ثانیہ فرمایا ہے- آج کل یہ مستقل خانقاہ عارفیہ سید سراواں ہی میں اپنے شوہر ساحل سعیدی (سروجیت سنگھ) کے ساتھ رہتی ہیں اور دعوت وتبلیغ میں مصروف ہیں- رجنی سے رابعہ تک کا ان کا ایمانی سفر عبرت انگیز بھی ہے اور پر کیف ونشاط انگیز بھی- (ادارہ)

میرا نام رجنی ہے- میں ۱۹۷۸ء میں محلّہ تیج موہن نگر، بستی شیخ، گلی نمبر ۵، جالندھر پنجاب کے ایک متوسط سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی- باپ کا نام پورن سنگھ جو ایک ایماندار ڈرائیور تھے، کمپنی کی گاڑی چلاتے تھے- کمپنی کے ذمہ دار لوگ ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے- میں تین بھائیوں اور چھ بہنوں میں سب سے چھوٹی ہوں- سب سے بڑی بہن کا نام راج رانی ہے، دوسری بہن کا نام نرملا عرف بلو دیدی (۳) ارملا (۴) نیلم (۵) جسوندر- تین بھائی (۱) سکھ دیو سنگھ (۲) سوم ناتھ سنگھ (۳) سرندر سنگھ- آٹھویں کلاس تک ہم نے اپنے شہر میں اسکول سے تعلیم حاصل کی-
۱۹۹۲ء یا ۱۹۹۳ء کا واقعہ ہے کہ میری والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی- دوا علاج سے کوئی فائدہ

نہ ہوا-جالندھر میں اجمیر سے ایک غلام رسول نام کے بابا آیا کرتے تھے-لوگ ان سے خوب دعا کرواتے تھے- میرے بھی دل میں خیال آیا کہ اپنی والدہ کے لیے ان سے دعا کی درخواست کروں-اچانک ایک دن میں نے روتے ہوئے ان کا دامن پکڑ لیا اور دعا کی گزارش کی-انھوں نے میری والدہ کے لیے دعا کی اور تعویذ دیا-بابا غلام رسول کے ذریعے جالندھر کے بہت سارے سکھ لوگ اپنی پوری فیملی کے ساتھ اجمیر جاتے تھے-۱۹۹۵ء میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا-۱۹۹۶ء میں، میں بھی پہلی بار اجمیر گئی-بابا غلام رسول کے گھر پر ہمارے تمام ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے-میں بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ تھی-یہاں میں نے پہلی بار مسلم عورتوں کو نقاب میں دیکھا-اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کاش میں بھی ان مسلم عورتوں کی طرح نقاب پہنتی تو اچھا لگتا-اجمیر سے میں پنجاب آتو گئی مگر میرا دل اجمیر ہی کی طرف کھنچا جا رہا تھا-خواجہ کے دربار میں حاضری کے بعد جب اجمیر سے روانہ ہونے لگی تو مجھے نہیں معلوم کہ میں کیوں رونے لگی-بابا غلام رسول کا ایک چھوٹا لڑکا تھا جس نے مجھ کو روتے ہوئے دیکھ کر نذرانہ میں کچھ روپیہ اور ایک چادر دی-

۱۹۹۷ء میں اجمیر کا دوسرا سفر تھا مگر اس سے قبل اسلام کی محبت اور مسلم کلچر اپنانے کی خواہش میرے دل میں جگہ بنا چکی تھی اور میں روزہ بھی رکھنے لگی تھی-میری دو بہنیں غلام رسول بابا کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کر چکی تھیں-جالندھر میں ایک مسلم لڑکا تھا جو ہم لوگوں سے اسلام کی وجہ سے محبت رکھتا تھا-ایک بار ان کے گھر ایک پروگرام ہوا- ہم لوگوں کو بھی دعوت دی- میں اپنی بہنوں کے ساتھ اس کے گھر گئی-اس کے گھر میں ایک تخت پر میں بیٹھ گئی-اس کی والدہ نے مجھ کو یہ کہتے ہوئے ڈانٹا کہ تم لوگ ناپاک ہو اور میرے اس تخت پر بیٹھ گئی جہاں اللہ کا کلام، قرآن رکھا ہوا ہے-یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ کو تخت سے اٹھا دیا-اس وقت مجھ کو بہت دکھ ہوا-میں رونے لگی اور مایوس اپنے گھر واپس ہوگئی-مگر میرے دل میں یہ خیال بار بار آتا رہا کہ کیا میں قرآن نہیں چھو سکتی اور کیا میں اس کو نہیں پڑھ سکتی؟

۱۹۹۷ء میں جب دوسری بار اجمیر کے سفر کا ارادہ ہوا تو میرے دل و دماغ میں صرف ایک بات تھی، وہ یہ کہ اس بار خواجہ صاحب سے میں اپنے دل کی بات کہوں گی اور دعا کروں گی کہ خواجہ! تو ہم کو بھی مسلم عورتوں کی طرح نقاب پہننے اور قرآن پڑھنے والی بنا دے-خواجہ صاحب سے ان کے روضے پر بیٹھ کر مسلسل یہ دعا کرتی رہی-جب روضہ کے اندر داخل ہوئی تو خادم نے خواجہ صاحب کے مزار سے ایک چادر لے کر میرے سر پر ڈال دی-مجھ کو ایسا لگا کہ میری مراد پوری ہوگئی-اس سفر سے واپسی کے بعد مکمل طور پر میرا دل اسلام کو قبول کر چکا تھا-

بابا غلام رسول صاحب کے ساتھ ایک ڈاکٹر اصغر صاحب آیا کرتے تھے-وہ اکثر میرے

گھر بھی آتے جاتے تھے-میری دو بہنیں، اپنے شوہروں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی کی کوشش سے اسلام بھی قبول کر چکی تھیں-ڈاکٹر صاحب میری بھی تربیت کرتے تھے-ہندی زبان میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو تین کتابیں (۱) آفتاب عالم (۲) قرآن مجید (۳) معرکۂ کربلا دی تھیں-میں اکثر ان کتابوں کو پڑھتی تھی-قرآن کا ترجمہ بھی پڑھتی تھی-ان کتابوں کو پڑھنے سے اسلام کی محبت بڑھتی گئی-ایک دن آیا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا سارا حال سنا دیا-انھوں نے مجھ کو کلمہ پڑھایا اور روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کو کہا-روزہ رکھنا تو آسان تھا مگر نماز پڑھنا میرے لیے مشکل تھا-۱۹۹۸ء کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پیر و مرشد ہمارے سرکار میاں حضور (شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی) ہمارے گھر تشریف لائے، میں نے ان کو وضو کا پانی دیا-انھوں نے دعا دی اور کہا کہ بیٹا! نماز کی پابندی کرنا، میں نے روتے ہوئے عرض کیا سرکار میں روزہ تو رکھ سکتی ہوں، لیکن نماز کیسے پڑھوں؟ سرکار نے ڈاکٹر صاحب کو نماز سکھانے کا حکم دیا-ڈاکٹر صاحب ہندی زبان میں سورہ، دعا وغیرہ لکھ کر دینے لگے-میں یاد کرتی گئی، میرا اس کے علاوہ کوئی کام بھی نہ تھا اور دوسرے کاموں میں میرا دل بھی نہیں لگتا تھا-نماز پڑھنا بھی مجھ کو جلد ہی آگیا-

جب میں نماز کی پابندی کرنے لگی تو میرے گھر والوں نے مجھ پر سختی شروع کر دی اور مجھ کو ہر طرح سے پریشان کرنا چاہا-مگر میں ہر حال میں اپنے مالک کو یاد کرتی رہی-ایسے حالات میں میری بہن راج رانی نے میرا ساتھ دیا اور گھر والوں کو سمجھایا کہ وہ مالک کو یاد ہی تو کرتی ہے، کوئی غلط تو نہیں ہے-اس کے بعد کافی حد تک میرے گھر والے نرم ہو گئے-

میرے گھر کے پیچھے تھوڑی دوری پر ایک مزار بھی تھا، جہاں میں بچپن ہی سے جایا کرتی تھی اور صفائی ستھرائی کر کے واپس آجاتی-یہ مجھ کو اچھا لگتا تھا، اگرچہ اس وقت مجھ کو کچھ بھی معلوم نہ تھا-میرے گھر والوں نے جب پریشان کرنا شروع کیا تو میں کبھی کبھی اس مزار پر جاتی یا اپنے گھر کی چھت ہی سے اس مزار کی طرف متوجہ ہو کر اللہ سے دعا کرتی اور مجھ کو سکون ملتا تھا-

اسی دور میں میری شادی کا مسئلہ بھی آیا-کئی رشتے آئے-پہلے تو میں شادی سے انکار کرتی رہی، بعد میں، میں نے یہ شرط لگا دی کہ جس سے میں شادی کروں گی وہ اسلام قبول کر لے مگر ایسا بھی نہ ہوا-آخر کار میری بہنوں کا بھی اب دباؤ شروع ہوگیا-باپ بھائی تو پہلے ہی سے ناراض تھے، اب بہنوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا-ایک لڑکا جو ۵۵ ہزار روپیہ مہینہ کماتا تھا، اس کا رشتہ آیا-اس کے گھر والے مجھ کو دیکھنے آئے-ان لوگوں نے پسند بھی کر لیا-اب میرے سامنے انکار کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا-اب میرے اوپر سختی بڑھتی گئی-نماز پر پابندی لگ گئی-گھر میں بند کر دیا گیا-میں صرف روتی رہتی تھی اور اپنے سرکار ابو میاں کو یاد کرتی اور ان کو خط لکھتی کہ مجھ

کواس کفر کی وادی سے سرکار جلد نکال لیا جائے اور اپنی خانقاہ میں تھوڑی سی جگہ دے دیں، میں وہیں پڑی رہوں گی-

وہ دور تھا جب میں اکثر خواجہ صاحب کو خواب میں دیکھتی اور ان سے اپنے سارے حالات بیان کرتی -وہ مجھ کو تسلی دیتے اور کہتے جلد تم یہاں سے دوسری جگہ چلی جاؤ گی-لیکن میری کوشش تھی کہ اب میری شادی کسی مسلم لڑکے کے ساتھ ایسی جگہ ہو کہ جہاں مجھ کو چاروں طرف سے اذان کی آواز سنائی دے اور اسلام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو-سرکار ابو میاں سے ملاقات ۱۹۹۸ء میں ہوئی- دوسری ملاقات ۱۹۹۹ء میں انبالہ میں سبھاش چند کے گھر ہوئی تھی-پہلی ملاقات ہی ایسی تھی کہ ان کی کریمی اور رحیمی کو دیکھ کر سب کچھ انہی کو مان لیا تھا- ہر دکھ درد میں ان ہی کو پکارتی تھی- ہر غم بذریعۂ خط ان ہی سے بیان کرتی تھی- بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اصغر صاحب جنہوں نے ہم کو اسلام کی دعوت دی، اور میاں حضور جیسا پیر و مرشد دیا، ایک لمبے عرصے تک غلام رسول بابا کی صحبت میں رہنے کے بعد جب ان کو کچھ نہ ملا تو مولوی عبد القیوم صاحب کے ذریعے سرکار ابو میاں کے پاس حاضر ہوئے اور خود بھی میاں کے ہو گئے اور ہم جیسے گمراہ لوگوں کو بھی اس درگاہ کے غلاموں میں شامل کر دیا-

سروبجیت سنگھ جو میری بھابھی کے بھائی ہیں، وہ میرے گھر آیا کرتے تھے- ان سے میری گفتگو بھی ہوتی تھی -اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ان کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ۱۹۹۹ء میں ہمارے ساتھ یہ بھی میاں حضور سے ملنے کے لیے انبالہ آئے تھے-اسی وقت ان کی دنیا بدل گئی تھی-اب ان سے میری انسیت بھی بڑھ گئی-سکھ مذہب کے مطابق ہم دونوں کا رشتہ جائز نہیں، مگر اب جب کہ ہم دونوں اسلام قبول کر چکے تھے تو میرے دل میں آیا کہ ہم دونوں اسلام میں ایک دوسرے کے مددگار ہو سکتے ہیں اور دونوں اپنی اجتماعی زندگی بھی گزار سکتے ہیں- یہ بات میں نے اپنے پیر و مرشد میاں حضور سے اس وقت عرض کی جب ڈاکٹر اصغر مرحوم کو لے کر سروبجیت الہ آباد خانقاہ شریف میں آئے تھے اور پیر و مرشد نے میری اس بات کی لاج بھی رکھ لی-

۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۳ء تک سرکار میاں حضور سے بذریعۂ خط اپنے سارے حالات بیان کرتی رہی اور امید لگا رکھی تھی کہ کوئی دن آئے گا جب مجھ کو میرے سرکار کے قدموں میں جگہ مل جائے گی-۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر اصغر صاحب کی طبیعت جب زیادہ خراب ہو گئی اور پنجاب سے الہ آباد آنے ہی میں انتقال ہو گیا اور وہ خانقاہ شریف الہ آباد میں مدفون بھی ہو گئے تو اب پنجاب میں میرا بظاہر کوئی سہارا نہ رہا-

سروبجیت جو ڈاکٹر اصغر صاحب کے ذریعے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، انھوں نے خفیہ

پلان بنایا اور الہ آباد کے لیے سفر کا ارادہ کر لیا- گورگھپور کا ایک مسلم لڑکا جو میرے گھر کے پاس ہی دوکان میں کام کرتا تھا، اس نے بھی ہماری مدد کی- خانقاہ آنے سے پہلے میں نے اس سے گزارش کی کہ تم ہمارا سامان الہ آباد پہنچا دو، پہلے تو اس نے انکار کیا اور معافی مانگی کہ تمہارے بھائی، باپ مجھ کو مار ڈالیں گے، مگر جب میں نے اللہ و رسول کا واسطہ دیا اور عرض کیا کہ میرا سامان ہی کیا ہے، چند کپڑے ہیں اور چند کتابیں ہیں جن کے ذریعے میں نے اللہ، رسول کو جانا ہے، جن میں قرآن پاک بھی ہے-اگر ہم نے ان کتابوں کو گھر میں چھوڑا تو لوگ اس کی عزت نہ کریں گے اور اس کا عذاب ہم کو ہوگا- اس لڑکے نے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور پھر ہمارے الہ آباد آنے سے ایک ہفتہ پہلے ہمارا تھوڑا جو سامان تھا اس کو الہ آباد خانقاہ میں پہنچا دیا- اللہ اس کا دنیا اور آخرت میں بھلا کرے-

ڈاکٹر اصغر صاحب جو پنجاب ہی میں رہتے اور لوگوں سے محبت اور نرمی کا سلوک کرتے، سارے لوگ ان کی عزت کرتے تھے- میرے گھر والے بھی ان کا احترام کرتے تھے- میرے اسلام لانے کے بعد بھی میرے گھر والوں نے ڈاکٹر صاحب کو کچھ نہ کہا اور ان کی عزت کرتے رہے- بلکہ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو میرے پاپا کے ساتھ میری بہنیں راج رانی اور نرملا عرف بلو دیدی بھی خانقاہ آئی تھیں اور میاں حضور سے ملاقات بھی کی تھیں- راج رانی تو اس کے علاوہ بھی دو بار خانقاہ آ چکی ہے- ہماری دو بہنیں جنہوں نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بابا غلام رسول کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا ان میں ایک تو نرملا عرف بلو دیدی، شوہر کا نام بلجیت سنگھ جو جالندھر کے رہنے والے ہیں، ان کے دو بچوں کا ختنہ بھی ہوا، بلجیت سنگھ نے حج بھی کیا ،مگر افسوس کہ آج تک مکمل طور پر اسلام میں داخل نہ ہو سکے- دوسری ارملا، شوہر کا نام بلدیو سنگھ، یہ جالندھر کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں، ارملا کی مالی حالت بہت اچھی تھی، مگر ایک دور بہت خراب بھی آیا- اسی دور میں اپنے زیورات بیچ کر وہ مجھ سے ملنے کے لیے الہ آباد آئی تھی- سننے میں آیا ہے کہ ۲۰۱۰ء میں اس کا انتقال بھی ہو گیا- ان کے بچوں سے اس وقت میرا رابطہ نہیں ہے-

ہماری ان دونوں بہنوں اور ان کے گھر والوں کو صحیح طور پر اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ ملا- اسلام کی حقانیت نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور اسلام کا اقرار تو ہوا مگر دلوں میں ایمان داخل نہ ہوا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ دو کشتی پر سوار رہے اور شیطان نے اپنا کام کیا یا تو گمراہ ہو گئے یا برے راستے پر چل پڑے- اسلام کا حاصل ہونا تو آسان تھا مگر ایمان کی دولت تو صرف مخلص بندوں کی صحبت ہی میں مل سکتی ہے- میرے سرکار نے بارہا بتایا کہ اسلام لانے اور بظاہر کلمہ پڑھ لینے سے دنیا میں تو آدمی مسلمان کہلائے گا مگر آخرت کی کامیابی کا دار و مدار ایمان پر ہے- یہ تو اللہ کا خاص فضل ہوا کہ اس نے مجھ جیسے ناپاک انسان کو سرکار میاں حضور جیسے پیر کی بارگاہ

میں لاکر رکھ دیا جہاں ہم کو سب کچھ ملا- میں نے پیر پالیا، ان کو پا کر میں نے اللہ ورسول، ماں باپ سب کو پالیا- ان کے گھر والوں نے بھی ہم کو ہمیشہ اپنے بھائی بہن کا سا پیار دیا - ہمارا پیر ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے- ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمارے پیر کی زندگی لمبی کرے اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے فیض یاب ہوں- جن کو میرے سرکار کی طرح مرشد مل جائے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا، شرط ہے کہ ان کی صحبت میں کچھ دن رہے- ان کی صحبت میں دل زندہ ہوتا ہے، ایمان ویقین حاصل ہوتا ہے، ان کے دیدار سے اللہ یاد آتا ہے اور ان کی گفتگو سے حق و باطل، حلال وحرام کا فرق معلوم ہوتا ہے-

۲۰۰۳ء میں رمضان کے مہینے میں سروبجیت جواب ہمارے شوہر بھی ہیں اور ہمارے سرکار کے خادم بھی- ان کے ساتھ الہ آباد آ گئی - الہ آباد اسٹیشن سے چند کلومیٹر کی دوری پر منڈیرہ میں ہم لوگ ٹھہرے، دوسرے ہی دن وہاں ہی ہم دونوں کا نکاح ہوا اور پھر تین چار دنوں کے بعد سید سراواں شریف سرکار کے پاس خانقاہ میں حاضر ہو گئے-

خانقاہ آنے سے پہلے میں دوبار اجمیر شریف خواجہ صاحب کے دربار میں حاضر ہوئی- اس کے علاوہ دہلی میں سلطان جی (سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا) اور قطب صاحب (حضرت قطب الدین بختیار کاکی) اور بوعلی شاہ قلندر پانی پت اور صابر پاک کلیر شریف میں بھی حاضر ہو چکی تھی- کلیر میں حاضری کے وقت ایک فقیر سے ملاقات ہوئی تھی جنہوں نے دعائیں دیں اور اپنی ایک تصویر بھی دی اور کہا تھا بیٹی جب کبھی کوئی پریشانی ہو تو اس تصویر سے کہنا، مگر اللہ کا کرم کہ میاں کی صورت میں ایسی تصویر مل گئی کہ کوئی حاجت ہی نہ رہی- میں نے اپنے گھر والوں کو چھوڑا، مگر میاں کو پا کر اور ان کے گھر والے حسن سرکار، حسین سرکار، علی سرکار، زینب آپا، فاطمہ آپا، ان سب کو پا کر میں خوش ہوں، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میاں کی صورت میں اتنا اچھا باپ اور پیرانی جی کی صورت میں اتنی اچھی ماں مل گئی -حسن بھائی، حسین بھائی، علی بھائی نے اپنے بھائی بہن سے زیادہ پیار دیا- خواجہ صاحب کا بڑا کرم رہا کہ انھوں نے میری دعا سن لی اور میاں جیسا حقیقی پیر دیا، پیر، شوہر، اولاد، سامان سب کچھ مل گیا- میاں کو پا کر سب کچھ پالیا- جہاں بھی میں جاتی ہوں وہاں لوگ میری عزت کرتے ہیں اور میری بات بھی تسلیم کرتے ہیں- یہ سب میرے میاں کا کرم ہے- میری عزت صرف میاں کی وجہ سے ہے- ورنہ لوگ اگر ہماری حقیقت جان جائیں تو کوئی ہماری طرف تھوکنا بھی پسند نہ کرے- دعا ہے کہ اللہ میرے میاں کو لمبی عمر عطا کرے اور ان سے پہلے ہم اس دنیا سے چلے جائیں-

۲۰۰۳ء میں ہم جب گھر (پنجاب) سے خانقاہ (الہ آباد) آ گئے تو دس دن کے بعد

میرے والد کا انتقال ہو گیا- میرے بھائیوں کا کہنا ہے کہ تمہاری وجہ سے پاپا ختم ہو گئے، جب کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وقت متعین ہے- یوں ہی میری شادی کو کئی سال ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہ ہوئی اور لوگ بھی کچھ کہنے لگے تھے مگر میں ہمیشہ اللہ سے دعا کرتی تھی کہ مولی! اولاد دینا تو نیک اور اپنی راہ پر چلنے والا دینا - اللہ کا خاص کرم ہوا اور ۲۵/ جولائی ۲۰۱۰ء کو ایک لڑکا ہوا جس کو دیکھنے سرکار ہاسپیٹل گئے اور تمام لوگوں نے مبارکباد دی- سرکار نے اس کا نام محمد زکریا رکھا-

اب میری دلی خواہش ہے کہ میں سچی پکی مسلمان ہو جاؤں، اپنے پیر کے نقش قدم پر چلنے والی ہو جاؤں، ظاہر وباطن ایک ہو جائے، کسی کو ہم سے تکلیف نہ ہو، میری زبان اور ہاتھ سے سارے لوگ محفوظ رہیں، میں اس عورت کو بھی دعا دیتی ہوں جس نے ہم کو ڈانٹا تھا، اس کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں قرآن اور اسلام کی محبت آئی-

غلام رسول بابا کے حق میں بھی میں دعا کرتی ہوں کہ اگر ہم کو یہ نہ ملے ہوتے تو شاید میں حق کی طرف نہ آتی - میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں پوری دنیا میں اسلام کو پہنچا دوں اور اپنے میاں کے مشن کو دنیا میں پھیلا دوں- میں اپنے گھر والوں کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی پریشان ہوں کہ سب حق کی طرف آ جائیں اور پوری دنیا حق اور سچ کو جان جائے- میرے گھر والوں کا اسلام کی طرف آنا ظاہر میں تھوڑا مشکل لگتا ہے مگر میرے میاں کی توجہ ہو جائے تو سب حق کی طرف آ جائیں گے- یہ صرف کرم کی بات ہے ورنہ کون ہے جو ہدایت پا جائے، کمال اسلام قبول کرنے والے کا نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہم جیسے کتوں کو اسلام جیسی نعمت دی- میری خواہش ہے کہ اس کو جو کوئی پڑھے وہ میرے حق میں دعا کرے کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے اور اپنے دین کا کام لے لے اور میرے میاں سے ملنے آئے اور ان سے دین کو جاننے کی کوشش کرے-

OOO

تحقیق وتنقید

تصوف اور صوفیہ: علامہ ابن حجر مکی ہیتمی کی نظر میں

تصوف اور صوفیۂ کرام کے بارے میں بالعموم افراط یا تفریط سے کام لیا جاتا ہے- صحیح نقطۂ نظر قائم کر کے تصوف اور صوفیہ سے متعلق معتدل راستہ اختیار کرنا نہایت ضروری ہے- ایک گروہ صوفیہ اور تصوف کے حوالے سے مبالغہ آمیز تعریف کرتا ہے، دوسرا گروہ انہیں برا بھلا کہتا ہے، جب کہ تیسرا گروہ اعتدال وانصاف کی راہ پر ہے- یہ تیسرا گروہ ان بالغ نظر علما و محققین کا ہے جنھوں نے تصوف کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس فن کو میزانِ شریعت پر تولنے کے بعد ہی یہ اعتدال پسندانہ موقف اختیار کیا ہے- علامہ ابن حجر مکی ہیتمی قدس سرہ (متوفی: ۹۷۴ھ) کا شمار ان علما و محدثین میں ہوتا ہے جو تصوف اور صوفیۂ کرام کے بارے میں مسلکِ اعتدال پر قائم ہیں-

شیخ تقی الدین ابن تیمیہ لکھتے ہیں: **فطائفة ذمت الصوفية والتصوف وقالوا: إنهم مبتدعون خارجون عن السنة .... وطائفة غلت فيهم فادعوا أنهم أفضل الخلق وأكملهم بعد الأنبياء وكلا طرفي هذه الأمور ذميم والصواب أنهم مجتهدون في طاعة الله كما اجتهد غيرهم من أهل طاعة الله.**

(مجموعۃ فتاویٰ احمد بن تیمیہ ۱۱/۱۸، مکتبہ ابن تیمیہ، بیروت)

ترجمہ: تصوف اور صوفیۂ کرام کے بارے میں لوگ تین خانوں میں بٹے ہوئے ہیں:

پہلا گروہ: ان کا کہنا ہے کہ تصوف اور اس کی نمائندگی کرنے والے صوفیۂ کرام بدعتی اور دائرۂ شریعت سے خارج ہیں-

دوسرا گروہ: صوفیہ اور تصوف کے حق میں غلو اور افراط سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ یہ گروہ صوفیۂ عظام کو انبیاے کرام کے بعد افضل ترین مخلوق سمجھتا ہے- یہ دونوں طریقے غلط ہیں- درست قول اور سچی بات تو یہی ہے کہ صوفیۂ کرام طاعتِ الٰہی اور عبادتِ خداوندی میں حد درجہ مشقت اٹھانے والے ہیں-

بقول ابن تیمیہ جو گروہ اطاعت خداوندی میں بہت زیادہ اجتہاد اور مشقت اٹھاتا ہو بھلا وہ اپنے علم وعمل کی بنیاد کتاب وسنت کے بجائے اسرار ورموز پر کیسے رکھ سکتا ہے؟

علامہ ابن جوزی جیسے صوفیہ کے مخالف بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں: **وما كان المتقدمون في التصوف إلا رؤساء في القرآن والفقه والحديث والتفسير.** (تلبیس ابلیس ص: ۳۴۵)

یعنی صوفیۂ متقدمین قرآن وحدیث، فقہ اور تفسیر میں بلند مقام پر فائز ہوا کرتے۔

بہر کیف! اب اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں اور علامہ ابن حجر مکی ہیتمی کے افکار کے تناظر میں تصوف اور صوفیہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

علامہ ابن حجر مکی ہیتمی

علامہ ابن حجر مکی ہیتمی قدس سرہ دسویں صدی ہجری کی مایۂ ناز شخصیت کا نام ہے۔ ابن حجر مکی صرف محدث یا فقیہ نہیں تھے، بلکہ مروجہ علوم وفنون پر مجتہدانہ بصیرت اور کامل دست گاہ رکھنے والے اپنے دور کے زبردست عالم اور بلند پایہ محقق بھی تھے۔ خاتم المحققین آپ کا مشہور لقب ہے۔ پورا نام ابوالعباس شہاب الدین احمد بن محمد بن علی بن حجر ہیتمی مکی شافعی ہے۔ ۱۴۹۴ء مصر کے گاؤں ''ہیتم'' میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ امام شمس الدین بن ابی حمائل اور امام شمس الدین شناوی نے کفالت فرمائی۔ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۲۴ھ میں جامع ازہر مصر میں داخل ہوئے اور وہاں جلیل القدر اساتذہ سے مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ شیخ شہاب الدین رملی، شمس سمہودی، شہاب ابن نجار حنبلی اور شہاب بن صائغ آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ قاضی زکریا، معمر زین عبدالحق سنباطی، امین غمری، (تلمیذ ابن حجر عسقلانی) امام سیوطی اور ابوالحسین بکری سے حدیث کا درس لیا اور اس طرح جملہ علوم وفنون میں کامل واکمل بن کر ابھرے۔ زبردست قوت حافظہ کے مالک تھے۔ ۲۰/سال سے بھی کم عمر میں آپ کے اساتذہ ومشائخ نے تدریس وافتا کی اجازت عطا فرمادی۔ ۹۳۳ھ میں دوبارہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۹۴۰ھ میں مکہ شریف میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور یہیں درس وتدریس، افتا اور تصنیف وتالیف کی خدمات انجام دینے لگے۔ مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی شاہ کار اور لاجواب تصنیف ہیں جو علوم وفنون میں آپ کی اجتہادی بصیرت پر گواہ ہیں: **(۱) فتح الالٰه شرح مشکاة (۲) الصواعق المحرقة (۳) الخيرات الحسان (۴) اتمام النعمة الكبرى على العالم (۵) تحرير الكلام في القيام عند مولد سيد الانام (۶) الاعلام بقواطع الاسلام (۷) الزواجر عن اقتراف الكبائر (۸) الجوهر المنظم وغيره (مقدمة الجوهر المنظم ص: ۱)**

آسمان فضل وکمال کا یہ بدر کامل نصف صدی تک پوری دنیا میں اپنی روشنی پھیلانے کے بعد ۹۷۴ھ میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے تا صبحِ قیامت آپ کی قبر انور پر رحمت ونور کی بارشیں فرمائے۔ (آمین)

''فتاوی حدیثیہ'' آپ کی گراں قدر تصنیف ہے جو آپ کے ''مجموعۂ فتاوی فقہیہ'' کی ایک اہم کڑی اور پُر مغز حصہ ہے۔ اس کتاب میں ہم ابن حجر ہیتمی کا محدثانہ مقام، فقیہانہ رنگ وآہنگ، متکلمانہ عظمت، مجتہدانہ شان اور محققانہ طرز استدلال بخوبی ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ تصوف وصوفی کی تعریف، صوفی کی وجہ تسمیہ، تصوف کا آغاز وارتقا، فقہاے عظام کا صوفیۂ کرام سے اختلاف، منکرین اولیا اور عداوتِ صوفیہ کا بھیانک انجام، تصوف وفقر اور زہد میں فرق وامتیاز اور اسی طرح صوفی، متصوف اور متشبہ کے درمیان بنیادی فرق اور شیخ محی الدین ابن عربی سے متعلق جب علامہ ابن حجر مکی سے سوال ہوا تو آپ نے ان تمام سوالوں کا مدلل اور تشفی بخش جواب دیا اور سچ پوچھیے تو جواب کا حق ادا کردیا۔

تصوف وصوفیہ اور اس کے متعلقات پر ابن حجر مکی کے علمی افادات اور نفیس ابحاث اختصار کے ساتھ سپردِ قرطاس ہیں:

صرف علامہ ابن حجر مکی ہی کی کیا تخصیص، ہر دور کے علما نے نفسِ تصوف اور صوفیۂ کرام کو عقیدت واحترام کی نظروں سے دیکھا ہے۔ ہاں! وہ جاہل صوفیہ اور زاہدانِ خشک جو بظاہر تصوف کا لبادہ اوڑھ کر کھلے بندوں شریعت کی خلاف ورزی کرتے تھے، ایسے لوگوں کی ہر دور میں علما نے مخالفت کی ہے اور جو نفوس قدسیہ واقعی صوفی صافی اور متبع شریعت ہوتے، علماے کرام انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے، ان کی عزت واحترام اور تواضع میں کوئی کمی نہ ہونے دیتے۔ امام عبدالوہاب شعرانی رقم طراز ہیں:

''**ولم يكن أحد منهم (الصوفية) في عصر من الأمصار إلا وعلماء ذالک الزمان يتواضعون له ويعملون بإشارته ويطلبون منه تفريج كربهم في الشدائد**'' (**الأنوار القدسية في بيان قواعد الصوفيه**، ص: ۹۲، مکتبہ دار صادر، بیروت)

یعنی ہر دور میں علمائے کرام، صوفیہ عظام کے ساتھ تواضع اور احترام وعقیدت کا برتاؤ کرتے، ان کے مشورے پر عمل کرتے اور مصیبت کی گھڑی میں ان سے ازالۂ مصیبت کی درخواست کرتے۔

امام احمد بن حنبل کی علمی جلالت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن جب کسی مسئلے میں آپ کو توقف ہوتا تو ابوحمزہ بغدادی سے پوچھتے: صوفی صاحب! اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور ان کی

رائے پر اعتماد کرتے۔(انوارِ قدسیہ ص:۹۱)

تصوف اور صوفی کی تعریف

علامہ ابن حجر مکی ''تصوف اور صوفی کی تعریف'' کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شرائطِ تصوف اور اس کے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے صوفیۂ کرام نے تصوف کی مختلف تعریفیں کی ہیں، یہاں تک کہ تصوف کی ایک ہزار سے زیادہ تعریف منقول ہے۔سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں: ''تصوف نام ہے ذکر، وجد اور اتباعِ شریعت کا''

شیخ رویم کا قول ہے: ''نفس کو مرضیِ مولیٰ کا پابند بنا دینا اور اپنے آپ کو مکمل طور سے خدا کے حوالے کر دینا ہی تصوف ہے۔''

ابو محمد حریری کا ارشاد ہے: ''عمدہ اخلاق اور بلند کردار کے زیور سے مزین ہونا اور برے اخلاق سے بچنے کا نام تصوف ہے۔''

ابن حجر مکی تصوف کے بعد ''صوفی'' کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

حضرت جنید بغدادی کے بقول صوفی وہ ہے جو زمین کے مانند پیکرِ عجز ہو کہ اس پر ہر طرح کی اچھی بری اور بے کارشئ ڈال دی جاتی ہے مگر یہی بے کارشئ زمین میں فنا ہو کر ایک کارآمد اور عمدہ فصل کی صورت میں تیار ہو کر نکلتی ہے۔

ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری نے کہا ہے: ''صوفی وہ ہے جو ہر طرح کی دنیاوی آلائشوں سے پاک اور مخلوق سے رشتہ توڑ کر اللہ تعالیٰ کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو اور اس کی نگاہ میں سونا اور ٹھیکرا برابر ہو۔''

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صوفی اس گروہ کو کہتے ہیں جس نے تمام چیزوں پر اللہ تعالیٰ کو ترجیح دے دی، تو اللہ نے بھی اسے ہر چیز پر ترجیح دے دی اور دیگر مخلوق میں منفرد و ممتاز بنا دیا۔'' (فتاوی حدیثیہ ص:۳۲۶)

صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق

صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق میں بھی اہل علم کا اختلاف ہے۔بعض اسے ''صفّہ بمعنی چبوترہ'' اور بعض ''صفا'' سے مشتق مانتے ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ صوفیۂ کرام کے قلوب چوں کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ تقرب الی اللہ کے بلند مقام اور ''صف اول'' کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔اسی ''صف اول'' کی طرف نسبت کرتے ہوئے انہیں ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ صوفی ''صوف'' بمعنی اُون سے مشتق ہے۔صوفیۂ کرام بالعموم اون کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے، اس لیے انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق سے متعلق مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد آخر میں امام یافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں ''**ھذا القول الثالث ھو المناسب للاشتقا ق اللغوی ای النسبة إلی الصوف**'' (فتاوی حدیثیہ ص:۳۲۷)۔

یعنی راجح قول یہی ہے کہ صوفی، صوف بمعنی اون سے مشتق ہے اور یہی مناسبت لغوی کے زیادہ قریب ہے۔

تصوف کا آغاز وارتقا

ان مباحث کو سمیٹنے کے بعد مصنف علام نے ''تصوف کے آغاز وارتقا'' پر کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ زمانۂ رسالت سے لے کر دو صدی ہجری کے اواخر تک تصوف اور صوفی کا لفظ متعارف نہیں تھا اور لوگوں کے کان اس لفظ سے نا آشنا تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے ایمان و یقین کی حالت میں اپنی آنکھوں سے جمالِ نبوت کا مشاہدہ کیا، ان کے لیے ''صحابی'' کا لفظ ہی ہر اعتبار سے موزوں تھا کیوں کہ شرفِ صحابیت سے بڑھ کر کوئی دوسرا وصف نہیں ہو سکتا۔یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صوفی کے لقب سے ملقب نہیں ہوئے۔(ورنہ شریعت مطہرہ کے سانچے میں مکمل طور سے ڈھلی ہوئی صحابۂ کرام کی سادہ اور زاہدانہ زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک صوفی اور تصوف کے بام رفیع پر متمکن تھے۔)

اسی طرح جن نفوسِ قدسیہ نے صحابۂ کرام کی زیارت کی اور ان سے اکتساب فیض کیا ان کے لیے ''تابعی'' کا لفظ انسب ٹھہرا۔البتہ ان کا زمانہ جیسے جیسے عہدِ رسالت سے دور ہوتا گیا، بے راہ روی عام ہوتی چلی گئی۔دنیا کی طرف رغبت بڑھنے لگی اور افکار و نظریات میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔فتنہ و فساد کا بازار گرم ہونے لگا اور بدعت کا چلن عام ہو گیا۔حضور کی سنتیں مردہ ہونے لگیں۔امتِ مسلمہ مختلف فرقوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی۔

ایسے ہوش ربا ماحول میں ہر ایک گروہ یہ دعویٰ کرنے لگا کہ زہد و تقویٰ صرف ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔زاہد و متقی اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے والے صرف ہم ہیں۔جب صورت حال یہ تھی تو ایسے میں اہل سنت کے عابد و زاہد اور تقویٰ شعار بزرگوں کی شناخت دشوار ہو گئی۔لہٰذا علامت کے طور پر ان خواص اہلِ سنت کو ''صوفی'' کہا جانے لگا اور دوسری صدی ہجری سے قبل ہی ''تصوف'' کا لفظ متعارف و مشہور ہو گیا۔(فتاویٰ حدیثیہ ص:۳۲۷)

تصوف، فقر اور زہد میں فرق

تصوف ابتدا میں صرف زہد و عبادت کا نام تھا۔حدیث کی امہات کتب ''صحاح ستہ'' وغیرہ میں ''کتاب الزہد والرقاق'' کے عنوان سے ایک مستقل باب ہوتا ہے۔اہل علم بیان کرتے ہیں کہ

یہی زہد ورقاق آگے چل کر تصوف کی بنیاد ثابت ہوا- زہد جس قدر بڑھتا گیا تصوف میں تنوع اور وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ متقدمین صوفیہ کو تصوف کی نوع بہ نوع تعریفیں کرنی پڑیں اور تعریف تصوف کی یہ تعداد ایک ہزار سے بھی تجاوز کرگئی- اس کی وجہ یہ ہے کہ مجموعۂ زہد میں سے صرف ایک حصے کو لیا گیا اور زہد کے لازمی اوصاف مثلاً عبادت وخشیت، تقویٰ، انابت، رجوع الی اللہ، صبر ورضا اور اعتماد وتوکل میں سے کسی ایک کا لحاظ کرتے ہوئے تصوف کی ایک اجمالی تعریف کردی گئی- بعض لوگوں نے زہد، تصوف اور فقر کو اس طرح خلط ملط کردیا ہے کہ ان سب کی شناخت انفرادی طور پر دشوار ہوگئی ہے، حالانکہ یہ تینوں تین مختلف چیزیں ہیں-

تصوف، زہد اور فقر کے مابین جو بنیادی فرق ہے، اسے علامہ ابن حجر مکی نے بڑے محققانہ انداز میں بیان کیا ہے- چنانچہ آپ لکھتے ہیں: شیخ شہاب الدین سہروردی کے بقول تصوف، زہد و فقر کے معانی کو شامل ہونے کے ساتھ بعض اور اوصاف کے مجموعے کا نام ہے- یعنی تصوف کے لیے صرف زہد وفقر ہی کافی نہیں، جب تک کہ زہد وفقر کے ساتھ اور دیگر اوصاف حمیدہ کی آمیزش نہ ہوجائے تصوف کا وجود نہیں ہوسکتا- انسان کے اندر زہد وفقر کے لاکھ اوصاف جمع ہوجائیں وہ زاہد وفقیر تو ہوسکتا ہے مگر صوفی نہیں ہوسکتا- اسی لیے تو کہا گیا ہے **نهاية الفقر بداية التصوف** کہ جہاں فقر کی منزل ختم ہوتی ہے وہیں سے تصوف اپنا سفر شروع کرتا ہے- اہل شام فقرا اور صوفیہ میں فرق نہیں کرتے- بلفظ دیگر یہ لوگ فقر اور تصوف میں اتحاد کے قائل ہیں-

اس موقف کو رد کرتے ہوئے ابن حجر مکی فرماتے ہیں: **والحق أن بينهما فرقا** یعنی فقر گو کہ تصوف کی اساس ہے مگر دونوں کی حقیقت ایک نہیں- فقیر جادۂ فقر کا مسافر ہوتا ہے- یہ دامنِ فقر کو ہر حال میں مضبوطی سے تھامے رہتا ہے- فقرا باقی کو فانی پر ترجیح دیتے ہیں، تاہم آخرت میں حصول اجر کے طلب گار بھی ہوتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ فقرا، اغنیا سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے- اس کے برعکس صوفیہ اپنے آپ کو مکمل طور سے مرضیِ مولیٰ کا پابند بنالیتے ہیں، انہیں نہ کسی چیز کی طلب ہوتی ہے، نہ باقی اور فانی کے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں- گویا یہ لوگ ہر حال میں ''مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' کے فلسفے پر عمل کرتے ہیں-

فقیر اور صوفی میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ فقر ''حظِّ عاجل'' یعنی دنیا ہی میں مل جانے والے حصۂ اجر وثواب کو اپنے ارادہ واختیار سے قصداً ترک کردیتا ہے، جب کہ صوفی اپنے ارادہ و اختیار پر بالکل نظر نہیں ڈالتا بلکہ جملہ معاملات میں اپنے اختیار کو مرضیِ مولیٰ اور ارادۂ الٰہی کے تابع بنادیتا ہے- ''**والاختيار والإرادة علة في حال الصوفي**-'' (اپنا اختیار اور ارادہ صوفی کے حال کے لحاظ سے عیب ہے-)

فقر اگرچہ تصوف کی اساس اور بنیاد ہے، فقر کا راستہ طے کیے بغیر کوئی تصوف کی منزل تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا، تاہم فقر کے وجود سے تصوف اور تصوف کے وجود سے فقر کا وجود بھی لازم آئے، یہ کوئی ضروری نہیں- تصوف اور فقر میں یہی بنیادی فرق ہے-

فقر اور زہد میں فرق یہ ہے کہ فقر میں تواضع وانکساری، خلوت نشینی، عبادت وریاضت اور اخلاق وآداب وغیرہ اوصاف حسنہ سے آراستہ ہوکر تکبر، حسد، عجب وغیرہ اوصاف رذیلہ سے پرہیز کیا جاتا ہے- **وهذه قد لا يوجد مع الزهد** اور یہ اوصاف بعض اوقات زہد کے ساتھ پائے نہیں جاتے- **والحاصل أن محاسن الزهد بعض محاسن الفقر ومحاسن الفقر بعض محاسن الصوفي**- خلاصۂ کلام یہ کہ زاہد کے بعض اوصاف ومحاسن فقیر میں اور فقیر کے بعض اوصاف ومحاسن زاہد میں پائے جاتے ہیں، یہی حال فقیر اور صوفی کا بھی ہے کہ فقیر صوفی کے بعض اوصاف سے آراستہ ہوتا ہے اور صوفی فقیر کے بعض اوصاف سے متصف ہوتا ہے-

صوفی، متصوف اور متشبّہ

تصوف کا ابتدائی مرحلہ ایمان، درمیانی مرحلہ علم اور آخری مرحلہ ذوق ہے- مطلب یہ ہے کہ صوفیہ یہ تینوں مراحل کمال مشقت سے طے کرتے ہیں اور ان اوصاف ثلاثہ کے جامع ہوتے ہیں، جب کہ متصوف صاحب علم ہوتا ہے اور متشبہ صاحب ایمان-

میدانِ تصوف میں قدم رکھنے کے بعد متصوفِ صادق کو صوفی کے فضل وکمال کا حصہ ملتا ہے اور متشبہ کو متصوف کے حال سے یک گونہ فیض ملتا ہے- صوفی مقاومتِ روح میں مشغول اور صاحب مشاہدہ ہوتا ہے، متصوف مقاومتِ قلب میں منہمک اور صاحبِ مراقبہ ہوتا ہے، جب کہ متشبہ مقاومتِ نفس میں الجھا ہوا اور صاحب مجاہدہ ہوتا ہے- ان تینوں کا میدان اور دائرۂ عمل جدا ہوتا ہے- **كل يعمل علىٰ شاكلته**۔ یہ تینوں گروہ اپنے اپنے دائرے میں رہ کر تصوف کی خارزار وادیوں کو طے کرتے ہیں اور **العطايا بقدر البلايا** (نوازشات بلاؤں اور آزمائشوں کے اندازے سے ہوتی ہیں-) کے تحت اجر وثواب کا حق دار ہوتا ہے- فلاح وکامرانی اور نجات اخروی تینوں سے متعلق ہے-

متشبہ از راہِ محبت صوفیہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے تاکہ اسے بھی صوفیہ کی برکت حاصل ہو اور صوفیہ کی طرح اسے بھی عقبیٰ کی سعادت مل سکے- تو متشبہ کا گروہ حدیث پاک ''**المرء مع من أحب**'' کے مطابق جماعت صوفیہ میں داخل ہے، بشرطیکہ صوفیہ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کو اپنی عملی زندگی کا لازمی حصہ بنالے- آداب تصوف سے بیگانہ محض صوفیوں جیسا لباس پہننے، صوفیوں جیسی وضع قطع اور صوفیوں جیسا بھیس اختیار کرلینے سے کوئی ''متشبہ'' نہیں بن سکتا بلکہ وہ حدیث ''**من**

تشبه بقوم فهو منهم" کے زمرے میں داخل ہوگا۔ (فتاوی حدیثیہ ص:۳۳۰)

انکارِ اولیا اور عداوتِ صوفیہ کا بھیانک انجام

باضابطہ ایک مستقل فن کی حیثیت سے تصوف کے وجود میں آنے کے بعد بہت جلد اس کا سکّہ اطرافِ عالم میں کھنکنے لگا۔ مسلم وغیر مسلم معاشرے میں صوفیۂ کرام کو عزت ووقار کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ تصوف اور صوفیہ کا رنگ دن بدن نکھرتا ہی چلا گیا، مگر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تصوف اور صوفیہ کو لے کر حسد اور حرص کا بازار بھی گرم ہوا۔ دنیادار لوگوں نے طلب جاہ اور حصول منفعت کی خاطر تصوف کا چولا پہن لیا اور بعض اہل علم محض حسد اور رقابت کے سبب تصوف اور صوفیہ کے دشمن بن گئے اور ہر محاذ پر صوفیہ کے روحانی واخلاقی مشن کو ناکام بنانے کے لیے زبان وقلم کی تلوار نیام سے باہر نکال لی۔ اس طرح انکارِ اولیا اور عداوتِ صوفیہ کا ایک نیا دور شروع ہوگیا، یہاں تک کہ کبارِ صوفیہ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی، امام غزالی، شیخ ابن فارض اور منصور حلاج کی تفسیق وتضلیل کی گئی اور مباحث تصوف اور طریقت کے اسرار ورموز پر مشتمل ان کی کتابیں نذرِ آتش کی گئیں۔

بہر کیف! تصوف اور صوفیہ کے خلاف ہر دور میں آندھیاں چلیں اور خدا جانے کب تک یہ آندھیاں تصوف کے نشیمن کو تاراج کرنے کی کوششیں کرتی رہیں گی؟ تصوف اور صوفیہ کے خلاف مورچہ سنبھالنے والے افراد ان کا تو کچھ نہیں بگاڑ پاتے مگر نادانی سے اپنی دنیا وآخرت ضرور برباد کر ڈالتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ منکرینِ صوفیہ اور دشمنانِ تصوف بڑے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ آیئے علامہ ابن حجر مکی کے الفاظ میں دشمنانِ صوفیہ کا بھیانک انجام اور عبرت انگیز داستان ملاحظہ کریں:

آپ فرماتے ہیں: معتزلہ جو کراماتِ اولیا کے منکر ہیں، ان پر کچھ تعجب نہیں بلکہ تعجب اور افسوس تو ان بعض علما پر ہے جو اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود صوفیۂ کرام پر پھبتیاں کستے ہیں۔ مبالغہ اور تشدد آمیز لہجے میں ان مقدس گروہ کا انکار وابطال کرتے ہیں۔ یقیناً یہ افسوس ناک رویہ؛ محرومی، نقصان اور بھیانک انجام کا باعث ہے۔ تصوف کے قائل ہونے کے باوجود علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں سادات صوفیہ اور کبار اصحاب طریقت کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اوتاد، ابدال، صدیقین اور صالحین تک کو نہیں چھوڑا۔ ابن حجر مکی نے ابن جوزی کی اس انتہا پسندی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ "قدیم وجدید ائمہ وفقہا اور علمائے امت صوفیۂ کرام کے معتقد تھے۔ (باستثنائے بعض) یہ علما وفقہا صوفیۂ کرام کی تعظیم وتوقیر اور عزت واحترام کرتے، ان سے برکتیں حاصل کرتے

اور بوقتِ ضرورت ازالۂ مصیبت کی ان سے درخواست کرتے اور مدد طلب کرتے۔

ابن دقیق عید اپنے دور کے ایک بزرگ اور صوفی باصفا شخص کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک صوفی سو فقیہ یا ہزار فقیہ سے بہتر ہے۔ فخر المحدثین امام نووی قدس سرہ شیخ یٰسین مزین کے بڑے معتقد تھے۔ امام نووی ان کا بہت احترام کرتے اور ان کے مشورے پر عمل کرتے۔ اسی طرح عزالدین ابن عبدالسلام صوفیۂ کرام کی تعظیم وتوقیر میں حد درجہ مبالغہ فرماتے۔ (فتاوی حدیثیہ ص:۳۰۶)۔

ابن حجر ہیتمی مزید لکھتے ہیں: جن لوگوں نے محض تعصب اور حسد کی بنا پر اولیائے کرام اور سادات صوفیہ کا انکار کر کے انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، وہ لوگ خائب وخاسر اور بھیانک انجام سے دوچار ہوئے۔ ان کی عزت وشہرت خاک میں مل گئی، اپنے بلند مرتبہ وعلم وفضل سے گر کر ذلت وگمنامی کے گڈھے میں دفن ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل اور رسوا کر دیا۔ **نعوذ با لله من ذالک!**

بعض عارفین نے سچ فرمایا ہے: اللہ کے نیک بندے صوفیۂ عظام اور اولیائے کرام کو اذیت پہنچاتے ہوئے کسی کو دیکھو تو جان لو کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ منکرین اولیا اور عظمت صوفیہ سے کھلواڑ کرنے والوں کے انجام بد کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ حدیث پاک: **من آذى لي وليا فقد آذنته بالحرب.** کے تحت داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لینے والوں کو دنیا وآخرت میں اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔ صوفیۂ عظام سے عداوت رکھنے والوں کا سب سے ہلکا انجام یہ ہے کہ وہ اس مبارک جماعت کی برکت سے محروم رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں سوے خاتمہ کا بھی اندیشہ ہے۔ لہٰذا صوفیۂ کرام اور اولیاء اللہ سے ہرگز عداوت نہ رکھو، کیوں کہ یہ عداوت زہر قاتل ہے، دولتِ ایمان سے محروم ہو جانے کا خدشہ ہے۔

عداوتِ صوفیہ کے انجام بد کے حوالے سے مشہور واقعہ ہے کہ ابن سقا یہ اولیاء اللہ کے منکر اور دشمن تھے۔ اس زمانے کے ایک ولی نے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ کفر کی حالت میں مرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نصرانیت کی حالت میں اس کی موت ہوئی۔ حالانکہ ابن سقا اپنے وقت کے مایۂ ناز عالم تھے۔ علم وادب، فضل وکمال اور ذکاوت وشہرت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے مگر عداوتِ اولیا کے باعث اس کا علم وفضل کام نہ آ سکا۔

امام ابوسعید بن ابی عصرون کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔

آج ہمارے زمانے میں بھی منکرین اولیا اور دشمنان صوفیہ کی کمی نہیں ہے۔ ان واقعات سے ایسے لوگوں کو درس عبرت حاصل کرنا چاہیے اور ان نفوس قدسیہ کی شان میں گستاخیاں اور نازیبا کلمات استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

علامہ ابن حجر مکی کی مندرجہ ذیل نصیحت ہمیں بار بار دعوت فکر وعمل دیتی ہے-اسی اقتباس پر ہم اپنا مضمون بھی ختم کرتے ہیں-اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اولیاے کرام، بزرگانِ دین اور صوفیۂ کاملین کے فیوض وبرکات سے مالا مال فرمائے، آمین-علامہ ابن حجر مکی فرماتے ہیں:

”وینبغی للإنسان حیث أمکنهٔ عدم الانتقاد علی السادة الصوفیة نفعنا اللہ بمعار فهم .... وقد شاهدنا من بالغ فی الانتقاد علیهم مع نوع تعصب فابتلاه الله بالانحطاط عن مرتبته وأزال عنه عوائد لطفه وأسرار حضرته.“

(فتاوی حدیثیہ ص:۸۱)

ترجمہ: جہاں تک ہوسکے انسان صوفیۂ کرام کی شان میں زبان طعن دراز کرنے سے پرہیز کرے-میرا مشاہدہ ہے کہ جن لوگوں نے ان پر طعن وتشنیع اور تنقید کا نشتر چلانے میں مبالغہ اور تعصب سے کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے بلند مرتبے سے گرا دیا ہے اور اپنے الطاف وعنایات سے انہیں محروم کر دیا ہے-

○○○

مولانا کوثر امام قادری

بیعت واجازت-احادیث کی روشنی میں

رسول کریم ﷺ کے عہد ظاہری میں متعدد اقسام کی بیعتیں رائج تھیں اور صحابہ کرام کے دلوں میں بیعت کا شوق وجذبہ تھا، نیز سرکار دوعالم ﷺ وقتاً فوقتاً بیعت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے جاں نثاروں کے دلوں میں ترغیب وتشویق پیدا فرماتے رہتے تھے جس کے سبب صحابہ جماعت درجماعت حاضر خدمت ہوکر دست نبوی پر بیعت کرتے اور صرف یہی نہیں کہ خود بیعت ہوتے بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی بیعت کے لیے پیش کرتے پھر سرکار دوعالم ﷺ از راہ نوازش انھیں کبھی بیعت کر لیتے اور کبھی دعاؤں سے نواز کر بغیر بیعت واپس فرما دیتے-بیعت کی ادائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر مقبول تھیں کہ آیتیں نازل ہوتیں اور انھیں بتایا جاتا کہ اے دیوانو! تم میرے محبوب کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہو تو یقین کامل رکھو کہ تمہارا ہاتھ صرف محبوب کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ تمہارے خالق ومالک رب تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور تمھیں اس پر مبارک باد دی جاتی ہے-

عہد صحابہ میں جتنی قسم کی بیعتیں رائج تھیں، اس کے تعلق سے آئندہ حدیثیں آرہی ہیں، سردست ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نفس بیعت قرآن حکیم کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں-

یٰایها النبی اذا جاء ک المؤمنات یبایعنک علی ان لایشرکن بالله شیئا ولایسرقن ولایزنین ولایقتلن اولادهن ولایاتین ببهتان یفترینه بین ایدیهن وارجلهن ولایعصینک فی معروف فبایعهن واستغفرلهن الله ان الله غفور رحیم -(۱)

اے نبی! جب تمہارے حضور مسلمان عورتیں حاضر ہوں، اس پر بیعت کرنے کو کہ اللہ کا کچھ شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ وہ بہتان لائیں گی جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان یعنی موضع ولادت میں اٹھائیں گی اور کسی نیک بات میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لو، اللہ سے ان کی مغفرت چاہو، بے

شک اللہ بخشنے والامہربان ہے-

لقد رضی اللہ عن المومنین اذیبایعونک تحت الشجرۃ فعلم مافی قلوبھم فأنزل السکینۃ علیھم وأثابھم فتحا قریبا. (۲)

بے شک اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ اس درخت کے نیچے تمہاری بیعت کرتے تھے تو اللہ نے جانا جوان کے دلوں میں ہے،توان پر اطمینان اتارااورانہیں جلد آنے والی فتح کاانعام دیا-

إن الذین یبایعونک إنما یبایعون اللہ، ید اللہ فوق أیدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ ومن أوفی بما عھد علیہ اللہ فسیوتیہ اجرا عظیما- (۳)

جوتمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تواللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں-ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے-توجس نے عہد توڑا تواس نے اپنے برے کوعہد کوتوڑااور جس نے پورا کیا وہ عہد جواس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اسے بڑا ثواب دے گا-

إن اللہ اشتری من المومنین انفسھم وأموالھم بان لھم الجنۃ.(۴)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلہ میں خریدلیا-

اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں:

علامہ قرطبی نے بیان کیا ہے کہ جب مکہ میں لیلۃ العقبۃ کوستر انصار نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا: آپ اپنے رب کے لیے اوراپنے نفس کے لیے ہم سے جوشرط چاہیں منوالیں- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مرے رب کے لیے یہ شرط ہے کہ تم اپنی جانوں اور مالوں کوجن چیزوں سے باز رکھتے ہوان سے مجھ کوبھی باز رکھنا،یعنی جس طرح اپنی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرتے ہواس طرح میری حفاظت کرنا-صحابۂ کرام نے عرض کیا: جب ہم ایسا کرلیں تو ہمیں اس کا صلہ کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت-صحابہ نے کہا: یہ نفع بخش بیعت ہے-ہم اس بیعت کو نہ توڑیں گے اور نہ توڑنے کا مطالبہ کریں گے-اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی-(۵)

چشم بصیرت سے آیات مذکورہ کوبغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صوفیۂ کرام نے جو بیعت کی طرح ڈالی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ حکم قرآن کے عین مطابق اور سنت نبی واتباع رسول پر مبنی ہے-

بیعت تقویٰ کی ابتداوارتقا

کتب احادیث وآثار میں بیعت سے متعلق جتنی حدیثیں مذکور ہیں سب کا مطالعہ اس نتیجے پر لاتا ہے کہ عہد صحابہ میں رائج بیعتیں حسب ذیل اقسام پر مشتمل تھیں:

(۱) بیعت تقویٰ (۲) بیعت اسلام (۳) بیعت ہجرت (۴) بیعت امارت (۵) بیعت جہاد-آج مشائخ اسلام وصوفیۂ کرام کے یہاں جوطریقۂ بیعت رائج ہے اسے بیعت تقوی یا بیعت توبہ کہتے ہیں-اس کی ابتداوارتقا کی کیفیت جاننے کے لیے صحابی رسول حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا تاریخی بیان ملاحظہ کریں:

عن عبادۃ ابن الصامت رضی اللہ عنہ قال: کنت ممن حضر العقبۃ الاولی وکنا اثنی عشر رجلافبایعنا رسول اللہ ﷺ علی بیعۃ النساء وذلک قبل أن یفرض الحرب علی أن لاتشرک باللہ ولاتسرق ولاتزنی ولا تقتل أولاد نا ولاتاتی ببھتان تفترینہ بین أیدینا وأرجلنا ولاتعصیہ فی معروف وقال فان وفیتم فلکم الجنۃ -(٦)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ان لوگوں میں سے ہوں جوعقبۂ اولی کے موقع پر حاضر تھے- ہم سب بارہ مرد تھے- رسول اللہ ﷺ سے ہم لوگوں نے عورتوں والی بیعت کی- یہ بیعت جہادفرض ہونے سے پہلے ہوئی- بیعت اس پر ہوئی کہ اللہ کے ساتھ شرک نہیں کریں گے، چوری، زنانہیں کریں گے، اپنی اولادکوقتل نہ کریں گے، ہاتھ پیر کے درمیان کے معاملے میں کسی پرالزام نہیں لگائیں گے، بھلے احکام میں نافرمانی نہیں کریں گے-حضور ﷺ نے فرمایا: اگرتم نے وعدہ پوراکیا تو تمہارے لیے جنت ہے-

حدیث مذکورکوکچھ فرق کلمات کے ساتھ حسب ذیل ائمہ کرام نے اپنی اپنی کتابوں میں تخریج فرمائی ہے-

امام مسلم-

امام ابوداؤد-

امام ترمذی-

خلاصۂ حدیث

یہ بیعت عقبۂ اولی کے موقع پر ہوئی یعنی قبل ہجرت اوراعلان نبوت کے بارہویں سال-

یہ بیعت حکم جہاد کے نزول سے پہلے ہوئی-

اس موقع پر بارہ مرد حاضر بارگاہ تھے-

یہ بیعت مکہ مکرمہ میں ہوئی-اس طرح کی بیعت کوصحابہ کی زبان میں بیعۃ النساء (عورتوں والی بیعت) کہا جاتا تھا-

بیعت النساء سے مراد وہی بیعت توبہ یا بیعت تقویٰ ہے،جس کا ذکر قرآن شریف کے

سورہ ممتحنہ میں ہوا ہے- بیعت عقبہ کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا اور عام رواج کی شکل اختیار کرگیا- چنانچہ متعدد صحابہ کرام کی بیعت کا تذکرہ حدیث میں مذکور ہے، مثلاً:

عن جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ قال بایعت رسول اللہ ﷺعلی اقامۃ الصلوۃ وایتاء الزکوۃ والنصح لکل مسلم.(۷)

حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے اقامت صلوۃ، ادائیگی زکوۃ اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کرنے پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی-

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کنا نبایع رسول اللہ ﷺعلی السمع والطاعۃ فیقول لنا فیما استطعتم.(۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ اس بات پر بیعت کیا کرتے تھے کہ ہم آپ کی ہر بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے- آپ فرماتے تھے کہ جہاں تک تم سے ممکن ہو-

عن عطیۃ رضی اللہ عنہا قالت بایعنا النبی ﷺفقرأ علی أن لا یشرکن باللہ شیئا ونہانا عن النیاحۃ. (۹)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہم لوگوں نے نبی ﷺ سے بیعت کی تو آپ نے سورہ ممتحنہ کی آیت لایشرکن باللہ شیئا کی تلاوت فرمائی اور ہم لوگوں کو نوحہ خوانی سے منع فرمایا-

الفاظ بیعت میں فرق

حضور ﷺکی بعثت کا مقصد قرآن مقدس میں یوں بیان کیا گیا:

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیہم رسولا من انفسہم یتلوعلیہم آیاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ -(۱۰)

آپ ﷺ کے فرائض منصبی کی فہرست میں آیات الٰہیہ کی تلاوت، تزکیۂ نفوس، تطہیر باطن اور تعلیم کتاب وحکمت جیسے بنیادی مسائل خصوصی توجہ کے مستحق تھے- ان ہی کے ذریعے معاشرتی، سماجی، معاشی، سیاسی، انفرادی، اجتماعی احوال کی اصلاح فرما کر ایک صالح نظام برپا کرنا تھا- ظلم و تعدی کو مٹانا، امن وسکون کا ماحول پیدا کرنا، انسانی اقدار کو پروان چڑھانا اور حیوانی شعور وادراک ختم کر کے ربانی علم وآگہی کی دولت سے افراد انسانی کو فیض یاب کرنا تھا- اس لیے نبوی نگاہ شعبۂ انسانی کے ہر پہلو و ہر گوشہ پر برابر لگی رہتی تھی- جب جہاں جیسی ضرورت محسوس ہوئی وہاں اسی کے مطابق احکام وفرمودات جاری ہوئے اور تقاضے واحوال کے پیش نظر عملی تحریک کی گئی-

مذکورہ احادیث پر نظر ڈالیں تو بیعت کے الفاظ میں یکسانیت نہیں ملے گی- کبھی شرک،

چوری، زنا، ناحق قتل، الزام تراشی، احکام کی نافرمانی سے بچنے پر بیعت لے گئی، کبھی اقامت نماز، ادائیگی زکوۃ اور مسلمانوں کی خیر خواہی پر بیعت لی گئی، کبھی اطاعت وفرماں برداری اور نوحہ خوانی سے احتراز پر بیعت لی گئی- یہ اختلاف صرف اور صرف اس وجہ سے تھا کہ بیعت ہونے والوں کی ضرورتوں میں اختلاف تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

قال القرطبی کانت مبایعۃ النبی ﷺلاصحابہ بحسب مایحتاج الیہ من تجدید عہد او توکید فلذٰلک اختلف الفاظہم -(۱۱)

علامہ قرطبی نے فرمایا رسول اللہ ﷺکی اپنے اصحاب سے بیعت ان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی تھی، اس کا تعلق تجدید عہد یا کسی کام کی تاکید سے ہوتا تھا، اسی لیے الفاظ بیعت میں اختلاف تھا-

تجدید بیعت

بیعت، عہد ووعدہ ہے جس کی تکرار، جسے بار بار دہرانا، یاد دہانی کرانا، معاہدہ میں توانائی پیدا کرتا ہے- ممکن ہے کہ پہلی مرتبہ بیعت کے بعد کچھ دنوں تک وعدہ نبھانے کا ذوق وشوق کامل طور پر تھا لیکن رفتہ رفتہ سستی پیدا ہونے لگی تو دوسری بیعت اس کو ازسرنو تازہ دم کردے گی اور آدمی پھر عہد کی پابندی میں ہمہ تن مشغول ہوجائے گا- روحانی بالیدگی میں اگر کچھ کمی آنے لگی تھی تو دوبارہ نئ قوت پا کر پروان چڑھنے لگے گی- آئینۂ قلب پر اگر گناہوں کی کثافت جم گئی تھی تو دوسری بیعت ان کثافتوں کو دور کر کے شفافیت پیدا کردے گی- اسی بنیاد پر مشائخ صوفیہ تجدید بیعت کے قائل ہیں-

سرکار دوعالم ﷺکی نگاہ نبوت اور صحابہ کرام کی نگاہ عشق ومحبت میں تجدید بیعت کی کتنی اہمیت تھی اسے ملاحظہ کریں:

عن عوف بن مالک الاشجعی قال کنا عند النبی ﷺسبعۃ اوثمانیۃ او تسعۃ فقال ألاتبایعون رسول اللہ ﷺفبسطنا أیدینا فقال قائل: یا رسول اللہ ﷺ انا قد بایعناک، فعلی مانبایعک قال ان تعبدوا اللہ ولاتشرکوا بہ شیئا وتقیموا الصلوۃ الخمس وتسمعوا وتطیعوا وأسرّ کلمۃ خفیۃ: و لاتسئلوا الناس شیئا-(۱۲)

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سات یا آٹھ یا نو آدمی رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر تھے- سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہ کرو گے؟ تو ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھایا- ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! ہم لوگ تو بیعت کر چکے ہیں، اب کس بات پر بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا اس بات پر کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے، اس

کے ساتھ شرک نہ کرو گے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرو گے، احکام سنو گے اور اطاعت کرو گے اور آہستہ سے فرمایا: کسی سے کچھ مانگنا نہیں-

عن سلمة قال بايعته اول الناس، ثم بايع وبايع حتى اذا كان وسط قال: بايع ياسلمة قلت: بايعتک، قال: وايضاء فبايعته، ثم بايع حتى اذاكان خرج الناس قال: الاتبايعنى ياسلمة، قلت: يا رسول الله بايعتک فى اول الناس وفى وسط الناس قال: وايضاء فبايعته الثالثة.(۱۳)

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سب سے پہلے بیعت کی پھر آپ نے بیعت کی، جب آدھے لوگوں کی بیعت ہو چکی تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! بیعت کرلو، عرض کیا، حضور! بیعت کر لی ہے، فرمایا: پھر کرلو: تو میں نے پھر بیعت کی، جب لوگ نکلنے لگے تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! کیا مجھ سے بیعت نہ کرو گے؟ میں نے عرض کی: حضور سب سے پہلے میں نے بیعت کی پھر درمیان میں بیعت کی، آپ نے فرمایا پھر کرلو، تو تیسری مرتبہ پھر بیعت کی-

بچوں کی بیعت

بیعت چوں کہ ایک طرح سے اطاعت الٰہی، اتباع رسول کا معاہدہ اور روحانی منازل طے کرنے کا عہد و پیمان ہے اور بچے غیر شعوری مرحلے میں ہونے کے باعث تکالیف شرعیہ کے مکلّف نہیں اور کسی مسئلہ یا عمل کا وعدہ کر لینا اور اسے پورا کرنا ضروری ہے-

واوفوا با لعهد ان العهد كان مسئولا. (۱۴)

اور وعدہ وفا کرو، کیوں کہ وعدے کے بارے میں پوچھ ہوگی-

اسی سبب سے رسول کریم ﷺ نے احکام شرعیہ سے جن جن لوگوں کو جدا رکھا اور جن کی گردن پر کسی شرعی حکم کا بوجھ نہیں ڈالا ان میں بچے بھی شامل ہیں- بایں سبب سرکار دو عالم بچوں سے بیعت نہیں لیتے تھے- ہاں جب سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں بچے لائے جاتے تو انھیں دعاؤں سے فیض یاب فرماتے-

عن ابى عقيل زهرة بن معبد عن جده عبد الله بن هشام وكان قد أدرک النبى ﷺ وذهبت به امه زينب بنت حميد الى رسول الله ﷺ فقالت: يا رسول الله بايعه فقال النبى ﷺ هو صغير فمسح راسه ودعاله. (۱۵)

زہرہ بن معبد اپنے دادا عبداللہ بن ہشام سے روایت کرتے ہیں- حضرت عبداللہ بن ہشام نے رسول کریم ﷺ کا زمانہ پایا تھا- ان کی والدہ زینب انہیں بارگاہ اقدس میں لے کر حاضر

ہوئیں، عرض کی: یارسول اللہ اس کی بیعت کر لیجئے- سرکار اقدس نے فرمایا: یہ بچہ ہے، پھر ان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور دعا سے نوازا-

ماشاء اللہ کتنا اچھا رواج تھا بیعت تقویٰ کا- صحابہ وصحابیات بیعت کے لیے اپنے بچوں کو بارگاہ اقدس میں لے کر حاضر ہوتیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بچے خود ہی سرکار اقدس میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست پیش کرتے-

عن الهرماس بن زياد قال مددت يدى الى النبى ﷺ وأنا غلام يبايعنى فلم يبايعنى.(۱۶)

حضرت ہرماس بن زیاد نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی طرف بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس وقت میں بچہ تھا تو آپ نے مجھے بیعت نہیں کیا-

بچے والدین کے لیے رب کی طرف سے امانت ہوتے ہیں- ان کی اچھی پرورش، تربیت و تعلیم کا انتظام، ان کے اندر اسلامی سیرت و کردار اور دینی مزاج پیدا کرنے کے لیے ابتدا ہی سے عبادت و ریاضت اور شریعت کی پابندی کی عادت ڈالنا والدین کی ذمہ داری ہے-

عن عمرو بن شعيب عن ابيه عن جده قال قال رسول الله ﷺ: مروا اولادكم بالصلوة وهم ابناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم ابناء عشر سنين وفرقوا بينهم فى المضاجع .(۱۷)

اس کی کیا وجہ ہے؟ صرف اور صرف یہ کہ نماز ان کی عادت بن جائے تا کہ جب حد بلوغ کو پہنچیں تو ان کے اندر عبادت کا شوق و جذبہ موجود رہے- اسی طرح دوسرے دینی امور کی پابندی کا بھی شوق پیدا کرنے کے لیے ان کے جذبات کو صحیح سمت دینے کی ضرورت پڑتی ہے- اسی وجہ سے مشائخ نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیعت کیا تا کہ اطاعت الٰہی کی تشویق و ترغیب ہو اور بچے ابتدا ہی سے اولیائے کرام و صوفیۂ اسلام کے طرز زندگی کو اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں- سرکار دو عالم ﷺ نے اسی شوق و ترغیب کو پیدا کرنے کے لیے بچوں کی بیعت لی ہے-

عن هشام بن عروة عن ابيه أن عبد الله بن الزبير وعبد الله بن جعفر بايعا النبى ﷺ وهما ابن سبع سنين (يقال اوثمان سنين) و ان رسول الله ﷺ لمارآهما تبسم وبسط يده فبايعهما.(۱۸)

حضرت ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن جعفر نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی اور وہ دونوں سات سال کے تھے- ایک قول یہ ہے کہ آٹھ برس کے تھے- رسول کریم ﷺ نے جب ان دونوں کو دیکھا تو مسکرائے، ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو بیعت کیا-

بیعت مع مصافحہ

مرشد کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیعت کرنا، یہ تو قرآن کریم سے ثابت ہے اور بیعت مع مصافحہ صرف اور صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ حضور ﷺ نے بیعت لیتے وقت کبھی کسی عورت سے مصافحہ نہیں کیا بلکہ ان کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔

عن عائشة الصديقة رضی الله عنها قالت: كان النبی ﷺ يبايع النساء بالكلام لهذه الآية لاتشركوا بالله شيئا ما مست يد رسول الله ﷺ يد إمرأة إلاإمراة يملكها . (۱۹)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ عورتوں سے آیت **لاتشركوا بالله شيئا** پڑھوا کر بیعت لیتے تھے۔ آپ ﷺ کے دست پاک نے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا سوائے ان عورتوں کے جو آپ کے تصرف میں تھیں۔

لیکن مردوں کو بیعت کے وقت محسوس اتصال یعنی مصافحہ کے ذریعے جو فیض ملتا تھا اس سے عورتوں کو بھی محروم نہیں رکھا بلکہ انہیں بھی اسی طرح فیض پہنچایا گیا لیکن تھوڑی صورت بدلی ہوئی تھی۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

اختلفوا فی كيفية المبايعة فقالوا كان يبايعهن وبين ايديهن ثوب. (۲۰)

علمائے کرام نے بیعت کے طریقۂ کار میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو آپ کے دست مبارک اور ان کے ہاتھوں کے درمیان کپڑا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا طریقہ یہ تھا:

دعا بقدح من ماء فغمس يده فيه ثم غمسن ايديهن فيه. (۲۱)

آپ نے ایک پیالہ پانی منگایا، اس میں دست اقدس ڈالا پھر عورتوں نے اپنا ہاتھ اس میں ڈالا۔ معلوم ہوا کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت کپڑا کا واسطہ لینا یا پانی میں ہاتھ ڈال کر ان کے حوالے کر دینا تا کہ وہ اپنا ہاتھ اس میں ڈالیں یہ سنت ہے جب کہ مردوں کے لیے بیعت مع مصافحہ سنت ہے۔ غیر مقلد عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری لکھتے ہیں:

اعلم ان السنة ان تكون بيعة الرجال بالمصافحة . (۲۲) جان لو کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ مردوں کی بیعت بطریق مصافحہ ہو۔

اجازت بیعت

بیعت تقویٰ کا تعلق پوری نوع انسانی سے ہے۔ اس سے حاصل ہونے والے فوائد کسی خاص دور کے انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ توبہ وانابت، روحانی بالیدگی، اتباع شریعت کا پختہ

ارادہ، اس ارادے کو عملی شکل دینا، کسی مرد صالح سے اپنے لیے دعا کرانا اور اس کے زیر نگرانی روحانی تربیت حاصل کرنا وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر شخص سے مطلوب ہیں۔ اس لیے بیعت تقویٰ نہ تو کسی دور کے ساتھ خاص ہوئی اور نہ ہی کسی شخصیت کے ساتھ مخصوص۔ یہ وہ بیعت ہے جسے ہر زمانہ اور ہر دور میں جاری رہنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس سنت کو باقی رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے دوسرے کو بیعت لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

عن ام عطية رضی الله عنها قالت: لما قدم رسول الله ﷺ جمع نساء الانصار فی بيت ثم أرسل الينا عمر بن الخطاب فقام على الباب وسلم علينا فرددن أو فرددنا قال: انا رسول رسول الله ﷺ اليكن قالت: فقلنا مرحبا برسول رسول الله، فقال: تبايعن على ان لا تشركن بالله ولاتسرقن ولاتزنين قالت: فقلنا: نعم! قالت: مد يده خارج الباب او البيت ومددنا ايدينا من داخل البيت ثم قال اللهم اشهد. (۲۳)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا اور ان کے پاس حضرت فاروق اعظم کو بھیجا۔ حضرت عمر دروازے پر آئے اور ہم لوگوں کو سلام کیا۔ ہم نے جواب دیا۔ انھوں نے کہا: میں تم لوگوں کے پاس رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ حضرت ام عطیہ نے کہا تو ہم لوگوں نے کہا رسول اللہ کے نمائندے خوش آمدید! حضرت عمر نے کہا: تم لوگ بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگی، چوری نہ کروگی، زنا نہ کروگی۔ ہم لوگوں نے کہا ہاں! حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں حضرت عمر نے گھر یا دروازے کے باہر ہاتھ بڑھایا اور ہم لوگوں نے گھر کے اندر سے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اے اللہ تو گواہ رہ۔

خلاصۂ حدیث

(۱) بیعت کے لیے کسی جگہ لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے۔

(۲) بیعت کے لیے لوگوں کو ترغیب دینا سنت ہے۔

(۳) بیعت لینے کے لیے کسی صاحب صلاحیت شخص کو اجازت (خلافت) دینا سنت ہے۔

(۴) بیعت کے بعد دعا فرمانا سنت ہے۔

(۵) بیعت لینے سے پہلے اپنے اجازت دینے والے (یعنی سلسلہ) کے نام کی صراحت کر دینا سنت ہے۔

(۶) بیعت لیتے وقت عورتوں کا باپردہ ہونا ضروری ہے۔

راقم الحروف نے بیعت کی متعدد مجالس میں شرکت کی، کہیں کہیں دیکھا کہ مجمع کثیر ہے، سیکڑوں افراد فروکش ہیں اور شیخ طریقت بیعت لے رہے ہیں لیکن شیخ کی آواز نہیں پہنچ پا رہی ہے- اس کے لیے یہ انتظام دیکھا کہ کوئی بلند شخص کھڑا ہو کر شیخ کے الفاظ کو زور زور سے چلا کر لوگوں تک پہنچا رہا ہے اور لوگ سن کر ان کلمات کو دہرا رہے ہیں- یہ انداز بیعت بھی سنت رسول سے ثابت ہے- آیئے اس سلسلے میں حضرت امام رازی کی ایک عبارت ملاحظہ کریں:

ان النبی ﷺ لما فرغ یوم الفتح من بیعة الرجال اخذ فی بیعة النساء وھو علی الصفا وعمر اسفل منه یبایع النساء بامر رسول الله ﷺ ویبلغن عنه — (۲۴)

رسول کریم ﷺ فتح مکہ کے دن جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کی بیعت شروع فرمائی- آپ صفا کی بلندی پر تھے اور حضرت عمر ان سے نیچے تھے اور حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عورتوں سے بیعت لے رہے تھے اور حضور کی جانب سے بیعت کے الفاظ پہنچا رہے تھے-

بیعت تقویٰ یا بیعت توبہ کے تعلق سے بارہ حدیثیں پیش کی گئیں- انصاف کی نظر سے کام لیا جائے تو مروجہ بیعت واجازت کی اہمیت ومقام اور شرعی حیثیت اظہر من الشمس ہو کر سامنے آجائے گی اور اگر ذہن کسی خارجی دباؤ کا شکار نہ ہوگا تو ضرور بیعت تقویٰ کو مسنون ومقبول اور محبوب ومرغوب تصور کرے گا اور اس کے ضمیر کی آواز ہوگی کہ

بیعت تقوی

روحانی بالیدگی کا ذریعہ ہے-
ایمان کی پختگی واسلامی استحکام کا وسیلہ ہے-
ارکان اسلام کی پابندی اور توبہ وانابت بجالانے کا سبب ہے-
پچھلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ احتراز معصیت کا پرعزم عہد ہے-
کسی مرد صالح کو گواہ بنا کر ارتکاب کبائر وصغائر سے پختہ توبہ کرنا ہے-
وابتغوا الیه الوسیلة کی عملی قبولیت کا آئینہ ہے-
کونوا مع الصادقین کی فعلی تعبیر ہے-
اطاعت رسول کا مظہر جمیل ہے-
ادائے صحابہ کرام کی پیروی ہے-
بزرگان سلف وخلف کو اپنا رہنما وامیر بنانا ہے-
عین اتباع شریعت ہے، نہ بدعت وضلالت-
اور اللہ والوں کے ذریعے تقرب الٰہی پانے کی راہ ہے-

حوالہ جات

۱-قرآن کریم، ممتحنۃ:۱۱
۲-قرآن کریم، فتح:۱۷
۳-قرآن کریم، فتح:۱۷
۴-قرآن کریم، توبہ:۱۱۱
۵-تفسیر کبیر جلد ۴ر ص:۵۰۶
۶-بخاری شریف جلد ۲، ص:۱۰۶۹
۷-بخاری شریف جلد اول ص:۱۳
۸-سنن ترمذی جلد اول ص:۲۰۵
۹-بخاری جلد ۲ر ص:۱۰۷۱
۱۰-قرآن مقدس، آل عمران:۱۶۴
۱۱-فتح الباری جلد اول ص:۱۳۵-۱۳۹
۱۲-سنن ابن ماجہ ص:۲۸۱
۱۳-صحیح مسلم جلد دوم ص:۱۱۳
۱۴-قرآن شریف، بنی اسرائیل:۳۴
۱۵-بخاری شریف جلد ۲ ص:۱۰۷۰
۱۶-سنن نسائی جلد ۲، ۱۸۳
۱۷-مشکوٰۃ شریف، ص:۵۸
۱۸-مستدرک حاکم، جلد:۳، ص:۵۹۷
۱۹-فتح الباری، جلد ۷، ص:۱۹۵
۲۰-تفسیر رازی سورہ ممتحنۃ ص:۱۹۳
۲۱-تفسیر رازی سورہ ممتحنۃ، ص:۱۹۳
۲۲-تحفۃ الاحوذی جلد ۲، ص:۳۵۹
۲۳-تفسیر ابن کثیر جلد ۳، ص:۴۸۹
۲۴-تفسیر رازی سورہ ممتحنۃ، ص:۱۹۲

○○○

حضرت جنید بغدادی: علمی تبحر اور روحانی مشاغل

علم کی تین قسمیں ہیں، علم من اللہ، جسے شریعت کہا جاتا ہے اور علم مع اللہ وہ علم مقامات و درجات اولیا اور علم طریق حق ہے اور علم باللہ۔ اسی کو علم معرفت کہا جاتا ہے۔ وہ اولیا جن کو ان تینوں علوم سے حظ وافر ملا ہے ان میں سے ایک سید الطائفہ ابوالقاسم حضرت جنید بن محمد زجاج قواریری بغدادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے آباواجداد کا تعلق نہاوند سے ہے اور آپ کی جائے ولادت اور نشوونما بغداد میں ہوئی۔

حضرت جنید بغدادی جس طرح طریقت کے امام الائمہ ہیں اسی طرح آپ شریعت کے بھی امام ہیں۔ آپ نے حضرت امام شافعی کے شاگرد حضرت ابوثور سے فقہ میں تلمذ حاصل کیا اور انہیں کے مذہب کے مطابق ان کی موجودگی میں بیس سال کی عمر میں فتویٰ دینا شروع کیا۔ (۱)

حضرت جنید بغدادی اپنے ماموں حضرت سری سقطی، حارث محاسبی اور محمد بن علی قصاب علیہ الرحمہ کے علوم سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی ذات علما کے لیے زینت تھی، اس لیے آپ کے معاصرین آپ کو ''طاؤس العلما'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ (۲) آپ کے ماموں اور پیرو مرشد حضرت سری سقطی بھی عظمت وطریقت میں آپ کی امامت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت سری سقطی سے پوچھا کہ کیا کوئی مرید اپنے پیر سے بلند مرتبہ ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اور اس کا ثبوت ظاہر ہے کہ حضرت جنید کا درجہ میرے درجے سے بلند ہے۔ (۳)

صاحب اقتباس الانوار لکھتے ہیں کہ آپ بالاتفاق مشائخ کے مقتدا اور پیشوا ہیں۔ **الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ۔** (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں۔) گویا محض آپ کی شان میں وارد ہوئی ہے۔ (۴)

حضرت عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی اپنے طبقات میں رقم طراز ہیں:

عراق کے آٹھ اوتاد ہیں: (۱) حضرت معروف کرخی (۲) امام احمد بن حنبل (۳) بشر حافی (۴) منصور بن عمار (۵) حضرت جنید (۶) سری سقطی (۷) سہل بن عبداللہ تستری (۸) اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (۵)

حضرت ابوعبداللہ بن خفیف فرماتے ہیں:

ہمارے شیوخ میں پانچ کی اقتدا کرو اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دو (۱) حارث بن اسد محاسبی (۲) جنید بن محمد (۳) ابومحمد رویم (۴) ابوالعباس بن عطا (۵) اور عمر بن عثمان مکی علیہم الرحمہ کیونکہ یہ لوگ علم اور حقائق دونوں کے جامع ہیں۔ (۶) طریقت کے میدان میں حضرت جنید بغدادی کو وہ نمایاں مقام حاصل ہے کہ صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش لاہوری آپ کے مسلک کے متعلق ایک مستقل فصل منعقد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جنیدی مسلک ومشرب تمام مذاہب میں سب سے زیادہ مشہور ومعروف ہے۔'' (۷)

تیسری صدی کو تصوف اور طریقت کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ عظیم ترین اور عہد ساز صوفیوں کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں صوفیہ کی خانقاہوں کا قیام بھی شروع ہوا۔ حضرت علامہ جامی کے ایک بیان کے مطابق صوفیہ کے سرخیل حضرت شیخ جنید بغدادی نے بھی اپنی خانقاہ قائم کی تھی۔ (۸) آپ کا سب سے بڑا کارنامہ غلو پسند صوفیہ کی بدعملی سے تصوف کی تطہیر اور تجدید ہے۔ اس طریق کی حفاظت کے لیے آپ نے عمل پر خوب زور دیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص معرفت کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: اہل معرفت ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ نیکی اور تقرب الیٰ اللہ کے لیے حرکت کرنا بند کر دیتے ہیں۔ (اس کی مراد یہ تھی کہ انہیں عمل کی ضرورت نہیں ہوتی) تو آپ نے فرمایا: یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اعمال کے ساقط ہو جانے کے قائل ہیں اور یہ میرے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اس بات کے قائل سے وہ شخص بہتر ہے جو چوری کرتا ہے اور زنا بھی، کیوں کہ عارفین باللہ نے اعمال کا حکم اللہ سے لیا ہے اور اعمال میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر میں ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں تب بھی ذرہ برابر بھی نیک اعمال کو ترک نہ کر سکوں گا مگر یہ کہ درمیان میں کوئی بات حائل ہو جائے۔ (۹)

آپ فرمایا کرتے تھے: مخلوق پر سارے راستے بند ہیں سوائے ان کے جو رسول ﷺ کے نقش قدم پر چلیں۔ (۱۰) آپ نے صوفیہ کا لباس یعنی خرقہ پہن کر بدعملی کا شکار ہونے والوں کی سخت مذمت فرمائی۔ حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات افضل الفوائد میں منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت جنید علیہ الرحمہ سے پوچھا گیا کہ خرقہ قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ فرمایا نہیں، پوچھا گیا کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ بہت سے خرقہ پوش ایسے ہیں جن سے افعالِ قبیحہ سرزد ہوتے ہیں اور قیامت کے

دن وہی خرقہ ان کا مدعی بنے گا، ایسے اشخاص دوزخ کے مستحق ہوں گے، محض خرقہ معتبر نہیں بلکہ خرقہ اس خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے جو اسے پہن کر اس کا حق ادا کرے، ایسے شخص کے خرقے کی عزت ہوتی ہے-(۱۱)

اور ایک موقع پر فرمایا: ہر روز ہمارے باطن میں یہ ندا کی جاتی ہے کہ **لیس الاعتبار بالخرقة انما الاعتبار بالحرقة.** یعنی خرقے کا کوئی اعتبار نہیں، صرف حرقہ یعنی عمل کا اعتبار ہے-(۱۲) آپ شریعت کا بے انتہا پاس ولحاظ کرتے تھے-آپ کا یہ قول مشہور ہے: ''**علمنا مشید بالکتاب والسنة**'' ہمارا علم کتاب وسنت سے مستحکم ہے-ہر وہ طریق جو کتاب وسنت کے خلاف ہو، مردود اور باطل ہے-(۱۳)

علمی تبحر

ایک علم کا تعلق قابلیت سے ہے اور ایک کا تعلق قبولیت سے-جس کا تعلق قبولیت سے ہوتا ہے وہ مقبول ہوتا ہے- اللہ تعالیٰ نے حضرت جنید بغدادی کے علم معرفت کو قبولیت عامہ عطا فرمایا-حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز علیہ الرحمۃ والرضوان نے فرمایا: حضرت جنید کے زمانے میں بہت سے مردان کامل تھے لیکن علم میں کوئی ان سے بڑھ کر نہ تھا(۱۴) اور حضرت امام شعرانی نے فرمایا: حضرت جنید علم میں قطب تھے، جبکہ سہیل تستری مقام میں قطب تھے اور حضرت بایزید حال میں قطب تھے-(۱۵) اگر کوئی مخالفت کی نیت سے ایک مرتبہ بھی آپ کی مجلس میں جاتا تو آپ کے علمی تبحر کا اعتراف کیے بغیر نہیں لوٹتا تھا-

رسالہ قشیریہ میں منقول ہے کہ: عبداللہ بن سعید بن کلاب سے کہا گیا کہ تم ہر شخص کے کلام پر جرح کیا کرتے ہو اور یہاں جنید نامی ایک شخص ہے کیا تم اس پر بھی اعتراض کر سکتے ہو یا نہیں؟ چناں چہ وہ آپ کے حلقہ میں حاضر ہوا اور حضرت جنید سے توحید کے تعلق سے سوال کیا تو انھوں نے ایسا جواب دیا کہ عبداللہ حیران ہو گئے اور کلام کے دہرانے کی درخواست کی تو حضرت جنید نے عبارت بدل کر بات دہرائی- اس پر عبداللہ نے کہا یہ تو کوئی اور ہی بات ہے جو مجھے نہیں آتی- ذرا پھر دہرائیے انھوں نے اسی بات کو دوسری عبارت میں دہرایا-عبداللہ نے کہا: آپ نے جو فرمایا مجھے یاد رکھنا ممکن نہیں، مجھے لکھ دیجیے تو حضرت جنید نے فرمایا: اگر آپ سلوک کا راستہ طے کر چکے ہو تو میں لکھ دیتا ہوں- اس پر عبداللہ کھڑے ہو گئے اور آپ کی فضیلت اور آپ کی شان بلند کا اعتراف کیا-(۱۶)

آپ کی فکر بچپن ہی سے علمی تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت جنید علیہ الرحمہ خود فرماتے ہیں: میں ابھی سات سال کا تھا اور سری سقطی علیہ الرحمہ کے سامنے کھیل رہا تھا، اس

وقت ان کے سامنے ایک جماعت شکر کے متعلق گفتگو کر رہی تھی تو آپ نے مجھ سے پوچھا شکر کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا؟: **ألا تعصی الله بنعمه** ـ تو اللہ کے احسان کے بدلے میں اس کی نافرمانی نہ کرے- اس پر حضرت سری علیہ الرحمہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عن قریب تجھے زبان عطا کرے گا-(۱۷)

حضرت جنید بغدادی کی علمی شان کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہ عنایت آپ کے شامل حال تھی، آپ علم سے مزین ہونے کے باوجود ابتدا میں وعظ نہیں کرتے تھے- آپ کا خود بیان ہے کہ حضرت سری علیہ الرحمہ لوگوں کو وعظ کرنے کا حکم کرتے تھے، میں وعظ کرنے میں جھجھک محسوس کرتا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھتا تھا- میں نے ایک جمعہ کی رات حضور نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: لوگوں کو وعظ کرو، میں اٹھ کر صبح ہونے سے پہلے ہی حضرت سری کے دروازے پر آیا اور دستک دی- انھوں نے کہا تم نے ہماری بات نہیں مانی، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے تجھ سے فرمایا- دوسرے دن حضرت جنید جامع مسجد میں لوگوں کو وعظ کرنے کے لیے بیٹھے، لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ جنید لوگوں کو وعظ فرمانے لگے ہیں، تو ایک عیسائی لڑکا بھیس بدل کر اٹھا اور آپ سے عرض کی: اے شیخ! رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے کیا معنیٰ ہیں؟: **اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله** (مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے-) تو حضرت جنید نے اپنے سر کو جھکایا، پھر اپنے سر کو اٹھا کر فرمایا: تو مسلمان ہو جا؛ کیوں کہ تیرے اسلام لانے کا وقت آ گیا ہے- وہ لڑکا مسلمان ہو گیا-(۱۸)

آپ کی مجلس میں شرکت کی برکت سے اہل علم کے علوم ترقی پاتے تھے، جیسا کہ ابوالحسین علی بن ابراہیم الحداد کا بیان ہے کہ میں قاضی ابوالعباس بن شُریح کی مجلس میں گیا تو انہوں نے اصول اور فروع کے متعلق ایسی عمدہ تقریر کی کہ مجھے اس سے بہت تعجب ہوا- جب انہوں نے میرے اس تعجب کو دیکھا تو کہا تجھے معلوم ہے کہ یہ علم میں نے کہاں سے حاصل کیا؟ میں نے کہا: آپ ہی فرما دیں تو انھوں نے کہا: یہ ابوالقاسم جنید کی مجلس میں بیٹھنے کی برکت ہے-(۱۹)

آپ نے جس جامعیت کے ساتھ تصوف اور صوفی کی تعریف کی ہے، یہ آپ کے علمی تبحر کی دلیل ہے، جیسا کہ کشف المحجوب میں یہ روایت ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے:(۱) سخاوت (۲) رضا (۳) صبر (۴) اشارہ (۵) غربت، یعنی اجنبی بن کر رہنا (۶) گدڑی (۷) سیاحت (۸) اور فقر- یہ آٹھ خصلتیں آٹھ انبیا کی اقتدا ہے- سخاوت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی؛ کیوں کہ آپ نے فرزند کو فدا کیا،

رضا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی؛ کیوں کہ بوقت ذبح اپنی جان عزیز کو بارگاہ خداوندی میں اپنی
رضا سے پیش کر دیا، صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی؛ کہ آپ رب کی طرف سے آئی ہوئی
ابتلا و آزمائش پر ثابت قدم رہے اور اشارہ حضرت زکریا علیہ السلام کی؛ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: **ان لاتکلم الناس ثلثۃ ایام الا رمزا.** آپ نے تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ فرمایا-
اسی سلسلے میں ارشاد ہے: **اذنادیٰ ربہ نداء خفیا.** (انھوں نے اپنے رب کو آہستہ پکارا-) اور
غربت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی؛ کہ وہ اپنے وطن میں مسافروں کی مانند رہے اور خاندان میں
رہتے ہوئے اپنوں سے بیگانہ رہے اور سیاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی؛ کہ آپ نے یکا و تنہا مجرد
زندگی گزاری اور سوائے ایک پیالہ و کنگھی کے کچھ پاس نہ رکھا- جب انھوں نے دیکھا کہ کسی نے
اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی پیا ہے تو انھوں نے پیالہ بھی توڑ دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں
سے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے تو کنگھی بھی توڑ دی؛ اور گدڑی یعنی صوف کا لباس حضرت موسیٰ علیہ
السلام کی؛ کہ انھوں نے پشمینی کپڑے پہنے اور فقر سید عالم رحمۃ للعالمین ﷺ کی جنھیں روئے
زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عنایت فرمادی گئی تھیں اور ارشاد ہوا کہ آپ خود کو مشقت میں نہ
ڈالیں بلکہ اپنے ان خزانوں کا استعمال کریں اور آرائش اختیار فرمائیں؛ لیکن بارگاہ الٰہی میں آپ
نے عرض کی: اے خدا! اس کی حاجت نہیں ہے، میری خواہش یہ ہے کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں
تو دو روز فاقہ کروں-(۲۰)

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: صوفی زمین کی مانند
ہے جسے نیک و بد ہر ایک روندتا ہے اور وہ ابر کی مانند ہے کہ ہر ایک پر سایہ فگن ہوتا ہے اور بارش کی
طرح ہے کہ ہر ایک کو سیراب کرتا ہے-(۲۱)

آپ نے قرب نوافل والی حدیث شریف سے استدلال کرتے ہوئے محبت کی تعریف
ایک نئے انداز میں کی ہے- صاحب عوارف المعارف رقم طراز ہیں: حضرت جنید بغدادی رحمۃ
اللہ علیہ سے محبت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ عاشق کا اپنی صفات ترک
کر کے محبوب کی صفات کو قبول کر لینا محبت ہے اور اللہ تعالیٰ کے (حدیث قدسی میں) اس ارشاد کا
یہی مفہوم و مطلب ہے **فاذا احببتہ کنت لہ سمعاً و بصراً.** (جب میں اس سے محبت کرتا ہوں
تو اس کی سماعت و بینائی بن جاتا ہوں-)(۲۲)

ہر ایک کی تمنا ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ رب سے کتنا قریب ہے- حضرت جنید
بغدادی نے اس کا بہترین معیار اپنے اس قول سے مقرر فرمایا: اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں سے
اتنا ہی قریب ہوتا ہے جتنا وہ بندوں کے دلوں کو اپنے سے قریب پاتا ہے اور تم یہ دیکھو کہ وہ

تمہارے دل سے کتنا قریب ہے-(۲۳)

کتاب اللہ کے اسرار و حقائق پر آپ کی گہری نظر تھی- قرآنی آیات سے آپ کے
استدلالات اس کی بین دلیل ہیں-

ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت ابوالعباس
بن عطا رحمہم اللہ ایک جگہ جمع تھے، قوال نے چند اشعار پڑھے، دونوں باہم وجد کرنے لگے اور
حضرت جنید ساکن بیٹھے رہے- وہ کہنے لگے اے شیخ! اس سماع میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے-
حضرت جنید نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول پڑھا: **تحسبہا جامدۃ وھی تمر مر السحاب.** (۲۴)
تم ان کو جامد اور ساکن خیال کرتے ہو حالاں کہ وہ گزرنے والے بادلوں کی مانند گزر جاتے
ہیں-) ابن شاہین نے حضرت جنید سے ''مع'' کے معنی دریافت کیے تو فرمایا: ''مع'' کے دو معنی
ہیں؛ انبیا کا ذکر ہو تو اس سے مراد مدد اور حفاظت ہے- اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اننی معکما اسمع واریٰ.** (طٰہٰ: ۴۶) بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں تمہاری باتیں سنتا ہوں اور تمہیں
دیکھتا ہوں- اگر عوام کا ذکر ہو تو اس سے علم اور احاطہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **مایکون من نجویٰ ثلاثۃ الا ھو رابعھم.** (المجادلہ: ۷) یعنی جو پوشیدہ باتیں تین آدمیوں میں ہوتی ہیں
تو اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں کو جانتا ہے-(۲۵)

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں حضرت سری سقطی کی
خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ایک شخص کو دیکھا جس پر غشی طاری ہے، میں نے عرض کی اسے کیا
ہوا؟ فرمایا: اس نے قرآن پاک کی ایک آیت سنی اور غشی طاری ہو گئی- میں نے کہا: اس پر وہی
آیت دوبارہ پڑھی جائے، جب آیت پڑھی گئی اسے افاقہ ہو گیا- حضرت یوسف علیہ السلام کی
قمیص کے سبب حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی بینائی متاثر ہوئی، پھر اسی سے بینائی
درست ہوئی- آپ نے اسے بہت پسند فرمایا-(۲۶)

لوگوں نے حضرت جنید قدس سرہ العزیز سے پوچھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں
کیا کہتے ہیں جس کے پاس دنیا کے مال میں سے صرف ایک پرانی کھجور کی مقدار چبانے کے لیے
رہ گیا ہو؟ فرمایا کہ مکاتب غلام ہی رہے گا، اگر چہ اس پر ایک درہم باقی رہے-(۲۷) حضرت جنید
بغدادی کے جو کچھ عالمانہ اور عارفانہ اقوال ہم تک پہنچے وہ کثیر ہونے کے باوجود قلیل ہیں- اس
لیے کہ آپ اسرار الٰہیہ کی حفاظت اور اخفا کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے، جیسا کہ مروی ہے کہ آپ
اکثر اپنے مرید حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے تھے کہ حجاب والوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا
عقدہ نہ کھولا کرو-(۲۸)

روحانی مشاغل

اہل اللہ کے سارے روحانی مشاغل اس حدیث کی تفسیر ہوا کرتے ہیں: **ان تعبد اللہ کأنک تراہٗ فان لم تکن تراہٗ فانہ یراک.** (تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تجھ سے یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور رکھ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے-)(۲۹)

اس حدیث شریف کے مطابق حضرت جنید بغدادی کی ساری زندگی اور آپ کے روحانی مشاغل؛ مراقبہ ومشاہدہ اور حضور وشہود پر مشتمل تھے- حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر ایسا زمانہ بھی گزرا کہ تمام زمین وآسمان والے میری پریشانی پر روتے تھے- پھر ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ ان کے مفقود ہونے پر میں روتا تھا، اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین وآسمان کی- صاحب کشف المحجوب فرماتے ہیں: یہ حضور حق کے متعلق بہترین اشارہ ہے-(۳۰) افضل الفوائد ملفوظات حضرت محبوب الٰہی کی روایت کے مطابق حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: دس سال میں بیابان میں پھرتا رہا اور دل کی نگہ داشت کرتا رہا، اب بیس سال سے مجھ کو کسی کی خبر نہیں، پھر کہا کہ بیس سال حق تعالیٰ جنید کی زبان سے بات کرتا رہا لیکن جنید کا بیچ میں کوئی دخل نہ تھا اور نہ ہی خدا کے سوا کسی کو اس بات کی خبر تھی-(۳۱)

آپ کے روحانی مشاغل میں سے ایک مشغلہ مراقبہ ہے، جیسا کہ صاحب کشف المحجوب نے فرمایا: باطن کا مراقبہ جنیدیوں کا امتیاز ہے-(۳۲)

حضرت جنید بغدادی مشاہدے کے کس عظیم مرتبے پر تھے، اس کا کشف المحجوب کی اس روایت سے پتا چلتا ہے: ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا حج کر کے آیا ہوں، آپ نے فرمایا حج کر لیا؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا جب تم اپنے مکان سے چلے، وطن سے کوچ کیا، کیا اس وقت تم نے گناہوں سے بھی کوچ کر لیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تم نے کوچ ہی نہ کیا، اس کے بعد فرمایا: جب تم گھر سے چلے اور ہر منزل میں رات کو قیام کیا تو کیا تم نے راہ حق کا قیام بھی طے کیا؟ اس نے کہا نہیں؟ آپ نے فرمایا: تم نے کوئی منزل طے نہیں کی، پھر فرمایا: جب تم نے میقات سے احرام باندھا تو کیا بشری صفات سے جدا ہو گئے تھے؟ جیسا کہ تم کپڑوں سے جدا ہوئے تھے- اس نے کہا نہیں، فرمایا: تو تم محرم بھی نہ ہوئے- پھر فرمایا: جب تم نے عرفات میں وقوف کیا تھا تو کیا مجاہدے کے لیے کشف میں بیٹھا تھا، اس نے کہا نہیں، فرمایا: تمہیں عرفات کا وقوف بھی میسر نہ آیا- پھر فرمایا: جب تم مزدلفہ میں اترے تھے اور تمہاری مراد برآئی تھی تو کیا تم نے تمام نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: بس تو مزدلفہ کا نزول بھی حاصل نہ ہوا، پھر فرمایا: جب تم نے خانۂ کعبہ کا

طواف کیا تھا تو کیا تم نے اپنے سر کی آنکھوں سے مقام تنزیہ میں حق تعالیٰ کے جمال کے لطائف کو بھی دیکھا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تو طواف بھی حاصل نہ ہوا، پھر فرمایا: جب تم نے صفا ومروہ کے درمیان سعی کی تھی تو صفا کا مقام اور مروہ کے درجے کا ادراک کیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: ابھی سعی بھی نصیب نہیں ہوئی، پھر فرمایا: جب منیٰ میں آئے تو کیا تمہاری ہستیاں تم سے جدا ہو گئیں تھیں؟ اس نے کہا، نہیں فرمایا: ابھی تم منیٰ بھی نہیں پہنچے، پھر فرمایا: جب قربان گاہ میں تم نے قربانی کی تھی اس وقت تم نے نفسانی خواہشوں کی بھی قربانی کی تھی؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: بس تو قربانی بھی نہیں ہوئی- پھر فرمایا جب تم نے جمرات پر سنگ ریزے پھینکے تھے اس وقت تمہارے ساتھ جو نفسانی تمنائیں تھیں کیا ان سب کو بھی پھینک دیا تھا- اس نے کہا نہیں، فرمایا: تم نے سنگ ریزے بھی نہیں پھینکے اور حج بھی نہیں کیا، جاؤ، ان صفات کے ساتھ پھر حج کرو تا کہ مقام ابراہیم علیہ السلام تک رسائی ہو-(۳۳)

حضرت جنید بغدادی کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا، خود ان کی زبانی سنیے:

کسی نے آپ سے پوچھا: آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟ تو آپ نے اپنے گھر کی سیڑھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اس سیڑھی کے نیچے اللہ کے سامنے تیس سال بیٹھے رہنے سے-(۳۴) آپ کی ساری زندگی مجاہدوں سے تعبیر ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا: ہم نے یہ علم تصوف قیل وقال کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترک دنیا اور ترک مالوفات اور مستحبات سے قطع تعلق کر کے پایا ہے-(۳۵) آپ نے اللہ تعالیٰ سے تقرب کے ہر قسم کے ذرائع کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا- عوارف المعارف کی روایت کے مطابق جہاں آپ صائم الدہر تھے وہیں آپ کے معمولات میں نوافل کی کثرت تھی، صاحب رسالہ قشیریہ اپنے استاذ ابو علی دقاق سے روایت کرتے ہیں کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ ہر روز اپنی دوکان پر آ کر پردہ لٹکا دیتے تھے اور چار سو رکعت ادا کر کے گھر کو لوٹتے تھے-(۳۶)

قیامت کے دن مصیبتوں کا ثواب کیا ہے؟ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو انسان نعمت کے ملنے سے بڑھ کر مصیبت کے آنے پر رب کا شکر ادا کرے گا، جیسا کہ بزرگوں کا معمول ہے - چناں چہ اسرار الاولیاء ملفوظات حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ میں منقول ہے کہ جب خواجہ جنید بغدادی قدس سرہ العزیز بخار، درد یا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہوتے تو شکرانے میں اس روز ہزار رکعت نماز ادا کرتے-(۳۷) بڑھاپے میں بھی آپ کے شوق وذوق اور عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا- صاحب کشف المحجوب روایت کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو اس بڑھاپے میں بھی جوانی کے کسی ورد کو نہ چھوڑا- لوگوں نے عرض کی شیخ! اب آپ بوڑھے ہو گئے، کمزور ہو گئے ہیں، ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجیے، انھوں نے فرمایا: یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کو ابتدا میں کر کے اس مرتبہ کو پایا ہے، اب یہ ناممکن ہے کہ انتہا پر پہنچ کر ان سے دستبردار ہو جاؤں-(۳۸)

جب آپ کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی گئی تو کسی نے عرض کی: باوجود اس قدر شرف وعظمت کے کیا آپ بھی اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ہاں! جس راستے سے ہم اللہ تک پہنچے ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔(۳۹) آپ کا دن جس طرح نمازوں سے معمور تھا، آپ کی راتیں بھی اللہ کے ذکر سے روشن تھیں۔صاحب افضل الفوائد نقل فرماتے ہیں کہ رات بھر اللہ اللہ کرتے اور یہ شعر پڑھتے تھے:

من لم یکن للوصال اھلا

فکل احسان لہ ذنوب

جو وصال کا اہل نہیں تو اس کی ہر نیکی گناہ ہے۔(۴۰)

آپ کا کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جو ذکر الٰہی سے خالی ہو، صاحب رسالہ قشیریہ روایت کرتے ہیں: حضرت جنید سے کہا گیا: لا الٰہ الا اللہ کہیے تو فرمایا: میں اسے بھولا نہیں ہوں کہ اسے یاد کروں اور کہا:

وحاضر فی القلب یعمرہ   لست انساہ فاذکرہ

فھو مولای ومعتمدی   ونصیبی منہ اوفرہ

(وہ تو دل میں حاضر ہے، جس سے دل آباد ہے، میں اسے بھولتا نہیں ہوں کہ یاد کروں۔ وہ میرا مولی اور میرا سہارا ہے اور مجھے اس سے وافر حصہ ملتا ہے۔(۴۱)

آپ عبادت کی طرح مخلوق کی دل جوئی وحاجت روائی کو بھی فرض سمجھتے تھے جیسا کہ صاحب اسرار الاولیا لکھتے ہیں: خواجہ جنید بغدادی قدس سرہ العزیز جب سجادے پر بیٹھ کر یاد حق میں مشغول ہوتے اور کوئی آجاتا تو چھوڑ کر باتیں کرنے لگتے اور باتوں ہی میں جس حاجت کے لیے آتا پوری کرتے، جب وہ واپس چلا جاتا تو آپ تلاوت میں مشغول ہوتے۔(۴۲) سماع بھی آپ کا روحانی مشغلہ تھا، اگرچہ زندگی کے آخری حصے میں اس کی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے ترک کر دیا۔حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے مطابق آپ نے سماع کو **طیب العیش مع اللہ** (اللہ کے ساتھ بہترین وقت گزارنا) قرار دیا۔(۴۳) حضرت امام شعرانی نقل فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا: فقرا پر تین مقامات میں رحمت کا نزول ہوتا ہے: سماع کے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف حق سے ہی سنتے ہیں اور صرف وجد سے ہی کھڑے ہوتے ہیں۔کھانا کھاتے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف فاقے سے ہی کھاتے ہیں اور علم کے مذاکرہ کے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف اولیاء اللہ کے احوال ہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔(۴۴)

صاحب عوارف المعارف لکھتے ہیں کہ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ پہلے تو آپ سماع سے رغبت رکھتے تھے (اب کیوں چھوڑ دیا) تو انہوں نے فرمایا: میں کس کے ساتھ سنتا تھا اور کن لوگوں سے

سنتا تھا؟ خود ہی فرمایا کہ ان کے اہل کے ساتھ سنتا تھا پھر جب ایسے لوگ ناپید ہو گئے تو چھوڑ دیا۔(۴۵)

آپ کے علمی مشاغل کا ایک حصہ تصنیف وتالیف بھی تھا۔مختلف کتب میں آپ کی تصانیف کی جو فہرست ملتی ہے وہ یہ ہے: **کتاب الرسائل ،امثال القرآن ،معانی الھمم، المقصد الیٰ اللہ تعالی** (۴۶)،**کتاب العمدۃ** (۴۷)،**کتاب الخوف ،کتاب الورع، کتاب الرھبان ،کتاب المحبۃ** ﷺ۔(۴۸)

بوقت وفات آپ کے روحانی مشاغل کی کیفیات قابل رشک ہیں۔افضل الفوائد ملفوظات حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ کیفیت تفصیل سے بیان کی گئی ہے:

جب خواجہ جنید بغدادی کا آخری وقت قریب آ پہنچا تو وضو کر کے سجدہ کیا اور روئے، لوگوں نے پوچھا سید طریقت! آپ نے اس قدر طاعت وعبادت کی ہے، پھر یہ رونے کا مقام کون سا ہے؟ فرمایا: میرے لیے اس گھڑی سے بڑھ کر اور کوئی احتیاج کا وقت نہیں۔پھر قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ اس وقت قرآن شریف پڑھتے ہیں؟ فرمایا: میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری عمر کا صحیفہ لپیٹ لیا جائے گا اور میری ستر سالہ طاعت وعبادت ہوا میں بال سے لٹکی ہوئی دکھائی دے رہی ہے، جسے ہوا ہلا رہی ہے۔ایک طرف پل صراط ہے اور ایک طرف ملک الموت اور قاضی عادل، اور سامنے راہ ہے۔مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کس راہ سے لے جایا جائے۔بعد ازاں جب قرآن شریف ختم کیا تو سورۂ بقرہ کی ستر آیتیں اور پڑھیں، جب وقت بالکل قریب آ پہنچا تو حاضرین نے عرض کی کہ اللہ کہیں، تو فرمایا: میں تو اسے بھولا نہیں، پھر تسبیح پڑھتے ہوئے انگلیاں بند کرنی شروع کیں جب چار بند کر چکے تو سبابہ کو سیدھی کر کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور آنکھیں بند کر کے جان دوست کے حوالے کی۔نہلاتے وقت غسال نے چاہا کہ خواجہ جنید کی آنکھوں میں پانی پہنچائے، آواز آئی کہ ہمارے دوست سے ہاتھ اٹھا لے، جو آنکھ ہمارے نام پر بند کی ہے، وہ ہمارے حکم کے سوا نہیں کھلیں گی۔بعد ازاں خواجہ جنید کو خواب میں ایک شخص نے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو منکر نکیر سے کس طرح خلاصی ہوئی؟ فرمایا کہ جب دونوں فرشتے آئے اور مجھ سے پوچھا کہ تیرا رب کون ہے تو میں نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا: جس روز اس نے **الست بربکم** پوچھا تھا اس روز میں نے **بلٰی** کہہ دیا تھا، اب تم پوچھنے آئے ہو کہ تمہارا رب کون ہے؟ جو بادشاہ کو جواب دے چکا ہو اسے بادشاہ کے غلاموں سے کیا گھبرانا! آج میں بھی اسی کی زبان سے جواب دیتا ہوں۔یہ سن کر فرشتے چلے گئے اور کہا ابھی یہ عاشق محبت کے نشے میں ہے۔(۴۹) آپ کی وفات شنبہ کے دن ۲۷ رجب ۲۹۷ھ کو ہوئی جب کہ آپ کی عمر شریف نوے (۹۰) سال کی تھی۔

حوالہ جات

(۱)طبقات الاولیا،سراج الدین ابوحفص عمر علی المصری المعروف بابن الملقن ،ص: ۱۱۱۰، الرسالۃ القشیریۃ للامام ابی القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری ،دارالکتب العلمیہ ، بیروت، لبنان،ص:۵۰

(۲)کشف المحجوب،حضرت داتا گنج لاہوری،رضوی کتاب گھر، بھیونڈی،ص:۲۷۳

(۳)نفس مصدر:۱۹۵

(۴)اقتباس الانوار،شیخ محمد اکرم قدوسی،حامد جمیل پرنٹرز،لاہور،ص:۵۴

(۵)طبقات امام شعرانی،سید عبدالوہاب شعرانی،ص:۲۸۱

(۶)الرسالۃ القشیریہ:ص۵۰

(۷)کشف المحجوب:۲۷۳

(۸)مجلّہ الاحسان،شاہ صفی اکیڈمی خانقاہ عارفیہ،الہ آباد:۲/ ۷۹

(۹)الرسالۃ القشیریہ،ص:۵۰

(۱۰)نفس مصدر،ص:۵۰

(۱۱)افضل الفوائد،ملفوظات حضرت محبوب الٰہی نظام اولیا(ہشت بہشت:۱/ ۹۳-۹۴)

(۱۲)نفس مصدر:۱/ ۹۷

(۱۳)تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف،شاہ عبدالحق محدث دہلوی،ترجمہ علامہ محمد عبدالکریم شرف قادری،ص:۱۰۱

(۱۴)جوامع الکلم،ملفوظات خواجہ بندہ نواز گیسودراز رحمۃ اللہ،ادبی دنیا،دہلی،ص:۲۳۴

(۱۵)طبقات امام شعرانی،ص:۴۳۲

(۱۶)رسالہ قشیریہ،ص:۴۲۵،۴۲۶

(۱۷)نفس مصدر،ص:۲۱۲

(۱۸)نفس مصدر،ص:۲۸۴-۲۸۵

(۱۹)رسالہ قشیریۃ،ص:۵۱

(۲۰)کشف المحجوب،ص:۷۴

(۲۱)عوارف المعارف،حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ،ص:۱۹۹

(۲۲)نفس مصدر،ص:۶۷۴

(۲۳)نفس مصدر،ص:۶۸۲

(۲۴)کشف المحجوب،ص:۵۸۷

(۲۵)رسالہ قشیریہ،ص:۱۷

(۲۶)طبقات امام شعرانی،ص:۱۹۹

(۲۷)سبع سنابل شریف،میر سید عبدالواحد بلگرامی،ص:۲۰۴

(۲۸)طبقات امام شعرانی،ص:۶۴

(۲۹)مشکوٰۃ المصابیح،کتاب الایمان

(۳۰)کشف المحجوب،ص:۳۶۶

(۳۱)افضل الفوائد(ہشت بہشت:۱/ ۹۷)

(۳۲)کشف المحجوب:۲۸۴

(۳۳)نفس مصدر،ص:۴۷۳-۴۷۴

(۳۴)رسالہ قشیریہ،ص:۵۱

(۳۵)عوارف المعارف،ص:۱۹۳

(۳۶)رسالہ قشیریہ،ص:۵۱

(۳۷)اسرار الاولیا،ملفوظات بابا فرید الدین گنج شکر(ہشت بہشت:۱۳۹-۱۴۰)

(۳۸)کشف المحجوب،ص:۴۳۶

(۳۹)رسالہ قشیریہ،ص:۵۱/طبقات الاولیا،ص:۱۱۱

(۴۰)افضل الفوائد:۱/ ۹۳

(۴۱)رسالہ قشیریہ،ص:۳۳۸-۳۳۹

(۴۲)اسرار الاولیاء،ص:۱۲۲

(۴۳)جوامع الکلم،ص:۲۷۸

(۴۴)طبقات امام شعرانی،ص:۱۹۹

(۴۵)عوارف المعارف،ص:۳۳۶

(۴۶)الفہرست لابن ندیم مع حاشیہ،دارالمعرفہ،بیروت،ص:۳۲۳

(۴۷)راحت القلوب،ملفوظات بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ،ص:۱۷

(۴۸)مقدمہ عوارف المعارف،شمس بریلوی،ص:۱۳

(۴۹)افضل الفوائد:۱/ ۳۹

ڈاکٹر ساحل شہسرامی

سید شاہ بہاء الدین بنگلوری: حیات اور تعلیمات

قطب العارفین، زبدۃ السالکین، بدر الہند حضرت سید شاہ بہاء الدین قادری قدس سرہٗ اپنے عہد کے ممتاز ترین اور بہت بافیض بزرگ ہیں- ذوق وشوق، زہدو تقویٰ، علم وفضل، اتباع شریعت اور مشرب قادریت کے ساتھ فدا کارانہ لگاؤ آپ کی پہچان ہے- فضل ربانی، عنایت مصطفوی اور فیضان غوث اعظم نے آپ کے وجود مقدس کو کندن بنا دیا تھا- روحانی تصرفات، جِنوں کی تسخیر، دلوں پر حکومت، غیبی خزانوں تک آپ کی دسترس اور سلب امراض کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ دائرۂ تحریر میں لانا مشکل ہے- آج بھی آپ کے آستانِ کرم سے فیض وکرم کے آبشار جاری ہیں اور ایک زمانہ مستفیض ہو رہا ہے-

....

حضرت بدر الہند، شیر میسور سید فتح علی معروف بہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے عسکری جبروت، ایمانی قوت، نظام عدل، حکمت وشجاعت کے سامنے فرنگی سورما بھی عاجز تھے؛ لیکن ہماری شامت اعمال سے چند ملت فروشوں کی وجہ سے سلطان ٹیپو نے بہت بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا اور پھر آپ کے خاندان کے افراد کلکتہ میں نظر بند کیے گئے اور کچھ حکومت کی نگاہ سے بچ کر لکادیپ اور مالدیپ کے جزیروں کی طرف نکل گئے- انہیں میں سرکار عالی کے والد ماجد سلطان سید شہاب الدین قدس سرہٗ بھی تھے- افسوس ہے کہ سرکار عالی بدر الہند کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بالکل دستیاب نہیں، حتیٰ کہ سال ولادت بھی معلوم نہیں- آپ کی سوانح پر دو کتابیں دیکھنے کو ملیں: ۱- حیات ولی؛ اور ۲- نور غوث؛ دونوں سوانحی تفصیلات سے خالی ہیں- ان میں ''حیات ولی'' غنیمت ہے-

سلطان فتح علی ٹیپو کے خاندان کے بارے میں اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ آپ قریشی مکی تھے- خاندان نبوت سے تعلق تھا- سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ خاندان مکہ مکرمہ سے

روزگار کی تلاش میں نکلا اور بغداد پہنچا پھر وہاں سے ایران ہوتے ہوئے افغانستان میں چند سال ٹھہرا، اس کے بعد پنجاب آیا- ایک مدت تک وہیں رہا پھر دہلی اجمیر ہوتے ہوئے گلبرگہ آ کر بس گیا- سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس خاندان کی آمد میسور میں ہوئی اور عرصے تک میسور کی حکمرانی اس خاندان میں رہی- حضرت ٹیپو سلطان علیہ الرحمہ کی شہادت ۲۸/ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۴/ مئی ۱۷۹۹ء کو ہوئی اور حضرت سرکار عالی بدر الہند کا وصال مبارک ۶/ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہوتا ہے- اس طرح آپ کے وصال اور آپ کے جد کریم حضرت ٹیپو سلطان علیہ الرحمہ کی شہادت کے درمیان تقریباً ۱۲۴/ سال کا فاصلہ ہے- اس وقفے سے حضرت سرکار عالی کی عمر شریف کا کچھ انداز کیا جا سکتا ہے-

....

تذکرہ نگاروں کے مطابق لکادیپ کے ایک مختصر سے جزیرے پر آپ کے والد ماجد حضرت سید شہاب الدین حکمراں تھے- ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ لندن بھیجا گیا لیکن آپ کو وہاں کی فضا راس نہ آئی اور آپ معاملات دنیا سے کنارہ کش ہو کر دینی علوم کے حصول کے لیے جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے جہاں سارے رائج اسلامی علوم آپ نے لگن سے حاصل کیے- مصر سے عراق تشریف لے گئے اور بغداد مقدس میں حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ مصطفےٰ بغدادی قدس سرہٗ کے دستِ مبارک پر سلسلۂ عالیہ قادریہ میں مرید ہوئے- بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور مرشد گرامی سے کثیر باطنی نعمتیں حاصل کیں اور اجازت وخلافت پائی- پھر مشائخ کے روحانی اشارے پر سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ سے مکہ معظّمہ میں، سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ حضرت خواجہ عبدالرحمٰن مدراسی قدس سرہٗ سے مدراس میں اور سلسلۂ عالیہ سہروردیہ حضرت مخدوم محمد نور سہروردی قدس سرہٗ سے بہار شریف میں حاصل کیا- راہ سلوک کی جتنی ریاضتیں اور مجاہدے ہو سکتے ہیں، وہ سب سرکار عالی نے کیے- بغداد قیام کے دوران مضافات کے جنگلات اور دریاے دجلہ کے ریگزار آپ کے مستانہ نعروں اور اذکار الٰہیہ سے گونجتے رہتے- اکثر وبیشتر استغراق وبےخودی کی کیفیت طاری رہتی- آپ کے مرشد برحق حضرت سید شاہ پیر مصطفےٰ بغدادی قدس سرہٗ آپ کو ''دیوانہ'' فرمایا کرتے- آپ مرشد برحق کی اجازت وخلافت اور نعمت باطنی سے سرفراز ہونے کے بعد حرمین طیبین پہنچے جہاں شیخ امداد اللہ مہاجر مکی سے سلسلۂ صابریہ کی نعمت ہاتھ آئی، پھر پیادہ کئی حج فرمائے- سفر حج میں دیگر حجاج کی خدمت بھی کرتے جاتے، وہاں سے آپ بمبئی پھر مظفر نگر، اس کے بعد بلند شہر کے قصبہ دان پور تشریف لائے لیکن ان ایام کی تفصیلات نہیں ملتیں- بس

اتنا معلوم ہے کہ بمبئی میں ایک تاجر کی صورت میں خود کو چھپائے رکھا- مظفر نگر یوپی پہنچے تو درازی عمر کے باوجود مدرسہ کے طالب علم ہونے کا حجاب اپنے اوپر ڈال لیا- عشق الٰہی کی جو آگ آپ کے مقدس دل میں روشن تھی، اس نے آپ کے وجود کو کندن بنا ڈالا تھا- بھلا سوزش عشق اور انوار الٰہیہ کوئی چھپنے کی چیزیں ہیں- ہر جگہ آپ سے کرامات اور خوارق عادات کا ظہور ہوا اور کثیر خلق خدا نے آپ سے فیض اٹھایا- بہت سارے لوگ آپ کے دست حق پرست پر سرکار غوث اعظم کے حلقۂ غلامی میں داخل ہوئے- مریض شفایاب ہوئے- پریشان لوگوں کی پریشانیاں دور ہوئیں، آسیب زدہ اور سحر میں مبتلا افراد صحت یاب ہوئے- آپ کی طبعی روش تھی کہ جہاں آپ کی بزرگی کا چرچا عام ہوتا اور مخلوق خدا کی بھیڑ بڑھنے لگتی، آپ فوراً اس جگہ سے چل دیتے- ۱۸۹۴ء میں مظفر نگر کی انار والی مسجد میں آپ قیام فرما ہوئے- آپ کے انفاس سوختہ کی برکت اور توجہ باطنی سے وہ انار کا درخت بہت بابرکت اور فیض بار ہوگیا- ہر قسم کے مریض اس کی پتیوں سے شفایاب ہونے لگے- چند سال رہنے کے بعد آپ نے مظفر نگر کو بھی الوداع کہا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل پڑے- تقریباً دو سال تک آپ روپوش رہے پھر حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روحانی اشارے پر آپ ۱۹۰۰ء میں موضع دان پور ضلع بلند شہر میں جلوہ افروز ہوئے اور یہاں چار پانچ سال قیام فرمایا- نواب دان پور آپ کا بہت معتقد تھا- اس دوران آپ نے کئی چلّے کیے- ایک چلہ بطرز حبس کبیر فرمایا جو چھ مہینے پر مشتمل ہوتا ہے اور خواص اولیاے کرام کا حصہ ہے- پھر آپ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشارے سے ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں اپنے جاں نثار مرید حافظ عبدالکریم خان قادری رئیس چونڈھیرہ کے بے حد اصرار پر ''بنیّر شریف'' تشریف لائے اور پھر اخیر دم تک یہیں قیام فرمایا-

....

بنیر جہاں پر آستانہ عالیہ ہے، دان پور سے معمولی فاصلے پر ہے- یہاں راجپوت راجہ سالباہن کا قلعہ تھا جسے اس نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے دست حق پرست پر ایمان لانے کے بعد تعمیر کیا تھا- یہ قلعہ سرکار عالی کے زمانے تک منہدم ہو کر ایک ٹیلے کی صورت میں رہ گیا تھا اور جنات وشیاطین کا مسکن بنا ہوا تھا- یہ خطۂ اراضی حافظ عبدالکریم خان قادری رئیس چونڈھیرہ کی ملکیت تھا جسے انھوں نے بصد عاجزی واحترام اصرار کر کے سرکار عالی کی نذر کیا- سرکار عالی یہاں ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں تشریف لائے اور اس ٹیلے کو مسطح کر کے دربار غوثیہ قائم فرمایا- ابتدا میں جناتوں کی یلغار رہی لیکن سرکار عالی کے قدموں کی برکت سے یہ خطہ جنّاتوں کے اثرات سے بالکل پاک ہوگیا-

سرکار عالی قدس سرہٗ مظفر نگر میں چار سال سے زیادہ قیام پذیر رہے، دان پور آپ کے مقدس قدموں کی برکت سے تقریباً پانچ سال سرفراز رہا لیکن بنیّر شریف میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۳ء وقت اخیر تک قیام مبارک رہا جس کی مدت تقریباً اٹھارہ سال ہوتی ہے- اس دوران آپ کے فیضان وبرکات کا جوبن بہاروں پر تھا- کثیر خلق خدا آپ کے دست حق پرست پر اپنے گناہوں سے تائب اور سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غلامی میں داخل ہوئی- نہ جانے کتنے مریض آپ کی دعاؤں کی برکت سے شفایاب ہوئے، آسیب اور سحر کے اثرات بد سے نجات پائے اور ان کی مشکلات اور نامرادیاں ختم ہوئیں-

....

سرکار عالی کو ربّ جمیل نے بہت عمدہ ذوق جمال عطا فرمایا تھا- آپ نے بنیّر شریف میں اٹھارہ سال قیام فرمایا اور اس مدت میں دربار غوثیہ کو خوب سنوارا سجایا- بہت عمدہ تعمیرات کیں- ان میں خانۂ خدا کی تعمیر بہت دل کش اور دیدہ زیب طرز کی ہے- سرکار عالی نے تقریباً دس فٹ اونچی کرسی دے کر یہ شاندار مسجد تعمیر فرمائی اور اس کے تعمیری کاموں میں بنفس نفیس حصہ لیا- فن تعمیر کا یہ دل فریب نمونہ آج بھی دعوت نظارہ دیتا ہے- اس خانۂ خدا کی تعمیر ۱۳۳۱ھ میں مکمل ہوئی- اس کے دو تاریخی مادے برآمد کیے گئے جو مسجد کی لوح پیشانی پر درج ہیں:

۱- عِبَادِیْ فَاسْعَوْا اِلیٰ ذِکْرِ اللّٰہِ [۱۳۳۱ھ]

۲- مسجد مرشد بہاء الدین شاہ بدر الہند [۱۳۳۱ھ]

۱- مسجد کے علاوہ، ۲- مدرسہ اسلامیہ عربیہ محی الدین [۱۳۳۴ھ]، ۳- مجلس خانہ، ۴- مہمان خانہ، ۵- زنان خانہ، ۶- لنگر خانہ، ۷- باغ، ۸- پختہ کنواں، ۹- اور مقبرہ آپ کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں- ان تمام تعمیرات کے مجموعے کو سرکارِ عالی دربار غوثیہ، باغ غوثیہ اور مرشد آباد کے پیارے ناموں سے یاد فرماتے-

....

تقریباً اٹھارہ سال تک بنیر شریف مرشد آباد ضلع بلند شہر یوپی میں سرکار عالی سلطان بدر الہند سید شاہ بہاء الدین قادری قدس سرہٗ ایمان، روحانیت اور محبت کی نعمتیں تقسیم کرتے ہوئے ۲۶/ ربیع الاول شریف ۱۳۴۲ھ/ ۶/ نومبر ۱۹۲۳ء بروز منگل صبح ۱۰/ بج کر ۱۰/ منٹ پر اپنے محبوب رب کے حضور حاضر ہوگئے- اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ- اخیر وقت میں بغرض علاج آپ علی گڑھ کنور مشکور علی خاں کی کوٹھی میں تشریف رکھتے تھے- اخیر شب میں آپ کی قیام گاہ میں انوار وتجلیات الٰہیہ کی بارش ہو رہی تھی- کمرہ خوشبو سے معطر تھا- زبان مبارک پر ذکر ''ھــــو'' جاری تھا- خوب گرم پانی

طلب فرماتے-وصال کے بعد چہرۂ مبارکہ پر ملکوتی جگمگاہٹ تھی-آپ کی رحلت

نشان مرد مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب او ست

کی عملی تفسیر تھی-تجہیز وتکفین کے بعد جنازۂ مبارکہ علی گڑھ سے شام کے وقت بنّیر شریف دربار غوثیہ لایا گیا- بعد نماز عشا ۸ ربجے شب تدفین، عمل میں آئی- نماز جنازہ حضرت مولانا عبدالقادر قادری علیہ الرحمہ علی گڑھی امام جامع مسجد، اپرکوٹ علی گڑھ نے پڑھائی، جو سرکار عالی کے مرید وخلیفہ تھے-

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ [۱۳۴۲ھ] سے سال وصال برآمد ہوتا ہے-

....

حضرت سرکار عالی کوطویل عمر عطا ہوئی، اس لیے آپ کے مریدین کی تعداد بہت ہے- خلفا کی تعداد بھی پچاس سے کم نہیں- ۲۹ رخلفا کے اسمائے گرامی تو خود ''حیات قدسی'' میں مذکور ہیں، جب کہ خود مولف کواعتراف ہے کہ یہ تعداد مکمل نہیں-سرکار عالی کے خلیفۂ اعظم حضرت سید یعقوب علی میرٹھی علیہ الرحمہ ہیں جو بادشاہ جہانگیر کے پیرومرشد حضرت شاہ پیر کے فرد خاندان سے ہیں-حضرت سرکار عالی کے پہلے سجادہ نشین حضرت مولوی محمد علی رحمۃ اللہ علیہ [پورقاضی، مظفرنگر] ہوئے جنہیں سرکار عالی سے براہ راست اجازت وخلافت حاصل تھی- اب تک درج ذیل حضرات دربار غوثیہ کے سجادہ نشین ہو چکے ہیں:

۱-حضرت مولوی محمد علی علیہ الرحمہ، پورقاضی مظفرنگر ثم رڑکی
۲-حضرت منشی عبدالمجید علیہ الرحمہ، سردھنہ
۳-حضرت صوفی عبدالحمید علیہ الرحمہ، میرٹھ
۴-حضرت حافظ مولوی برکت اللہ علیہ الرحمہ، امروہہ
۵-حضرت حافظ سید ولایت حسین علیہ الرحمہ، مظفرنگر
۶-حضرت سید ساجد علی شہید علیہ الرحمہ، ریٹول میرٹھ
۷-حضرت حافظ عبدالحمید علیہ الرحمہ، چمن پورہ سہسوان
۸-حضرت صوفی قدرت اللہ علیہ الرحمہ، مظفرنگر
۹-حضرت مرزا غلام جیلانی علیہ الرحمہ، سوروں ایٹہ
۱۰-حضرت قاری طفیل احمد علیہ الرحمہ، رامپور
۱۱-حضرت صوفی ریاض الدین، دہلی

۱۲-حضرت سفیر احمد صاحب، امروہہ
۱۳-حضرت محمد اکبر قادری صاحب، رڑکی [موجودہ سجادہ نشین]

....

سرکار عالی اخلاق نبوی کا عکس جمیل تھے-سادہ لباس، کم خوراک، بے تکلف طرز زندگی اور شرم وحیا کے پیکر تھے-سرکار عالی نے کسی کو اپنے در سے مایوس اور محروم نہیں لوٹنے دیا-حضرت سرکار عالی کا خود ارشاد مبارک ہے کہ فقیر کے در سے کوئی محروم نہیں جاتا-اکثر وبیشتر جمال طاری رہتا- ہر ایک کے ساتھ لطف ومروت سے پیش آتے- جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ نذرانے کی ساری چیزیں مستحقین میں تقسیم فرمادیتے-غریبوں کی بڑی دلداری فرماتے- رئیسوں سے رابطہ نہ رکھتے-نواب رامپور نے سرکار عالی سے ملاقات کا بہت اشتیاق ظاہر کیا لیکن آپ قطعاً راضی نہ ہوئے-تواضع اور خاک ساری میں بھی سنت نبوی کی جھلک تھی-مہمانوں کی خدمت بہ نفس نفیس فرماتے- اپنا کام خود سے کرتے- کپڑوں میں پیوند لگا لیتے- شفقت ومحبت کا سمندر تھے- سترہویں شریف میں جب احباب ومتوسلین رخصت ہونے لگتے تو آپ غم زدہ ہو جاتے- حال پوچھنے پر فرماتے: ''فقیر بے چین ہے، بچہ لوگ جارہا ہے-'' مریدین کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے اور انھیں ''بچہ لوگ'' جیسے پیارے لقب سے یاد فرماتے- ہر ایک کی دست گیری فرماتے-مشکل وقت میں کام آتے-لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتے- براہِ راست غلطی کی نشان دہی اور اصلاح بہت کم فرماتے-اکثر ایسا ہوتا کہ فرماتے: ''لوگ ایسا غلطی کرتا ہے، یہ نہ کرنا چاہیے-'' ایک مرتبہ آپ کے مرید تحصیل دار ہزبر حسین کی گھڑی چوری ہوگئی- وہ حاضر خدمت ہوکر عرض کرنے لگے کہ حضور چور کا پتہ بتادیں-سرکار عالی نے فرمایا: فقیر کسی کا پردہ فاش نہیں کرتا- آپ کا گھڑی مل جائے گا، چور خود آکر رکھ جائے گا-''

اللہ اللہ! کیسی پردہ داری ہے-اسی کو حدیث پاک میں فرمایا گیا: مَنْ سَتَرَ الْعَبْدَ سَتَرَہُ اللّٰہُ. جس نے کسی بندے کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا-مخلوق کی حاجت روائی جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا خاص وصف ہے، وہ سرکار عالی کے یہاں بھی پورے طور سے موجود ہے- حیات مبارکہ میں ہر قسم کے حاجت منداور پریشاں حال حاضر ہوئے اور دل کی مرادیں پائیں اور آج بھی فیض وکرم کا وہی آبشار جاری ہے- ایک دنیا آتی ہے اور جھولیاں بھر بھر کر لے جاتی ہے- آپ نے جس سے جو وعدہ فرمایا، اسے وفا کیا- باغ بانی، معماری، زراعت اور کھیتی باڑی کے کام بھی آپ نے خود کیے- ہم سائے اور پڑوس کے باشندوں کا آپ نے ہمیشہ خیال رکھا، ان کے دکھ درد اور خوشی کے مواقع پر شریک رہے- چونڈیرہ،

پنڈ راول، پہاسو، دان پور، علی گڑھ تک کے احباب پر خصوصی نگاہ کرم تھی- فرمایا کرتے: ''یہ ہمارے ہم سائے ہیں، ان کا فقیر پر حق ہے-'' احباب و حاضرین کو ''اے حضرت!'' کے باوقار لقب سے یاد فرماتے، گویا یہ آپ کا تکیہ کلام تھا-

....

حضرت سرکار عالی کی کرامات اور خوارقِ عادات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے- حضرت کی حیات مبارکہ پر لکھی گئی تین کتابیں: ۱- حیات ولی، ۲- حیات قدسی، ۳- اور نورِ غوث میں کثیر کرامات درج ہیں- آج بھی آپ کی فیض باریوں کا سلسلہ جاری ہے، جس کا جی چاہے، اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے جا کر دربار غوثیہ کا نظارہ کر لے- تفصیل کے لیے مذکورہ بالا کتابوں کو دیکھنا چاہیے-

....

سرکار عالی فقر و درویشی کے ساتھ ساتھ علم و فضل کا بھی اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے- آکسفورڈ لندن اور جامعہ از ہر مصر جیسی مشہور زمانہ یونیورسٹیوں کے فاضل تھے- عربی اور انگریزی بہت شستہ اور رواں بولتے تھے- اردو بولنے میں قدرے تکلف تھا- شریعت میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقلد تھے اور طریقت میں سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فدائی- آپ کا عربی سلام: ''صلاۃ اللہ سلام اللہ علیٰ طٰہٰ رسول اللہ'' اور آپ کی صوفیانہ تصنیف بہاء القلوب/ منور القلوب آپ کی علمیت کی روشن دلیل ہیں- ان میں آپ نے عربی نثر و نظم کا جو ادبی پیرایۂ بیان اختیار فرمایا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے- بہاء القلوب میں آپ نے اسرار طریقت اور ہدایات سلوک بہت حکیمانہ انداز میں بیان فرمائے ہیں- فتاویٰ رضویہ میں ایک عیدگاہ کے تعلق سے ایک استفتا بھی ملتا ہے جس کا سنگ بنیاد آپ کے دست مبارک سے رکھا گیا- [دیکھیے فتاویٰ رضویہ جدید، ۵/۳۴۴] مسلک اہل سنت اور عقیدۂ ماتریدیہ کے بالکل پابند تھے اور مشرب صوفیہ پر گام زن - کئی بدمذہب آپ کی بابرکت محفل میں تائب ہوئے- خود ''حیات قدسی'' کے مولف پہلے وہابیت زدہ تھے لیکن سرکار عالی کی ایک نگاہ کرم کیا پڑی کہ دل کی دنیا بدل گئی اور پکے قادری عاشق رسول بن گئے- سرکار عالی کو میلاد شریف اور ذکر غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عشق تھا، اسی لیے آپ نے ہر چیز حضور غوث پاک سے منسوب کی- آپ کی خانقاہ، دربار غوثیہ کہلائی- آپ کے مریدین، قادری ہوئے- آپ نے صرف حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عرس منایا- اپنے عرس کی تقریب سے منع فرمایا- ان باتوں سے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ آپ کس قدر صوفیہ کے مذہب کے پیرو کار اور حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کیسے عاشق جاں باز تھے-

....

اب میں سرکار عالی کی چند قیمتی ہدایات اور کریمانہ اقوال منور القلوب اور دیگر کتابوں سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں- سرکار عالی شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شریعت طریقت، حقیقت اور معرفت چار باب ہیں، جن کے چالیس مقام ہیں- ہر باب کے دس مقام ہیں-

....

پہلا باب شریعت کا ہے جس کے دس مقام ہیں:

پہلا مقام اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ہے، یونہی تقدیر پر کہ ہر بھلائی اور برائی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد اٹھنا برحق ہے، ان پر بھی ایمان لانا ہے-

دوسرا مقام فرض نمازوں کی پابندی کے ساتھ ادائیگی ہے- اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی [البقرۃ: ۲۳۸] نمازوں کی نگہبانی کرو اور خصوصاً نماز عصر کی-

تیسرا مقام زکوٰۃ دینا ہے- جب زکوٰۃ واجب ہو تو اسے فوراً مستحق کے حوالے کر دے-

چوتھا مقام رمضان کے مہینے کا روزہ رکھنا ہے جس میں قرآن شریف نازل کیا گیا- یہ روزے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر فرض فرمائے ہیں-

پانچواں مقام بیت اللہ شریف کا حج کرنا ہے- صاحبِ استطاعت پر پوری زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے-

چھٹا مقام حلال روزی کمانا ہے- یقیناً اللہ تعالیٰ حلال روزی میں برکت عطا فرماتا ہے اور حلال کمائی کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے-

ساتواں مقام حرام کاموں سے بچنا ہے، کیوں کہ حرام فعل دل کو سیاہ کر دیتا ہے اور دل پتھر جیسا سخت ہو جاتا ہے بلکہ پتھر سے بھی سخت ہو جاتا ہے-

آٹھواں مقام شریعت کی اطاعت میں مکمل طور سے داخل ہونا ہے- شریعت کی متابعت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کی جائے اور اس کی منع کی ہوئی باتوں سے بچا جائے اور جسے شریعت نے حلال کیا، اسے حلال سمجھیں اور جسے حرام کیا، اس کو حرام جانیں-

نواں مقام قرآن حکیم ہے، یعنی اس کی تلاوت کی جائے، اس کی ہر بات کی تصدیق کی جائے- اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے، اس کے معانی میں غور و خوض کیا جائے- اس کے اوامر کا

اتباع کیا جائے اوراس کے نواہی سے بچنے کی کوشش کی جائے-

دسواں مقام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ [لقمان: ١٧] نماز برپا رکھ اور اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے منع کر اور جو افتاد تجھ پر پڑے، اس پر صبر کر- بے شک یہ ہمت کے کام ہیں-

....

دوسرا باب طریقت کے بیان میں ہے اور اُس کے بھی دس مقامات ہیں:

پہلا مقام توبہ ہے اور یہ ہر مکلّف انسان پر فرض ہے- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعاً اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ [النور: ٣١] اور اللہ کی طرف توبہ کرواے مسلمانو! سب کے سب، اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ-

دوسرا مقام حسن خلق ہے اور اُس میں تمام عمدہ خصلتیں اور سب اچھے کام داخل ہیں اور اُن ہی میں سارے صالح اعمال بھی شامل ہیں-

تیسرا مقام دین، تقویٰ، اطاعت الٰہی اور ہمارے آقا و مولیٰ محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں خوب خوب کوشش کرنا ہے- کیوں کہ انوار الٰہی کا وہی مشاہدہ کرتا ہے جو اس کی طلب میں کوشش کرتا ہے اور جو کوشش نہیں کرتا، وہ مشاہدۂ انوار الٰہی سے محروم رہتا ہے-

چوتھا مقام امید اور خوف کے درمیان میں رہنا اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا ہے- کبھی اللہ کی آزمائش سے بے خوف نہ ہو اور کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو-

پانچواں مقام خواہشات نفسانی کو ترک کرنا ہے- کیوں کہ اتباع شہوت سے دل سخت ہوتا ہے-

چھٹا مقام شبہات سے بچنا ہے- شبہات میں مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے احتراز کرنا شامل ہے اور اسی میں شک اور ریب بھی داخل ہے-

ساتواں مقام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانا اور اس کی جناب میں توبہ اور استغفار کرنا ہے- دعا، خشوع و خضوع اور حضور قلب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز سے توجہ ہٹالی جائے-

آٹھواں مقام پیر و مرشد کی رضا کا طالب رہنا ہے- یہ مقام پیر کے ساتھ محبت اور خدمت کا تعلق رکھنے، اس کی نصیحت پر عمل کرنے اور ہر بات میں مکمل طور سے اس کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوتا ہے- پیر کے سامنے ایسے رہے جیسے مردہ غسّال کے سامنے ہوتا ہے، کہ وہ اسے جس طرح چاہتا ہے الٹا پلٹتا رہتا ہے-

نواں مقام وعظ و نصیحت سننا اور اس کے تقاضوں پر بے تکلف عمل کرنا ہے- جب خود

دوسروں کو نصیحت کرے تو نرم اور لطیف انداز اختیار کرے-

دسواں مقام اللہ کے سوا ساری دنیا سے علاحدگی اختیار کرنا ہے- کیوں کہ ماسوی اللہ سے میل جول، قرب الٰہی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے-

....

تیسرا باب حقیقت کے بیان میں ہے اور اس کے مقامات بھی دس ہیں:

پہلا مقام یہ ہے کہ تواضع اور فروتنی اختیار کی جائے اور ہر ایک سے نرم لہجے میں بات کی جائے-

دوسرا مقام یہ کہ بہتّر گمراہ فرقوں کو ایک خانے میں رکھے، ان کے درمیان کوئی امتیاز نہ کرے- چوں کہ یہ سب فرقے گمراہ ہیں، اس لیے ان سب سے بچتے رہنا واجب ہے- ہاں! صرف اہل سنت و جماعت سے میل جول رکھے، کیونکہ یہ فرقہ عنداللہ مقبول ہے-

تیسرا مقام یہ کہ تھوڑا بہت جو ماحضر ہو، کھالے اور نئے یا عمدہ کھانے وغیرہ کا انتظار نہ کرے-

چوتھا مقام یہ ہے کہ ہمیشہ حق کے راستے میں رہے اور کسی مخلوق کو تکلیف نہ پہنچائے بلکہ اُن سے جو اذیتیں بھی پہنچیں اُن کو برداشت کرے-

پانچواں مقام یہ ہے کہ کسی سے بدلہ لینے کا دل میں خیال بھی نہ آئے بلکہ برائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرے اور خطا کار کا عذر قبول کرے اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کردے-

چھٹا مقام یہ ہے کہ فقیروں اور مسکینوں سے متکبرانہ انداز میں نہ ملے بلکہ ان سے شفقت اور محبت سے پیش آئے اور اُن سے اچھا برتاؤ رکھے-

ساتواں مقام یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں صرف اس کی رضا کے لیے قدم بڑھائے، اس میں ریاکاری اور نمائش کا دخل نہ ہو-

آٹھواں مقام یہ ہے کہ اپنی اور دوسروں کی پوشیدہ باتیں چھپائے، کسی کا راز فاش نہ کرے- جب کسی کی کوئی خوبی دیکھے تو اُس کا چرچا کرے اور اگر برائی دیکھے تو اُسے چھپادے-

نواں مقام یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے رب سے مناجات میں اس طور سے مشغول رہے کہ دنیا کے غیر ضروری امور اس راہ میں اس کے لیے رکاوٹ نہ بنیں-

دسواں مقام یہ ہے کہ تمام چیزوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھے اور علم نافع کی طلب اور اپنے نفس کی تربیت میں لگا رہے، جیسا کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم درحقیقت زہد ہے اور آدمی کا ادب اُس کے زہد سے بہتر ہے-

....

چوتھا باب معرفت کے بیان میں ہے-اس کے بھی دس مقامات ہیں:

پہلا مقام یہ ہے کہ ادب کی راہیں اس طور سے ملحوظ رکھے کہ خود آدابِ شریعت سے مکمل آراستہ ہو،ان کی پابندی کرے اور ہر قدم پر ان کی حفاظت فرمائے-

دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کی دی ہوئی اذیت اور زیادتیوں پر صبر وتحمل سے کام لے، کسی موذی سے انتقام لینے کا خیال دل میں نہ لائے بلکہ ان کی ایذا رسانی کو برداشت کرے اور ان کے ساتھ عفوو درگذر کا معاملہ کرے-

تیسرا مقام یہ ہے کہ بروں کی صحبت اور دنیا داروں کی تابع داری سے بچتا رہے اور ہر قسم کے کھلے چھپے فتنوں سے دور رہے-

چوتھا مقام یہ ہے کہ مکمل خلوص اور سچائی کے ساتھ مشائخ کی خدمت کرتا رہے اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے ان کا بہی خواہ، ہمدرد اور وفادار رہے-

پانچواں مقام یہ ہے کہ علم تصوف، اپنے نفس اور علم تصوف کے مقامات کا عرفان رکھتا ہو-

چھٹا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت دکھانے کے لیے نہ کرے اور حق تعالیٰ کو ہر جگہ سامنے موجود خیال کرے- اس کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا اپنی آنکھوں سے رب تبارک وتعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا تصور ضرور جمائے کہ رب تبارک وتعالیٰ تجھے ملاحظہ فرما رہا ہے-

ساتواں مقام یہ ہے کہ غصہ کے وقت حلم اور بردباری سے کام لے اور اپنے معاملات میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے-

آٹھواں مقام یہ ہے کہ ہر دن اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنے دل کے زنگار دور کرتا رہے- رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ لوہے کی طرح انسان کے دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں تو اپنے دل کو ذکر الٰہی سے صاف کرتے رہا کرو-

نواں مقام یہ ہے کہ قسم قسم کی طاعات اور عبادات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے-

دسواں مقام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سب سے کم تر جانے اور اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ سمجھے-

....

پیر ومرشد کے تعلق سے جو آداب مرید پر واجب ہیں، درج ذیل ہیں:

پیر کی صحبت میں رہے، اُس سے سچی محبت رکھے، اس سے معاملات میں صداقت کا برتاؤ کرے، اس کے ساتھ کامل گہری عقیدت رکھے، اس سے اپنی کوئی بات راز نہ رکھے، اپنے سارے معاملات بلکہ خود اپنے آپ کو بھی پیر کے سپرد کردے، اُس پر کسی حال میں معترض نہ ہو، اس کی جانب

ظاہر و باطن، جسم وجان ہر طور سے پیر کی جانب متوجہ رہے اور پیر کے سامنے عاجزی، تواضع، فقر ومسکنت کے ساتھ پیش آئے- اس کی طرف پشت نہ کرے، اس پر اپنا مال فدا کرنے کا جذبہ رکھے بلکہ پیر کو اپنی ساری مملوکہ چیزوں کا مالک بنادے اور پیر ومرشد کے سامنے ایسے رہے جیسے مردہ غسّال کے سامنے رہتا ہے کہ غسال مردے کو جس طرح چاہتا ہے الٹتا پلٹتا رہتا ہے- پیر کے آگے کبھی نہ چلے بلکہ اس سے پیچھے رہا کرے، آگے چلنے سے مکمل پرہیز کرے، پیر کا حکم ماننے میں ہرگز کبھی کوتاہی نہ کرے، وہ جس چیز سے منع کرے اُس سے مکمل بچتا رہے اور اس کا کبھی ارتکاب نہ کرے، اس کی خدمت میں بہی خواہ بن کر رہے، اس کی اطاعت کی خوب کوشش کرے، اس کے احوال، اقوال اور افعال کو بغور ملاحظہ کرتا رہے، پیر جو کچھ بتائے اُسے یاد رکھنے کے لیے مستعد رہے، اُس کے راز کی حفاظت کرے، جو کچھ وہ کہے اس کو یاد رکھے اور اس کے کلام کو فضول جان کر نہ چھوڑے، اُس کی باتوں کو ضائع ہونے سے بچاتا رہے- پیر کے آدابِ زندگی کو خود اپنائے، اس کے اخلاق سے خود کو آراستہ کرے، اس کے احوال، اقوال، افعال کی پیروی کرتا رہے- جو بات پیر کو ناپسند ہو اسے چھوڑ دے، اُس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرے، مرشد کو بتائے بغیر اپنے اختیار سے کچھ نہ کرے، اسی کے حکم پر چلے، اُس کی منع کی ہوئی باتوں سے باز رہے، جب مرشد کسی بات کا حکم دے یا کسی بات سے منع کرے تو کبھی یہ نہ کہے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا اور فلاں چیز سے آپ نے کیوں منع کیا کیوں کہ مرشد کی باتوں پر معترض ہونے سے مرید فیض سے محروم رہتا ہے- مرشد کے سجادے پر نہ بیٹھے، اس کے تکیہ پر سر رکھ کر نہ سوئے، نہ اُس کا زیب تن کیا ہوا کوئی لباس پہنے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر اُس کے پاس حاضر ہو، نہ اس کے بعد اُس کی بیوی سے نکاح کرے کیوں کہ یہ حرماں نصیبی کا باعث ہوتا ہے- پیر ومرشد سے کبھی بددل نہ ہو، گرچہ وہ اسے ڈانٹ پلائے یا برا بھلا کہے، ہمیشہ اُس کی محبت پر قائم رہے اور اس کی ہر نرم گرم بات کو گوارہ کرے اور اُس کی مجلس میں بغیر ضرورت کسی سے کوئی بات نہ کرے، اگرچہ وہ اپنا حقیقی بھائی ہو- اگر کلام کرنے کی ضرورت ہو تو بقدر ضرورت کرے- پیر کی موجودگی میں کوئی شخص سوال کرے تو اُس کا جواب نہ دے، پیر کی موجودگی میں یا غائبانے میں کسی سے بحث نہ کرے، یہ اعتقاد رکھے کہ میرا پیر میرے حق میں اپنے زمانے میں سب سے زیادہ کامل ہے- دشمن اور حاسد کے قول پر کبھی کان نہ دھرے- ہاں پیر کو معصوم نہ جانے، البتہ خطا سے محفوظ رہنے کا اعتقاد رکھے- پیر کی مجلس میں ہنسی مذاق، لڑائی جھگڑے اور بحث نہ کرے بلکہ خاموش رہے اور جو کچھ پیر کہے اس کو سنتا رہے اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں- مرید کے لیے یہ آدابِ شیخ جو ذکر ہوئے، ٹھیک یہی آداب والدین کے حق میں اولاد پر لازم ہیں- اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی ہدایت اور توفیق ملا کرتی ہے-

....

مرید کو اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ جن آداب کی رعایت کرنی چاہیے، وہ حسبِ ذیل ہیں:

مرید اپنے سب پیر بھائیوں کو دوست رکھے اور جس بات میں اُن کی رضا ہو اس میں ان کا مطیع رہے، اُن کی حاجت روائی کی کوشش کرتا رہے اور اُن کی حاجت روائی کو اپنی ضرورتوں پر مقدم جانے- اپنے ہر چھوٹے بڑے پیر بھائی کے پاس ادب سے بیٹھے، کسی کے سامنے کبھی تکبر نہ کرے، اُن کے احوال، اقوال اور افعال سے کبھی تعرض نہ کرے بلکہ ساری باتوں میں جہاں تک شریعت اجازت دے اُن کا ساتھ دے- جب کسی پیر بھائی کا انتقال ہو جائے تو اُس کے جنازے میں شرکت کرے- اگر کوئی اُن کا حال دریافت کرے تو اُن کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہے اور غائبانے میں جہاں تک ہو سکے، ان کی بے آبروئی نہ ہونے دے اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے ان کا مخلص دوست بنا رہے- اپنے پیر بھائیوں سے جب ملاقات ہو تو اُن سے اپنے حق میں دُعا کا طالب ہو- اُن کے بارے میں کسی بدخواہ اور حاسد کی باتوں پر ہرگز کان نہ دھرے- پیر بھائیوں سے اگر کوئی تکلیف پہنچ جائے تو درگذر کر دیا کرے اور ان سے عفو و درگذر کا مطالبہ نہ کرے- اُن کے خلاف کسی کی مدد نہ کرے، اگر چہ پیر بھائی کے مخالف کا اُس کے اوپر حق ہو، پیر بھائی کے مال اور سرمائے کو اپنے مال اور جائداد کی طرح سمجھے- ان میں کوئی خیانت نہ کرے، اُن کی لغزشوں کی پردہ پوشی کرے، اُن کے حالات اور راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دے، اُن کے کسی گناہ اور برے عمل پر اُن کو غیرت اور عار نہ دلائے، بشرطے کہ وہ علانیہ گناہ کا ارتکاب کرنے پر جری نہ ہو کیوں کہ اس صورت میں اس کے جرائم کا واضح کرنا ضروری ہے تا کہ لوگ اس سے بچیں- ہاں! اگر وہ اپنے علانیہ گناہوں سے توبہ کر لے تو اب اس کے سابقہ گناہوں کا تذکرہ کرنا جائز نہیں- خلوت و جلوت میں ان کے حق میں دعا کرتا رہے، اُن کے ساتھ پُر خلوص محبت اور دوستی کا رشتہ رکھے، جب پیر بھائی کوئی کسی قسم کی نصیحت کرے تو برا نہ مانے بلکہ اسے مان لے- جب اللہ تعالیٰ کسی پیر بھائی پر اپنی رحمتوں کے دروازے کشادہ کرے تو ان سے حسد نہ کرے، کیوں کہ جب اپنے بھائیوں سے حسد کرے گا تو یہ خود اس کی اپنی رسوائی اور محرومی کا سبب ہوگا- کسی چیز میں خود کو ان سے ممتاز نہ سمجھے، اگر کوئی پیر بھائی کبھی فخریہ باتیں کرنے لگے تو یہ اُن سے خوشی اور فرحت کا اظہار کرے، ان کا فخر و مباہات میں مقابلہ نہ کرنے لگے بلکہ ان کے حق میں نعمتوں کی اور زیادتی کے لیے دعا کرے، ان کی برائی کرنے والے کا ساتھ نہ دے اگر چہ وہ اپنا بھائی ہی کیوں نہ ہو اور درست بات ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو کیونکہ اسلام میں عیب پوشی کا حکم ہے، پردہ دری کا نہیں، بلکہ اسے جھڑک دے اور ایسی باتوں سے باز رکھے، پیر بھائیوں میں چھوٹے بڑے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے، اگر کوئی کئی دن سے دکھائی نہ دے تو اُس کے حالات دریافت کرے، اگر کوئی پیر بھائی ضرورت مند ہو تو اس کی مدد کرے اور وسعت بھر اس کا

ہاتھ بٹائے- اگر کوئی پیر بھائی مقروض ہو تو قرض کی ادائیگی میں اس کی بھرپور مدد کرے، کسی پیر بھائی کو اگر پیر و مرشد نے خاص اہمیت دے رکھی ہو تو اس کا اتباع کرے اور بھی اسے محترم سمجھے اور اس کی خدمت بجا لانے کی کوشش کرے، اگر چہ وہ شخص عمر اور مرتبے میں اس سے چھوٹا ہو- سارے پیر بھائیوں پر ایسے شخص کا احترام اور اس کی اقتدا ضروری ہے- کسی گناہ گار کو اس کے پچھلے گناہ یاد نہ دلائے، بلکہ خود کو اس سے کم تر سمجھے اور یہ نہ کہے کہ میں اس سے افضل ہوں-

....

وہ آداب جنہیں مرید کو اپنے ساتھ برتنے چاہییں، وہ یہ ہیں:

مسکینی، فاقہ کشی اور عاجزی اختیار کرے، ہر چیز کا عمدہ پہلو اختیار کرے، نفسانی خواہشات اور لذتوں کو ترک کر دے، نفس امارہ کی بھرپور مخالفت کرتا رہے یہاں تک کہ موت طاری ہو جائے، دنیا کے معاملے میں زہد اختیار کرے، کبھی دنیا کی طرف التفات نہ کرے بلکہ اس سے بغض اور وحشت کا معاملہ رکھے، کبھی اس کی محبت دل میں نہ آنے دے کیونکہ دنیا کی محبت قربِ الٰہی کے لیے زبردست حجاب ہے، نفس سے بھرپور مجاہدہ کرتا رہے کیونکہ جو شخص مجاہدہ کرتا ہے وہ تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے اور جو شخص مجاہدہ نہیں کرتا اسے تجلیاتِ الٰہی کے مشاہدے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [العنکبوت:۶۹] اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیں گے-

یہ خیال نہ کرے کہ وہ خود وصول الی الحق کی طاقت رکھتا ہے- کیوں کہ یہ جہت کے لوازمات سے ہے اور وصول تو محدود چیز تک ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حدود اور جہات سے پاک ہے- پس نہ تو کوئی جہت اسے گھیر سکتی ہے اور نہ کوئی مکان اسے سمو سکتا ہے- نفس کی غفلت پر چشم پوشی نہ کرے، اپنے اعمال کو قلیل جان کر ہرگز نہ چھوڑے، رات کے اخیر تہائی حصے میں بیدار رہے، نوجوان لڑکوں کی صحبت اور عورتوں کی محبت سے بچتا رہے، ہاں اگر وہ اس کے اہل ہوں تو کچھ مضایقہ نہیں- مرشد کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھائے، اگر چہ والدین کی خدمت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ جب انسان دربارِ الٰہی کا قصد کرتا ہے تو اُس سے مخلوق کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں اور جب دو حق [حق اللہ اور حق العباد] متعارض ہوں تو اللہ تعالیٰ کا حق، بندوں کے حق سے مقدم سمجھا جائے گا مگر کسی عارض سے- [شریعت بہت سی جگہوں پر حق العبد کو مقدم رکھتی ہے، اس کی اپنی مصلحتیں ہیں اور یہ تقدیم بھی اللہ و رسول کے دربار سے ہی عطا ہوئی ہے-]

مرشد کے حقوق والدین کے حقوق پر چند وجوہ سے مقدم ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب کرتا

ہےاور یہ بات والدین میں نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو گناہوں کی پستیوں سے نکال کر نیکیوں کے باعزت عرش پر لا بٹھاتا ہے، عموماً والدین کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر علم الٰہی کی روشنی عطا کرتا ہے اور شقاوت سے نکال کر سعادت ابدی سے ہم کنار کرتا ہے، جب کہ عام طور سے والدین کو یہ سعادت نہیں ملتی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو دنیا سے زہد سکھاتا ہے اور آخرت کی رغبت دلاتا ہے، جب کہ والدین یہ نہیں کرتے۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کے لیے قیامت کی ہول ناکیوں سے نجات کا سامان اور سرمدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہوتا ہے، لیکن والدین کے لیے یہ سعادت نہیں ہوتی، بلکہ دنیا میں بھی شریعت کی نگاہ میں مرشد اور والدین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔

مرید اپنے اوراد و وظائف کو کبھی ترک نہ کرے کیوں کہ جو شخص ایک دن کا بھی ورد چھوڑے گا، اُس سے اُس دن کی مدد منقطع ہو جائے گی۔ جو ورد کی پابندی نہیں کرتا، اللہ کے دربار سے اس کی مدد نہیں ہوتی اور جو اپنے اوراد کے آداب کی حفاظت اور نگہ داشت کرتا ہے اور اُس کے حقوق کو ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے توفیق خیر عطا ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

....

فرمایا: ''دنیا کی کوئی خوشی جنت کی خوشی سے زیادہ نہیں اور دنیا کی کوئی تکلیف دوزخ کی تکلیف سے زیادہ نہیں۔''

ان دونوں باتوں کو اگر لوحِ دل پر نقش کر لوگے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر استقامت حاصل ہو جائے گی۔ تمنائے حصول جنت، حسنات کی طرف مائل کرے گی اور نفور دوزخ، سیئات سے بچائے گی۔

....

فرمایا: ''انسان کی چار قسمیں ہیں: ''اول وہ جو خود بھی علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔ دوئم وہ لوگ ہیں جو خود تو راہ مستقیم پر ہیں مگر مخلوق کو ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ سوئم وہ ہیں کہ انھوں نے علم تو حاصل کیا لیکن وہ علم نہ ان کی ذات کے لیے مفید ہوا، نہ مخلوق کو اس سے نفع پہنچا۔ چہارم وہ لوگ ہیں جنھوں نے علم و ہدایت کو قبول ہی نہیں کیا۔ یہ کفار ہیں۔

....

فرمایا: ادب بھی ایک عجیب نعمت ہے۔ جس کے پاس یہ دولت ہو، وہ سب کا محبوب ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص میں غرور و خود پسندی نہیں رہتی۔

....

فرمایا: فقیر کی صفت یہ ہے کہ خود نہیں کھاتا، دوسروں کو کھلاتا ہے۔ خود تکلیف اٹھاتا ہے، دوسروں کو راحت پہنچاتا ہے۔

....

فرمایا: جہاں تک ہو سکے، عاجزی و فروتنی اختیار کرنا چاہیے۔ غرور و تکبر خدا کو ہرگز پسند نہیں۔ جس قدر ممکن ہو، چھوٹا بننے کی کوشش کرے۔ پھل دار درخت ہمیشہ جھکا رہتا ہے اور جو بے پھل ہوتا ہے، اس کی شاخیں کبھی نہیں جھکتیں۔

....

فرمایا: تین کام کرنے سے تین باتیں بلا مشقت حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ خانۂ کعبہ کو دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔

۲۔ والدین کی صورت محبت و تعظیم سے دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔

۳۔ عالم یا بزرگ کی صورت دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔

○○○

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی

صوفی خواتین: ایک جائزہ

ایک مشہور صوفی کا قول ہے کہ ''پہلے تصوف ایک بے نام حقیقت تھا، مگر آج حقیقت سے خالی محض ایک نام ہے-'' یہ درست ہے کہ لفظ تصوف یا صوف قرآن وسنت میں وارد نہیں ہوا بلکہ قرآن میں لفظ تزکیہ اور حدیث میں لفظ احسان استعمال ہوا ہے، صوفیۂ کرام دراصل اسی تزکیہ و احسان کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا نام تصوف ہے اور چوں کہ تزکیہ و احسان ہمیشہ مطلوب رہا ہے، اس لیے اسلام کے ابتدائی ادوار میں یہ ایک حقیقت تھا، البتہ اس کو تصوف یا سلوک کے نام سے نہیں جانا جاتا تھا- بعد کے زمانے میں خاص طور پر تیسری صدی ہجری میں جب تصوف کی باضابطہ تشکیل ہوگئی اور وہ فقہ وکلام کی طرح ایک فن کے طور پر مدون ومروج ہو گیا تو ایسے بھی بہت سے لوگ پیدا ہو گئے جو ظاہر میں صوفی تھے لیکن باطنی آلائش وغفلت سے پاک نہیں تھے، شاید ان کو دیکھ کر ہی کسی نے مذکورہ بالا جملہ کہا ہوگا-

تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک کی جتنی ضرورت مردوں کو ہے اتنی ہی عورتوں کو بھی ہے اور اسلام نے روحانی ترقی کا جو موقع مردوں کو دیا ہے وہی عورتوں کو دیا ہے- چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ہے: ''ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کرنے والا ہوں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو-'' (آل عمران: ۱۹۵) ایک اور آیت میں فرمایا گیا: ''مردوں کے لیے اپنی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے اپنی کمائی کا حصہ ہے-'' (النساء:۳۲)

یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ قرآن میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ آیا ہے کہ مرد اور عورت خدا کے سامنے بالکل برابر ہیں جو نیک کام کرے گا، عمل صالح کرے گا، اچھائی کا حکم دے گا، صدقہ وخیرات کرے گا اس کو پورا پورا اجر دیا جائے گا، اس اجر میں کوئی صنفی تفریق نہیں ہوگی-

احادیث مبارکہ میں بھی یہی بات مبرہن کی گئی ہے- ایک حدیث میں آیا ہے: **انما النساء شقائق الرجال** - (بے شک عورتیں مردوں کے برابر ہیں-)

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں ہمیں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ عرب کا بدوی معاشرہ کس طرح تبدیل ہوکر ایک متمدن معاشرہ بن گیا اور کس طرح عورت اور مرد دونوں نے یکساں طور پر اپنی آخرت کی منزل کو آسان کرنے کی اور اپنے روحانی ارتقا کی کوشش کی- ایسی خواتین کی ایک بڑی تعداد کا تذکرہ، حدیث اور طبقات کی کتابوں میں محفوظ ہے، بلکہ ابن سعد اور ابن حجر وغیرہ مصنفین نے تو صرف عورتوں کے لیے ایک ایک جلد مخصوص کی ہے- ان میں عبادات، اوراد و اذکار، خیرات وزکوٰۃ، غلام آزاد کرنے اور درس وتدریس جیسے امور تک میں خواتین کی خدمات کا بھی مفصل تذکرہ ہے-

جیسا کہ شروع میں کہا گیا تصوف اس وقت ایک بے نام حقیقت تھا- یعنی لفظ تصوف کا استعمال نہیں ہوتا تھا- اس لیے کسی صحابی کو صوفی نہیں کہا جاتا اور اسی لیے اس عہد کی وہ خواتین جو عبادت واطاعت اور زہد وتقویٰ میں سبقت لے گئیں ان کو بھی خواتین صوفیہ یا الصوفیات نہیں کہا جاتا اور یہ فرق صوفیہ کرام نے خود روا رکھا ہے- صوفیہ کے سب سے بڑے تذکرہ نگار ابوعبدالرحمٰن السلمی نے صحابہ وتابعین کے عہد کے صوفیہ کا ذکر ''نساک'' کے نام سے کیا ہے اور فضیل بن عیاض کے بعد سے نساک کا ذکر لفظ صوفی سے کیا ہے-

تصوف وسلوک کی اس روایت میں حضرت حسن بصری کو پیش وائی حاصل ہے، اگرچہ وہ بھی صوف نہیں پہنتے تھے اور انہوں نے بعض اوقات اون پہننے کو ناپسند بھی کیا ہے- لیکن ان کے بعض تلامذہ اون پہنتے تھے وہ اگرچہ صوفی کے نام سے مشہور نہیں تھے، لیکن وہ صوفی تھے- حضرت حسن بصری کو صوفیہ اپنا سرخیل اور امام مانتے ہیں-

تصوف کی روایت میں جس طرح حضرت حسن بصری کا نام اساطین میں لیا جاتا ہے اسی طرح خواتین صوفیہ میں حضرت رابعہ بصریہ کا نام لیا جاتا ہے- راہ سلوک میں جس طرح صوفیہ مردوں سے اکتساب فیض کرتے تھے اسی طرح خواتین سے بھی مستفید ہونے والے بہت سے صوفیہ تھے- خود حضرت رابعہ بصریہ کے بارے میں ہے کہ امام سفیان ثوری ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کو اپنی مؤدِّبہ کہتے تھے- سلمی نے لکھا ہے کہ رابعہ کے علوم وحکمت کو سفیان ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے- (**ذکر النسوۃ المتعبدات الصوفیات** ،ص:۲۸) اسی طرح حضرت شعوانہ کے بارے میں ہے کہ زاہد، عابد اور ارباب قلوب ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور ان کے علوم سے استفادہ کرتے تھے، وہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتی تھیں- (ص: ۴۴) ذوالنون مصری نے فاطمہ نیشاپوریہ سے استفادہ کیا- (ص:۶۱) ابراہیم بن شیبان نے عائشہ الدینوریہ سے تربیت حاصل کی اور ان کے وصایا کو روایت کیا- (ص:۶۸) اس طرح بہت

سی صوفی خواتین مرد صوفیہ سے اخذ واستفادہ کرتی تھیں، جیسے بحریہ شقیق بلخی کی مریدہ تھیں-(ص: ۶۶)امۃ الحمید بن القاسم ابوسعید الخراز کی شاگردہ اور خادمہ تھیں-(ص:۶۹)ابوعثمان کی شاگردہ اور مریدہ فاطمہ بن احمد تھیں-(ص:۸۲)

مرد صوفیہ نے بہت سی صوفی خواتین کی عظمت اور ان کے مقام کا اعتراف کیا ہے- انہوں نے ام ہارون الدمشقیہ کی بڑی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ مجھے شام میں ان سے بہتر کوئی نام نہیں معلوم-(ص:۶۴)فاطمہ نیشاپوری کی ابویزید نے بہت تعریف کی ہے-(ص:۶۱)

جس طرح مرد صوفیہ ہر طرح کے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے اسی طرح صوفی خواتین بھی ہر طرح کے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتی تھیں-اسماعیل بن عیاش ایک عظیم محدث اور امام ہیں-ان کی والدہ بڑی متقی پرہیزگار اور صوفی خاتون تھیں-مہلب بن ابی صفرہ جو عہد بنی امیہ کے بڑے سرداروں میں ہیں، ان کی بیٹی اور حجاج بن یوسف کی اہلیہ ہند بھی بڑی مشہور صوفی خاتون تھیں-ان کے والد بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے-(اعلام النساء، ص:۵/۲۰۴-۲۰۶)

صوفی مردوں کے پہلو بہ پہلو ان گھرانے کی خواتین بھی بڑی پائے کی گزری ہیں-ابو عثمان الحیری کی بیٹی عائشہ بہت مشہور صوفی تھیں-(ص:۸۵)امام محمد بن سیرین کی بہن حفصہ بھی بہت مشہور صوفی خاتون تھیں-(ص:۵۱)بشر حافی کی دو بہنیں زبدہ اور مضغہ بھی بڑی مشہور صوفی خواتین تھیں-(ص:۸۸)اور ابوسلیمان دارانی کی دو بہنیں عبدہ اور آمنہ بھی بڑی پائے کی صوفیات تھیں-(ص:۸۹)ان کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے-احمد بن ابی الحواری کی اہلیہ رابعہ بنت اسماعیل بہت مشہور صوفی خاتون تھیں-(ص:۵۹)اسی طرح فاطمہ ام الیمن ابوعلی الرودباری کی اہلیہ بھی بڑی عابدہ وزاہدہ اور اعلیٰ پائے کی صوفی خاتون تھیں-(ص:۸۶)

صوفی خواتین کی خدمات کا ایک خاص پہلو ان کا وعظ ونصیحت اور درس وتدریس ہے- ایسی متعدد صوفی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے عام لوگوں میں وعظ وارشاد کی محفل آراستہ کی- مثلاً عبیدہ بنت ابی کلاب البصریہ کے بارے میں مشہور ہے کہ طفاۃ نام کے مقام پر آتیں اور وعظ و ارشاد کرتیں-سلمی نے ان کو جید المواعظ کہا ہے-(ص:۵۷)ام الاسود اور فاطمہ کے بارے میں سلمی نے لکھا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتی تھیں-(ص:۴۳-۶۲)

صوفی خواتین کا ایک پہلو جس کا تذکرہ بعض تذکرہ نگاروں نے کیا ہے وہ صوفی اور تصوف کی تعریف سے متعلق ہے، مثلاً فاطمہ بن احمد جو ابوعبداللہ الرودباری کی اہلیہ تھیں-انھوں نے فرمایا کہ میرا بیٹا صوفی نہیں ہے وہ ایک صالح انسان ہے، صوفی تو میرے بھائی (ابوعلی الرودباری) تھے-(ص:۱۰۰)

بعض صوفی خواتین اپنے شطحات اور مدہوشی کے لیے بھی مشہور تھیں-بعض صوفی خواتین بلکہ صوفی خواتین نے راہ سلوک کے علوم ومعارف اور احوال وکیفیات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے اور انہوں نے حب، مراقبہ، محبت، نفس کی آفات وغیرہ پر بے مثال اہم نکات پیش کیے ہیں-

راہ سلوک میں ایک مقام آتا ہے جب اعلیٰ درجات کے صوفیہ کی نگاہیں ایسے لوگوں پر ٹھہرتی ہیں جن کے یہاں تصوف ایک رسم ہے تو وہ ان صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں یہ وصف جس طرح مرد صوفیہ میں ہے اسی طرح خواتین صوفیہ کے یہاں بھی اس کی نظیر مل جاتی ہے-سلمی نے ایک خاتون کا تذکرہ کیا ہے جو صوفیہ پر تنقید کے لیے مشہور تھیں- ان کا نام فاطمہ الدمشقیہ ہے-(ص:۹۴)

صوفی خواتین اور صوفی مردوں میں اصل فرق صرف صنف کا تھا درجات کا نہیں، ورنہ جس طرح مسلمان مرد صوفیہ تھے اسی طرح مسلمان عورت صوفیات تھیں- دونوں کی خدمات، دونوں کے تجربات اور دونوں کے افکار ومعارف بالکل یکساں ہیں- دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے-مردوں کی استاد عورتیں رہیں اور عورتوں کے استاد مرد رہے-رشتہ وقرابت رہا اور اخذ واستفادہ بھی-

تذکرہ نویس اور مؤرخ بالعموم مرد ہوتے ہیں-ان مردوں کی رسائی بسا اوقات دور دراز کی خواتین تک نہیں ہوتی تھی اور جن تک ہو جاتی تھی ان کے بھی حالات تفصیل سے نہیں ملتے تھے، اس لیے صوفی عورتوں کے احوال تذکرہ نگاروں نے کم لکھے ہیں-اس کے باوجود بہت سے تذکرہ نگاروں نے صوفی خواتین کے ذکر پر مشتمل کتابیں لکھی ہیں، اپنی کتابوں میں صوفی خواتین کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً ابوعبدالرحمٰن السلمی کی کتاب ’’ذکر النسوۃ الصوفیات المتعبدات‘‘ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، صرف عورتوں کے حالات پر لکھا گیا واحد تذکرہ ہے-اس میں کم وبیش ۸۰ عورتوں کا تعارف کرایا گیا ہے-

’’ذکر النسوۃ الصوفیات المتعبدات‘‘ کے بعد سب سے مشہور تذکرہ جس میں خواتین کی بھی بڑی تعداد موجود ہے وہ ابن الجوزی کی صفۃ الصفوۃ ہے-اس کتاب میں مصنف نے کم وبیش ۱۳۰ خواتین کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں بڑی تعداد میں ایسی خواتین کی ہے مصنف کو جن کے نام کا علم نہیں، بلکہ نامعلوم عورت یا غیر معروف عورت کے نام سے ان کا تذکرہ کر دیا ہے، یا کچھ عورتوں کا تذکرہ فلاں کی بیٹی، فلاں کی بہن، فلاں کی بیوی یا فلاں کی والدہ کے نام سے کیا ہے-

صوفی خواتین کے تذکرے میں ایک اور انتہائی اہم کتاب ہے اور وہ ہے نفحات الانس- یہ کتاب علامہ جامی نے لکھی ہے جو فارسی زبان میں صوفیہ کا مستند ترین تذکرہ ہے-اس میں ۱۶

خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے-خواتین کے حالات پر بہت سی کتابیں ہیں لیکن خاص صوفی خواتین کے تذکرے پر مشتمل یہ کتابیں زیادہ شہرت رکھتی ہیں-بعض دوسری کتابوں میں بھی اکا دکا صوفی خواتین کا تذکرہ ہے لیکن سب سے اہم مراجع یہی ہیں-تذکرہ نگاروں نے صوفی خواتین کے تذکرے میں تعریف وتوصیف میں کمی نہیں کی اور جو حالات ملے ان کو پوری دیانت کے ساتھ بیان کر دیا؛ لیکن مختلف اسباب کی بنا پر خواتین کے حالات اور واقعات کم تعداد میں ملے-

تصوف کی تاریخ میں سب سے عظیم خاتون رابعہ بصریہ ہیں لیکن حضرت رابعہ بصریہ کی شخصیت جتنی اہم ہے اتنے ہی واعظوں اور قصہ گویوں نے ان کی شخصیت کے گرد اساطیری جالے بن دیے جن کی وجہ سے آج ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان کے وجود کو بھی مشکوک سمجھنے لگے، حتیٰ کہ دور حاضر کے نامور عالم علامہ یوسف القرضاوی نے ایک مستقل کتابچہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا وجود اساطیری نہیں حقیقی ہے-حضرت رابعہ بصریہ کے بارے میں مراجع کی کمی ہے۔ مثلاً دور اول کے اہم تذکرے جیسے طبقات الصوفیہ از ابوعبدالرحمٰن السلمی، حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی، میں سرے سے حضرت رابعہ کا ذکر ہی نہیں- الرسالۃ القشیریہ از ابوالقاسم القشیری میں ضمناً تذکرہ آیا ہے-ان وجوہات سے بھی ان کی شخصیت پورے طور پر واضح ہو کر سامنے نہ آسکی اور ان کا سب سے تفصیلی تذکرہ تذکرۃ الاولیاء از فریدالدین عطار میں ملتا ہے- اس میں کئی باتیں غیر تاریخی اور بعض کم زور روایتیں ان کی طرف منسوب کر دی ہیں-اس لیے حضرت رابعہ کی شخصیت تاریخی طور پر پردۂ ذہول میں چلی گئی اور صوفیانہ روایت میں ان کے گرد کرامات اور مافوق العادت واقعات کا ایسا ہالہ بن گیا کہ ان کی اصل شخصیت ہی دھندلا گئی-

اس کو حسن اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے طبقات الصوفیہ کے علاوہ ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی **ذکر النسوة الصوفیات المتعبدات**، یہ کتاب تاریخ اسلامی میں صوفی خواتین کا واحد تذکرہ ہے اور اس کا زمانۂ تصنیف ۴۱۲ھ ہے-اس میں حضرت رابعہ کا تفصیل ذکر موجود ہے اور یہ دراصل ان چیزوں سے بھی پاک ہے جو بعد میں ان کے حالات کا حصہ بن گئیں-

ابوعبدالرحمٰن السلمی نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور آل عتیک کی آزاد کردہ باندی تھیں-سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان کی باتوں پر بھروسہ کرتے تھے اور ان سے نصیحت سنتے تھے اور ان سے دعا کرانے کے متمنی رہتے تھے- رابعہ کے علوم وحکمت کو سفیان ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے-

جعفر بن سلیمان سے روایت ہے کہ سفیان ثوری نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا مجھے میری ادب

سکھانے والی کے پاس لے چلو جس سے جدا ہو کر مجھے راحت نہیں ملتی- جب ہم رابعہ کے پاس گئے تو سفیان نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا **اللھم انی اسئلک السلامة** تو رابعہ رونے لگیں- انہوں نے پوچھا آپ کیوں رونے لگیں؟ تو جواب دیا کہ مجھے آپ نے رلایا ہے- پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ سلامتی یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھوڑ دیا جائے اور یہ ہو نہیں سکتا، چوں کہ لوگ دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں-

شیبان الابلی کہتے ہیں کہ میں نے رابعہ کو کہتے سنا کہ ہر چیز کا ایک پھل ہوتا ہے اور معرفت کا پھل اعتراف ہے- یہی راوی یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا میں استغفار میں قلت صداقت سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں-

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا رسول اللہ سے تمھاری محبت کا کیا عالم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن مجھے خالق کی محبت نے مخلوق کی محبت سے پھیر رکھا ہے-حضرت رابعہ نے ایک دن رباح کو دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے بچے کا بوسہ لے رہے ہیں، حضرت رابعہ نے پوچھا کیا تم اس بچے سے محبت کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! حضرت رابعہ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتی تھی کہ غیر اللہ کی محبت کے لیے آپ کے دل میں کوئی جگہ ہے- اس پر رباح بے ہوش ہو کر گر پڑے- جب ہوش میں آئے تو کہا ''بلکہ یہ تو رحمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے-''

جعفر سے روایت ہے کہ محمد بن واسع رابعہ کے پاس گئے-وہ جھوم رہی تھیں-انہوں نے پوچھا آپ کیوں جھوم رہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں رات اپنے رب کی محبت میں مدہوش ہو گئی تھی-جب سے صبح ہوئی میں اس کے خمار میں ہوں-

حضرت سفیان ثوری نے حضرت رابعہ سے پوچھا کہ بندے کو اس کے رب سے قریب کرنے والی چیز کیا ہے؟ حضرت رابعہ رونے لگیں اور فرمایا کہ مجھ جیسی سے یہ سوال کیا جارہا ہے! پھر جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والی چیز یہ ہے کہ اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ بندہ دنیا وآخرت میں اس کے سوا کسی چیز سے محبت نہیں کرتا-

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا ہائے غم، حضرت رابعہ نے کہا جھوٹ مت بولو، یہ کہو ہائے غم کی کمی-چوں کہ اگر تم سچ مچ غم زدہ ہوتے تو یہاں آرام سے نہ رہتے-

حضرت رابعہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میرا غم یہ نہیں ہے کہ مجھے غم ہے بلکہ میرا غم یہ ہے کہ مجھے غم ہی نہیں-ایک مرتبہ حضرت رابعہ کا گزر بصرہ میں ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس کو بدکاری کے جرم میں سزا دی گئی تھی-حضرت رابعہ نے فرمایا کہ اس زبان پر میرے ماں باپ قربان ہوں

جس سے تو لا الہ الا اللہ کہتا تھا۔ (یعنی تیرے عمل نے تیرے قول کو باطل کر دیا۔)

ایک مرتبہ صالح مری نے ان کے سامنے کہا کہ جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اس کے لیے دروازہ کھل جائے گا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کون اس میں داخل ہوتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ کے یہ وہ حالات ہیں جو ابوعبدالرحمٰن السلمی نے **ذکر النسوۃ الصوفیات المتعبدات** میں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت رابعہ کے بارے میں مستند معلومات نہیں ہیں، حالاں کہ حضرت رابعہ کا تذکرہ بعد کے بہت سے مصنفین نے کیا ہے، لیکن ان سب کا مرجع تذکرۃ الاولیاء (فریدالدین عطار) ہے، جس میں عام طور پر غیر محتاط واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب سیدالطائفہ شیخ جنید بغدادی)

حضرت رابعہ بصریہ کے سلسلہ میں ایک مشکل اور بھی ہے وہ یہ کہ رابعہ نام کی متعدد خواتین ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے ان خواتین کو آپس میں ملتبس کر دیا ہے۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے اپنی کتاب میں رابعہ نام کی چار صوفی خواتین کا ذکر کیا ہے جبکہ علامہ جامی نے نفحات الانس میں دو رابعہ نام کی خواتین کا تذکرہ ہے۔ ایک رابعہ العدویہ (ص:۳۸۴) اور دوسری رابعہ الشامیہ جو احمد بن ابی الحواری کی اہلیہ تھیں۔ (ص:۳۸۶) امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں رابعہ العدویہ اور رابعہ بنت اسماعیل دونوں میں التباس کر دیا ہے۔ (تاریخ الاسلام ۲۴۱/۸-۳۴۳) ابوعبدالرحمٰن السلمی نے رابعہ کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آل عتیک کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ والد کا نام یا خاندان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ابوعبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ رابعہ العدویہ اور رابعہ الشامیہ دونوں کے والد کا نام اسماعیل ہے۔ (صفۃ الصفوۃ، ۲/۱۷۸) لیکن ابو عبدالرحمٰن کی مطبوعہ کتاب میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔

صوفی خواتین میں سب سے مشہور اور بڑا نام حضرت رابعہ بصریہ کا ہے۔ ان پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ اردو، عربی اور انگریزی میں کئی تحقیقی کتابیں لکھی گئیں، بلکہ قدما میں ابن الجوزی نے ان کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے صفۃ الصفوۃ میں کیا ہے، لکھا: **قد اقتصرت ھھنا علی ھذا القدر من اخبار رابعة لانی قد افردت لھا کتابا جمعت فیه کلامھا و اخبارھا.** (صفۃ الصفوۃ ۲/۱۷۲)

(یہاں میں رابعہ کے حالات میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے ان کے لیے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس میں ان کا کلام اور احوال جمع کیے ہیں۔)

حضرت رابعہ بصریہ کے علاوہ مشہور صوفی خواتین میں لبابہ المتعبدہ ہے۔ وہ بھی مشہور

خواتین میں سے ہیں۔ محمد بن روح نے ان کی روایات نقل کی ہیں۔ بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی محبت پیدا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس کا ذوق پیدا کرتی ہے اور اس کا ذوق اس سے انس پیدا کرتا ہے اور اس سے انس اس کی خدمت اور فرماں برداری پر دوام عطا کرتی ہے۔ (ص:۵۲) ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ میں (ص۴/۲۰۱) پر بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

مومنہ بنت بہلول کے بارے میں ابوعبدالرحمٰن السلمی نے لکھا ہے کہ وہ عظیم عابدات میں سے تھیں۔ ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ تم نے یہ مقامات کیسے حاصل کیے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے احکام کا اتباع، سنت رسول کی پیروی، مسلمانوں کے حقوق کی تعظیم اور نیک مسلمانوں کی خدمت کے ذریعہ۔ (ص:۳۴) صفۃ الصفوۃ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ (ص۲/۵۲۷)

رابعہ بصریہ کی معاصر مریم البصریہ تھیں جو رابعہ کے بعد بھی زندہ رہیں۔ فرماتی تھیں کہ جب سے میں نے سنا ہے: **و فی السماء رزقکم و ما توعدون.** (الذاریات:۲۲) میں نے نہ رزق کی فکر کی اور نہ اس کی طلب میں پریشان ہوئی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ محبت الٰہی سے سرشار تھیں، حتی کہ ایک دفعہ ایک واعظ محبت الٰہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اسے سن کر ان کا پتہ پھٹ گیا اور فوت ہو گئیں۔ (۳۳)

اس عہد کی ایک صوفی خاتون شبکۃ البصریۃ تھیں۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی کے زمانے میں مشہور تھیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی کی ساتھی یعنی راہ سلوک کی ساتھی تھیں، لیکن بھائی کا نام نہیں لکھا اور بعد کے کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا، اس لیے ان کی شخصیت اور ان کے بھائی کو متعین کرنا مشکل ہو گیا۔ البتہ ابوسعید الاعرابی نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں اس کا تذکرہ کیا تھا لیکن یہ کتاب مرور ایام سے ضائع ہو گئی۔ حضرت شبکہ فرماتی تھیں کہ ریاضتوں کے ذریعے اپنے نفس کو پاک کرو، جب نفس پاک ہو جائے گا تو عبادت میں ذوق وشوق پیدا ہو جائے گا۔ (ص۳۶)

رابعہ بصریہ کی ہم عصر اور انہی کے پائے کی ایک خاتون صوفی معاذہ بنت عبداللہ العدویہ تھیں۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے چالیس سال تک اپنی آنکھیں آسمان کی طرف نہیں اٹھائیں۔ معاذۃ بہت مشہور صوفی خاتون تھیں۔ ان کا تذکرہ بہت سے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ طبقات ابن سعد میں بھی ان کا ذکر ہے اور یحیٰ بن معین نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ مشہور تابعی صلہ بن اشیم العدوی کی اہلیہ تھیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ص:۴/۵۰۹) ابوعبد الرحمٰن السلمی نے ان کو رابعہ کی اقران اور دوستوں میں لکھا ہے، لیکن دیگر تذکروں خاص طور پر ابن سعد اور اصابہ کے اندراج کو پیش نظر رکھا جائے تو رابعہ سے معاصرت مشکوک ہو جاتی ہے۔ سلمی کی

کتاب کے محشی نے ان کی تاریخ وفات ۸۳ھ یا ۱۰۱ھ لکھی ہے- اگر یہ سال درست ہے تب بھی رابعہ سے معاصرت نہیں ہوسکتی چوں کہ حضرت رابعہ کی ولادت ہی اس کے بعد کی ہے-

بصرہ میں صالح المری کے عہد میں ایک اور بزرگ خاتون تھیں، جن کا نام ریحانۃ الوالہ ہے- سلمی نے ان کے کچھ عارفانہ اشعار نقل کیے ہیں- (ص:۳۸) اور ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے- (ص:۴/۵۷)

یوسف بن اسباط کی بیوی نسیبہ بنت سیمان بھی ایک مشہور خاتون تھیں- ان کا ایک مقولہ سلمی نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے میرے بارے میں سوال کرے گا، مجھے سوائے حلال کے کچھ مت کھلانا اور میری وجہ سے کوئی مشتبہ چیز حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا-'' (ص:۳۷)

عافیہ المشتاقہ عبدالقیس سے تعلق رکھتی تھیں- بصرہ کی رہنے والی تھیں- کثرت سے ذکر کرتی تھیں- رات میں جاگتیں، دن میں قبرستان میں جاتیں اور کہتیں کہ محبت کرنے والے اپنے محبوب سے مناجات سے نہیں تھکتے اور نہ کسی اور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں- (ص:۴۰)

شام کے محدث امام حافظ اسماعیل بن عیاش کی والدہ بھی ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں- محمد بن اسماعیل سے روایت ہے کہ میرے والد نے فرمایا کہ ان کی والدہ فرماتی تھیں کہ اگر مجھ کو یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو ضرور جنت میں داخل کردے گا تب بھی میں عبادت واطاعت میں زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کروں گی- ان کی والدہ ام عبداللہ بنت خالد بن معدان کے نام سے مشہور تھیں- (ص:۴۱)

رئیسہ بنت عمر والعدویہ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور معاذۃ العدویہ کی شاگرد تھیں- فرماتی تھیں کہ عمل کے ساتھ تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے- اخلاص ہو، عمل درست ہو، سنت کے موافق ہو- (ص:۴۷) تب ہی قابل قبول ہوگا-

ام الاسود بنت زید العدویہ ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں- معاذہ العدویہ نے ان کو دودھ پلایا تھا- حضرت معاذۃ نے ان کو نصیحت کی کہ حرام کھا کر میرے دودھ پلانے کو خراب مت کرنا- وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس کے بعد حلال رزق کے حصول کے لیے حتی الوسع جدوجہد کی اور اگر کبھی میں نے کوئی مشکوک نوالہ لیا تو پھر یا تو میرا کوئی فریضہ چھوٹ گیا یا کوئی ورد چھوٹ گیا- (ص:۵۷)

حضرت شعوانہ ایک عظیم صوفی اور عابدہ خاتون تھیں- ابلہ میں آتی تھیں، آواز بہت اچھی تھی، لوگوں کو وعظ کہا کرتی تھیں، عابد، زاہد اور ارباب القلوب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، وہ بہت رونے والی اور محنت ومجاہدہ کرنے والی تھیں- ابوعون کہتے ہیں کہ شعوانہ ایک دفعہ اتنی

روئیں کہ ہم کو ان کے اندھے ہوجانے کا اندیشہ ہوا- میں نے ان سے کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ آپ اندھی نہ ہوجائیں تو وہ اور روئیں اور کہا کہ بخدا دنیا میں اندھا ہونا مجھے آخرت میں اندھے ہونے کے مقابلے میں بہت پسند ہے- (ص:۴۴)

بصرہ میں حدیث کے مشہور امام حماد بن زید کی بہن معبدہ بنت زید بھی عظیم صوفی خواتین میں سے تھیں- سلمی نے ان کو رابعہ کے مثل لکھا ہے- (ص:۴۵)

عصامہ بنت بلال بن ابی الدرداء بھی بڑی عابدہ، زاہدہ اور نیک خواتین میں سے تھیں، ان کی بینائی جاتی رہی لیکن وہ اس پر صابر وشاکر رہیں- ان کا تذکرہ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب الزہد میں کیا ہے- یہ دراصل مشہور صحابی حضرت ابوالدرداء کی پوتی تھیں- سلمی نے ان کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں- (ص:۴۶)

امام محمد بن سیرین کی بہن حفصہ کا تذکرہ بھی اپنے عہد کی بڑی عابدات اور زاہدات خواتین میں کیا جاتا ہے- ابن سعد نے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ میں- سلمی نے بھی ان کا ایک مقولہ نقل کیا ہے- (ص:۵۱)

بصرہ کی ام سالم الراسبیۃ بھی عظیم صوفی خواتین میں تھیں- ابن جوزی نے ان کا ذکر کیا ہے اور سلمی نے بھی ان کے اقوال بیان کیے ہیں- (ص:۵۶)

جب اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے تو اس کو شکر کے ساتھ آگے بڑھ کر قبول کرو، قبل اس کے کہ اس نعمت پر زوال آجائے- (ص:۵۸)

رابعہ بنت اسماعیل ایک بڑے امیر گھرانے کی خاتون تھیں- ان کی شادی مشہور صوفی احمد بن ابی الحواری سے ہوئی اور انہوں نے اپنی ساری دولت اپنے شوہر پر قربان کردی وہ فرماتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی تھی کہ میرا مال آپ جیسا کوئی آدمی استعمال کرے-

رابعہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں برف کو دیکھتی ہوں تو اعمال ناموں کا تقسیم ہونا یاد آتا ہے- جب ندیوں کو دیکھتی ہوں تو میدان حشر یاد آتا ہے اور مؤذن کی اذان سنتی ہوں تو قیامت کی منادی یاد آتی ہے- (ص:۶۰-۵۹)

فاطمہ نیشاپوریہ بھی اپنے عہد کی عظیم صوفی خواتین میں تھیں- ابویزید بسطامی جیسے عظیم صوفی نے فاطمہ کی تعریف کی ہے- فرماتے تھے میں نے اپنی زندگی میں ایک مرد کو دیکھا اور ایک عورت کو یعنی اس پائے کا کسی اور کو نہیں دیکھا اور عورت فاطمہ نیشاپوری تھیں- ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ فاطمہ اللہ کے ولیوں میں سے ایک ولیہ ہیں- سلمی نے لکھا ہے کہ اپنے عہد میں فاطمہ سے زیادہ معزز اور بزرگ کوئی خاتون نہیں تھیں- (ص:۶۱-۶۲) النجوم الزاہرہ میں اور صفۃ

الصفوۃ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

شام میں ایک عظیم صوفی خاتون ام ہارون الدمشقیہ بھی تھیں۔ ابوسلیمان دارانی ان کے بارے میں کہتے تھے کہ میں نے شام میں ام ہارون سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا اور احمد بن الحواری ان سے وعظ و نصیحت سنتے تھے۔ (ص:۶۴)

بصرہ کی ایک عارفہ بحریہ بھی تھیں۔ انہوں نے شقیق بلخی کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کی۔ حضرت شقیق بلخی بھی اس کی تعریف کیا کرتے تھے اور ان کی نصیحتیں بصرہ میں لوگ بیان کرتے تھے۔ سلمی نے بصرہ کی ایک بڑھیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ بحریہ فرماتی تھیں کہ جب دل شہوات کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کو علم سے انسیت ہو جاتی ہے، اس کا اتباع کرتا ہے اور جو علم اسے حاصل ہوتا ہے اس کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ص۶۶) ابن الجوزی نے بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ (صفۃ الصفوۃ، ص:۳۹/۴)

ابوحمزہ ابوالحسن نوری اور جنید بغدادی کے حالات میں ایک خاتون زیتونہ کا نام آتا ہے جو دراصل ان دونوں بزرگوں کی خادمہ تھیں۔ عام طور پر مؤرخین نے ان کا تذکرہ محض ایک خادمہ کے کیا ہے۔ سلمی نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی عظیم صوفی خاتون تھیں اور زیتونہ کے نام سے مشہور تھیں، ورنہ ان کا اصل نام فاطمہ تھا۔ سلمی نے ان کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے جو دراصل ابوالحسن نوری سے متعلق ہے اور اس کا تذکرہ خطیب بغدادی نے بھی کیا ہے۔

صفراء الرازیۃ نام کی ایک عابدہ خاتون کا تذکرہ سلمی نے کیا ہے۔ دراصل ابوحفص نیشاپوری نے اپنے رے کے دوران قیام اس خاتون سے شادی کی تھی اور جب رے سے جانے کا ارادہ کیا تو اس خاتون سے کہا کہ تم طلاق لے لو چوں کہ میں جا رہا ہوں اور مجھے نہیں معلوم کب واپس آؤں گا۔ اس خاتون نے اس کو پسند کیا کہ ابوحفص کے نکاح میں رہے اور چلتے ہوئے کچھ نصیحتیں ان سے سنیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ سلمی نے کیا ہے۔ (ص:۷۳)

احمد بن خضرویہ کی اہلیہ ام علی بھی بڑی عابدہ زاہدہ اور عارفہ خاتون تھیں۔ خود بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلمی نے لکھا ہے کہ کانت من بنات الرؤساء والاجلاء . ابوحفص نیشاپوری اور ابویزید بسطامی نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابویزید بسطامی کہا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ تصوف اختیار کرے وہ ام علی کی طرح کرے۔ سلمی نے ان کے بعض اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ (ص:۷۶)

مشہور صوفی ابوعثمان الحیری النیشاپوری کی بیٹی عائشہ بھی عابدہ وزاہدہ خواتین شمار ہوتی ہیں۔

سلمی نے لکھا ہے کہ وہ ابوعثمان کی اولادوں میں سب سے زیادہ عابد و زاہد تھیں۔ سلمی نے ان کی صاحبزادی ام احمد سے ملاقات کی اور ان کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے متعدد اقوال سنائے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ میری والدہ نے مجھے نصیحت کی کہ بیٹی جو فنا ہونے والا ہے اس پر خوش ہونے کی ضرورت نہیں اور جو چیز جانے والی ہے اس پر غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوش رہنے کے لیے اللہ کافی ہے اور اصل غم کی بات یہ ہے کہ اس کی معافی کے فیضان سے محروم ہو جاؤ۔ (ص:۵۸)

مشہور صوفی بشر الحافی کی تین بہنیں بھی اپنے وقت کی عظیم صوفی خاتون تھیں۔ سلمی نے زبدۃ اور مضغۃ دونوں بہنوں کا ذکر کیا ہے۔ (ص:۸۸) ابن الجوزی نے تیسری بہن مخۃ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (ص۲/۵۲۴۔۵۲۶) امام یافعی نے مخۃ سے متعلق امام احمد بن حنبل کے تعریفی کلمات بھی لکھے ہیں۔ (مرآۃ الجنان، ص:۹۴/۲)

فاطمہ دمشقیہ بھی ایک عظیم صوفی خاتون ہیں۔ سلمی کے بقول وہ صوفیہ پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔ جب ابوالحسین المالکی دمشق آئے تو انہوں نے جامع دمشق میں تقریر کی اور اچھی تقریر کی۔ اس کے بعد فاطمہ ان کی مجلس میں آئیں اور ان سے کہا اے ابوالحسن! آپ نے تقریر کی، بلاشبہ اچھی تقریر کی اور آپ اچھی تقریر کرتے ہیں، لیکن یہ بتائیے کہ کیا آپ اچھی طرح خاموش بھی رہ سکتے ہیں؟ ابوالحسن لاجواب ہو گئے اور پھر کبھی نہیں بولے۔

اوپر کے صفحات میں صوفی خواتین سے متعلق چند باتیں عرض کی گئیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی میراث میں صوفی خواتین، ان کی اہمیت و معنویت اور نمونے کے طور پر چند خواتین کا ذکر کیا جائے۔ اس کا مقصد صوفی خواتین کے افکار و تجربات کا اظہار نہیں ہے بلکہ صرف میراث اسلامی میں ان کا تذکرہ اور تذکرہ کا انداز بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لیے نمونہ کے طور پر چند خواتین کا ضمنی سا تذکرہ بھی اس مضمون میں درج کر دیا گیا۔ یہ موضوع اپنی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے مستقل تحقیقی کام کا متقاضی ہے۔

مصادر و مراجع

۱۔ ابوعبدالرحمٰن السلمی: ذکر النسوۃ المتعبدات الصوفیات، تحقیق: الدکتور محمود محمد الطناحی، مکتبۃ الخانجی، قاہرۃ، طبع اول: ۱۹۹۳ء

۲۔ ابوالفرج عبدالرحمٰن الجوزی: صفۃ الصفوۃ، دار ابن خلدون، اسکندریۃ

۳۔ ابوعبدالرحمٰن جامی: نفحات الانس، اصفہان

○○○

ضیاء الرحمن علیمی

حافظ ابن قیم جوزی اوران کا ذوق تصوف

حرف آغاز

تصوف ایک حقیقت ہے جو کسی خاص جامۂ الفاظ کا پابند نہیں۔ لبادہ کوئی بھی ہو، الفاظ جو بھی ہوں، تعبیر جیسی بھی ہو، اگر اس خاص حقیقت و ماہیت اور مفہوم و معنی کی تبلیغ و ترسیل ہو رہی ہو جو قرآن و حدیث میں ہے اور جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر میں ''احسان'' کہا گیا ہے، تو اسے قبول کیا جائے گا اور کسی وجہ شرعی کے بغیر اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ بعض متقدمین علما نے اگر تصوف پر تنقید کی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ حقیقت تصوف ''احسان'' کے منکر تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تحقیق کے مطابق تصوف کے نام پر رائج بعض باتیں اعتدال و توازن، آسانی اور نرمی اور فلسفیانہ موشگافیوں سے براءت، جو اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے، اور جادہ شریعت سے منحرف نظر آئیں۔ چناں چہ انہوں نے اپنے مزاج و منہاج کے مطابق تنقید کی اور اپنی سمجھ کے لحاظ سے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی محقق سے اس کا یہ علمی حق چھینا نہیں جا سکتا۔ لیکن اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جس طرح کسی بھی اسلامی محقق و ناقد سے اصول اسلام کی روشنی میں کسی بھی نظریے کی تحقیق اور اس پر تنقید کا حق سلب کر لینا ایک علمی جرم ہے اسی طرح اس کی تحقیق کو حرف آخر سمجھ لینا اور اس کی تنقید کو وحی کا درجہ دینا شرک فی النبوۃ کے مترادف ہے اور جس طرح اس محقق کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ کسی بھی نظریے یا عمل کو قرآن و سنت کے معیار پر پرکھے، اسی طرح آنے والے محققین کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ ان محققین و ناقدین کی تحقیقات و تنقیدات کو اسی شرعی کسوٹی پر پرکھ کر اپنا فیصلہ صادر کرے۔

متقدمین علما میں جن لوگوں نے تصوف کو قرآن و سنت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی، ان میں دو شخصیتیں علامہ ابن جوزی اور شیخ ابن تیمیہ بہت مشہور ہوئیں۔ اس حوالے سے ایک تیسرا

نام حافظ ابن قیم الجوزیہ کا بھی خاصا اہم ہے، جن کا ذوق تصوف اس وقت زیر بحث ہے۔ لیکن ان حضرات کی ان تنقیدوں سے کیا یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ یہ لوگ تصوف کو بالکلیہ مسترد کرنے والے اور کسی صورت میں بھی اسے قبول کرنے والے نہیں تھے، تصوف سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور ذوق تصوف سے یہ لوگ بالکلیہ محروم تھے؟ یا پھر ان کی بعض تحریروں کی روشنی میں یہ فیصلہ صادر کر دیا جائے کہ یہ تینوں حضرات یکساں طور پر ذوق تصوف رکھتے تھے اور خود یہ حضرات بھی صوفی تھے؟ آخر حقیقت کیا ہے؟ اس سے قبل لکھے گئے مقالات میں اول الذکر دو شخصیتوں سے متعلق اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، اب آنے والے صفحات میں علامہ ابن قیم جوزی کے حوالے سے بھی اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مقالے کا منہج یہ ہوگا کہ پہلے حافظ ابن قیم جوزی کی شخصیت، ان کے احوال زندگی اور علمی مقام کو مختصراً بیان کیا جائے گا اور پھر تصوف سے متعلق ان کی مختلف تحریروں کو ذکر کر کے اس کا تجزیہ کیا جائے گا اور اخیر میں حاصل شدہ نتائج کو بیان کیا جائے گا۔

حافظ ابن قیم: ولادت، تعلیم و تربیت

امام الجوزیہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابو بکر بن ایوب بن سعد بن جریز زرعی معروف بہ ابن قیم الجوزیہ ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں اپنی زندگی کے روز و شب گزارے اور وہیں ۷۵۱ھ میں آسودۂ خاک ہوئے۔ شہاب نابلسی، قاضی تقی الدین سلیمان، فاطمۃ بن جوہر، عیسی مطعم، ابو بکر بن عبد الدایم اور اساتذۂ وقت کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ فقہ حنبلی میں مہارت پیدا کی اور فتوی نویسی شروع کی۔ (۱)

علمی مقام

یوں تو ان کو تمام اسلامی علوم میں درک حاصل تھا لیکن بطور خاص تفسیر میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ اصول دین میں بھی وہ مقام کمال پر فائز تھے۔ فقہ، اصول فقہ، علوم عربیہ، علم نحو اور علم کلام میں بھی کمال حاصل تھا۔ حدیث، فقہ حدیث اور استنباط دقائق میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ امام ذہبی نے اپنی مختصر میں لکھا ہے کہ ابن قیم کو قبول حدیث اور رجال حدیث کی طرف بڑی توجہ تھی۔ وہ فقہ کے مطالعے میں مشغول رہے اور مسائل فقہی کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھتے تھے۔ قاضی برہان الدین زرعی نے فرمایا: میں اس وقت اس نیلگوں آسمان کے نیچے ان سے زیادہ وسیع العلم نہیں پاتا۔ (۲)

شخصیت و سیرت

علامہ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن قیم بڑی محبت رکھنے والے آدمی تھے۔ نہ کسی سے حسد و کینہ رکھتے، نہ کسی کو تکلیف پہنچاتے اور نہ کسی کی عیب جوئی کرتے۔ میری ان

کے ساتھ سب سے زیادہ صحبت تھی اور میں ان کو بڑا محبوب تھا-(۳) اور حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ معصوم تو نہیں تھے لیکن میں نے قرآن وسنت کے معانی و مفاہیم اور ایمانی حقائق جیسی خصوصیات میں ان کی طرح آدمی نہیں دیکھا- اپنے استاذ شیخ ابن تیمیہ کی طرح وہ بھی آزمائش کے مرحلے سے گزرے- چناں چہ جب شیخ ابن تیمیہ قلعے میں قید کیے گئے تو وہ بھی محبوس ہوئے اور شیخ کے انتقال کے بعد ہی ان کی رہائی ہوئی-(۴)

علمی خدمات

حافظ ابن قیم جوزیہ نے تدریس اور تصنیف دونوں طریقے سے دین متین کی خدمات انجام دیں، چناں چہ شیخ ابن تیمیہ کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا- فضلائے زمانہ ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے اور ان کی شاگردی کو اپنے لیے باعث شرف سمجھتے تھے- انہوں نے صدریۃ میں تدریسی خدمت انجام دی اور جوزیہ میں طویل مدت تک امامت کے فرائض نبھائے- ان سے تحصیل علم کرنے والوں میں ابن عبدالہادی اور ابن رجب جیسے اکابر شامل ہیں-

ان کو علم سے بڑی محبت تھی- کتابوں کی ذخیرہ اندوزی، مطالعہ اور تصنیف وتالیف سے بڑا شغف تھا- چناں چہ انہوں نے وہ کتابیں ذخیرہ کر رکھی تھیں جو دوسروں کو میسر نہیں ہو سکیں- انہوں نے خود اپنی تصنیفات کا ایک بڑا اثاثہ یادگار چھوڑا ہے- ان کی تصانیف میں سے بعض نمایاں کتابیں درج ذیل ہیں:

(۱) تھذیب سنن ابی داؤد (۲) اعلام الموقعین عن رب العالمین (۳) زاد المعاد فی ھدی خیر العباد (۴) جلاء الافھام فی الصلوٰۃ والسلام علی محمد خیر الانام (۵) بدائع الفوائد (۶) اجتماع الجیوش الاسلامیۃ علی غزو الفرقۃ الجھمیۃ (۷) نقد المنقول والمحک الممیز بین المردود والمقبول (۸) شرح اسماء الکتاب العزیز (۹) الکلم الطیب والعمل الصالح (۱۰) امثال القرآن-(۵)

شیخ ابن قیم کے قلمی آثار کے مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ حسن ترتیب، علمی نظم اور عمدہ پیش کش کے لحاظ سے ان کی تصنیفات شیخ ابن تیمیہ سے بھی ممتاز ہیں- ان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تمام تالیفات میں تصوف کی چاشنی، فکر کی روحانیت، روح کی پاکیزگی اور عبارت کی دل کشی اور دلآویزی پائی جاتی ہے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بقول یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے جس میں جلال سے زیادہ جمال غالب ہے-(۶)

حافظ ابن قیم تیمی درس گاہ کے فرد فرید

شیخ ابن تیمیہ سے استفادہ کرنے والے فاضلین کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان کی شخصیت اور فکر کا جو گہرا رنگ حافظ ابن قیم کی شخصیت میں پایا جاتا ہے وہ کسی میں نہیں پایا جاتا- وہ ان کے علوم وافکار کے مرتب وناشر ہیں- انہوں نے شیخ ابن تیمیہ کے شذوذ اور تفردات مثلاً زیارت قبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت سے سفر، مسالۃ طلاق وغیرہ میں ان کی حمایت میں فتوی دیا اور اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھیں-(۷) اپنے شیخ کی صحبت اختیار کی تو پھر آخری لمحے تک ان کے رفیق ومونس رہے اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے مسلک ومشرب پر قائم اور ان کی محبت میں سرشار رہے- وہ اپنے استاذ کی شخصیت وسیرت اور ان کے علوم وافکار کے مکمل آئینہ دار ہیں، چناں چہ وہ اپنی کتابوں میں اپنے شیخ کے اقوال کثرت کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور انہیں مقام استدلال میں پیش کرتے ہیں-(۸) استاذ اور شاگرد کی شخصیت میں صرف اتنا فرق ہے کہ استاذ کی شخصیت پر غضب وجلال غالب تھا جب کہ شاگرد کے مزاج پر جمال اور رنگ تصوف نمایاں ہے-

ذوق تصوف کی کسوٹی

ابن قیم جوزی تصوف کو قبول کرتے ہیں یا نہیں، ان کو تصوف سے کوئی تعلق اور تصوف سے کوئی ذوق تھا یا نہیں؟ یہ ایک سوال ہے- اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے اس تصوف کے خط وخال کو واضح کر لیا جائے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں- چناں چہ اگر صوفیۂ کرام کے پورے مشن کا جائزہ لیا جائے تو تصوف کی جو حقیقت سامنے آتی ہے اس کو دو نقطوں میں سمویا جا سکتا ہے: پہلا تزکیۂ نفس اور دوسرا مقام احسان تک رسائی- ان کے مشن کا پہلا نقطہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث طیبہ کی بہت سی تصریحات سے مستفاد ہے- تزکیے کا مفہوم یہ ہے کہ نفس کو جملہ اخلاق رذیلہ سے پاک کر کے جملہ اخلاق حمیدہ سے آراستہ کیا جائے تاکہ انسان بارگاہ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو جائے- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قد افلح من زکّٰھا.** (۹) (یقیناً وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا-)

صوفیہ کے مشن کا دوسرا نقطہ حدیث جبریل سے لیا گیا ہے- تصوف کو حدیث جبریل میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے- احسان کے دو درجے ہیں: (۱) مشاہدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے گویا ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہوں، یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے- احسان کا دوسرا درجہ مراقبہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے وقت اگر مشاہدہ اور دیدار کی کیفیت نہ پیدا ہو سکے تو کم از کم اس یقین کے ساتھ ضرور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے-

تصوف کی اس تعریف کے بعد یہ طے ہو جاتا ہے کہ جو بھی جماعت اس مشن پر قائم ہو گی

وہ جماعت صوفیہ کی ہوگی اور جو بھی شخص اس مشن میں مصروف اور اس کے فروغ کے لیے اپنی شبانہ روز خدمات پیش کرنے والا ہوگا وہ یا تو صوفی ہوگا یا متصوف اور ذوق تصوف رکھنے والا اور جہاں تک بعض فقہی مسائل میں اختلاف اور شذوذ وتفرد کی بات ہے تو علمائے اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا عالم نہیں ملے گا جس کے یہاں بعض مسائل میں شذوذ اور تفرد نہ پایا جاتا ہو- بہر حال یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کس کر ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ کوئی شخص ذوق تصوف رکھتا ہے یا نہیں- یہاں ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ لفظ تصوف کو قبول کرتا ہے یا نہیں اور بعض فروعی وجزوی مسائل مثلاً سماع یا کسی عمل کے بدعت وسنت ہونے میں مکمل طور سے جماعت صوفیہ کے ساتھ ہے یا نہیں، ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ حقیقت تصوف کو قبول کرتا ہے یا نہیں اور اس کے اثرات اس کی زندگی میں پائے جاتے ہیں یا نہیں-

تصوف سے متعلق ابن قیم کی رائے

حافظ ابن قیم تیمی درس گاہ کے بے نظیر فاضل ہیں- شیخ ابن تیمیہ سے علمی طور پر استفادہ کرنے والوں میں کسی پر ان کی فکر کا وہ گہرا اثر اور وہ پختہ چھاپ نہیں نظر آتی جو ابن قیم پر نظر آتی ہے- چناں چہ تصوف کے معاملے میں بھی وہ وہی نظریہ رکھتے ہیں جو ان کے استاذ شیخ ابن تیمیہ رکھتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ تنقید تصوف کو انہوں نے اپنی تصانیف میں باضابطہ موضوع نہیں بنایا ہے، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے موضوعات تصوف کو کثرت سے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے- دوسری بات یہ ہے کہ اگر کہیں تنقید بھی کی ہے تو ان کے یہاں اس باب میں وہ شدت اور وہ تیکھا پن نہیں پایا جاتا ہے جو ان کے استاذ شیخ ابن تیمیہ کی خصوصیت ہے-

تصوف سے متعلق ان کی آرا کو مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے:

(۱) وہ فلسفیانہ تصوف کے منکر ہیں اور وحدۃ الوجود کی دقیق فلسفیانہ تعبیرات کو اپنی تحقیق کے لحاظ سے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے بالکلیہ رد کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک وحدۃ الوجود کے قائلین اتحاد وحلول کا قول کرنے والے یا پھر اس تک لے جانے والے ہیں، لیکن اگر وحدۃ الوجودی اقوال مشائخ صوفیہ کی طرف منسوب ملتے ہیں تو وہ اس میں تاویل کر کے یہ بتاتے ہیں کہ دراصل وہ توحید، توحید وجودی نہیں ہے، بلکہ وہ توحید شہودی ہے اور ان صوفیہ کا یہ مقصود نہیں ہے کہ خارج میں ماسوائے رب کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ایک خاص حالت طاری ہونے کے وقت، جسے صوفیہ فنا سے تعبیر کرتے ہیں، ماسوا کا وجود سالک کے شہود واحساس سے فنا ہو جاتا ہے-

(۲) وہ جاہل صوفیہ پر تنقید کرنے والے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ مشائخ صوفیہ اصول

کتاب وسنت سے جڑے رہے اور وہ شاہ راہ ہدایت پر گام زن رہے اور جب جس قدر اس جماعت کے مترسمین ومستصوفین نے اصول سے انحراف کیا اسی وقت سے اور اسی قدر وہ راہ اعتدال سے منحرف ہو گئے اور پھر ان کے وہ عقائد ونظریات سننے میں آئے جو قلب ونگاہ پر گراں ہیں-(۱۰)

(۳) وہ صوفیہ کو یکسر گمراہ نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ وہ گروہ صوفیہ کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں: (۱) صوفیۃ الحقائق (۲) صوفیۃ الرسوم (۳) صوفیۃ الارزاق-صوفیۃ الحقائق کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ صوفیہ ہیں جن کے آگے علما اور فقہا کی گردنیں جھکتی ہیں-

شرح منازل السائرین میں لکھتے ہیں:"**الصوفية ثلاثة اقسام: صوفية الأرزاق، وصوفية الرسوم، وصوفية الحقائق وبدع الفريقين المتقدمين يعرفها كل من له إلمام بالسنة والفقة ...... وإنما الصوفية صوفية الحقائق الذين خضعت لهم رؤوس الفقهاء والمتكلمين، فهم فى الحقيقة علماء حكماء.** " (۱۱)

ترجمہ: صوفیہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) صوفیۃ الارزاق، (۲) صوفیۃ الرسوم اور (۳) صوفیۃ الحقائق - پہلے دونوں گروہوں کی بدعتوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کو سنت وفقہ سے تھوڑا سا بھی لگاؤ ہے...... درحقیقت صوفیہ تو صوفیۃ الحقائق ہیں جن کے آگے فقہا اور متکلمین کی گردنیں جھکتی ہیں، یہی لوگ درحقیقت علما اور حکما ہیں-

ایک دوسرے مقام پر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

أعز الخلق خمسة انفس: عالم زاهد وفقيه صوفي، وغني متواضع وفقير شاكر وشريف سنيّ. (۱۲)

ترجمہ: مخلوق میں عزیز ترین لوگ پانچ ہیں: عالم جو زاہد ہو، فقیہ جو صوفی ہو، غنی جس کے اندر تواضع ہو، فقیر جو شکر گزار ہو اور شریف جو روشن کردار کا حامل ہو-

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

أنهم (اى الصوفية) كانوا أجل من هذا وهمهم اعلى واشرف، انماهم حاكمون على اكتساب الحكمة والمعرفة وطهارة القلوب وزكاة النفوس وتصحيح المعاملة- (۱۳)

ترجمہ: وہ لوگ (صوفیہ) اس سے بہت برتر ہیں اور ان کا مقصود اعلیٰ اور اشرف ہے- یہ لوگ حکمت ومعرفت کے حصول، قلب کی طہارت اور نفس کی ستھرائی اور معاملے کی درستگی پر حکم لگانے والے ہیں-

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

التصوف زاوية من زوايا السلوك الحقيقي وتزكية النفس وتهذيبها لتستعد لسيرها إلى صحبة الرفيق الاعلىٰ ومعية من تحبه. (۱۴)

ترجمہ: تصوف سلوک حقیقی، تزکیہ وتہذیب نفس کے گوشوں میں سے ایک گوشہ ہے، تا کہ نفس رفیق اعلیٰ کی صحبت اور محبوب کی معیت کے سفر کے لائق ہو جائے۔

ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

ومنها ان هذا العلم (التصوف) هو من اشرف علوم العباد وليس بعد علم التوحيد اشرف منه وهو لايناسب إلا النفوس الشريفة- (۱۵)

ترجمہ: اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ علم (تصوف) بندوں کے علوم میں سب سے زیادہ شرف والا ہے اور علم توحید کے بعد اس علم سے زیادہ شرف والا کوئی علم نہیں اور یہ علم شریف نفوس کے ہی لائق ومناسب ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

الدين كله خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في الدين وكذلك التصوف، قال ابو بكر الكتاني: التصوف خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في التصوف. وقال شيخ الاسلام: واجتمعت كلمة الناطقين في هذا العلم أن التصوف هو الخلق، وجمع الكلام فيه يدور على قطب واحد وهو بذل المعروف وكف الاذى. (۱۶)

ترجمہ: دین سراسر اخلاق ہے، تو جو تم میں سے اخلاق میں زیادہ ہوگا وہ دین میں تم سے بڑھ کر ہوگا، اور یہی حال تصوف کا ہے۔ ابوبکر کتانی نے فرمایا: تصوف سراسر اخلاق ہے، تو جو تم سے اخلاق میں بڑھ کر ہوگا، وہ تم سے تصوف میں بڑھ کر ہوگا۔ شیخ الاسلام (عبداللہ انصاری) نے فرمایا: اس علم میں کلام کرنے والوں کا اتفاق ہے کہ تصوف سراسر اخلاق ہے اور اس میں کلام کا مدار ایک ہے اور وہ یہ ہے: بھلائی پھیلانا اور تکلیف دور کرنا۔

ایک مقام پر شطحات کا ذکر کر کے صوفیہ کے تعلق سے عادلانہ فیصلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وهذه الشطحات أوجبت فتنة على طائفتين من الناس: احداهما حجبت بها عن محاسن هذه الطائفة ولطف نفوسهم وصدق معاملتهم فأهدروها لما حل من هذه الشطحات وانكروها غاية الانكار وأساءوا الظن بهم مطلقا وهذا عدوان وإسراف...... وهذه الشطحات ونحوها هي التي حذر منها سادات القوم وذموا عاقبتها وتبروؤا منها. (۱۷)

ترجمہ: یہ شطحات دو جماعتوں کے لیے فتنے کا سبب بنے، ایک جماعت ان کی وجہ سے اس جماعت (صوفیہ) کے محاسن، ان کے نفوس کی لطافت اور ان کے معاملے کی سچائی سے محجوب ہوگئی۔ ان شطحات کی وجہ سے انہوں نے ان کو چھوڑ دیا، ان کا شدومد سے انکار کیا اور ان سے پوری طرح بدگمان ہوگئے۔ یہ حد سے تجاوز اور اسراف ہے۔ ان شطحات سے سادات صوفیہ نے ہوشیار رہنے کو کہا ہے اور اس کے انجام کی مذمت کی ہے اور اس سے براءت کا اظہار کیا ہے۔

طریقۂ صوفیہ کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاعلم أن في لسان القوم (اى الصوفية) من الاستعارات وإطلاق العام وإرادة الخاص، وإطلاق اللفظ وارادة الاشارة دون حقيقة معناه، ما ليس في لسان احد من الطوائف غيرهم. ولهذا يقولون نحن اصحاب اشارة لا اصحاب عبارة والاشارة لنا والعبارة لغيرنا. وقد يطلقون العبارة التي يطلقها الملحد ويريدون بها معنى لافساد فيه. وصار هذا سببا لفتنة طائفتين: طائفة تعلقوا عليهم بظاهر عباراتهم فبدّعوهم وضلّلوهم وطائفة نظروا إلى مقاصدهم ومغزاهم فصبوا تلك العبارات وصححوا تلك الاشارت فطالب الحق يقبله ممن كان ويرد ما خالفه على ما كان. (۱۸)

ترجمہ: ذہن نشین رہے کہ صوفیہ کے یہاں استعارات ہوتے ہیں، وہ عام بول کر خاص مراد لیتے ہیں اور لفظ بول کر اشارہ مراد لیتے ہیں، اس کے حقیقی معنی مراد نہیں لیتے۔ یہ باتیں دوسری جماعتوں میں نہیں پائی جاتیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں: ہم اہل اشارہ ہیں، اہل عبارت نہیں، اور یہ کہ ہمارے لیے اشارہ ہے اور دوسروں کے لیے عبارت۔ وہ لوگ کبھی ملحدین کی ایسی عبارتیں بول کر ایسے معنی مراد لیتے ہیں جس میں کوئی فساد نہیں ہوتا اور یہ چیز دو جماعتوں کے لیے فتنے کا سبب بنی۔ ایک وہ جماعت جس نے ان کی ظاہری عبارت کو لے کر ان کو بدعتی اور گمراہ قرار دے دیا، دوسری وہ جماعت جنہوں نے ان کے مقصود ومراد کو دیکھتے ہوئے ان عبارات سے وہ اشارہ لینا صحیح قرار دے دیا۔ حق کا طلب گار حق کو قبول کرتا ہے جہاں سے بھی آئے اور جو حق کے مخالف ہو اس کو رد کر دیتا ہے خواہ وہ جس بنیاد پر بھی ہو۔

طریقۂ صوفیہ کے بیان کے ضمن میں وحدۃ الوجودی تعبیرات، اس کے حلولی واتحادی پہلو، عارفین صوفیہ کے یہاں پائے جانے والے ان الفاظ کے صحیح معانی اور پھر ان کے فہم میں غلطی کے وقوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فاياك ثم اياك والالفاظ المجملة المشتبهة التي وقع في اصطلاح

القوم عليها، فانها اصل البلاء، وهى مرد الصديق والزنديق، فاذا سمع الضعيف المعرفة والعلم بالله لفظ اتصال، وانفصال، ومسامرة، ومكالمة وأنه لا وجود فى الحقيقة إلا وجود الله وأن وجود الكائنات خيال ووهم وهو بمنزلة وجود الظل القائم بغيره، فسمع منه ما يملأ الآذان من حلول واتحاد وشطحات، والعارفون من القوم أطلقو هذه الالفاظ ونحوها، وأرادوا بها معانى صحيحة فى نفسها فغلط الغالطون فى فهم ما أرادوا ونسبوهم إلى الحادهم وكفرهم. (۱۹)

ترجمہ: صوفیہ کی اصطلاح میں آنے والے مجمل اور مشتبہ الفاظ سے مکمل طور سے ہوشیار رہو، اس لیے کہ وہ بلاؤں کی جڑ ہے- انہیں کی وجہ سے آدمی صدیق سے زندیق ہوجاتا ہے- اسی لیے اللہ کی کم معرفت اور اس کا کم علم رکھنے والا جب اتصال، انفصال، مسامرۃ (بات چیت) اور مکالمہ کے لفظ کو سنتا ہے اور یہ سنتا ہے کہ حقیقت میں صرف اللہ کا وجود ہے اور کائنات کا وجود وہم وخیال ہے، اور وہ ظلی وجود کے درجے میں ہے جو غیر سے قائم ہوتا ہے، تو اس سے حلول، اتحاد اور شطحات جیسی کانوں پر گراں بار باتیں سننے میں آتی ہیں، جب کہ صوفیۂ عارفین نے ان الفاظ کو بول کر بذاتہ صحیح معانی مراد لیے ہیں، ان کی مراد کو سمجھنے میں غلطی کرنے والے غلطی کر گئے اور ان کو کفر والحاد سے منسوب کردیا-

صوفیہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استفادے کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

قال الشافعی رضى الله عنه: صحبت الصوفية فما انتفعت منهم إلا بكلمتين، سمعتهم يقولون: الوقت سيف فان قطعته والا قطعك، ونفسك إن لم تشغلها بالحق وإلا شغلك بالباطل، قلت: يالها من كلمتين، ما أنفعهما وأجمعها وأدلهما على علوهمة قائلها ويقظته ويكفى فى هذا ثناء الشافعى على طائفة اى السادة الصوفية. (۲۰)

ترجمہ: امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں صوفیہ کی صحبت میں رہا تو ان سے صرف دو باتیں سیکھیں، میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا: وقت تلوار کی طرح ہے، اگر تم اس کو کام میں نہیں لاؤ گے تو وہ تمہارا کام کرتے ہوئے گزر جائے گا اور اپنے نفس کو تم حق کے ساتھ مشغول نہیں رکھو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کردے گا- میں (ابن قیم) کہتا ہوں: کتنے عظیم ہیں یہ دونوں کلمے، یہ دونوں کلمے کس قدر نافع اور جامع اور ان کے قائل کی بلند ہمتی اور ان کی بیداری پر دلالت کرنے والے ہیں- اس ذیل میں امام شافعی کی طرف سے صوفیہ کی تعریف ہی کافی ہے-

چنانچہ وہ تصوف شرعی کو مجموعی طور پر قبول کرنے والے ہیں البتہ بعض فروعی مسائل مثلاً

سماع وغیرہ سے اختلاف رکھتے ہیں (۲۱) اور صوفیہ کی اصطلاحات مثلاً عارف، معرفت، فنا، بقا، سکر اور علم لدنی کو تسلیم کرتے ہیں-

صوفیہ کے نزدیک عارف باللہ کسے کہتے ہیں، اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فالعارف عندهم اى الصوفية، من عرف الله سبحانه بأسمائه وصفاته وأفعاله، ثم صدق الله فى معاملته، ثم أخلص له فى مقصوده ونياته، ثم انسلخ من أخلاقه الرديئة وآفاته، ثم تطهر من أوساخه ومخالفاته، ثم صبر على أحكام الله فى نعمه وبلياته، ثم دعا على بصيرة بدينه وآياته، ثم جرد الدعوة إليه وحده، بما جاء به رسوله، ولم يشبهها بآراء الرجال وأذواقهم ومواجيدهم ومقاييسهم ومعقولاتهم، ولم يزن بها ما جاء به الرسول، عليه من الله افضل صلواته، فهذا الذى يستحق اسم العارف على الحقيقة، إذا سمى به على غير الدعوى والاستعارة- (۲۲)

ترجمہ: صوفیہ کے نزدیک عارف وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات، اسماء صفات اور افعال کی معرفت حاصل ہو، اس کے معاملے میں سچائی ہو، اس کے قصد وارادہ اور نیت میں اخلاص ہو، برے اخلاق اور اس کی آفتوں سے جدا ہوچکا ہو، گندگیوں اور مخالف باتوں سے پاک ہوچکا ہو، نعمت وآسائش اور مصیبت وآزمائش کی حالتوں میں اللہ کے احکام پر جما رہا ہو، مکمل بصیرت کے ساتھ اللہ کے دین اور اس کی آیتوں کی طرف بلانے والا ہو، اپنی اس دعوت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کے علاوہ کسی اور چیز کی آمیزش نہ کی ہو اور اس کو لوگوں کی آرا، ان کے ذوق ووجدان اور قیاس وعقل سے مشابہ نہ قرار دیا ہو، ان سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کا موازنہ نہ کیا ہو- درحقیقت ایسا شخص عارف کہلانے کے لائق ہے جب کہ بغیر کسی دعوے اور استعارے کے اس سے کسی کو موسوم کیا جائے-

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

قال بعض السلف: نوم العارف يقظة، وأنفاسه تسبيح، ونوم العارف أفضل من صلاة الغافل، وانما كان نوم العارف يقظة لأن قلبه حى، وعيناه تنامان وروحه ساجدة تحت العرش بين يدى ربها وفاطرها، جسده فى الفرش وقلبه حول العرش. (۲۳)

ترجمہ: اسلاف میں سے کسی کا قول ہے: عارف کا سونا بیداری ہے، اس کی سانسیں تسبیح ہیں اور عارف کا سونا غافل کی نماز سے افضل ہے، عارف کا سونا بیداری اس لیے ہے کہ اس کا دل

بیدار ہے جب کہ اس کی آنکھیں سو رہی ہیں اور اس کی روح عرش کے نیچے اپنے رب اور اپنے خالق کے حضور سجدے میں ہے۔ اس کا جسم تو فرش پر ہے لیکن اس کا دل عرش الٰہی کے گرد ہے۔

عارفین کی صحبت سے استفادے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقيل: مجالسة العارف تدعوك من ست إلى ست: من الشك إلى اليقين، ومن الريا إلى الاخلاص، ومن الغفلة إلى الذكر، ومن الرغبة فى الدنيا إلى الرغبة فى الآخرة، ومن الكبر إلى التواضع ومن سوء الطوية إلى النصيحة. (۲۴)

ترجمہ: ایک قول ہے کہ عارف کی ہم نشینی تم کو چھ باتوں سے الگ کر کے چھ باتوں تک پہنچاتی ہے: شک سے یقین تک، ریا سے اخلاص تک، غفلت سے ذکر تک، دنیا کی رغبت سے آخرت کی رغبت تک، کبر سے تواضع تک، بدخواہی سے خیر خواہی تک۔

فنائے صوفیہ پر گفتگو کے ضمن میں وحدۃ الوجودی اقوال کی وحدۃ الشہودی توضیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والفناء الذى يشير إليه القوم ويعملون عليه: أن تذهب المحدثات فى شهود العبد وتغيب فى أفق العدم كما كانت قبل أن توجد، ويبقى الحق تعالى كما لم يزل ثم تزيل صورة المشاهد واسمه أيضا، فلا يبقى له صورة ولا اسم، ثم يغيب شهوده أيضا فلا يبقى له شهود ويصير الحق هو الذى يشاهد نفسه بنفسه كما كان الأمر قبل ايجاد المكونات، وحقيقته: أن يفنى من لم يكن، ويبقى من لم يزل، وليس مرادهم فناء وجود ماسوى الله فى الخارج بل فناء ه عن شهودهم وحسهم.(۲۵)

ترجمہ: وہ فنا جس کی طرف صوفیہ اشارہ کرتے ہیں اور اس پر وہ عمل کرتے ہیں یہ ہے کہ بندے کے مشاہدے میں حادث چیزیں ایسے فنا ہو جائیں جیسے کہ وجود بخشے جانے سے پہلے تھیں۔ جس طرح حق تعالیٰ ازل سے ہے اسی طرح حق تعالیٰ رہ جائے پھر مشاہد کی صورت اور اس کا اسم بھی فنا ہو جائے، کوئی صورت و اسم باقی ہی نہ رہ جائے، اس کا شہود بھی غائب ہو جائے، کوئی شہود نہ رہ جائے، حق ہی خود اپنے آپ کا مشاہدہ کرنے والا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے کہ تکوین کائنات سے قبل معاملہ تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو نہیں تھا وہ فنا ہو جائے اور جو ازل سے ہے وہی باقی رہے۔ صوفیہ کی یہ مراد نہیں ہے کہ ماسوا کا وجود فانی ہو جائے بلکہ ماسوا ان کے شہود اور احساس سے فنا ہو جائے۔

اسی مسئلے پر مزید گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ولكن فى حالة السكر والاصطلام والفناء قد يغيب عن هذا التميز، و فى هذه الحال قد يقول صاحبها: مايحكىٰ**

عن أبى يزيد أنه قال: سبحانى، أو ما فى الجبة إلا الله، ونحو ذلك من الكلمات التى لو صدرت عن قائلها وعقله معه لكان كافرا لكن مع سقوط التمييز والشعور قد يرتفع عنه قلم المؤاخذة. (۲۶)

ترجمہ: لیکن سکر و فنا کی حالت میں کبھی یہ تمیز فنا ہو جاتی ہے اور اس حال میں بندہ وہ کہہ اٹھتا ہے جو حضرت بایزید بسطامی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے جبے میں اللہ ہی ہے۔ اس طرح کے دوسرے کلمات جو اگر ہوش و حواس کی حالت میں قائل سے صادر ہوں تو وہ کافر ہو جائے لیکن تمیز نہ رہنے کی وجہ سے وہ شخص مرفوع القلم ہو جاتا ہے۔

علم لدنی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **الدرجة الثالثة علم لدنى، يشير القوم بالعلم اللدنى إلى مايحصل للعبد من غير واسطة، بل بالهام من الله، وتعريف منه لعبده كما حصل للخضر عليه السلام بغير واسطة موسىٰ، قال الله تعالىٰ: آتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علما.** (۲۷)

ترجمہ: تیسرا درجہ علم لدنی ہے، صوفیہ کی اصطلاح میں علم لدنی سے اس علم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو بندے کو بلا واسطہ بلکہ الہام ربانی اور اس کی تعلیم کے ذریعہ حاصل ہو، جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطے کے بغیر حضرت خضر کو علم حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے ان کو اپنی رحمت اور اپنی طرف سے علم عطا فرمایا۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

والعلم اللدنى ثمرة العبودية والمتابعة والصدق مع الله والاخلاص له، وبذل الجهد فى تلقى العلم من مشكاة رسوله وكمال الانقياد له، فيفتح له من فهم الكتاب والسنة، بأمر يخصه به كما قال على بن أبى طالب رضى الله عنه وقد سئل هل خصكم رسول الله بشئ دون الناس، فقال: لا والذى خلق الحبة وبرأ النسمة إلا فهما يوتيه الله عبدا فى كتابه فهذا هو العلم اللدنى الحقيقى. (۲۸)

ترجمہ: علم لدنی؛ عبودیت، پیروی، صدق و اخلاص کے ساتھ مشکوٰۃ رسالت سے تحصیل علم کی راہ میں جد و جہد اور مکمل فرماں برداری کا ثمرہ ہے۔ اس کی وجہ سے بندے کو کتاب و سنت میں وہ خاص فہم حاصل ہوتی ہے جو اسی کے ساتھ خاص ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب سوال ہوا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خاص طور سے کوئی ایسا علم عطا فرمایا ہے جو دوسروں کو عطا نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: نہیں، قسم اس ذات کی جس نے دانے کو شق کیا اور مخلوق کو پیدا کیا، سوائے اس فہم کے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے تعلق سے کسی بندے کو عطا فرماتا ہے

اور یہی حقیقی علم لدنی ہے-

پوری گفتگو کو مختصر کر کے یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ تصوف کے ردو قبول کے معاملے میں شیخ ابن تیمیہ کی روش پر ہیں البتہ جو بات ان کو اپنے شیخ سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مسائل سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے یہاں خشکی اور جمود نہیں ہے- یہی وجہ ہے کہ وہ صوفیہ کے مختلف ایسے اقوال جو انہیں خلاف شرع نظر آتے ہیں ان کے صحیح معنی بیان کرتے ہیں اور ان کے فہم میں عوام کو غلطی کا شکار ہونے سے بچنے کی تلقین بھی کرتے ہیں بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعے سے عموماً اور حقیقت تصوف سے تعلق رکھنے والی کتابوں کے مطالعے سے خصوصاً ایک خاص قسم کی مٹھاس اور طراوت کا احساس ہوتا ہے-

علامہ ابن قیم پر حقیقت تصوف کا غلبہ نظر آتا ہے جب کہ تنقید تصوف کے جو عناصر ان کے یہاں ہیں وہ یا تو بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں ان میں سے بہت سے عناصر سے تصوف کی عمومی صورت حال کے مدنظر اتفاق کیا جاسکتا ہے- بعض عناصر سے اختلاف کی گنجائش ہے- ان میں جن عناصر تنقید کا تعلق اصول سے ہے ان کا سرا یا تو فلسفیانہ تصوف سے ملتا ہے یا پھر جاہل صوفیہ یا متصوفین کے مزعومہ تصوف سے- اور جہاں تک حقیقی تصوف کے سلسلے میں ان کی فیصلہ کن رائے کی بات ہے تو اس سلسلے میں ان کی متوازن ومعتدل اور صوفیہ کے ساتھ انصاف کرنے والی رائے وہی ہے جس کو ماسبق میں آخری اور تیسرے نکتے کے تحت بیان کیا گیا ہے- ان کے اسی نکتے کو اساس بنا کر اب ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ خود ان کی تحریروں اور ان کی عملی زندگی میں رنگ تصوف پایا جاتا ہے یا نہیں؟

حافظ ابن قیم جوزی کی تحریروں میں تصوف

ابن قیم جوزی کو تصوف یا حقیقت تصوف سے کس قدر لگاؤ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تصوف کے مختلف موضوعات پر ان کی مندرجہ ذیل کتابیں میرے علم کی حد تک موجود ہیں: ۱-اغاثة اللهفان من مصائد الشيطان (دوجلدیں)، ۲-الفوائد، ۳-الوابل الصيب، ۴-حادى الارواح، ۵-روضة المحبين، ۶-جلاء الأفهام فى الصلوٰة و السلام على محمد خير الأنام، ۷-زاد المهاجر، ۸-طريق الهجرتين وباب السعادتين، ۹-عدة الصابرين، ۱۰-مفتاح دار السعادة ومنشور ولاية العلم و الإرادة، ۱۱-زاد المعاد فى هدى خير العباد (دوجلدیں)، ۱۲-الروح، ۱۳-مدارج السالكين بين منازل اياک نعبد واياک نستعين -(۲۹)

یہ ساری کتابیں تصوف کی حلاوت اور احسان کی شیرینی سے لبریز ہیں-

۱-اغاثة اللهفان من مصائد الشيطان

یہ کتاب دوجلدوں پر مشتمل ہے، اس میں تیرہ ابواب ہیں، جس کے تحت بہت سی فصلیں ہیں- پہلا باب اس بات کے بیان میں ہے کہ دل دوطرح کے ہوتے ہیں، ایک امراض سے پاک دل اور دوسرے امراض زدہ- دوسرا باب قلب کے امراض کی حقیقت کے بیان میں ہے- تیسرا باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قلبی امراض کی دوائیں دوطرح کی ہوتی ہیں، ایک طبعی اور دوسری شرعی- چوتھا باب اس کے بیان میں ہے کہ قلب کی زندگی اور اس کا منور ہونا ہر خیر کی اصل ہے- پانچواں باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قلب کی زندگی اور اس کی صحت اسی صورت میں ہوگی جب کہ حق کا ادراک کرنے والا، حق کا ارادہ رکھنے والا اور غیر حق پر اسے ترجیح دینے والا ہو- چھٹا باب اس بیان میں ہے کہ قلب کی سعادت، اس کی لذت، اس کی نعمت اور اس کی بھلائی اسی صورت میں ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا معبود، اس کا مطلوب اور اس کا محبوب ہو- ساتواں باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قرآن میں قلب کے تمام امراض کی دوائیں اور اس کا علاج موجود ہے- آٹھواں باب قلب کی زکوٰۃ کے بیان میں ہے- نواں باب گندگیوں اور نجاستوں سے قلب کی طہارت کے بیان میں ہے- دسواں باب قلب کے امراض کی علامتوں کے بیان میں ہے- گیارہواں باب غلبۂ نفس کے مرض سے قلب کے علاج کے بیان میں ہے- بارہواں باب شیطان کے مرض سے قلب کی حفاظت اور اس کے علاج کے بیان میں ہے- تیرہواں باب شیطان کے ان حیلوں کے بیان میں ہے جن کے ذریعے وہ ابن آدم کو فریب دیتا ہے-

آخری باب ہی اصل کتاب ہے اور یہی باب عنوان کتاب کے مضامین پر مشتمل مفصل باب ہے- اسی میں تفصیل کے ساتھ شیطان کی فریب کاریوں کو بیان کر کے سالکین راہ الٰہی کو ہوشیار رہنے کی دعوت دی گئی ہے- کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله الذى ظهر لأوليائه بنعوت جلاله وأنار قلوبهم بمشاهدة صفات كماله وتعرف إليهم بما أسداه إليهم من إنعامه وإفضاله فعلموا أنه الواحد الأحد الفرد الصمد الذى لاشريک له فى ذاته ولا فى صفاته ولا فى افعاله." (۳۰)

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحمت والا، تمام حمد ہے اللہ تعالیٰ کے لیے جو اپنے دوستوں کے سامنے اپنی صفات جلالیہ کے ساتھ جلوہ فگن ہوا اور ان کے دلوں کو اپنی صفات کمالیہ کے مشاہدے سے منور فرمایا اور اس نے اپنا جو فضل وانعام ان پر فرمایا اس کی معرفت ان کو عطا فرمائی تو ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، احد ہے، فرد ہے، صمد ہے، اس کا کوئی

شریک نہیں، نہ اس کی ذات میں، نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال میں-

حمد و صلاۃ کے بعد موضوع کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بے کار نہیں پیدا فرمایا بلکہ اسے اوامر و نواہی کا مکلّف بنایا اور جس بات کی طرف مجمل یا مفصل طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی رہ نمائی فرمائی اس کی فہم کو لازم قرار دیا- ان کو شقی اور سعید میں تقسیم کیا- دونوں جماعتوں کے لیے ایک مقام و مرتبہ بنایا اور اپنے فضل و انعام سے ان کو قلب، سماعت، بصارت اور اعضائے جسمانی عطا کیے- چنانچہ جس شخص نے ان قوتوں کا استعمال اس کی طاعت و فرماں برداری میں کیا اور اس کے ذریعے اس کی معرفت کی راہ اختیار کی اور اس سے عدول نہیں کیا، اس نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا اور رضائے الٰہی کی راہ پر چلا اور جس نے ان کا استعمال اپنے ارادے اور اپنی خواہش میں کیا، اپنے خالق کے حقوق کی رعایت نہیں کی، اس سے جب ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا تو وہ گھاٹے میں ڈوبا اور بڑے غم و اندوہ میں مبتلا ہوگا- اس لیے کہ ان اعضا کے حقوق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ ضرور محاسبہ فرمائے گا- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک قوت سماعت، بصارت اور قوت فہم و فکر کے بارے میں سوال ہوگا-

چوں کہ تمام اعضا میں دل کی حیثیت اس بادشاہ کی سی ہے جو اپنے لشکر میں تصرف کرتا ہے اور جس کے حکم سے یہ لشکر حرکت میں آتا ہے اور جہاں چاہتا ہے وہ اسے استعمال کرتا ہے- چنانچہ یہ سارے اعضا اس کے تابع فرماں اور اس کے حکم کے غلام ہیں- اسی دل کی وجہ سے استقامت اور اسی سے کجی پیدا ہوتی ہے- اسی لیے سالکین نے اس کی تصحیح و درستگی پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے- اس کے امراض اور اس کے علاج پر عبادت گزاروں نے سب سے زیادہ دھیان دیا ہے، اور چوں کہ دشمن خدا ابلیس کو یہ بات معلوم ہے کہ ساری باتوں کا دار و مدار قلب پر ہے اس لیے اس نے قلب میں وسوسہ اندازی کی، نوع بنوع خواہشات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور ان احوال و اعمال کو لوگوں کے لیے آراستہ کر کے پیش کیا جن سے وہ اپنی راہ سے رک جائیں، سرکشی کی باتیں لے کر سامنے آیا تاکہ توفیق کی راہیں بند ہو جائیں اور اس نے ایسے جال بچھائے کہ اگر کوئی اس جال میں پھنسنے سے بچ بھی گیا تو اس کی وجہ سے اس کی راہ میں اڑچنیں ضرور آئیں، لیکن چوں کہ اللہ رب العزت نے اپنے لطف و کرم سے اپنے بندوں کو قلب کے امراض، اس کی دواؤں اور دل میں آنے والے شیطانی وسوسوں اور ان وسوسوں سے پیدا ہونے والے اعمال اور قلب کو لاحق ہونے والے احوال سے آگاہ فرما دیا ہے- اس لیے میں نے چاہا کہ میں ان باتوں کو اس کتاب میں ذکر کر دوں تاکہ ناظرین اس سے نفع اٹھائیں اور مولف کے لیے دعاے

رحمت و مغفرت کریں- اس کا نام میں نے **اغاثة اللهفان من مصائد الشيطان** رکھا ہے اور اس کو میں نے تیرہ ابواب پر مرتب کیا ہے-(۳۱)

بعض اختلافی مقامات کے استثنا کے ساتھ یہ کتاب سالکین راہ طریقت کے لیے بہترین توشہ ہے- اس میں شیطان کے پُرفریب دام اور اس سے نجات کے طریقوں کو عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے-

شیطان کی پُرفریب راہوں پر **لاغوینهم اجمعین** کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر صبح شیطان چار مقامات پر میرا انتظار کرتا ہے؛ آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں، اور وہ کہتا ہے: خوف مت کر و اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، تب میں یہ آیت کریمہ پڑھتا ہوں: بے شک میں اسے بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے اور عمل صالح کرے پھر ہدایت کی راہ اختیار کرے- میرے پیچھے سے آکر مجھ کو پس ماندگان کی بربادی کا خوف دلاتا ہے تو میں یہ آیت پڑھتا ہوں: روئے زمین پر چلنے والے ہر جان دار کی روزی اللہ کے ذمۂ کرم پر ہے- میرے دائیں عورتوں کی راہ سے آتا ہے تو میں یہ آیت پڑھتا ہوں: اچھا انجام متقیوں کے لیے ہے، میرے بائیں شہوتوں کی راہ سے آتا ہے تو میں یہ آیت تلاوت کرتا ہوں: ان کے اور ان کی خواہشات کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا-(۳۲)

اس پر اپنی رائے ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں:

میں کہتا ہوں کہ انسان کی راہیں چار ہی ہیں، ان سے زیادہ نہیں- وہ کبھی داہنی راہ اختیار کرتا ہے، کبھی بائیں راہ لیتا ہے، کبھی آگے چلتا ہے تو کبھی پیچھے کی طرف پلٹتا ہے- انسان جس طرف بھی جائے گا شیطان ادھر اس کے گھات میں ہوگا- ان راہوں کی طرف اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے بڑھتا ہے تو وہ ان راہوں پر شیطانی اڑچنوں، رکاوٹوں سے دوچار ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نیکی سے رک جاتا ہے یا پھر اس میں ٹال مٹول اور تاخیر ہوتی ہے، اور اگر گناہ کے لیے نکلتا ہے تو ان راہوں پر شیطان کو اپنا معین و مددگار اور گناہ پر برانگیختہ کرنے والا پاتا ہے اور اگر شیطان کو نیچے جا کر رکاوٹیں پیدا کرنے کی قدرت ہوتی تو وہ نیچے کی طرف سے بھی آتا ہے-(۳۳)

اس کتاب کی پہلی جلد ۳۹۱ صفحات پر مشتمل ہے جب کہ دوسری جلد ۳۶۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: "**اللّٰھم صل وسلم علی سیدنا محمد كلما ذكره الذاكرون وصل وسلم على سيدنا محمد كلما غفل عن ذكره الغافلون وهدانا الله لهدايته وحشرنا في زمرته تحت لوائه وأوردنا حوضه الذى لايظمأ من شرب منه وأوفر نصيبنا من شفاعته، إنه جواد كريم.**" (۳۴)

۲-الفوائد

مباحث تصوف سے متعلق ابن قیم کی دوسری کتاب الفوائد ہے- یہ کتاب مختلف فوائد پر مشتمل ہے، جس میں متعدد عناوین کو زیر بحث لایا گیا ہے، اس میں ''قاعدة جليلة'' کہہ کر کئی اصولی باتیں بھی ذکر کی گئی ہیں- انہی فوائد وقواعد کے مابین بہت سی فصلیں بھی ہیں- اس کتاب کو ہم تصوف سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات کا مجموعۂ مرکب کہہ سکتے ہیں-

کتاب کے آغاز میں ''قاعدۂ جلیلہ'' کے تحت قرآن سے نفع حاصل کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر تم قرآن سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو تلاوت قرآن کریم اور اس کی سماعت کے وقت جمعیت قلبی حاصل کرو- کان لگاؤ اور اسی طرح اپنے آپ کو حاضر رکھو جس طرح وہ لوگ حاضر ہوتے ہیں جن سے رب تعالیٰ مخاطب ہوتا ہے اور جن سے رب تعالیٰ کلام فرماتا ہے- اس لیے کہ رب تعالیٰ اپنے رسول کے واسطے سے تم سے مخاطب ہے- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جن کے پاس دل ہے اور جو حضور قلبی کے ساتھ کان لگا کر سننے والا ہے-(۳۵)

''دس ضائع ہونے والی غیر نافع چیزیں'' کے عنوان سے ایک خوبصورت بحث لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

دس چیزیں ضائع ہونے والی اور بے سود ہیں: پہلا وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے- دوسرا وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ ہو- تیسرا وہ مال جس میں سے خرچ نہ کیا جائے، جس سے نہ دنیا میں فائدہ حاصل کرے اور نہ اسے آخرت کے لیے آگے بھیجے- چوتھا وہ دل جو اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی جانب اشتیاق اور اس کے انس سے خالی ہو- پانچواں وہ بدن جو اس کی اطاعت، اس کی خدمت اور اس کی محبت سے محروم ہو اور جو بدن محبوب کی خوش نودی اور اس کے احکام کا پابند نہ ہو- چھٹا وہ وقت جو کوتاہیوں کی تلافی، نیکی اور قرب الٰہی کی دولت سمیٹنے سے خالی ہو- ساتواں وہ فکر جس کی جولانی بے سود باتوں میں ہو- آٹھواں اس کی خدمت جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قریب نہ کرے اور جس سے تم کو دنیاوی صلاح وفلاح بھی حاصل نہ ہو- نواں اور دسواں تمہارا اس شخص سے خوف کھانا اور اس سے امید لگانا جس کی لگام اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے اور جو اپنے لیے کسی نفع ونقصان، موت وحیات اور کسی کو زندہ کرنے کا مالک نہیں- اس بربادی میں دو بربادیاں ایسی ہیں جو ہر بربادی کی اصل ہے; پہلی قلب کی بربادی اور دوسری وقت کی بربادی- قلب کی بربادی دنیا کو آخرت پر ترجیح

دینے سے ہوتی ہے اور وقت کی بربادی لمبی لمبی امیدیں باندھنے سے ہوتی ہے- چنانچہ سارا فساد خواہش کی پیروی اور درازی امید میں ہے، اور سارا خیر وصلاح ہدایت کی پیروی اور لقائے الٰہی کی تیاری میں ہے- اس سلسلے میں اللہ ہی سے استعانت ہے- تعجب تو اس پر ہے جسے کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اسے حاجت برآری کی خواہش رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے لیکن وہ جہل واعراض کی موت سے اپنے قلب کی زندگی اور شہوات وشبہات کے مرض سے شفا کے لیے وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز نہیں کرتا-(۳۶)

پوری کتاب تصوف کے نفیس مباحث پر مشتمل اور سالکان راہِ الٰہی کے لیے لائق مطالعہ ہے، زبان کی چاشنی اس پر مستزاد ہے- یہ کتاب ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے-

۳-الوابل الصیب

یہ کتاب ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے- اس میں تصوف وسلوک کے عمدہ مباحث ہیں- اس کتاب کے بنیادی طور پر تین حصے ہیں، پہلے حصے میں سعادت، استقامت قلب اور قلب کی قسموں پر گفتگو کی گئی ہے، دوسرے حصے میں ذکر الٰہی اور اس کے فائدے کے عنوان سے گفتگو کی گئی ہے- اس کے بعد یہ ذکر کر کے کہ ذکر الٰہی سے سو سے زائد فائدے ہیں- تفصیل کے ساتھ اس کے ۷۳ر فائدوں کو شمار کرایا گیا ہے- تیسرے حصے میں ''ذکر سے متعلق نفع بخش فصلیں'' کے عنوان سے ۷۵ فصلیں ہیں- ان فصلوں میں مختلف مواقع سے متعلق اذکار اور دعائیں یا پھر اس سے متعلق مباحث کو بیان کیا گیا ہے-

''نماز میں لوگوں کے پانچ درجے ہوتے ہیں'' اس عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نماز کی حالت میں لوگوں کے پانچ درجے ہوتے ہیں: پہلا اس شخص کا درجہ جو اپنے آپ پر ظلم کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہے، اور وہ ایسا شخص ہے جس کے وضو، جس کے وقت اور جس کے حدود وارکان میں نقص اور کمی ہو- دوسرا وہ شخص جو اوقات، حدود، ظاہری ارکان اور وضو کی حفاظت کرنے والا ہے، لیکن اس نے وسوسوں کو دور کرنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ نہیں کیا- چنانچہ اس کی نماز وسوسے اور افکار وخیالات کے ساتھ چلی گئی- تیسرا وہ شخص جس نے حدود وارکان کی محافظت کی اور وساوس وافکار کو دور کرنے کے لیے نفس سے مجاہدہ بھی کیا- چنانچہ وہ اپنے دشمن سے مجاہدے میں مصروف ہے کہ کہیں وہ اس کی نماز چرا نہ لے جائے- وہ شخص نماز اور جہاد میں لگا ہے- چوتھا وہ شخص جو نماز کے لیے کھڑا ہوا تو اس کے حقوق، ارکان، اور حدود کی تکمیل کی اور نماز کے حدود وحقوق کی رعایت میں اپنے قلب کو مستغرق رکھا تا کہ نماز کے حدود وحقوق میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہونے پائے، بلکہ اس کی توجہ پوری طرح شایان شان طریقے سے نماز کو قائم کرنے

میں رہی-نماز کی تکمیل کے دوران اس کا قلب نماز کی عظمت وشان اور رب تعالیٰ کی عبودیت میں مستغرق رہا- پانچواں شخص وہ ہے جو نماز میں پہلے والی شان کے ساتھ کھڑا ہوا لیکن اس نے مزید یہ کیا کہ اپنے عنان قلب کو پکڑ کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ڈال دیا، اس طرح کہ وہ اپنے قلب سے اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، اس کے مراقبے میں ہے، اس کی محبت اور اس کی عظمت کے جذبات سے اس طرح سرشار ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اور اب صورت حال یہ ہے وساوس وخطرات فنا ہو چکے ہیں، اس کے اور رب تعالیٰ کے مابین حجاب اٹھ چکا ہے، چنانچہ یہ شخص نماز کی حالت میں دوسرے نمازیوں سے اتنی عظمت اور فضیلت رکھتا ہے جتنی کہ آسمان کو زمین پر حاصل ہے- یہ شخص اپنی نماز میں اپنے رب کے ساتھ مشغول ہے اور اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہے- پہلی قسم کے نمازی پر عقاب ہوگا، دوسری قسم کے نمازی سے حساب و محاسبہ ہوگا، تیسری قسم کے نمازی کو معاف کر دیا جائے گا، چوتھی قسم کے نمازی کو ثواب دیا جائے گا جب کہ پانچویں قسم کا نمازی اپنے رب کا مقرب ہے، اس لیے کہ اس کو دنیا میں ان لوگوں سے حصہ ملا ہے جن کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اور دنیا میں جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہوگی آخرت میں قرب الٰہی سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور دنیا میں بھی رب تعالیٰ سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور رب تعالیٰ سے جس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اس سے ہر آنکھ کو ٹھنڈک حاصل ہوگی-(۳۷)

۴-حادی الارواح إلی بلاد الافراح

یہ کتاب جنت، جنت کی حقیقت، اس کی نعمت اور اس سے متعلق جملہ مباحث کا انسائیکلو پیڈیا ہے- اس میں ۷۰/ابواب ہیں جو مجموعی طور پر ۲۹۳/صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں- اس میں سالکین راہ طریقت اور مشتاقان جنت کے لیے بڑی دل چسپی کا سامان ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کے ۶۵ ویں باب میں دیدار الٰہی سے متعلق بڑی عمدہ بحث کی گئی ہے اور مختلف فصلیں ذکر کر کے اس بحث کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے-

اس باب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

یہ باب کتاب کے ابواب میں سب سے زیادہ شرف والا، سب سے بڑے مقام ومرتبے والا، اہل سنت وجماعت کی آنکھوں کو سب سے زیادہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور اہل بدعت وضلالت کے اوپر سب سے سخت اور دشوار گزار ہے- یہی وہ مقصود ہے جس کے لیے تیاری کرنے والے تیاری کرتے ہیں- مقابلہ اور مسابقہ کرنے والے مقابلہ اور مسابقہ کرتے ہیں- اسی کے لیے عمل کرنے والے عمل کرتے ہیں- جب اس نعمت کو جنتی پائیں گے تو جنت کی ساری نعمتیں بھول

جائیں گے اور اس سے محرومی، جہنمیوں کے لیے جہنم کے عذاب سے بھی زیادہ سخت ہوگی- اس نعمت کے ملنے پر انبیا ومرسلین، تمام صحابہ، تابعین اور ہر دور کے ائمہ اسلام کا اتفاق ہے-(۳۸)

اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنتی ہر جمعہ کو رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے، پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو جنتیوں کو دی جائیں گی- اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر رب تعالیٰ فرمائے گا حجاب اٹھا دو، چنانچہ ایک ایک کر کے حجاب اٹھا دیا جائے گا، پھر رب تعالیٰ ان کے لیے تجلی فرمائے گا اور اپنے وجہ کریم کا جلوہ دکھائے گا تو اس وقت جنتیوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ انہوں نے اس سے قبل کوئی نعمت پائی ہی نہیں تھی اور رب تعالیٰ کے فرمان ولدینا مزید کا یہی مطلب ہے-(۳۹)

قیامت میں ظاہری آنکھوں سے دیدار الٰہی پر اہل حق کے تمام گروہوں کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور دیدار الٰہی کے سلسلے میں تابعین اور اسلام وایمان کی جماعتیں یعنی ائمہ حدیث، ائمہ فقہ و تفسیر اور ائمہ تصوف کے اقوال کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا احاطہ رب تعالیٰ ہی کر سکتا ہے-(۴۰)

آگے چل کر حضرت حسن بصری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں عابدوں کو معلوم ہو جائے کہ آخرت میں ان کو رب کا دیدار نہیں ہوگا تو غم کے مارے وہ دنیا میں ہی گھل جائیں-(۴۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ اس کتاب میں سالکین وبندگان الٰہی کے لیے بڑے نشاط انگیز مباحث ہیں- اس کے مطالعے کے بعد یقیناً دلوں میں جنت کی امنگ اور دیدار الٰہی کا شوق پیدا ہوگا اور بندہ عمل کی راہ پر گام زن ہو جائے گا-

۵-روضة المحبين ونزهة المشتاقين

یہ کتاب انتالیس ابواب پر مشتمل ہے- اس میں محبت اور اس سے متعلق علمی، لغوی اور روحانی مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۴۸۶ صفحات تک پھیلا ہوا ہے- کتاب کا آغاز حمد الٰہی سے ان الفاظ میں ہوتا ہے:

الحمد لله الذى جعل المحبة إلى الظفر بالمحبوب سبيلا ونصب طاعته والخضوع له على صدق المحبة دليلا، وحرك بها النفوس إلى انواع الكمالات إيثارا لطلبها وتحصيلاً وأودعها العالم العلوى والسفلى لاخراج كماله من القوة إلى الفعل إيجادا وإمدادا وقبولا، وأثار بها الهمم السامية والعزمات العالية إلى أشرف غاياتها تخصيصا لها وتأهيلا-(۴۲)

ترجمہ: تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے محبت کو محبوب تک رسائی کا ذریعہ بنایا اور اپنی اطاعت اور فرماں برداری کو محبت کی سچائی پر دلیل قرار دیا، محبت کو نوع بنوع کے کمالات کی تحصیل اور ترجیح کا محرک بنایا، محبت میں عالم علوی اور سفلی کو ودیعت کیا تا کہ وہ اپنے کمال کو امکان سے وجود خارجی کا جامہ پہنا سکے، اس میں وہ امداد کر سکے اور اس کو قبول کر سکے اور محبت کے ذریعے عالی ہمت لوگوں اور بلند عزائم رکھنے والوں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ سب سے زیادہ شرف رکھنے والے مقاصد کو اپنے لیے خاص کریں اور اس کی اہلیت حاصل کریں۔

ایک مقام پر نفس انسانی اور ان کی محبتوں کے اقسام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نفوس تین طرح کے ہیں: سماوی اور علوی نفس، اس کی محبت کا تعلق علوم و معارف اور انسان کے لیے ممکنہ فضائل و کمالات کی تحصیل اور رذائل سے اجتناب سے ہوتا ہے۔ ان کا دل ان باتوں سے لگا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے رفیق اعلیٰ کا قرب حاصل کر سکے۔ وہی اس کی روزی، وہی اس کی غذا اور وہی اس کی دوا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں میں مشغول ہونا ہی اس کے لیے مرض ہوتا ہے۔

دوسرا ہے حیوانی اور شہوانی نفس۔ اس کی محبت کا تعلق کھانے پینے اور نکاح کرنے سے ہوتا ہے۔ کبھی یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں تو ان کی محبت کا تعلق روئے زمین میں سرکشی اور فساد سے ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی ہے اور اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک گروہ کو کم زور کر رکھا ہے، ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتا ہے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ فساد پھیلانے والوں میں سے ہے اور اسی سورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ دار آخرت ہے، یہاں ان لوگوں کا حق ہوگا جو زمین میں سرکشی اور فساد نہیں کرتے تھے، اچھا انجام متقیوں کے لیے ہے۔

اس دنیا میں محبت ان ہی تین طرح کے نفوس میں منحصر ہے، چنانچہ ان نفوس میں جن کو بھی ان کی طبیعت کے موافق کوئی چیز ملتی ہے اسے وہ بہتر سمجھتی ہیں، اس کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی ملامت کرنے والی کی ملامت پر کان نہیں دھرتیں اور ان میں سے ہر جان یہ سمجھتی ہے کہ جس میں وہ لگی ہے وہی ترجیح کے زیادہ لائق ہے، اس کے علاوہ دوسری چیزوں میں مشغول ہونا گھاٹے کا سودا اور بربادی ہے۔ (۴۳)

پوری کتاب لائق مطالعہ، نفع بخش اور خیر کثیر لیے ہوئے ہے۔ ارباب محبت، رصاحبان دل، مشتاقان راہ وصال اور طالبان محبت الٰہی کے لیے اس میں تسکین خاطر اور سیر و تفریح کا خاطر خواہ سامان موجود ہے۔

٦-جلاء الافهام في الصلاة والسلام على محمد خير الانام

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے سلسلے میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مرسل اور موقوف احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل پر درود پڑھنے کا ذکر ہے اور آل کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان مقامات کو بیان کیا گیا ہے جن میں درود پاک پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اکتالیس مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں درود شریف پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ پانچویں باب میں درود شریف پڑھنے کے فوائد و ثمرات پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں پر اور آپ کی آل پر درود پڑھنے کی بحث ہے۔ یہ کتاب ۴۸۲ صفحات کو محیط ہے۔

اذان کے جواب سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

درود شریف کے مقامات میں چھٹی جگہ یہ ہے کہ موذن کے جواب سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب تم اذان سنو تو اذان کے کلمات کا اعادہ کرو، پھر مجھ پر درود پڑھو، اس لیے کہ جو مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے۔ پھر میرے لیے اللہ سے وسیلہ طلب کرو۔ (۴۴)

نماز کے بعد درود شریف پڑھنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

پینتسواں مقام یہ ہے کہ نمازوں کے بعد درود شریف پڑھا جائے، اس کو حافظ ابوموسیٰ وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں صرف ایک حکایت ذکر کی ہے جس کو ابوموسیٰ مدینی نے عبدالغنی بن سعید کی روایت سے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اسماعیل بن احمد بن اسماعیل حاسب سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ابوبکر محمد بن عمر نے خبر دی، وہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر بن مجاہد کے پاس تھا کہ ان کے پاس شبلی آئے تو ان کے لیے ابوبکر بن مجاہد کھڑے ہو گئے، ان سے معانقہ کیا اور ان کی آنکھوں کے مابین بوسہ دیا۔ اس پر میں نے ان سے کہا: آپ شبلی کا یہ احترام کر رہے ہیں! جب کہ آپ اور بغداد کے سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مجنون ہیں۔ یہ سن کر ابوبکر بن مجاہد نے کہا میں نے ان کے ساتھ وہی کیا ہے جو میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ شبلی آئے تو آپ ان کے لیے کھڑے ہوئے اور ان کی آنکھوں کے مابین بوسہ دیا۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ شبلی کا یہ احترام کر رہے ہیں!! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نماز کے بعد **لقد جاء کم رسول من انفسکم الخ** پڑھتے ہیں اور پھر درود شریف پڑھتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ ہر فرض نماز کے بعد

لقد جاء کم پڑھ کر تین مرتبہ **صلی اللہ علیک یا محمد** پڑھتے ہیں-(۴۵)

آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص طور سے صلاۃ بھیجنے کے سلسلے میں ایک لمبی بحث کرنے کے بعد ان کی فیصلہ کن رائے یہ ہے کہ اگر رافضیوں کی طرح اس کو شعار بنالیا جائے کہ کبھی اس کو ترک نہ کرے تو ایسی صورت میں صلاۃ نہ بھیجنا متعین ہے لیکن اگر شعار نہ بنایا جائے تو ایسی صورت میں اس میں کوئی حرج نہیں-(۴۶)

درود شریف کے موضوع پر یہ کتاب بہت علمی، جامع اور بحث کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے- صوفیۂ کرام درود شریف کی بڑی تاکید کرتے ہیں، اس لیے موضوعات تصوف پر لکھی گئی کتابوں میں اس کتاب کے شمار سے کوئی علمی مناقشہ نہیں ہونا چاہیے-

۷-زاد المهاجر إلى ربه

یہ مختصر سی کتاب ۷۷ رصفحات پر مشتمل ہے- اس میں سالکین راہ طریقت کے لیے توشۂ سفر ہے- اس کتاب میں ''مہاجر'' اور ''ہجرت'' دونوں صوفیۂ کرام کے معانی میں استعمال کیے گئے ہیں- اس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے اقوال سے استدلال بھی موجود ہے-

ہجرت کے صوفیانہ معانی پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انسان کا سب سے اہم مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے- یہ ہجرت فرض عین ہے اور یہ ہجرت ہر وقت لازم ہے- اس کی فرضیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں- یہی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے- ہجرت کی دو قسمیں ہیں: پہلی جسم کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت، اس کے احکام معلوم ہیں اور یہاں وہ ہجرت زیر بحث نہیں ہے- دوسری ہجرت یہ ہے کہ قلب کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی جائے- یہی یہاں مقصود ہے اور یہی ہجرت حقیقی اور اصلی ہے- جسم کی ہجرت تو اس کے تابع ہے-(۴۷)

ایک فصل کے تحت یہ ذکر کرتے ہیں کہ جب دل اس سفر ہجرت کے لیے تیار ہوتا ہے تو وہ کسی رفیق کو تلاش کرتا ہے- اسی ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

جو شخص یہ سفر شروع کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مردہ نفس لوگوں کو اپنا رفیق بنالے جو حقیقی معنوں میں دنیا میں زندہ ہیں- ان کی رفاقت کی برکت سے وہ مقصد تک پہنچ جائے گا -وہ بظاہر زندوں اور درحقیقت مردوں کی صحبت سے بچے، اس لیے کہ وہ اس سفر کے رہ زن ہیں- چنانچہ سالک کے لیے ان مردہ نفس لوگوں کی رفاقت سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز نہیں ہے-(۴۸)

ایک مقام پر اسی سفر ہجرت سے متعلق گفتگو کے دوران یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر تم یہ کہو کہ آپ نے اس عظیم الشان سفر کے بارے میں تو بتادیا لیکن زاد سفر، طریقۂ سفر اور اس سفر کی سواری کے

بارے میں کچھ نہیں بتایا، تو میں کہوں گا کہ زاد سفر وہ علم ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے- اس کے سوا اور کوئی زاد سفر نہیں- جس کے پاس یہ توشہ نہ ہو وہ اپنے گھر سے نہ نکلے-(۴۹)

آگے چل کر طریقۂ سفر پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سفر صرف آرزووں اور تمناؤں سے طے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے پوری کوشش اور پوری جدوجہد کرنی ہوگی- طریقہ تو یہ ہوگا اور سواری یہ ہوگی کہ رب تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا پڑے گا- سب سے کٹ کر، اس کی جانب صدق دل کے ساتھ لولگانا ہوگا اور اسی کی بارگاہ میں اپنی مکمل حاجت مندی کا اظہار کرنا ہوگا- صدق توکل کے ساتھ اس سے استعانت طلب کرنا ہوگا- مکمل طور سے نہتے، لٹے ہوئے خود سپردگی کرنے والے انسان کی طرح اس کی بارگاہ میں خود سپردگی کرنی ہوگی- حاجت مندوں کی طرح اپنے بال بکھرا کر اس کے فضل وانعام کا طلب گار رہنا ہوگا، تب جا کر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی ہدایت اپنے ذمۂ کرم پر لے لے اور اس سفر ہجرت کے مقامات ومنازل اور اس کے پوشیدہ احوال کو اس پر کھول دے-(۵۰)

اس کتاب کو پڑھ کر بندے کے دل میں سفر ہجرت کی امنگ پیدا ہونے اور سفر پر نکلنے کی تیاریوں میں لگ جانے کی امید ہے- یقیناً یہ کتاب مہاجران راہ الٰہی کے لیے توشہ کی حیثیت رکھتی ہے-

۸-طريق الهجرتين وباب السعادتين

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کیا ہے اور ایسی ہجرت کن لوگوں کی شان ہوتی ہے؟ اس کتاب میں اس موضوع اور اس سے متعلق جملہ مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے- اس میں پچیس فصلیں ہیں-

خطبے کے بعد کتاب کا آغاز اس مفہوم سے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے دلوں میں اپنی محبت، اپنی معرفت اور اپنی توحید کی شجر کاری فرمائی ہے- ان کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے- ہر آنکھ کو ان سے ٹھنڈک ملتی ہے- ہر طرح کے غم کے مارے ان سے خوشی حاصل کرتے ہیں- خوف زدہ لوگ ان سے امان حاصل کرتے ہیں- ان کے دیدار سے اللہ کی یاد آتی ہے- ان کی محبت اللہ کے لیے، ان کا بغض اللہ کے لیے، ان کا دینا اللہ کے لیے اور ان کا نہ دینا اللہ کے لیے ہی ہوتا ہے- ہر وقت ان کی دو ہجرتیں ہوتی ہیں: ایک ہجرت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اسی کی طلب، اسی کی محبت، عبودیت، توکل وانابت، تسلیم وتفویض، خوف ورجا، توجہ اور اپنی حاجت مندی کے اظہار کے ذریعے؛ اور ان کی دوسری ہجرت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے؛ اور وہ اس طرح کہ وہ اپنے حرکات وسکنات، خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، ہر حالت میں ان کی شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی دین کو قبول نہیں کرتے- چنانچہ شیخ طریقت امام الطائفہ جنید بن محمد

قدس اللہ روحہ فرماتے ہیں: ساری راہیں مسدود ہیں سوائے اس کی راہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہے- اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: میری عزت وجلال کی قسم! اگر لوگ ساری راہوں سے آئیں اور ہر دروازے سے دستک دیں لیکن ان کے لیے دروازہ اسی وقت کھلے گا جب کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور پس روی کرتے ہوئے آئیں- اور بعض عارفین فرماتے ہیں کہ ہر وہ عمل جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ ہو وہ عیش نفس ہے- (۵۱)

حقیقت فقر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کی طرف لو لگائے رہے- وہ لکھتے ہیں کہ دنیاوی اغراض میں ملوث ہونا چوں کہ ایک قسم کی قید ہے، جو کہ بندے کو اس کے شہر حیات اور کشور نعمت کی طرف سفر کرنے سے روک دیتا ہے- اسی طرح جو دل محبت کا مزہ چکھ لیتا ہے، معرفت کی سوزش سے جس کو انس حاصل ہو جاتا ہے، بعض دقیق اغراض رکاوٹ بن کر اس کے سامنے آتے ہیں اور قلب کو مشاہدۂ حق اور مکمل فنا سے روک دیتے ہیں؛ وہ فنا جس سے بقائے دوام حاصل ہوتا ہے، جس سے نور الٰہی حاصل ہوتا ہے اور جو سیر وسلوک کا مقصود ہے، جس کے لیے سالکین تیاریاں کرتے ہیں اور جس کے گرد عارفین طواف کرتے ہیں- چنانچہ ہر وہ چیز جو بندے کے قلب ونظر اور اس کی ہمت کو اس کے مقصود سے روکتی ہے وہ حجاب ہے جس سے واصل، سالک اور طالب محجوب ہو جاتا ہے- ان چیزوں سے زہد وفقر بلند ہمتوں کے لیے ضروری ہے اور چوں کہ فقر کا پہلا زینہ یہ ہے کہ آخرت کی طرف رجوع کیا جائے، اس لیے آخرت کی فکر میں استغراق اور دنیا سے دونوں ہاتھ جھاڑ لینا ضروری ہے- یہاں سے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی طرف رجوع کرے گا تو اس سے عمدہ اقوال کا صدور ہوگا، اس کو بلند وبالا مقامات حاصل ہوں گے اور اس کے فضل وکرم سے اس کو رب تعالیٰ کی خوش نودی، اس کی رحمت، اس کا قرب، اس کی کرامت اور اس کی ولایت حاصل ہوگی اور پھر اللہ تعالیٰ ہی اول وآخر ہوگا، تو اس کو فقر کی حقیقت حاصل ہو جائے گی، اور اس میں جب ظاہر وباطن سے عبودیت کا ضمیمہ لگ جائے گا تو وہ عارف ہو جائے گا- (۵۲)

اس کتاب میں فقر وغنا وغیرہ سے متعلق عمدہ گفتگو ہے، جو ۶۳۲ صفحات پر مشتمل ہے- یہ کتاب طالبین وسالکین کے لیے بہترین ذخیرہ ہے-

۹-عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين

یہ کتاب صبر وشکر کے موضوع پر ہے- اس میں ۲۶/ابواب ہیں- ان ابواب کے تحت متعدد فصلیں بھی ہیں، جن میں قرآن وحدیث اور آثار کی روشنی میں علمی، لغوی، دینی اور روحانی گفتگو کی گئی ہے- کل صفحات کی تعداد ۲۴۴ ہے-

حقیقت صبر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: صبر عمدہ اخلاق کا نام ہے جس کے ذریعے بندہ غیر مستحسن افعال سے رک جاتا ہے- اس سلسلے میں جنید بن محمد سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ناگواری کا اظہار کیے بغیر کڑوے گھونٹ پی جانا صبر ہے- ایک قول یہ ہے کہ حرف شکایت زبان پر لائے بغیر آزمائش میں بے نیازی کا اظہار صبر ہے- خواص نے فرمایا: صبر یہ ہے کہ کتاب وسنت کے احکام پر ثابت قدم رہا جائے- ابو علی دقاق نے فرمایا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر اعتراض نہ کرے، لہٰذا ابلا کا اظہار اگر شکوہ کے طور پر نہ ہو تو یہ صبر کے منافی نہیں ہے- (۵۳)

صبر نصف ایمان ہے، اور ایمان میں دو نصف ہیں، ایک نصف صبر ہے اور دوسرا نصف شکر- اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مصنف نے نو توجیہات پیش کی ہیں- پہلی توجیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایمان؛ قول وعمل اور نیت کے مجموعے کا نام ہے- یہ دو چیزوں کی طرف راجع ہے: فعل اور ترک فعل- فعل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، یہی شکر کی حقیقت ہے- اور ترک یہ ہے کہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے اور صبر کیا جائے- پورا دین انہی دو چیزوں میں منحصر ہے- جس کا حکم دیا گیا ہے اس کو کیا جائے اور جس سے روکا گیا ہے اس سے رک جایا جائے- (۵۴)

کتاب کا خاتمہ بہت ہی صوفیانہ اور ناصحانہ انداز میں کیا گیا ہے- درمند انداز میں سالکین راہ طریقت کو اپنے نفس وعمل کے عیوب، اپنی کوتاہیوں کے مشاہدے اور عمل پر بھروسا کرنے کی بجائے اس کے عفو ومغفرت کی طرف لو لگانے کی دعوت دی گئی ہے، لیکن گناہ کرنے کے بعد اس پر اصرار وسرکشی کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے کیونکہ رب تعالیٰ بڑا غیور بھی ہے، لہٰذا بندہ رب کی نوازشات پا کر بھی اگر گناہ پر قائم رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے رکھی ہے تو ایسا خیال دماغ سے نکال دے؛ کیوں کہ اس نے مہلت نہیں دی ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ رب تعالیٰ کی ایک صفت صبور بھی ہے، اسی لیے فوری گرفت نہیں فرما رہا ہے- (۵۵)

۱۰-مفتاح دار السعادة ومنشور ولاية العلم والإرادة

اس کتاب میں رب تعالیٰ کے مختلف افعال میں پنہاں دقائق واسرار کو بیان کیا گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالے جانے کے اسرار پر گفتگو کی گئی ہے- کتاب دو جلدوں میں ہے- پہلی جلد میں ۳۰۵ صفحات ہیں- پہلی جلد کے اختتام پر مصنف نے لکھا ہے کہ رب تعالیٰ کے تمام افعال میں بے شمار حکمتیں ہیں- ان حکمتوں تک انسان کی تفصیلی طور پر رسائی اس کے بس سے باہر ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس پر کچھ حکمتیں اور کچھ اسرار ودقائق کو کھول دیتا ہے- (۵۶)

دوسری جلد ۴۷۲ صفحات پر مشتمل ہے،اس میں بھی متعدد فصلیں ہیں-ان فصول کے تحت مختلف مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے اور نوع بنوع دقائق واسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے-

گناہ میں پوشیدہ اسرار کو بیان کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں: گناہ کی حکمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ گنہ گار لوگوں کے عیوب نہیں دیکھتا-لوگوں کے معائب کی طرف نظر نہیں کرتا-اس لیے کہ وہ اپنے عیوب کو دیکھنے میں لگا ہوتا ہے-چنانچہ بشارت ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب کو دیکھنے میں لگا ہے اور خرابی ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب کو فراموش کر کے لوگوں کی عیب جوئی میں لگا ہے-یہ شقاوت کی علامت ہے، جب کہ پہلی والی بات سعادت کی علامت ہے-انہی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ بندہ جب گناہوں کے جال میں پھنستا ہے تو اسے اپنے دوسرے خطا کار بھائیوں کی یاد آتی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مصیبت سب کی ایک ہے اور سب کے سب اپنی حاجت اور ضرورت میں اللہ کی مغفرت،اس کے عفو وکرم اور اس کی رحمت کے محتاج ہیں-چنانچہ جس طرح اس کو یہ بات محبوب ہے کہ مسلمان بھائی اس کے لیے دعاے مغفرت کریں اسی طرح اس کے لیے بھی مناسب ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرے-(۵۷)

شریعت کی حاجت اور اس کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شریعت کی جانب لوگوں کا احتیاج تمام حاجتوں سے بڑھ کر ہے اور علم طب کی حاجت سے اس حاجت کا کوئی مقابلہ نہیں-دیکھتے نہیں کہ بہت سے لوگ دنیا میں بغیر طبیب کے ہی جیتے ہیں-بدوی لوگوں اور عام انسانوں کو ڈاکٹر کی حاجت نہیں ہوتی ہے-وہ سب سے صحت مند ہوتے ہیں اور جو ڈاکٹر سے مسلسل چیک اپ کراتا ہے ان سے بھی زیادہ وہ لوگ قوی ہوتے ہیں-اکثر اصول طب لوگوں کے عادات،ان کے عرف اور ان کے تجربے سے ماخوذ ہوتے ہیں، جب کہ شریعت کی بنا اس بات پر ہوتی ہے کہ بندوں کے اختیاری افعال میں اللہ کی رضا اور اس کی ناراضی کہاں کہاں ہے،اس کو معلوم کیا جائے -اور اس کا دارومدار خالص وحی پر ہوتا ہے-سانس لینے اور کھانا پانی نہ ملنے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بدن کو موت آجائے گی اور روح جسم عنصری سے نکل جائے گی جب کہ دوسری طرف شریعت نہ ہونے کی صورت میں روح اور قلب میں مکمل طور سے فساد برپا ہو جائے گا،اور خود بدن کو بھی ہلاکت نصیب ہوگی-اس لیے انسانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے احکام کی معرفت،اس کی انجام دہی،اس کی طرف دعوت،اس پر صبر اور اس سے خروج کرنے والے سے جہاد، سے بڑھ کر لوگوں کو کسی بات کی حاجت نہیں-(۵۸)

مختلف لطائف ومعانی اور دقائق واسرار پر مشتمل یہ کتاب سالکین کے لیے ایک ضروری مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے-

۱۱-زاد المعاد فی هدی خیر العباد

یہ کتاب اسلامیات کا دائرۃ المعارف ہے-اس میں صحیح احادیث وآثار کی روشنی میں سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے-عبادات واخلاق سے لے کر معاملات تک ہر پہلو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے-جابجا محدثانہ بحثیں بھی موجود ہیں-یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے-پہلی جلد میں پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب بیان کیا گیا ہے-اس کے آخر میں چند فصول کے تحت عبادات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے-دوسری جلد میں بھی عبادات سے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو بیان کیا گیا ہے-تیسری جلد میں غزوات اور سرایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے-چوتھی جلد میں طب نبوی پر گفتگو کی گئی ہے-پانچویں جلد میں سیرت رسول کی روشنی میں معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے-جلد اول کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں حمد وصلاۃ کے بعد سیرت رسول کی اہمیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی معرفت کا مقام ومرتبہ بیان کیا گیا ہے اور کتاب کن حالات میں لکھی گئی ہے،اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے-

پوری کتاب لائق مطالعہ ہے،بعض مقامات پر ان کی خاص آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے،مثلاً زیارت قبور کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابۂ کرام کی قبروں کی زیارت کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعاے رحمت ومغفرت کرتے اور یہی زیارت امت کے لیے مسنون ہے-

آگے چل کر لکھتے ہیں: لیکن مشرکین نے اس سے انکار کیا،وہ مردوں کو پکارتے ہیں،اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں،ان کی قسم کھاتے ہیں، ان سے حاجتیں مانگتے ہیں،ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں-(۵۹)

مجموعی طور پر کتاب اسلامی علوم ومعارف کا مجموعہ ہے جو طالبین وسالکین کے لیے کام کی چیز ہے-زبان کی صوفیانہ حلاوت وچاشنی اس پر مستزاد ہے-

۱۲-الروح فی الکلام علی أرواح الاموات والاحیاء بالدلائل من الکتاب والسنة

روح اور اہل قبور کے احوال سے متعلق مختلف علمی مباحث پر مشتمل یہ کتاب اسلامیات کے ذخیرے میں وقیع اضافہ ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ روح اور اس سے متعلق جملہ مباحث پر قرآن وحدیث اور آثار صحابہ وتابعین وائمہ مسلمین کی روشنی میں جس عمدہ علمی انداز

میں اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے وہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

بنیادی طور پر کتاب کو اکیس مسائل پر منقسم کیا گیا ہے۔ ہر مسئلہ کو ہم ایک مستقل باب کی منزل میں قرار دے سکتے ہیں۔ پھر ان مسائل کے تحت متعدد فصلیں ہیں۔ اخیر میں ایک خاتمہ ہے اور اس کے تحت بھی کئی فصلیں ہیں۔ اس پوری کتاب کے مطالعے سے بہت سے وہ اعتقادات سامنے آتے ہیں جن کی، حافظ ابن قیم کے نام لیواؤں کے یہاں کوئی گنجائش نہیں، مثلاً وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ مردے اپنی قبروں کی زیارت کرنے والوں کو پہچانتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ (۶۰) مردوں کی روحیں باہم زیارت اور ملاقات کرتی ہیں۔ (۶۱) خود مردوں کی روحیں زندوں سے ملاقات کرتی ہیں۔ (۶۲) اور زندوں کی جو صفتیں ہوتی ہیں وہ موت کے بعد بھی روحوں سے جدا نہیں ہوتیں اور روحیں بے جان پتھر کی طرح نہیں ہوتیں۔ (۶۳) وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ مردوں کو عبادات مالیہ اور بدنیہ میں سے کچھ بھی اگر ایصال ثواب کیا جاتا ہے تو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ (۶۴)

عبادات بدنیہ کے ایصال ثواب پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عبادات بدنیہ مثلاً نماز، روزہ، قرآن کی تلاوت اور ذکر کے سلسلے میں اختلاف ہے، چنانچہ امام احمد اور جمہور سلف کا یہی مذہب ہے کہ اگر ان عبادتوں کا ثواب مردوں کو پہنچایا جائے تو پہنچتا ہے۔ یہی قول امام ابوحنیفہ کے بعض اصحاب کا ہے۔ محمد بن یحییٰ کحال سے منقول امام احمد کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے۔ محمد بن یحییٰ کحال فرماتے ہیں کہ ابوعبداللہ (امام احمد) سے کہا گیا کہ ایک آدمی نماز، صدقہ وغیرہ کرتا ہے اور پھر اس کا آدھا ثواب اپنے والد یا اپنی والدہ کو ہبہ کر دیتا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے ثواب پہنچنے کی امید ہے یا آپ نے یہ فرمایا: صدقہ وغیرہ کا ثواب پہنچے گا اور آپ نے یہ بھی فرمایا: تین مرتبہ آیت الکرسی پڑھو، قل ہو اللہ احد پڑھو اور یہ کہو اے اللہ! اس کا ثواب قبرستان والوں کو پہنچے۔ (۶۵)

ایک مقام پر الہام ملکی اور القائے شیطانی کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الہام ملکی اور القائے شیطانی کے مابین کئی فرق ہے۔ ایک یہ ہے کہ جو الہام اللہ کے لیے اور اس کی رضا وخوش نودی کے موافق ہو وہ الہام ملکی ہے اور جو اس کی خوش نودی کے مطابق نہ ہو وہ شیطانی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جس الہام کا نتیجہ اللہ کی طرف توجہ وانابت اور اس کے ذکر کی صورت میں ہو وہ الہام ملکی ہے اور جو اس کے برعکس ہو وہ شیطانی ہے، اور جس الہام سے انس اور قلب وسینہ میں نور وانشراح پیدا ہو وہ الہام ملکی اور جو اس کے برعکس ہو وہ شیطانی ہے۔ جس الہام سے سکینہ وطمانیت حاصل ہو وہ ملکی ہے اور جس سے قلق واضطراب پیدا ہو وہ شیطانی ہے۔ (۶۶)

۱۳۔مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد وایاک نستعین

تصوف کے مسائل ومفاہیم، ارشادات واقوال، احوال ومقامات اور حقائق ومعارف پر مشتمل یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۵۳۰ر صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دوسری جلد میں ۵۲۰ر صفحات ہیں جب کہ تیسری جلد ۵۲۳ر صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دراصل شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی حنبلی قدس سرہ (۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح ہے۔ عام طور سے حافظ ابن قیم کے سوانح نگاروں نے اس کتاب کا نام مراحل السائرین ذکر کیا ہے۔ (۶۷)

اس کتاب میں مؤلف نے سورۂ فاتحہ کے معانی ومطالب اور حقائق ومعارف پر گفتگو کی ہے، اہل بدعت اور اہل ضلال کا رد کیا ہے اور سائرین وسالکین کے منازل اور عارفان راہ طریقت کے مقامات کو بیان کیا ہے۔ (۶۸) اور اسی ضمن میں انہوں نے کثرت کے ساتھ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی کی کتاب منازل السائرین سے نقل کیا ہے اور اس طرح پوری کتاب کی شرح کر دی ہے۔ ''قال صاحب المنازل'' کہہ کر وہ شیخ الاسلام کی بات نقل کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد کلام کرتے ہوئے اس پر اپنی رائے نقل کرتے ہیں۔

ایک مقام پر صرف تصوف کے رسوم ورواج پر اکتفا کرنے والے قرآن وسنت سے دور متصوفین پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اسی بات پر قسم یاد فرمائی ہے کہ ہر شخص گھاٹے میں ہے اور صرف وہی کامیاب ہے جس کی قوت علمیہ اور قوت عملیہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعے کامل ہے اور جو حق بات اور اس پر صبر کی وصیت کر کے دوسرے کو کمال عطا کرنے والا ہے، اور ایمان وعمل کو کمال اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ ایمان وعمل پر صبر کیا جائے اور ایمان وعمل کی وصیت کی جائے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے لمحات بلکہ وہ زندگی کی ہر ایک سانس عالی مطالب کے حصول میں صرف کرے اور اس طرح وہ کھلے خسارے سے نجات پائے۔ اور یہ اسی صورت میں حاصل ہوگا جب کہ قرآن کی طرف کامل توجہ کی جائے اور قرآن کے معانی ومفاہیم میں غور وفکر سے قلبی تعلق قائم کیا جائے، اس کے خزانوں کو نکالا جائے، اس کے دفینوں کو کرید کر سامنے لایا جائے، اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی طرف پورا لو لگایا جائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی معاش ومعاد میں اپنے بندوں کے مصالح کا ذمہ دار ہے اور وہی اپنے بندوں کو رشد وہدایت پر گام زن کرنے والا ہے۔ لہٰذا حقیقت، طریقت، ذوق اور صحیح مواجید ساری چیزیں مشکاۃ الٰہی سے مقتبس ہوں گی اور اس کے ثمرات اس کے شجر سے ہی برآمد ہوں گے۔ (۶۹)

سالک کے منازل میں ایک منزل خشوع بھی ہے۔ خشوع کی حقیقت اور پھر اس کے

درجات بیان کرنے کے بعد خشوع کا تیسرا درجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خشوع کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ مکاشفے کے وقت حرمت مقام کی حفاظت کی جائے اور ''وقت'' کولوگوں کے ریا سے پاک وصاف رکھا جائے اور نگاہیں محض اسی کے فضل وکرم پر لگی ہوں۔ مکاشفے کے وقت حرمت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو عاجزی اور انکساری کے ذریعے انبساط اور شوخی سے روکا جائے، اس لیے کہ مکاشفہ انبساط وشوخی کا سبب بنتا ہے اور ایسے مقام پر اگر خشوع حرمت مقام کا محافظ نہ ہو تو شطحیات کا خدشہ ہے، اور لوگوں کے دکھاوے سے وقت کو پاک وصاف رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے وقت کو ریا سے پاک رکھے کیوں کہ اس مقام پر فائز حضرات تو اس چیز سے بہت بلند ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس نے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کیا ہے اسی طرح مقدور بھر اپنے اچھے احوال کو لوگوں سے چھپائے تا کہ لوگ اس پر مطلع نہ ہوں اور اس کے مکاشفے پر لوگوں کی اطلاع کی وجہ سے اس کے اندر عجب وغرور پیدا نہ ہو، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے اس کا وقت، اس کا قلب اور اس کا حال فاسد ہو جائے۔ کتنے سالک اس بیابان سلوک میں لٹ گئے اور وہی شخص محفوظ رہ سکا جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ لہٰذا اس مقام پر سالک صادق کے لیے تواضع اور انکساری سے آراستہ ہونے سے زیادہ کوئی بھی چیز نفع بخش نہیں ہے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جس کا اسلام ہی ابھی درست نہیں ہوا ہے۔ پھر وہ اسلام میں شرف ومنزلت کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے۔(۷۰)

توکل کے درجات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

توکل کا چھٹا درجہ یہ ہے کہ قلب کو مکمل طور سے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے اور سارے اسباب کو سمیٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور اپنے تمام میلانات وخواہشات کو ختم کر دیا جائے اور اسی لیے اس کی تفسیر کرنے والوں نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ توکل یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح ہو جائے جس طرح مردہ غسل دینے والے کے سامنے ہوتا ہے، کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے، اس کی اپنی کوئی حرکت اور کوئی تدبیر نہ ہو اور یہی مقصود ان لوگوں کا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ توکل یہ ہے کہ تدبیر چھوڑ دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی تدبیر کے سامنے خود سپردگی کر دی جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ امر ونہی کو چھوڑ دیا جائے بلکہ رب تعالیٰ جو آپ کے ساتھ کرنا چاہتا ہے اس میں تدبیر چھوڑ دی جائے، وہاں نہیں جہاں اس نے بندے کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہے۔(۷۱)

معرفت کے ضمن میں علم کے تعلق سے صوفیہ کا موقف واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

علم کے تعلق سے اہل حق صوفیہ کا موقف یہ ہے کہ صوفیہ کی جماعت معرفت کو علم پر ترجیح

دیتی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ حصول علم کے لیے تیار نہیں ہوتے بلکہ اسے قاطع راہ طریقت اور حجاب قرار دیتے ہیں، جب کہ صوفیہ میں اہل استقامت حضرات اپنے مریدین کو حصول علم کا بہت تاکیدی حکم دیتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کوئی صاحب علم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اللہ کا کامل ولی نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ کسی جاہل کو اپنا ولی بنایا اور نہ کسی جاہل کو اپنا ولی بنائے گا اور جہالت ہر بدعت وگم راہی اور نقص کی اصل ہے جب کہ علم ہر بھلائی، ہدایت اور کمال کا سرچشمہ ہے۔(۷۲)

حافظ ابن قیم کی عملی زندگی میں تصوف

گزشتہ صفحات میں حافظ ابن قیم کی مختلف کتب تصوف کا تعارف پیش کیا گیا اور ان سے متعدد اقتباسات پیش کیے گئے، اب ہم مورخین کی تصریحات کی روشنی میں ان کی عملی زندگی میں تصوف معنوی اور حقیقی کے عناصر تلاش کریں گے جس سے قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ ان کو ذوق تصوف حاصل ہے یا نہیں۔ ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر چکے ہیں کہ جو بھی عقیدے کی تصحیح کے ساتھ تزکیۂ باطن اور مقام احسان تک رسائی کے لیے کوشاں ہو، ہم صوفی اور متصوف کے نام کا اطلاق ایسے شخص پر کر سکتے ہیں اور ہم اسے راہ سلوک کا مسافر قرار دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ابن قیم جوزی کی کثرت عبادت، محبت الٰہی، جوش و ولولہ اور مقام احسان تک رسائی کے لیے ان کے مجاہدات وعبادات کو بیان کرتے ہوئے حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں:

وہ کثیر العبادت اور بڑے شب بیدار تھے۔ ان کی نماز بڑی دراز اور پُرسکون ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت ذکر وشغل میں مصروف رہتے، ان کے اندر حب الٰہی کا ایک جوش اور انابت ورجوع کی ایک خاص کیفیت تھی۔ ان کے چہرے پر بارگاہ خداوندی کی طرف فقر واحتیاج اور عجز وانکساری کا نور معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ان کو اس کیفیت میں بالکل منفرد اور ممتاز پایا۔ کئی مرتبہ سعادت حج سے سرفراز ہوئے اور ایک زمانے تک مکہ معظّمہ میں اقامت پذیر رہے۔ اہل مکہ ان کی کثرت عبادت اور کثرت طواف کے ایسے حالات وواقعات سناتے ہیں جو باعث حیرت ہیں۔(۷۳)

علامہ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے زمانے میں دنیا میں ان سے زیادہ کوئی عبادت گزار اور کثرت کے ساتھ نوافل ادا کرنے والا تھا۔ وہ نمازیں بڑی لمبی پڑھتے اور رکوع وسجود بہت طویل کیا کرتے۔ بعض اوقات ان کے احباب ان کو ملامت بھی کرتے لیکن اس کے باوجود وہ اس کو ترک نہیں کرتے اور اپنا یہ عمل بند نہیں کرتے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے اپنے امور و احوال میں ان کی نظیر کم ہوگی۔(۷۴)

حافظ ابن قیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بعض اسباب کی بنا پر قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے گزرا- ان کی زندگی کا یہ حصہ تو بظاہر مشکلات و تکالیف سے پُر رہا لیکن دینی اور روحانی لحاظ سے یہ ان کے لیے بڑا نفع بخش اور عظیم فتوحات کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوا- اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شاگرد حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں:

اس پوری مدت میں وہ تلاوت قرآن اور اس کے معانی میں تدبر و تفکر میں مشغول رہے- اس سے ان کو بڑے فتوحات خیر حاصل ہوئے اور ان کو صحیح ذوق و وجد کا بڑا حصہ حاصل ہوا، جس کی وجہ سے اہل معارف کے علوم اور ان کے غوامض و دقائق کا سمجھنا، سمجھانا اور ان پر کلام کرنا ان کے لیے آسان ہو گیا- ان کی تصنیفات اس طرح کے مضامین سے بھری ہوئی ہیں-(۷۵)

ان کے شاگرد حافظ ابن رجب حنبلی اور ان کے دوست حافظ ابن کثیر کے ان بیانات کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حافظ ابن رجب نے ان کو ''عارف'' (۷۶) کے لقب سے یاد کیا ہے جو خالص صوفیہ کی اصطلاح ہے اور خود ان کی وہ تصنیفات جو موضوعات تصوف پر مشتمل ہیں، ان میں علمی اور عملی تصوف کے نمونے جابجا نظر آتے ہیں- ان کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی عملی زندگی رنگ تصوف میں رنگی ہوئی ہے-

جائزہ و خلاصۂ بحث

اگر ہم پچھلے صفحات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آغاز گفتگو میں ایک سوال اٹھایا گیا اور اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے پہلے تصوف اور صوفیہ کے تعلق سے ان کی رائے پیش کی گئی، پھر کسی کو معنوی طور پر صوفی یا متصوف کب کہا جا سکتا ہے، اس کی کسوٹی بھی بیان کی گئی اور پھر اس کے بعد موضوعات تصوف پر مشتمل ان کی کتابوں کی فہرست دی گئی اور پھر ان کتابوں کو بنیاد بنا کر آگے کی گفتگو کی راہ ہموار کی گئی، بالترتیب ان کتابوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا اور ان کی ہر کتاب سے ذوق تصوف کی شہادت دینے والا کم از کم ایک اقتباس ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر پیش کیا گیا، اور پھر عملی طور پر ان کے ذوق تصوف کی تائید میں ان کے ہم عصر دو مورخین کی تاریخی شہادت پیش کی گئی- چنانچہ تصوف اور صوفیہ سے متعلق حافظ ابن قیم کی رائے، ان کی کتابوں کے مطالعے اور ان سے دیے گئے اقتباسات اور مورخین کے تاریخی بیانات کی روشنی میں اس بحث کے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱- وہ تصوف فلسفی کے منکر ہیں اور فلسفہ سے متاثر صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں اور وحدت الوجود جیسے مسائل کو اس لیے قبول نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اس کی وجہ سے حلول و اتحاد اور پوری کائنات کے خالق ہونے کا نظریہ سامنے آتا ہے- البتہ لاموجود الا اللہ جیسے کلمات

اگر صوفیۂ عارفین سے منقول ملتے ہیں تو ان کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے خارج میں وجود کی نفی نہیں کی ہے بلکہ سالک کے شہود و احساس میں ماسوا کے وجود کی نفی کی ہے-

۲- وہ جاہل صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے نظام شریعت کو معطل کر کے یا پس پشت ڈال کر رسم و رواج کو عین شریعت سمجھ رکھا ہے اور ان کی نظر خالق سے زیادہ مخلوق کی طرف مرکوز ہے-

۳- وہ تصوف شرعی کو قبول کرتے ہیں، اہل استقامت صوفیہ کی آرا نقل کرتے ہیں اور ان صوفیہ کو اہل حق جماعت میں شامل قرار دیتے ہیں، صوفیانہ اصطلاحات کو بھی قبول کرتے ہیں البتہ اس ضمن میں وہ محقق کی حیثیت سے بعض اصطلاحات اور فروعی مسائل سے کلی یا جزوی طور پر اختلاف کرتے ہیں، صوفیہ کے بعض مبہم اقوال کی شرح بھی کرتے ہیں اور اس کے صحیح معانی کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں-

۴- ان کی فکری اور عملی زندگی بلاواسطہ حقیقت تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے- قشر تصوف اور رسومات تصوف سے خواہ انہیں جس قدر بیر ہو لیکن قرآن و حدیث کے گہرے مطالعے اور مشائخ صوفیۂ کرام کی تالیفات اور ان کے اقوال پر وسیع معلومات کی وجہ سے ان کی تحریریں ذوق تصوف سے لبریز اور عملی زندگی پر حضرات صوفیہ کے گہرے اثرات معلوم ہوتے ہیں- بالجملہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں وہ حقیقت تصوف کو قبول کرنے والے اور تزکیہ و احسان کی راہ پر گام زن ہیں اور صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق کم از کم وہ متصوف ضرور ہیں اور اس نتیجے سے ان لوگوں کی تردید ضرور ہوتی ہے جو علامہ ابن جوزی، شیخ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم وغیرہم جیسے دوسرے علما کی آڑ میں تصوف پر تنقید کی بجائے تصوف کی تردید کرتے ہیں، تصوف کے نام پر رائج غلط عناصر پر قدغن لگانے کے بجائے سرے سے تصوف کو مسترد کرتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا شخصیات کے نزدیک تصوف بالکلیہ گم راہی کا نام ہے اور صوفیہ کی ساری جماعتیں گم راہ ہیں- جو لوگ اس نتیجے تک پہنچے ہیں یقیناً ان کی بحث میں کہیں نہ کہیں کوئی سقم ہے یا پھر وہ خود ساختہ نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں، جب کہ ناقدین تصوف کے مختلف اقوال کو ایک خاص زاویے سے پیش کرنا اور ان سے مزعومہ نتائج اخذ کرنا ان محققین کا شیوہ نہیں جو حق کی تلاش میں روز و شب سرگرداں ہیں اور ایسا کرنے والے تحقیق کی اخلاقیات کے لحاظ سے مجرم تو ہیں ہی وہ کل بروز حشر بھی احکم الحاکمین کی بارگاہ میں مجرموں کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے-

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ قبول حق اور اشاعت حق کی کوشش کی جائے، خواہ وہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور صوفیہ اور تصوف کے حوالے سے ہمارے اسلاف اور جمہور علمائے دین کا جو موقف ہے اسے پیش کیا جائے اور کسی جماعت کو بھی گم راہ قرار دیتے وقت رب تعالیٰ کا یہ فرمان پیش نظر رہے کہ بے شک تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے منحرف اور کون راہ ہدایت پر

ہے-(۷۷)یونہی صوفیہ کے متعلقین و منتسبین کو بھی چاہیے کہ وہ بھی جادۂ حق سے منحرف نہ ہوں، رسوم ورواج کے بجائے حقیقت تصوف کی ترویج واشاعت کے لیے جہد مسلسل کریں اور کسی بھی بات کو صرف اس بنا پر ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی کوشش نہ کریں کہ اس کا قائل ان پر تنقید کر رہا ہے اور ان کی ہر بات من وعن قبول نہیں کرتا ہے-ایسے موقع پر ”شاید کہ پلنگ خفتہ باشد“ پیش نظر رہے اور حق کو قبول کیا جائے خواہ وہ کہیں سے بھی آئے اور ہمیشہ ہماری توجہ اپنی اصلاح اور غیروں کے لیے تمنائے ہدایت پر مرکوز رہے-کون شاہ راہ ہدایت پر ہے اور کون اس سے منحرف، اس کی حقیقت اللہ جانتا ہے، یہ عقیدہ بھی پیش نظر رہے-یہی صوفیانہ منہج ہے اور یہی صوفیہ کا طریقہ-اللہ تعالیٰ ہمیں حق سننے، حق دیکھنے، حق سمجھنے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے-(آمین)

حوالہ جات

۱-ذیل طبقات الحنابلہ،ص:۳۶۱،مصدر الکتاب:http:/www.alwarraq.com

۲-نفس مصدر،ص:۳۶۱-۳۶۲

۳-البدایۃ والنہایۃ،ج:۱۴،ص:۲۷۰،مصدر الکتاب:موقع یعسوب

۴-ذیل طبقات الحنابلۃ،ص:۳۶۲

۵-نفس مصدر

۶-تاریخ دعوت وعزیمت،۲/ ۳۴۸مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۲۰۰۵ء

۷-ذیل طبقات الحنابلۃ،ص:۳۶۲،البدایۃ والنہایۃ،ج:۱۴،ص:۲۷۵

۸-دیکھئے:مدارج السالکین اور ان کی دوسری کتابیں

۹-القرآن، والشّمس:۹

۱۰-دیکھیے: مدارج السالکین میں مذکور مختلف مباحث اور ان کی دیگر تالیفات تصوف؛ خصوصیت کے ساتھ مدارج السالکین،ج:۱،ص:۱۳۹/اورص:۱۵۵،ج:۳،ص:۱۵۱،

۱۱-دیکھیے: www.attaweel.com اور التصوف والصوفیۃ فی ضوء الکتاب و السنۃ للسید یوسف ہاشم الرفاعی-یہ عبارت ان حوالوں میں موجود ہے لیکن جب میں نے اصل ماخذ یعنی مدارج السالکین شرح منازل السائرین، جو المکتبۃ الشاملۃ میں موجود ہے، سے رجوع کیا تو مجھے یہ عبارت تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی، حالاں کہ جنہوں نے یہ عبارت ذکر کی ہے ان کا نام علمی دنیا میں ایک معتبر حوالہ ہے-لہٰذا اس عبارت کا ابن قیم کی مذکورہ کتاب میں نہ ملنا ان کی کتابوں میں تحریف کا غماز ہے-

۱۲-نفس مصدر ج:۲،ص۳۳۰

۱۳-نفس مصدر، ج:۱،ص: ۱۳۵

۱۴-نفس مصدر، ج:۲،ص:۳۰۷

۱۵-طریق الہجرتین،ص:۲۶۱،۲۶۰

۱۶-مدارج السالکین، ج:۲،ص:۶۴۹۹

۱۷-نفس مصدر، ج:۱،ص:۳۹

۱۸-نفس مصدر، ج:۳،ص:۳۳۰

۱۹-نفس مصدر، ج:۳،ص:۱۵۱

۲۰-نفس مصدر، ج:۳،ص:۱۲۸

۲۱-دیکھئے مدارج السالکین میں مختلف مقامات پر سماع کی بحث

۲۲-نفس مصدر، ج:۳،ص:۳۳۴

۲۳-نفس مصدر، ج:۳،ص:۳۳۵

۲۴-نفس مصدر

۲۵-نفس مصدر، ج:۱،ص:۱۳۹

۲۶- نفس مصدر، ج:۱،ص:۱۵۵

۲۷-نفس مصدر، ج:۲،ص:۴۵۷

۲۸-نفس مصدر

۲۹-ذیل طبقات الحنابلۃ،ص:۳۶۲

۳۰-ج:۱،ص:۳۰،ناشر دار المعرفۃ،طبع ثانی،تحقیق:محمد حامد الفقی

۳۱-نفس مصدر ص:۶-۵ملخصاً

۳۲-نفس مصدر ص:۱۰۳-۱۰۴

۳۳-نفس مصدر ص:۱۰۴ملخصاً

۳۴-نفس مصدر ج:۲،ص:۳۶۷

۳۵-ص:۳۰،ناشر دار الکتب العلمیۃ طبع ثانی ۱۳۹۳-۱۹۷۳

۳۶-نفس مصدر ص:۱۱۱-۱۱۲

۳۷-ص:۳۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۵-۱۹۸۵ء،تحقیق عبدالرحمٰن عوض

۳۸-ص:۱۹۶،ناشر دار الکتب العلمیہ، بیروت

۳۹-نفس مصدر ص:۲۱۵

۴۰-نفس مصدر ص:۲۳۴

۴۱-نفس مصدر

۴۲-ص:۳۰، ناشر دار الکتب العلمیۃ، بیروت،۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء

۴۳-نفس مصدر ص:۲۵۹-۲۶۰

۴۴-ص:۲:۳۷۲، دار العروبۃ، کویت، ۱۹۸۷م، تحقیق شعیب الارناؤط، عبدالقادر الارناؤط

۴۵-نفس مصدر ص:۴۳۴

۴۶-نفس مصدر:۴۸۲

۴۷-ص:۱۶، ناشر مکتبۃ المدنی، جدہ، تحقیق: محمد جمیل غازی

۴۸-نفس مصدر ص:۳۷-۴۷

۴۹-نفس مصدر ص:۵۹

۵۰-نفس مصدر ۵۹-۶۱ ملخصاً

۵۱-ملخصاً، ص:۱۹-۲۱، دار ابن القیم، دمام، طبع ثانی،۱۴۱۴/ ۱۹۹۶ء، تحقیق: عمر بن محمود ابو

عمر

۵۲-نفس مصدر: ص:۴۰

۵۳-ملخصاً ص:۹، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، تحقیق: زکریا علی یوسف

۵۴-نفس مصدر:۸۸

۵۵-نفس مصدر:۲۴۲-۲۴۳

۵۶-ج:۱،ص:۳۰۵، ناشر دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۵۷-ج:۱، نفس مصدر ص:۲۹۸

۵۸-نفس مصدر ج:۲،ص:۲

۵۹-ج:۱،ص:۵۲۷، ناشر: موسسۃ الرسالۃ، بیروت، سال طباعت ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء

۶۰-المسألۃ الأولی،ص:۵-۱۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۳۹۵/ ۱۹۷۵ء

۶۱-المسئلۃ الثانیۃ، نفس مصدر، ص:۱۷-۲۰

۶۲-نفس مصدر، المسئلۃ الثالثۃ،ص:۲۰-۳۴

۶۳-نفس مصدر، المسألۃ الخامسۃ،ص:۳۸-۴۱

۶۴-المسألۃ الرابعۃ عشرۃ ص:۸۹،۹۰، المسئلۃ الخامسۃ عشرۃ، المسئلۃ السادسۃ عشرۃ

۶۵-نفس مصدر، المسئلۃ السادسۃ عشرۃ،ص:۱۱۷

۶۶-نفس مصدر، المسئلۃ الحادیۃ العشر ون،ص:۲۵۶-۲۵۷

۶۷-ذیل طبقات الحنابلۃ ص:۳۶۲، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، ابن العماد ص:

۱۶۸

۶۸-دیکھیے: ج:۱،ص:۷، دار الکتاب العربی، بیروت،۱۹۷۳ء، تحقیق محمد حامد الفقی

۶۹-نفس مصدر ج:۱،ص:۷

۷۰-نفس مصدر ج:۱،ص:۵۲۴

۷۱-نفس مصدر ج:۲،ص:۱۲۱-۱۲۲

۷۲-نفس مصدر ج:۳،ص:۳۳۵

۷۳-ذیل طبقات الحنابلۃ ص:۳۶۲

۷۴-ج:۱۴،ص:۲۷۰

۷۵-ذیل طبقات الحنابلۃ،ص:۳۶۲

۷۶-نفس مصدر:۳۶۱

۷۷-القرآن الکریم، النحل:۱۲۵

(نوٹ) اس مقالے کی تیاری میں تاریخ دعوت وعزیمت کو چھوڑ کر سارے مصادر و مراجع ''المکتبۃ الشاملۃ'' سے لیے گئے ہیں، لہٰذا بازار میں دستیاب مطبوعہ کتابوں سے مقالے میں دیے گئے حوالوں کے صفحات مختلف ہو سکتے ہیں۔

○○○

محمد ساجد رضا مصباحی

الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ-ایک تجزیاتی مطالعہ

حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (۱۰۵۸ء/۴۵۰ھ-۱۱۱۱ء/۵۰۵ھ) ایک ایسی عبقری شخصیت کا نام ہے جنہیں ان کے بے مثال کارناموں اور زریں خدمات کی وجہ سے شہرت دوام حاصل ہوئی- متقدمین و معاصرین نے انھیں حجۃ الاسلام اور محی علوم الدین کے لقب سے یاد کیا- عقائد واعمال کی اصلاح، فرق باطلہ کے خلاف جہاد اور معاصر فلاسفہ کے گم راہ کن نظریات کے خلاف معرکہ آرائی اور ان جیسے متعدد تجدیدی کارناموں نے انھیں پانچویں صدی کے مجدد کی حیثیت سے متعارف کرایا- ان کی عہد ساز شخصیت اور ان کے شان دار کارناموں پر تحقیق وتنقید کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے- ان کے افکار ونظریات پر بحث وتمحیص اور جلیل القدر علما کا نقد ونظر، ان کی عظمت ورفعت کی دلیل ہے-

امام غزالی اپنی گوناگوں خصوصیات اور فضائل وکمالات کے باوصف تاریخ کی دوسری عظیم المرتبت شخصیتوں کی طرح تعریف وتوصیف کے ساتھ ایک دوسرے طبقے کی شدید تنقید کا بھی نشانہ رہے- ان کے افکار ونظریات پر طرح طرح سے اعتراضات کیے گئے- ان کی تصانیف پر نقد ونظر کی محفلیں سجائی گئیں- امام غزالی کے ناقدین کوئی عامی یا معمولی افراد نہیں تھے بلکہ علوم وفنون میں گہری بصیرت رکھنے والے چوٹی کے وہ علما تھے، جن کی حیثیت اہل علم کے درمیان مسلم تھی- امام غزالی کے ناقدین میں خصوصی طور پر ابو بکر بن العربی، حافظ تقی الدین ابن الصلاح، ابو الفرج ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن رشد اور ابو عبد اللہ مازری مالکی کے نام لیے جاسکتے ہیں-

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۹ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو مصر میں پیدا ہوئے- ۹ر برس کی عمر میں حفظ قرآن کریم کی تکمیل کی، پھر جامعہ ازہر میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک عرصے تک مصر کی وزارت

مذہبی امور میں کام کیا- ان کی بعض تصانیف سے مصری حکومت مشتعل ہوگئی اور انھیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا-

ڈاکٹر قرضاوی یورپین کونسل فار فتاویٰ اینڈ ریسرچ سینٹر کے سربراہ ہیں- عرب دنیا میں انھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے- وہ اسلام آن لائن ڈاٹ نٹ (islamonline.net) پر بھی لوگوں کے سوالات کے جوابات اور فتاویٰ جاری کرتے ہیں- ڈاکٹر قرضاوی کا خیال ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو گرین وچ کے ٹائم کے بجائے مکہ مکرمہ کے ٹائم کو مد نظر رکھنا چاہیے- وہ تصویر کشی کو جائز قرار دیتے ہیں- اب تک ان کی پچاس سے زائد تصانیف شائع ہوچکی ہیں-(۱)

ڈاکٹر قرضاوی بنیادی طور پر آزاد خیال سلفی ہیں- یعنی عام سلفیوں کی طرح سخت گیر اور متعصب نہیں ہیں، بلکہ اپنے مطالعے اور مشاہدے سے جو بات انھیں حق معلوم ہوتی ہے اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتے، خواہ وہ سلفی نظریات کے خلاف کیوں نہ ہو- وہ ابن تیمیہ اور امام غزالی کو آئیڈیل قرار دیتے ہیں-

الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی گراں قدر تالیف ہے، جس میں انھوں نے علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں امام غزالی قدس سرہ کے نقد ونظر اور اصلاحات اور دین کی تجدید واحیا میں ان کے شان دار کارناموں کو پیش کر کے ان کے مادحین اور ناقدین کا جائزہ لیا ہے-

اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی کی وفات کے نو سو سال مکمل ہونے پر ایسیسکو کی ایک اسلامی ثقافتی تنظیم کی جانب سے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیز کو ایک مکتوب ارسال کیا گیا، جس میں اس عظیم اسلامی مفکر اور عبقری شخصیت کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کانفرنس، سیمینار اور جشن کے اہتمام کی تجویز پیش کی گئی- اسلامی ممالک کی دوسری یونیورسٹیز کی طرح جامعہ قطر نے اس مبارک تجویز کو قبول کرتے ہوئے جشن کے اہتمام کا فیصلہ لیا- اس موقع پر سیمینار اور سمپوزیم کے انعقاد کے ساتھ ساتھ غزالی کی حیات و خدمات پر ایک جامع کتاب کی اشاعت کا بھی ارادہ ہوا- مؤلف گرامی ڈاکٹر یوسف القرضاوی سے دس بارہ صفحات پر مشتمل مقدمے کی فرمائش کی گئی- لیکن ڈاکٹر صاحب کا اشہب قلم جب رواں دواں ہوا تو پھر صفحات کی تحدید بے معنی ہوگئی- وہ غزالی کے فضائل وکمالات اور ان پر کیے جانے والے نقد ونظر پر لکھتے گئے، یہاں تک کہ ان کا یہ مقدمہ ۱۹۶ر صفحات پر مشتمل ایک کتاب کی صورت میں مکمل ہوا، جس کا ایک حصہ جامعہ قطر کے کلیۃ الشریعہ کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا- اسی موقع کی یہ تحریر بعد میں ''الغزالی بین ماد حیه و ناقدیه'' کے

نام سے طبع ہوکر منظر عام پر آئی-

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے- پہلے حصے میں امام غزالی کا علمی وفکری مقام ،مختلف علوم وفنون میں ان کے بے مثال کارنامے، احیاے دین کے لیے ان کی مخلصانہ جدو جہد اور جمہور مسلمین کے نزدیک ان کی بے پناہ مقبولیت کے اسباب بتائے ہیں، جب کہ کتاب کے دوسرے حصے میں امام غزالی کے مادحین وناقدین اور ان پر کیے جانے والے نقد وجرح کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے-

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں کہ غزالی اپنے زمانے میں علوم وفنون کا انسائیکلو پیڈیا تھے- فقہ، اصول فقہ، کلام ،فلسفہ، منطق ،تصوف ، اخلاق اور ادیان وغیرہ فنون پر آپ کی تصانیف اس پر شاہد ہیں- شیخ الازہر الاستاذ شیخ محمد مصطفیٰ مراغی کے بقول:

''جب علما کا نام آتا ہے تو ذہن ان علوم کی طرف منتقل ہوتا ہے جن علوم میں انھیں اختصاص حاصل ہے- مثلا جب ابن سینا یا فارابی کا ذکر آتا ہے تو فلسفے کا خیال آتا ہے، اس لیے کہ وہ عظیم فلسفی تھے- امام مسلم ، بخاری اور احمد کا ذکر چھڑتا ہے تو علم حدیث میں ان کی معرفت، دیانت ،صداقت اور امانت کا خیال آتا ہے- لیکن جب غزالی کا ذکر ہوتا ہے تو علوم وفنون کی متعدد ایسی شخصیتوں کا تصور پردۂ ذہن پر ابھرتا ہے جن میں سے ہر ایک علم وفن کے بحر ناپیدا کنار تھے- غزالی جہاں ماہر اصولی معلوم ہوتے ہیں وہیں عظیم فقیہ، بے مثال متکلم، ماہر فلسفی، ناقد فلسفہ، امام السنۃ ،احوال عالم کے راز داں، قلبی کیفیات کے آشنا بھی- گویا ایک ہی شخص متعدد علوم وفنون کے انسائیکلو پیڈیا نظر آتے ہیں''- [۲]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب میں یہ سوال زور وشور سے اٹھایا ہے کہ غزالی کے عہد میں متعدد علما ایسے تھے، جنہیں مروجہ علوم پر گہری بصیرت حاصل تھی ، پھر کیا وجہ ہے کہ جمہور مسلمین نے حجۃ الاسلام کا لقب امام غزالی ہی کے لیے منتخب کیا؟ وہ کون سے کارنامے ہیں جن کی وجہ سے انھیں پانچویں صدی ہجری کا مجدد کہا جاتا ہے؟؟ کیا غزالی حدیث نبوی ''**ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ راس کل مأۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا**'' (رواہ الحاکم والبیہقی) کے صحیح معنوں میں مصداق تھے؟

ان سوالوں کے جواب کے لیے ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے غزالی کے عہد کے حالات کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد غزالی کے ان کارناموں کو ترتیب وار پیش کیا ہے جن کی وجہ سے وہ بجا طور پر حجۃ الاسلام اور پانچویں صدی کے مجدد کہے جانے کے مستحق نظر آتے ہیں- ذیل میں ڈاکٹر قرضاوی کی تفصیلی بحث کا اختصار پیش کیا جاتا ہے-

فلاسفہ سے معرکہ آرائی

غزالی کے عہد میں دینی اصول میں فلسفیانہ افکار کی آمیزش نے دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا- بے لگام فلسفیانہ موشگافیوں کی وجہ سے طرح طرح کی بد عقیدگیاں پیدا ہو رہی تھیں، جن کا دائرۂ اثر دن بہ دن وسیع ہوتا جا رہا تھا- عام لوگوں کے دلوں میں دین کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے- ان کا یقین متزلزل ہو رہا تھا- دینی شعائر کی عظمت ورفعت ان کے دلوں سے ختم ہوتی جا رہی تھی- اس دور کے علما ان کی تردید و ابطال کے لیے جدو جہد بھی کر رہے تھے- لیکن ان کی دفاعی کوششیں ان کے پیہم حملوں کے مقابلے میں بے اثر تھیں- اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کسی ایسے مرد حق آگاہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف یہ کہ دین کے رموز واسرار پر گہری بصیرت رکھتا ہو، بلکہ فلسفہ کے اصول وقوانین کی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف ہو- امام غزالی نے اسلامی اصول وقوانین ، بنیادی عقائد اور اسلامی فلسفے کے تناظر میں مخالفین کے اعتراضات وتنقیدات کا زبردست تعاقب و محاسبہ کیا اور اسلامی علوم وفنون کے ذریعے اس کی کڑی گرفت کی ،جس کے بعد مخالفین کی قلعی کھل گئی اور حق آئینہ کی طرح نمایاں ہو گیا-

امام غزالی کے زمانے میں علوم فلسفہ کی کئی شاخیں تھیں- چوں کہ وہ تمام شاخیں دین کے اصول سے متصادم نہیں تھیں- لہٰذا تردید وابطال سے قبل امام غزالی نے علوم فلسفہ کو چھ قسموں میں تقسیم کیا-۱- ریاضی(Mathamatics). منطق(Logic)۳-طبعیات(physics) ۴-الٰہیات(Metaphisics) ۵-سیاسیات(olitical Science)۶-اخلاقیات (Ethics) پھر علوم فلسفہ کی ان چھ قسموں کو شرعی احکام کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا-

۱-''**قسم یجب به التكفير**''(پہلی قسم: جس کے قائل کی تکفیر کی جائے گی-)

۲-''**قسم یجب به التبديع**''(دوسری قسم: جس کے قائل پر بدعتی ہونے کا حکم لگایا جائے گا-)

۳-''**قسم لایجب انکارہ اصلا**''(تیسری قسم: جس کا انکار ضروری نہیں-)

علوم فلسفہ کی مذکورہ بالا چھ قسموں میں سے ایک ہی قسم یعنی الٰہیات کے بعض اصول شرعی اصولوں سے متصادم ہیں جن میں فلاسفہ نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں- الٰہیات میں فلاسفہ کی غلط فہمیوں کو مجموعی طور پر بیس قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں سے تین امور ایسے ہیں جن کے قائل کی تکفیر کی جائے گی- باقی سترہ کے قائل کو بدعتی قرار دیا جائے گا- ان ہی بیس مسائل میں مذہب فلاسفہ کی تردید کے لیے غزالی نے ''**تہافت الفلاسفۃ**'' لکھی- فلاسفہ کی وہ تین غلط فہمیاں

جن کے قائل کی تکفیر کی جائے گی یہ ہیں:

۱-اجسام کا حشر نہیں ہوگا، بلکہ ثواب وعذاب کا تعلق روح سے ہوگا-

۲-اللہ تعالیٰ کو صرف کلیات کا علم ہے، جزئیات کا نہیں-

۳-کائنات ازلی اور قدیم ہے-

الٰہیات کے علاوہ علوم فلسفہ کی باقی پانچ قسمیں ضروریات دین سے متصادم نہیں، اسی لیے غزالی نے ان سے تعرض نہیں کیا-ہاں! ریاضیات اور طبعیات پر اذعان ویقین کے سبب بعض شرعی قباحتیں لازم آتی ہیں-غزالی نے تہافت الفلاسفہ اور المنقذ من الضلال میں ان قباحتوں پر روشنی ڈالی ہے-

غزالی اور باطنیہ

غزالی کے دور میں دینی وسیاسی منظر نامے میں اسلام کے لیے شدید خطرہ بن کر فرقۂ باطنیہ وجود میں آیا-اس فرقے کا خیال تھا کہ ادراکِ حقیقت اور فہمِ شریعت کے لیے صرف امام معصوم کا قول حجت ہوسکتا ہے-کتاب وسنت کی جو تشریح وہ کریں وہ قابل حجت ہوگی-فرقۂ باطنیہ کے عقائد واعمال بھی اسلام سے متصادم تھے-وہ تعطیل صانع، ابطال نبوت وعبادات کے قائل تھے-بعث بعد الموت کا انکار کیا کرتے تھے-

فرقۂ باطنیہ کا طریقۂ تبلیغ یہ تھا کہ وہ ابتدائی مرحلے میں اپنے ان عقائد کو ظاہر نہیں کرتے-بلکہ وہ اللہ ورسول کی حقانیت کا اقرار کرتے اور ابتدا میں صرف یہ کہا کرتے تھے کہ دین کے باطنی اسرار ان ظاہری اسرار کے علاوہ ہیں، جنھیں عام لوگ جانتے ہیں-ان باطنی اسرار کے افشا کے لیے ہم امام معصوم کے محتاج ہیں-

دھیرے دھیرے اس فرقے کی جمعیت بڑھتی گئی اور یہ فرقہ دلیر ہوتا گیا-اپنے پُرفریب اور شاطرانہ چالوں سے ایک بڑی تعداد کو انھوں نے اپنا ہم نوا بنالیا جو ان کے اشارۂ ابرو پر جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتی-اس فرقے نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے شدت پسندی کا راستہ اختیار کرلیا اور قتل وغارت گری شروع کردی-وہ جس سیاسی یا علمی شخصیت کو اپنے مقصد کے حصول میں رکاوٹ سمجھتے انھیں بڑی مہارت سے قتل کردیتے-ابن جوزی کے بقول:

''وہ انسانوں کا اغوا کرتے تھے، پھر انھیں قتل کرکے کنویں میں ڈال دیتے تھے-ان کی دہشت گردی اس قدر عروج کو پہنچ گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی عصر کے وقت تک اپنے گھر واپس نہیں آجاتا تو اس کے گھر والے اس کی زندگی سے مایوس ہوجاتے تھے-یعنی انھیں یقین ہوجاتا کہ یہ بھی باطنیوں کے ہتّے چڑھ گیا''-(۳)

باطنیہ اپنے گم راہ کن نظریات پر جو دلائل پیش کررہے تھے، ان کی تردید وابطال کے لیے علوم عقلیہ ونقلیہ میں تبحر کے ساتھ ساتھ سنجیدہ انداز کلام اور وسیع فکر ونظر کی ضرورت تھی-یہ اوصاف غزالی کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھے-چناں چہ غزالی نے بڑے موثر انداز میں ان کا رد بلیغ فرماکر ان کی غلط فہمیوں کو آشکارا کیا-آپ نے باطنیہ کی تردید میں درج ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں-

۱-فضائح الباطنیة ۲-حجة البیان ۳-حجة الحق ۴-مفصل الخلاف ۵-الدرج المرقوم بالجداول ۶-القسطاس المستقیم ۷-قاصم الباطنیة ۸-مواھم الباطنیة-

باطنیہ کی دہشت گردی اور ان کی انتقامی کارروائیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غزالی ان کی تردید وابطال میں لگے رہے؛ جب کہ انھیں معلوم تھا کہ یہ وہ جسارت ہے جس کے نتیجے میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑسکتا ہے-لیکن انھوں نے کمالِ شجاعت سے باطنیوں کے ساتھ اپنا قلمی جہاد جاری رکھا اور احقاق حق اور ابطال باطل کے فریضۂ منصبی سے سبک دوش ہوئے-امام غزالی کا یہ وہ بڑا کارنامہ ہے جس میں بڑے بڑے اصحاب استقامت کے قدم اکھڑ جائیں، مگر امام غزالی نے باطنیہ کے اس دور میں تجدید اور احیاے دین کا جو فریضہ انجام دیا ہے وہ کسی مجدد ہی کا کارنامہ ہوسکتا ہے-

غزالی اور مسئلۂ تکفیر

غزالی کے عہد میں متعدد اسلامی فرقوں کا وجود ہو چکا تھا-ہر فرقہ اپنے مخالف فرقوں کی تکفیر کا قائل تھا اور انھیں مباح الدم اور خلود فی النار کا مستحق قرار دیتا تھا-غزالی اس غلو فی التکفیر کے مخالف تھے-انھوں نے بڑے زور وشور سے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اس موضوع پر دو اہم ترین کتابیں ''**الاقتصاد فی الاعتقاد**'' نیز ''**فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة**'' تحریر فرماکر مسئلۂ تکفیر میں غلو سے بچنے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا-

''الاقتصاد'' میں فرماتے ہیں:

''اگر تکفیر سے بچنے کی کوئی راہ نکل سکے تو تکفیر سے بچنا چاہیے-اس لیے کہ اہل قبلہ جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں، ان کے جان ومال کو مباح قرار دینا خطا ہے؛ کہ ایک مسلمان کی خوں ریزی کی غلطی ایک ہزار کافر کو زندہ چھوڑ دینے کی غلطی سے بڑھ کر ہے-نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''**امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، فاذا قالوھا فقد عصموا منی دمائھم واموالھم الا بحقھا.**''(۴)

آگے مزید لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ خطافی التاویل موجب تکفیر ہے، اس لیے کہ تکفیر کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور کلمۂ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وجہ سے عصمت جان و مال قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے- لہٰذا ان کے مباح ہونے کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے-'' (۵)

''فیصل التفرقة بین الاسلام و الزندقة'' میں تکفیر میں غلو کرنے والوں کو غزالی نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا؛ کیوں کہ متکلمین کے ایک متعصب گروہ نے عام مسلمانوں کے لیے یہ لازم قرار دیا کہ وہ علما کی طرح عقائد دینیہ دلائل کے ساتھ جانیں، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ان کی نظر میں کافر ہیں-

اس پر غزالی کہتے ہیں:

''تکفیر میں غلو کرنے والوں میں متکلمین کا ایک گروہ بھی ہے جنھوں نے عام مسلمانوں کی تکفیر کی اور یہ کہا کہ جو ہماری طرح علم کلام کی معرفت نہ رکھے اور عقائد شرعیہ کو ہمارے بیان کردہ دلائل کے ساتھ نہ جانے وہ کافر ہے- اس گروہ نے اللہ کے بندوں پر اس کی وسیع رحمت کو تنگ کر دیا اور جنت کو متکلمین کی ایک مشت بھر جماعت کی جاگیر بنا ڈالا- یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث سے ناواقف تھے؛ کیوں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں بھی بادیہ نشین مسلمانوں کی ایسی جماعت موجود تھی جو پہلے بتوں کی پرستش کرتی تھی- اسلام لانے کے بعد دلائل کے علم سے زیادہ اشتغال نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کی گہرائی سے واقفیت نہیں ہو سکتی تھی- بندے کے دل میں ایمان کا نور متکلمین کی دلائل سے نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے ہوتا ہے-'' (۶)

غزالی اور اصلاح سلاطین

غزالی کی اصلاحی تحریک کا دائرہ صرف عام مسلمان، متکلمین، فلاسفہ، علماے ظاہر اور متصوفۂ عصر تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کے نقد و نظر اور اصلاح و موعظت کے حدود میں وزرا اور سلاطین زمانہ بھی شامل تھے- غزالی کا ماننا تھا کہ امت کی اصلاح، ارباب علم و فکر اور اصحاب سیاست و سلطنت کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی- **اذا صلحا صلح الناس و اذا فسدا فسد الناس**. یعنی جب علما اور سلاطین سدھر جائیں گے تو عوام بھی سدھر جائیں گے اور جب یہ دونوں بگڑیں گے تو عوام بھی بگڑ جائیں گے-

غزالی کہتے ہیں کہ لوگ سلاطین سے حق بات کہنے اور ان کو خیر کی نصیحت کرنے سے اس لیے باز رہتے ہیں کہ ان کے دل میں بادشاہ کا خوف اور اس کی عنایات و عطیات کی طمع پیدا ہو جاتی ہے، حالاں کہ سلاطین کے پاس نہ کوئی ایسی قوت ہے جس کا خوف کیا جائے اور نہ ہی کوئی ایسا مال ہے جس کی طمع کی جائے- یہ لوگ یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ دنیا مسافر کی شاہ راہ ہے، دائمی اقامت

کی جگہ نہیں-

خلیفہ نوشیروان کا ایک وزیر آپ کی عظمت و منزلت اور علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا- امام غزالی نے اس سے فرمایا:

''تمہاری سلطنت کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا اور تم لوگوں کی پناہ گاہ ہو، لہٰذا تمہارا ان کی نگرانی کرنا میری زیارت سے بہتر ہے-'' (۷)

غزالی نے احیاء العلوم میں ظالم امرا و حکام سے میل جول اور ان کے دربار میں آمد و رفت کو مذموم قرار دیا ہے- فرماتے ہیں کہ ظالم امرا و حکام کی تین حالتیں ہیں:

۱- سب سے بری بات یہ ہے کہ تم ظالم امرا اور حکام کے پاس جاؤ-

۲- یہ بھی مذموم ہے کہ وہ تمھارے پاس آئیں-

۳- سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم ان کے پاس جاؤ نہ وہ تمھارے پاس آئیں-

غزالی نے جہاں اپنی تصانیف میں حکام عصر کی غیر شرعی سرگرمیوں اور رعایا پر ان کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی، وہیں اپنے مکتوبات کے ذریعے بلا واسطہ سلاطین کو ان کی کوتاہیوں کا احساس بھی دلایا-

آپ نے سلجوقی سلطان سنجر بن ملک شاہ، جس کے زیر نگیں پورا خراسان تھا، اس کو لکھا:

''افسوس! کہ امت مسلمہ مصائب و آلام کے سبب ہلاکت کے دہانے پر ہے اور تمہارے گھوڑے کی گردن سونے (کے زیورات) سے بوجھل ہے-'' (۸)

وزیر فخر الملک کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا:

''تنہائی میں دو رکعت نماز ادا کرو اور اپنے سجدوں میں اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرو: اے وہ بادشاہ! جس کی بادشاہت لازوال ہے، میرے ملک پر رحم فرما جو ہلاکت کے دہانے پر ہے- اسے غفلت سے بیدار کر اور رعایا کی اصلاح کی توفیق عطا فرما-'' (۹)

وزیر مجیر الدین کو لکھا:

مخلوق کی معاونت سب پر واجب ہے- لیکن ظلم حد سے تجاوز کر گیا ہے- میرے اندر ظلم دیکھنے کی استطاعت نہیں، اس لیے میں نے طوس سے ہجرت کر لی حتیٰ کہ میں ان ظالموں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو رحم و کرم سے ناآشنا ہیں اور محرمات کی رعایت تک نہیں کرتے- پھر کسی ضرورت کے تحت ایک سال بعد طوس آنا ہوا تو ظلم کو بدستور باقی پایا-'' (۱۰)

غزالی ظالم حکمرانوں کے یہاں علما کی آمد و رفت اور ان کے تحفے اور تحائف قبول کرنے کو دین میں رشوت قرار دیتے ہیں- وہ کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں سلاطین کے اموال کا پورا یا

اکثر حصہ حرام طریقے سے حاصل ہوتا ہے-لہٰذا ان سے احتراز لازم ہے-

غزالی اور تصوف

غزالی؛ اصول، فقہ، کلام اور فلسفے میں کامل بصیرت کے حصول اور بعض علوم میں ضروری اصلاحات کے بعد تصوف کی طرف متوجہ ہوئے؛ کیوں کہ غزالی کے بقول صوفیہ ہی درحقیقت رہ روِراہِ خدا ہیں- ان کی سیرت سب سے اچھی، ان کا اخلاق سب سے اعلیٰ، ان کا طریقہ سب سے عمدہ ہے؛ بلکہ اگر دانش وروں کی دانش، حکما کی حکمت اور علماے شریعت کے علم کو جمع کر دیا جائے اور ان سے صوفیہ اپنے اخلاق کو بدل کر بہتر کرنا چاہیں تو ایسا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا-صوفیہ کے تمام ظاہری و باطنی حرکات وسکنات مشکاۃ نبوت سے مقتبس ہیں اور نبوت کے علاوہ روے زمین پر کوئی ایسا نور نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کیا جا سکے- اس طرح غزالی ایک محبّ اور عاشق کی حیثیت سے میدان تصوف میں وارد ہوئے، دیگر علوم وفنون کی طرح بحیثیت ناقد نہیں- اس لیے ابن جوزی نے غزالی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ: غزالی تصوف کو فقہ اور عقل کے معیار پر پرکھنے سے قبل ہی اس میدان میں کود پڑے، لہٰذا انہوں نے بہت سارے ایسے صوفیانہ افکار و اعمال کو قبول کر لیا جو قانون شرع کے خلاف اور کتاب وسنت سے منحرف ہیں-

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ غزالی تصوف کی جس راہ کے مسافر تھے، اس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہی تھی- انھوں نے صوفیانہ افکار وخیالات کو اسلامی اصول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بڑی جد و جہد کی- غزالی سے قبل صوفیہ کی ایک جماعت علم سے کنارہ کش بلکہ علم کی مخالف تھی- یہ جماعت علم کو اللہ اور بندے کے درمیان ایک طرح کا حجاب سمجھتی تھی- غزالی نے سالکِ طریقت کے لیے علمِ شرعی کو ضروری قرار دیا- متعدد مقامات پر ان الفاظ کے ذریعے حصولِ علم کی تاکید فرمائی: ”ان السعادة لاتنال الا بالعلم والعمل.“ (سعادت کا حصول علم وعمل کے بغیر ممکن نہیں-)

غزالی صوفیہ کے اس گروہ کے مخالف تھے جو اپنی شہوات کو ’شریعت‘، اپنے جھوٹے اوہام کو ’علم الٰہی‘، ’نفسانی خواہشات‘ کو ’حب الٰہی‘ اور شریعت مصطفیٰ کی عدم پیروی کو ’طریقۂ تصوف‘ کہتے ہیں- غزالی نے اپنی تصانیف میں جابجا ایسے صوفیہ سے بیزاری اور سخت برہمی کا اظہار کیا ہے- اصلاح تصوف میں غزالی کی خدمات کا اعتراف متقدمین و معاصرین سبھی نے کیا ہے، بلکہ مستشرقین بھی اس میدان میں آپ کے کارناموں سے متاثر نظر آتے ہیں- تفصیلی معلومات کے لیے ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے- ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں کہ تصوف کے باب میں غزالی کی اصلاحات اس شخص کے نزدیک زیادہ واضح ہوں گی جس نے غزالی

سے قبل کے تصوف اور ارباب تصوف کے حالات کا مطالعہ کیا ہے-

امام غزالی کے ناقدین پر ایک نظر

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا کہ حجۃ الاسلام ابوحامد محمد بن محمد الغزالی نے اپنی علمی بصیرت، فکری گہرائی وگیرائی اور خداداد ذہانت کے ذریعے علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں کئی جہتوں سے اصلاحات کیں- باطل افکار ونظریات کا جائزہ لے کر ان کا قلع قمع کیا- باطل فرقوں کے غیر اسلامی عقائد کو طشت از بام کر کے انھیں کیفر کردار تک پہنچایا- احیاے دین کی ان گراں قدر خدمات نے آپ کو مرجع عوام وخواص بنا دیا اور علما کا ایک بڑا طبقہ آپ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہو گیا- اس طبقے کے بعض افراد نے مبالغہ آرائی میں غلو کیا اور فرط عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا: ” كاد الأحياء ان يكون قرآنا“ جب کہ دوسری طرف ایک گروہ نے آپ پر مسلسل طنز وتنقید کو اپنا وتیرہ بنا لیا- یہ گروہ بھی جادۂ اعتدال پر قائم نہ رہ سکا اور غزالی کی شان میں غیر مناسب کلمات استعمال کیے اور حقائق سے نظریں چرا کر تہمت تراشی کی انتہا کر دی- گویا کہ آپ کے مادحین اور ناقدین دونوں ہی اعتدال کے راستے سے ہٹے ہوئے تھے- ہاں! اتنا مسلم ہے کہ غزالی کے مادحین کی تعداد ان کے ناقدین سے زیادہ ہے- آپ کے مادحین میں عبد الغافر فارسی، حافظ ابن کثیر، علامہ تاج الدین سبکی، ابن العماد حنبلی جیسی قدر آور شخصیتیں شامل ہیں- ہم یہاں غزالی کے مداحوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ناقدین کا ایک سرسری جائزہ ڈاکٹر قرضاوی کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں-

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے بقول غزالی کے ناقدین کے کئی گروہ ہیں- بعض نے ان کی تصانیف اور رسائل کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، بعض نے ان کے طریقۂ زہد وسلوک پر کلام کیا، بعض نے ان کے اسلوب نقد ومعارضہ کو اپنا موضوع بنایا- علامہ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں غزالی کے ناقدین اور ان کے نقد ونظر کو تفصیل سے بیان کر کے ان کا جواب بھی قلم بند کیا ہے- ڈاکٹر قرضاوی نے اپنی اس کتاب میں چند معروف ناقدین کا تذکرہ طبقات الشافعیہ کے حوالے سے کیا ہے- ذیل میں ہم اس کا حاصل مطالعہ قلم بند کرتے ہیں-

محمد بن محمد طرطوشی مالکی

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے غزالی کے ناقدین میں سب سے پہلا نام طرطوشی مالکی (۵۲۰ھ) کا ذکر کیا ہے جنھوں نے غزالی پر یہ تہمت لگائی کہ غزالی علم کو چھوڑ کر عمل میں مشغول ہو گئے- پہلے باطنی علوم اور شیطانی وسوسوں میں داخل ہوئے، پھر فلسفیانہ نظریات اور منصور حلاج کے رموز واسرار کو پروان چڑھایا- دھیرے دھیرے غزالی فقہا و متکلمین پر طعن وتشنیع کرنے لگے- طرطوشی

نے یہاں تک کہہ دیا کہ غزالی صوفیہ کے علوم سے نہ تو مانوس تھے اور نہ ہی انھیں اس کی کچھ آگہی تھی۔

امام ابو عبداللہ مازری مالکی

غزالی کے ناقدین میں طرطوشی کے بعد امام ابو عبداللہ مازری (ت ۵۳۶ھ) کا نام آتا ہے۔ مازری نے غزالی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے احیاء العلوم میں متعدد مقامات پر ضعیف حدیثیں نقل کیں اور اپنے بعض دعووں کی بنیاد ایسے امور پر رکھی جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھوں نے غزالی کے قول: **من مات بعد بلوغه ولم يعلم ان البارى قديم مات مسلما اجماعا.** یعنی "جو شخص بلوغت کے بعد اس حال میں مرا کہ اسے باری تعالیٰ کے قدیم ہونے کا علم نہیں وہ اجماعا مسلمان مرا۔" کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اس مسئلے میں غزالی کے دعوائے اجماع کو غلط قرار دیا۔

امام غزالی کا نظریہ ہے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں کتابوں میں لکھنا مناسب نہیں۔ غزالی کے اس نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے مازری کہتے ہیں کہ اگر یہ باتیں حق ہیں تو کتابوں میں ان کا ذکر کیوں نہیں کرنا چاہیے؟ کیا ان کے دقیق اور پیچیدہ ہونے کی وجہ سے؟ ان کی تفہیم سے کون سی چیز مانع ہے؟

مازری کے بقول غزالی علم اصول دین میں تبحر حاصل کرنے سے قبل ہی فلسفہ کی تحصیل میں لگ گئے جس کی وجہ سے ان سے بارہا لغزشیں ہوئیں۔ علامہ تاج الدین سبکی نے ان اعتراضات کے جوابات دیا ہے، اگرچہ ان کے بعض جوابات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

حافظ تقی الدین ابن الصلاح

امام غزالی کے ناقدین میں ایک نام حافظ تقی الدین ابن صلاح کا بھی آتا ہے۔ ابن صلاح کہتے ہیں کہ غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم اصول فقہ میں منطق کی آمیزش کی۔ ابن صلاح غزالی کی اُس عبارت پر بھی برہم ہیں جسے انھوں نے منطق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے المستصفیٰ کے آغاز میں رقم فرمایا ہے:

"**هذه مقدمة العلوم كلها، من لايحيط بها فلا ثقة فى العلوم اصلا.**"

یعنی علم منطق تمام علوم کا مقدمہ ہے، جو اس پر دست رس نہیں رکھتا اس کے علوم پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس پر ابن صلاح کہتے ہیں:

"صحابۂ کرام اور امت کے سلف صالحین علم منطق نہیں جانتے تھے تو کیا ان کے علوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جائے گا؟ حالاں کہ یہی حضرات ہمارے لیے سرچشمۂ علم ہیں اور ان ہی کے توسط

سے علم دین ہم تک پہنچا۔"

ابوالفرج ابن جوزی

ابن جوزی کا شمار غزالی کے زبردست ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں متعدد مقامات پر غزالی پر تنقید کی ہے۔ لیکن ابن جوزی کی تنقید اکثر احیاء العلوم ہی کے ارد گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے احیاء العلوم پر ابن جوزی کی تنقید کے دو بنیادی مآخذ بتائے ہیں۔

(۱) ابن جوزی کہتے ہیں کہ غزالی نے احیاء العلوم کی بنیاد صوفیہ کے مذہب پر رکھی ہے اور فقہی قوانین کا لحاظ نہیں رکھ سکے ہیں۔ ابن جوزی نے احیاء العلوم میں غزالی سے منقول صوفیہ کے احوال، زہد و سلوک میں مبالغہ، نفس کشی کے لیے رات بھر سر کے بل قیام اور ریا سے بچنے کے لیے صدقہ کے بجائے مال کو دریا میں ڈال دینے جیسے امور پر تنقید کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا: **فما ارخص باع ابو حامد الغزالى الفقه بالتصوف.** "غزالی نے کتنی سستی قیمت پر فقہ کو تصوف کے ہاتھ بیچ دیا۔"

(۲) امام غزالی نے احیاء العلوم میں موضوع حدیثیں ذکر کی ہیں، ان کی نقل کردہ احادیث میں تھوڑی ہی حدیثیں صحیح ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزالی علم حدیث میں دست رس نہیں رکھتے تھے۔ کاش وہ ان احادیث کو نقل کرنے سے پہلے علم حدیث کی معرفت رکھنے والوں پر پیش کر دیتے تو ہر طرح کی احادیث نقل نہیں کرتے۔

شیخ ابن تیمیہ

غزالی کے شدید ترین ناقدین میں شیخ ابن تیمیہ بھی ہیں جو بقول ڈاکٹر قرضاوی علم حدیث وفقہ میں غزالی سے ممتاز ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارے میں کہا گیا:

"**كل حديث لا يعرفه ابن تيمية فليس بحديث.**"

جو حدیث ابن تیمیہ کے علم میں نہیں وہ حدیث نہیں۔

ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ سبعینیہ میں امام غزالی کی بعض تصانیف مثلاً 'معیار العلم'، 'فیصل التفرقہ'، اور 'جواہر القرآن' وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تصانیف کے بعض اقوال اور تاویلات سلف صالحین کے طریقے سے متصادم اور فلاسفہ کے نظریات پر مبنی ہیں۔ ان کے کلام میں فلسفیانہ نظریات کی آمیزش ہوگئی ہے۔ بسا اوقات وہ جن امور کی بنا پر تکفیر کا قول کرتے ہیں بعض دوسرے مقامات میں وہی باتیں ان کے موافق ہوتی ہیں۔ ابن تیمیہ نے ایسے موقعوں پر خاص طور سے غزالی سے دھوکا کھانے سے بچنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک غزالی

کا ایک مقام اور مرتبہ ہے، کہیں اسی مقام و مرتبے کی وجہ سے ان کی ہر بات پر یقین نہ کر بیٹھیں۔

ابن تیمیہ فتاویٰ کبریٰ میں کہتے ہیں کہ غزالی کا علم منطق کے حصول کو فرض کفایہ قرار دینا خطائے فاحش ہے؛ کیوں کہ منطق کا بعض حصہ حق ہے اور بعض حصہ باطل۔ منطق کے وہ اصول جو حق ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ان میں سے جن کی ضرورت پڑتی ہے ان کے لیے عقل سلیم کافی ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں:

"انه علم لا ينتفع به البليد ولا يحتاج اليه الذكي"

یعنی منطق ایسا علم ہے جس سے غبی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اور ذہین کو اس کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا غزالی کا اسے فرض کفایہ قرار دینا لغو ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب میں غزالی کے تعلق سے معاصر علما کے نقد و نظر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً علم حدیث کے تعلق سے غزالی پر لگائے گئے الزامات کو شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

حاصل کلام

غزالی کی ہمہ جہت شخصیت کے تعارف اور ان کے تعلق سے علما کی متضاد آرا کی تفہیم کے لیے "**الغزالی بین مادحیه و ناقدیه**" ایک اہم ترین تالیف ہے جس کے مطالعے سے امام غزالی کے مادحین اور ناقدین کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا جو منہج بحث اور نظریہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ امام غزالی بلاشبہ عمیق فکر اور گہری بصیرت کے مالک اور حقائق و معارف کے رمز شناس ہیں۔ ان کی آخری سطور سے یوسف قرضاوی صاحب کا ذاتی جھکاؤ امام غزالی کے مادحین کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق علمائے اسلام نے امام غزالی کو جن القاب و آداب سے یاد کیا ہے وہ بلاشبہ ان کے مستحق تھے، البتہ امام غزالی اور تصوف کی ذیلی سرخی میں ان کی یہ بات بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے، جس میں امام غزالی کے متعلق ان کے نظریے کا دوسرا رخ یہ سامنے آتا ہے کہ امام غزالی نے فلسفہ، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، تفسیر اور کلام جیسے علوم میں نقد و تحقیق کا جو معیار اور منہاج قائم کیا ہے وہ تصوف کے ذیل میں نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوف کے متعلق ان کا معاملہ حد درجہ محبت اور رضا کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے تصوف کی ساری چیزوں کو من و عن قبول کر لیا ہے، جو نقد و تحقیق کے معیار سے ہٹ کر ہے؛ کیوں کی جب کسی چیز کو محبت میں قبول کیا جائے تو پھر محبت اندھی اور بہری ہوتی ہے۔ قرضاوی صاحب کے اس دوسرے نظریے پر اہل تحقیق کے لیے تفصیلی اور تحقیقی بحث کی بھر پور گنجائش ہے مگر موجودہ صفحات میں ہمیں مطالعے کا تجزیہ اور خلاصہ لکھنا منظور ہے اس لیے اتنے

ہی پر اکتفا کیا گیا۔

حوالہ جات

۱-آن لائن ویکیپیڈیا ڈاٹ کام

۲-**الامام الغزالی بین مادحیه و ناقدیه**، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ص:۱۸، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۳-نفس مصدر، ص:۹۶

۴-نفس مصدر، ص:۷۲، ۷۱

۵-نفس مصدر، ص:۷۲

۶-نفس مصدر، ص:۷۳

۷-نفس مصدر، ص:۹۴

۸-نفس مصدر، ص:۱۰۰

۹-نفس مصدر، ص:۱۰۱

۱۰-نفس مصدر، ص:۱۰۲

ooo

امام غزالی اور مسئلۂ تکفیر - ایک جائزہ

امام غزالی نے جس عہد اور ماحول میں آنکھیں کھولیں اس کی ایک اہم خصوصیت اسلامی فرقوں کی کثرت اور ان کے درمیان کش مکش اور جدال ومناظرے کی فضا تھی- خصوصیت کے ساتھ معتزلہ اور اشاعرہ نے علم اسلام کے قلب کو فکری معرکہ آرائیوں کا میدان کارزار بنا دیا تھا- دوسری طرف فلاسفہ اور باطنیہ کی جماعت تھی جو اپنی عقلی اور باطنی تاویلات سے اسلامی عقائد ومسلمات کے بنیادی ڈھانچے کو مسمار کرنے میں مصروف تھی- فلسفے اور علم کلام کے علاوہ فقہ اور تصوف کے میدان میں بھی فکری انتشار کی کیفیت پائی جاتی تھی- چناں چہ غزالی نے احیاء العلوم سمیت دوسری کتابوں میں دنیا پرست فقہا اور خواہش پرست صوفیہ کی شدید مذمت کی ہے- خاص طور پر وہ اول الذکر طبقے میں پیدا ہو جانے والی مختلف اخلاقی خرابیوں؛ حسد وریا، جاہ پسندی، سلاطین وقت سے تعلق اور ان کی خوشامد وچاپلوسی اور فقہ کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا لینا وغیرہ کا شدید رد کیا ہے- حالاں کہ وہ خود فقیہ بھی تھے اور بحر معرفت وتصوف کے شناور بھی، فقہا کے تعلق سے ان کا انقباض اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ خود کو فقیہ کہلانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے-(۱) امام غزالی کے امتیازات میں ایک اہم امتیاز ان کی فکری اعتدال پسندی ہے- ایک ایسے دور اور ماحول میں جب باہم مختلف اسلامی جماعتیں ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق کو دین متین کی سب سے بڑی خدمت تصور کیے بیٹھی تھیں، فقہا کا ایک بہت بڑا اور مؤثر طبقہ خشک فقہی بحثوں کو سرمایۂ دین وہنر سمجھ کر اس میں الجھا ہوا تھا، ایسے میں غزالی نے اسلامی فکر وعمل کے اخلاقی پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا- فقہ کے پہلو بہ پہلو مقاصد فقہ وشریعت کے خدوخال کو ابھارنے کی کوشش کی اور بین جماعتی کش مکش کے خاتمے کے لیے کفر وایمان کے حدود ومعیارات اس نظریاتی کش مکش کے تناظر میں متعین کرنے کی کوشش کی- ان کوششوں کا ہدف اس بات کا اثبات تھا کہ مختلف اسلامی جماعتوں کے درمیان اختلافات کی حیثیت فروعی ہے، اصولی نہیں ہے، اس لیے ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جا سکتی-

اس حوالے سے ان کی دو کتابیں نہایت اہم ہیں: **فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة** اور **الاقتصاد فی الاعتقاد**- خاص طور پر پہلی کتاب اور دوسری کتاب کا چوتھا باب اس موضوع کے تمام اہم اور ضروری نکات اور پہلوؤں پر حاوی ہے- غزالی نے ان کے حوالے سے اسلامی شریعت کی رواداری اور توسع پسندی کی روشنی میں جو اصول طے کیے ہیں ان سے تکفیر مسلم کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے- غزالی کی شخصیت پر لکھنے والوں نے اس کو ان کے نہایت اہم کارناموں میں شمار کیا ہے، تاہم اسی کے ساتھ ان پر تنقید کرتے ہوئے انہیں تکفیر کے باب میں حد سے زیادہ رواداری برتنے والا بھی قرار دیا ہے-(۲) الاقتصاد فی الاعتقاد میں لکھتے ہیں: **والذی ینبغی ان یمیل المحصل الیه الاحتراز من التکفیر ما وجد الیه سبیلا فان استباحة الدماء والاموال من المصلین الی القبلة المصرحین بقول لا اله الا الله محمد رسول الله، خطأ والخطأ فی ترک الف کافر فی الحیاة أهون من الخطأ فی سفک محجمة من دم مسلم.** (۳) ”حق وباطل میں تمیز کرنے والے کے لیے مناسب ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو تکفیر سے احتراز کرے؛ اس لیے کہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے والوں اور کلمہ شہادت کا اقرار کرنے والوں کے جان ومال کو مباح قرار دینا خطا ہے اور ایک ہزار کفار کو زندہ چھوڑنے میں غلطی کرنا اس کی بہ نسبت آسان ہے کہ کسی فرد مسلم کے خون بہانے میں غلطی کی جائے-“

فیصل التفرقہ میں دوسری جگہ تقریباً ایسی ہی بات انہوں نے اپنی وصیت کے عنوان سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ: ”تکفیر میں بہر حال خطرہ ہے جب کہ اس میں خاموشی کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے- **فان التکفیر فیه خطر والسکوت لاخطر فیه.** (۴) اس سے اس مسئلے میں ان کی حساس ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے-

کفر وایمان کی اصولی بحث

امام غزالی نے فیصل التفرقہ میں کفر وایمان کی حقیقت کی توضیح میں نہایت دقیق اصولی بحث کی ہے- حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی جیسے علمائے روزگار کا خاصہ تھا، جن کی فکر علوم شریعت سے روشن اور جن کا قلب روحانیت کی لذتوں سے سرشار تھا- امام غزالی خود لکھتے ہیں کہ کفر وایمان کی حقیقت ایسے لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی جن کے دل جاہ ومال کی طلب اور ان کی محبت کی گندگی میں ملوث ہوں بلکہ وہ ایسے لوگوں پر ظاہر ہوتی ہے، جن کے دل دنیا کے خس وخاشاک سے پاک ہوں، کامل ریاضت سے صیقل ہو چکے ہوں، ذکر الٰہی سے روشن ہوں، فکر صائب سے معمور اور حدود شرع کی پابندی سے مزین ہوں-(۵) ان کی نظر میں وہ فقہا جن کے علم کا سرمایہ نجاست اور

آب زعفران کے مسائل میں سمٹا ہوا ہے، وہ اصحاب جنہوں نے سلاطین کی چوکھٹوں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے اور جو درہم و دینار کے پجاری بن گئے ہیں، ان پر اس طرح کے حقائق و معارف کا انکشاف ممکن نہیں ہے-(٦)

غزالی کے نزدیک کفر و ایمان کے حوالے سے سب سے بنیادی بات کفر کی ایسی جامع و مانع تعریف ہے، جو اپنے مشتملات و متعلقات پر پوری طرح حاوی ہو اور اس کا رخ کسی متعین فرقے اور جماعت کی طرف نہ ہو- فیصل التفرقہ میں وہ لکھتے ہیں: ''اگر کوئی کفر کی وہ تعریف کرے جو اشاعرہ، معتزلہ یا حنابلہ کے خلاف ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا شخص سادہ لوح اور احمق ہے اور تقلید کے پھندے میں گرفتار ہو چکا ہے-(٧) اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر تم انصاف سے کام لو تو تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جو شخص حق کو کسی ایک صاحب فکر و نظر پر موقوف رکھتا ہے تو ایسا شخص کفر اور تناقض سے زیادہ قریب ہے-

ان انصفت علمت ان من جعل الحق وقفا علی واحد من النظار بعینه فھو الی الکفر والتناقض اقرب. (٨)

اہم بات یہ ہے کہ غزالی خود اشعری تھے، البتہ ابوالحسن اشعری کے مقلد نہ تھے، نہ ہی اشاعرہ کے تمام اصول و تفریعات سے اتفاق کرتے تھے- فیصل التفرقہ کی تالیف کا پس منظر یہی ہے کہ اشاعرہ کے ساتھ بعض نظریاتی اختلافات کی بنا پر ان کی تکفیر کی جانے لگی تو انہوں نے ایک دوست کے اس تعلق کے خط لکھنے پر یہ کتاب تالیف کی-

امام غزالی نے کفر کی دو قسمیں کی ہیں: کفر عملی اور کفر اعتقادی- کفر عملی ان کی نظر میں وہ ہے جسے فسق اور بدعت و ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کفر اعتقادی باضابطہ کسی اصل دین کا عقیدے کی سطح پر انکار ہے، جیسے حشر و نشر، قیامت یا نماز روزے کا انکار- کفر اعتقادی میں ملوث لوگوں کی انہوں نے کھل کر تکفیر کی ہے اور اس میں کسی رعایت اور سہل پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے- تکفیر کے تعلق سے غزالی نے یہ اہم اصول بیان کیا ہے کہ تکفیر کا ماخذ (مأخذ التکفیر) عقل نہیں بلکہ شرع ہے- اگر کوئی شخص ضروریات عقلی کا انکار کرتا ہے، مثال کے طور پر اندرائن کے کڑوے پھل کو میٹھا کہتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے مخالف عقل بات کہی، لیکن اس بنیاد پر اس کی تکفیر و تفسیق نہیں کی جا سکتی- غزالی کی یہ بات بظاہر سادہ لیکن نہایت دقیق اور اہم ہے- دراصل اس اصول کے ذریعے وہ یونانی فلسفے اور علم کلام کی بنیاد پر کفر و ایمان کے باب میں اٹھائے گئے سوالات اور مباحث کا رد کرنا چاہتے ہیں- ان کی نظر میں معتزلہ و اشاعرہ اسی طرح دیگر کلامی فرقوں کا کلامی اصول و نظریات کی بنیاد پر ثابت ہونے والے عقلیاتی حقائق کے منکرین یا ناواقف افراد کی تکفیر و تفسیق کرنا اصولی

طور پر غلط ہے اور شریعت سے اس کے حق میں کوئی دلیل فراہم نہیں کی جا سکتی؛ کیوں کہ عہد نبوی و عہد صحابہ میں دائرۂ ایمان میں داخل ہونے والوں کا ذہن اس طرح کی عقلی موشگافیوں سے بالکل خالی تھا- بھلا رسول ﷺ اصحاب رسول ﷺ سے یہ کہاں ثابت ہے کہ انہوں نے، مثال کے طور پر، مسلمان ہونے والے اعرابی کو بلا کر یہ سوال کیا ہو کہ عالم حادث ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے علم اور ایسی قدرت کی صفت کے ساتھ عالم و قادر ہے جو اس کی ذات پر زائد ہے-(٩)

غزالی کفر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: **الکفر ھو تکذیب الرسول علیه الصلاة والسلام فی شیء مما جاء به والایمان تصدیقه فی جمیع ما جاء به.** (١٠)...... **والاصل المقطوع به ان کل من کذب محمدا ﷺ فھو کافر مخلد فی النار بعد الموت.** (١١) ''رسول اللہ جن احکام دین و شریعت کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں ان میں آپ کی تکذیب کا نام کفر ہے اور ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کی جائے...... اور اصول قطعی یہ ہے کہ جس نے محمد ﷺ کی تکذیب کی وہ کافر ہے اور موت کے بعد وہ جہنم کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا-''

انہوں نے شریعت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: اصول، فروع، متواتر اور آحاد- اور ایمان کے تین بنیادی اصول بیان کیے ہیں: ١- اللہ پر ایمان، ٢- رسول پر ایمان، ٣- یوم آخر یعنی حشر و نشر پر ایمان- ان کے علاوہ ان کے نزدیک دوسری چیزیں فروعات کی قبیل سے ہیں اور ان کے انکار سے تکفیر لازم نہیں آتی، الا یہ کہ اصول دین میں سے کسی ایسی اصل کا انکار کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو- یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ غزالی نے ایمان کی اصل صرف تین قرار دی ہے، حالاں کہ عقائد کے ذیل میں ٦/ اصولوں کا ذکر کیا جاتا ہے یعنی مذکورہ تینوں کے علاوہ فرشتوں، کتابوں اور تقدیر پر ایمان- بعض لوگ تقدیر کو اس میں شمار نہیں کرتے اور اس کو ذات باری پر ایمان لانے سے ہی متعلق کر دیتے ہیں، لیکن بقیہ دو اصولوں کا ذکر عقائد پر لکھی گئی اکثر کتابوں میں موجود ہے اور یہی عوام کی زبان پر بھی ہے- صحیح بات یہ ہے کہ اس تعلق سے کسی بھی غلط فہمی کو راہ دینے کی ضرورت نہیں- دیکھا جائے تو ملائکہ اور کتابوں پر ایمان رسولوں کی تصدیق کے ضمن میں آجاتا ہے یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ عدد مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اصول دین و ایمان وہ ہیں جو قطعی شکل میں تواتر کے ساتھ ثابت ہوں، جو امور آحاد سے ثابت ہوں ان کے انکار پر کفر کا ترتب نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ آحاد کے ذریعے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا- وہ اجماع کے انکار کو بھی کفر کے لیے مستلزم قرار نہیں دیتے کیوں کہ اجماع کے حجت قاطعہ ہونے میں غموض و ابہام ہے اور اس لیے وہ مختلف فیہ ہونے کے درجے میں ہے-(١٢) اس ضمن میں اہم

بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ جس برہان یا دلیل قطعی کی بنیاد پر کوئی شخص کسی کی تکفیر کرتا ہے، اس برہان کی معرفت بھی آسان نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ برہان کو بھی منضبط کرنے والا کوئی ضابطہ ہو جو متفق علیہ ہو اور تمام لوگ اس کے معترف ہوں۔(۱۳)

تکذیب و تصدیق کے تعلق سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے تعلق سے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے رسول کی تکذیب کی ہے اور اس لیے وہ کافر ہے، وہ اس ضمن میں فریق مخالف کی باتوں کی حسب منشا تاویل و ترجمانی کرتا ہے۔غزالی لکھتے ہیں:

''اشعری معتزلی کی تکذیب کرتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے رؤیت باری کے جواز کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اور خدا کے لیے علم و قدرت جیسی صفات کو ثابت نہ مانتے ہوئے رسول اللہ کی تکذیب کی ہے اور معتزلی اشعری کو تکذیب کرنے والا گردانتا ہے کہ خدا کے لیے صفات کے اثبات سے قدما کی کثرت لازم آتی ہے۔''(۱۴) استویٰ علی العرش کے مسئلے میں حنابلہ اشاعرہ کو استوا کا منکر اور مکذب گردانتے ہیں جب کہ اشاعرہ کا دعویٰ ہے کہ استوا کا جو مفہوم حنابلہ نے متعین کیا ہے اس سے خدا کی تشبیہ لازم آتی ہے۔اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر زمانے میں اور اس زمانے میں بھی مسلکی اختلاف و تنازع میں یہی صورت حال قائم ہے۔تقریبا یہی ذہنیت اور نظریاتی تصادم کی یہی نوعیت مختلف مکاتب فکر کے مابین پائی جاتی ہے، خواہ یہ جماعتیں باہم ایک دوسرے کی تکفیر میں مبتلا ہوں یا تفسیق و تبدیع یعنی بدعتی ٹھہرانے میں۔غزالی کے بقول اس گرداب شر (Vicious Circle) سے نکلنے کے لیے تصدیق و تکذیب کی حقیقت کا معلوم ہونا ازبس ضروری ہے۔تصدیق کی حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کے وجود کی خبر دی ہے اس کو تسلیم کیا جائے۔اس وجود کے ان کی نظر میں پانچ مراتب ہیں: وجود ذاتی، وجود حسی، وجود خیالی، وجود عقلی اور وجود شبہی۔وجود ذاتی وجود خارجی یا بدیہی وجود ہے جس کے اثبات کے لیے حس اور عقل کی ضرورت نہیں ہے؛ جیسے زمین و آسمان اور چرند و پرند کا وجود، وجود حسی جس کا تعلق صرف حاسے سے ہو جیسے خواب میں دیکھی جانے والی چیز کہ خواب سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا یا جیسے شعلہ کو گردش دینے پر اس کے دائرے کی صورت جو اصلا دائرہ نہیں ہوتی لیکن ہمیں دائرے کی صورت میں نظر آتی ہے۔وجود خیالی کسی بھی محسوس چیز کی تصور اور خیال میں پائی جانے والی شکل ہے۔وجود عقلی کسی شے کے ظاہر کی بجائے اس کی اصل حقیقت جیسے کسی چیز کا ہاتھ میں ہونا دراصل قوت اختیار میں ہونے کا معنی رکھتا ہے۔اس صورت میں قدرت و اختیار ہاتھ کا وجود عقلی ہے۔وجود شبہی سرے سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ ایک دوسرا وجود اس کے مشابہ ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے کسی امر حقیقی کے وجود کی جو خبر دی ہے اگر کوئی شخص اس کے وجود کی ان

انواع خمسہ میں سے کسی بھی نوع کے تحت اعتراف کر رہا ہو تو اسے رسول کی تکذیب کرنے والا قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے تصدیق کرنے والا شمار کیا جائے گا۔ان کے بقول مکذب وہ ہے جو ان تمام معانی کی نفی کر دے اور یہ خیال کرے کہ رسول نے جو کچھ بھی کہا وہ کذب محض ہے۔''(۱۵)

غزالی نے تکذیب کے ۶/مراتب کا ذکر کیا ہے اور محسوس مثالوں کے ذریعے اس کے اطلاق سے بھی بحث کی ہے۔(۱) یہود نصاریٰ، مجوس اور بت پرست؛ ان کی تکذیب اور اس بنیاد پر ان کی تکفیر منصوص ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے۔(۲) دوسری قسم براہمہ اور دہریہ کی ہے۔براہمہ اصل نبوت کے اور دہریہ صانع عالم کے منکر ہیں۔(3) تیسرے فلاسفہ ہیں جو صانع عالم کے وجود اور نبی کی نبوت کے قائل ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ نبی نے بہت سی باتیں چھپالیں اور انہیں صراحت کے ساتھ عوام کو نہیں بتایا؛ کیوں کہ وہ ان کی حقیقت کے ادراک سے قاصر تھے۔(۴) چوتھے معتزلہ اور مشبہہ اور ان کی طرح کے بعض دوسرے فرقے ہیں جو براہ راست رسول کی تکذیب نہیں کرتے البتہ تاویل کے ذریعے وہ رسول کی تکذیب کو درست رکھتے ہیں۔غزالی کے نزدیک یہ طبقہ محل اجتہاد میں ہے، تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ ان کی تکفیر نہ کی جائے۔(۵) پانچواں طبقہ وہ ہے جو کسی اصول دین کا انکار کرے جیسے پنج وقتہ نماز کے فرض ہونے کا تو اس کی بھی تکفیر کی جائے گی۔(٦) چھٹا طبقہ وہ ہے جو کسی ایسے امر دین کا صراحت کے ساتھ انکار نہ کرے جو تواتر کے ساتھ قطعی طور پر ثابت ہو، یہ بھی محل اجتہاد میں ہے، تاہم وہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑے مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، مثلا اگر کوئی شخص محمد ﷺ کے بعد کسی نبی کی آمد کا قائل ہو تو اس کی تکفیر میں توقف کرنا صحیح نہیں ہوگا۔(۱٦)

ان امور کا خلاصہ غزالی کی اپنی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ امور مکفرہ تین ہیں: ۱۔صانع عالم کے وجود و صفات اور نبوت کے انکار کا اعتقاد رکھنا، ۲۔وہ چیز جو ایک شخص کو خدا کی ذات و صفات کے اقرار سے روک دے اور اس سے ایسا تناقض لازم آتا ہو جو ان کے انکار کو ہی مستلزم ہو، ۳۔تیسرے ایسا عمل جو کسی کافر سے ہی صادر ہو، جیسے آگ کی پرستش یا بت کو سجدہ کرنا یا بعض رسولوں کا انکار یا زنا اور شراب کو حلال سمجھنا یعنی تواتر سے ثابت شدہ ضروریات کا انکار کرنا۔

تاویل کا مسئلہ اور اس کی حقیقت

تکفیر کے مسئلے میں سب سے اہم معاملہ تاویل کا ہے یعنی امور دین اور معاملات شرع میں کس قسم کی تاویل قابل قبول اور کون سی تاویل قابل رد ہے۔ان کی نظر میں یہ اصول طے شدہ ہے کہ تاویل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ تاویل سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے۔سب سے کم تاویل کرنے والے امام احمد بن حنبل ہیں۔تین مسائل میں انہوں نے بھی تاویل سے کام لیا ہے۔(۱۷)

امام غزالی کی نگاہ میں تاویل کی دو قسمیں ہیں: وہ تاویل جو غلبۂ ظن پر قائم ہو، دوسری وہ جو برہان قاطع یا قطعی دلیل پر قائم ہو- انہوں نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ بغیر کسی واضح وروشن دلیل کے غلبۂ ظن کی بنیاد پر تاویل کرتے ہیں، ان کی تاویل کے تعلق سے دیکھا جائے گا کہ اس کا تعلق اصول عقائد سے ہے یا نہیں اور جیسا کہ اوپر گزرا غزالی کی نظر میں اصول عقائد تین ہیں: اللہ، رسول اور یوم آخرت پر ایمان (ان کے علاوہ باقی سب فروع ہیں-) چناں چہ اگر تاویل کا تعلق اصول عقائد سے نہیں ہے تو پھر تاویل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، جیسے صوفیہ کا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آفتاب وماہتاب کو 'ھٰذا ربی' 'نہیں کہا تھا، کیوں کہ یہ ان کی شان سے فروتر تھا، بلکہ غیر محسوس نورانی جواہر کو کہا تھا- اسی طرح بعض حضرات حضرت موسی علیہ السلام کے عصا (طہ:69) اور نعلین (طہ:12) کی تاویل کرتے ہیں؛ ایسی تاویل کرنے والوں کو کافر تو کجا بدعتی بھی اس لیے قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کے بقول اس صورت میں یہ اندیشہ ہے کہ عوام ہر اس چیز کو جو اسلاف سے ثابت نہ ہو، بدعت تصور کرنے لگیں- ہاں! اگر تاویل کا تعلق بنیادی عقائد سے ہو جیسے حشر ونشر یا آخرت کا عذاب محسوس تو ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی کیوں کہ حشر ونشر کے ممکن نہ ہونے پر سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے-

فروع دین کے تعلق سے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فروع میں تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے اس صورت کے جب کہ رسول سے ثابت شدہ کسی اصل دینی کام کا انکار کر دیا جائے، لیکن ان کی نظر میں اس معاملے کی بھی بعض صورتوں سے متعلق شخص کو خطا کار یا بدعتی تصور کیا جائے گا کافر نہیں- چناں چہ اہل تشیع کا امامت کے تعلق سے نظریہ اسی قبیل سے ہے؛ البتہ اگر اس صورت میں تکذیب پائی جائے جیسے کوئی شخص مکہ میں موجود کعبے کا انکار کر دے یا وہ حضرت عائشہ پر تہمت طرازی کرے جب کہ ان کی برأت قرآن سے ثابت ہو چکی ہے تو ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی؛ اس لیے کہ اس صورت میں تکذیب رسول اور انکار تواتر دونوں پایا جاتا ہے، تاہم اس صورت میں بھی وہ ان لوگوں کا استثنا کرتے ہیں جو ابھی حال ہی میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ضروریات وحقائق دین سے ابھی پوری طرح واقف نہ ہو سکے ہوں-

فلاسفہ اور باطنیہ کی تکفیر

فیصل التفرقہ میں امام غزالی کا نقطۂ نظر تکفیر کے باب میں اس قدر نرمی اور لچک رکھتا ہے کہ بعض لوگوں کو محسوس ہوا ہے کہ وہ اس معاملے میں افراط وتفریط یا مداہنت کا شکار ہو گئے ہوں، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے- وہ فلاسفہ، باطنیہ اور اعتقادی سطح پر شریعت سے منحرف صوفیہ کے ایک گروہ کی کھل کر تکفیر کرتے ہیں اور ایسے صوفیہ سے متعلق جو اس بات کے مدعی ہیں کہ روحانی ریاضتوں کے

بعد ان سے تکلیف شرعی ساقط ہو چکی ہے غزالی لکھتے ہیں کہ ان کا قتل واجب ہے- اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بقول ان میں سے ایک کو قتل کرنا سو کفار کو قتل کرنے سے بہتر ہے- اس لیے کہ اس طرح کے اعتقاد رکھنے کی شناعت اور اس کا ضرر کفر سے بڑھا ہوا ہے- اس سے اباحیت کا دروازہ کھلتا ہے اور یہ اباحیت عام اباحیت سے بہت زیادہ خطرناک ہے؛ کیوں کہ دین بیزار لوگوں کی اباحیت کی خرابیاں ہر صاحب عقل وہوش پر واضح ہو جاتی ہیں لیکن دین کے پردے میں چھپی ہوئی اس طرح کی اباحیت بہت سے لوگوں کے لیے غارت گر دین وایمان بن جاتی ہے- تاہم کیا ایسے صوفیۂ سو کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے؟ غزالی کے نزدیک یہ بات محل نظر ہے-

فلاسفہ کی تکفیر کی وجہ ان کی نظر میں ان کے تین نظریات ہیں: ۱- عالم قدیم ہے، ۲- خدا کو کلیات کا علم حاصل ہے، جزئیات کا علم حاصل نہیں ہے، ۳- قیامت کے دن حشر ونشر جسمانی نہیں ہوگا اور نہ گنہ گاروں کو اللہ تعالی کی طرف سے محسوس عذاب دیا جائے گا-

باطنیہ کی تکفیر وہ اس لیے کرتے ہیں کہ باطنی بھی فلاسفہ کی طرح حشر ونشر کی غلط تاویل کرتے ہیں- اسی طرح وہ اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، وہ عقائد وامور شریعت سے تعلق رکھنے والے اکثر امور کی تاویل کرتے ہیں اور انہیں ظاہر نص سے سمجھ میں آنے والی حقیقت کی بجائے انہیں اصل حقیقت کا رمز اور علامت قرار دیتے ہیں-

خدا کی رحمت واسعہ کا تصور

خدا کی وسیع رحمت کا جو تصور امام غزالی کے یہاں نظر آتا ہے، علمائے اسلاف میں اس کی زیادہ نظیریں نہیں ملتیں- اس کی ایک وجہ غالباً صوفیہ کے افکار کا ان پر اثر بھی ہے- صوفیۂ کرام کی جماعت کا ایک اہم امتیاز ان کی شمولیت پسندانہ (Inclusive) فکر ہے- انہوں نے دنیا وآخرت دونوں کے تعلق سے بندگان خدا کے لیے خدا کی رحمت کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے اور اس کے اطلاقات کو عام کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے خشک فقہا ومتکلمین کی ایک جماعت ان سے نالاں رہی- قرآن میں خدا کی رحمت واسعہ کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے-: **قال عذابی اصیب بہ من أشاء ورحمتی وسعت کل شیء** ''اللہ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیا پر محیط ہے-'' (الاعراف:۱۵۶)

قرطبی نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے: بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت کے تحت ہر چیز کو خدا کی رحمت کی توقع ہوئی یہاں تک کہ ابلیس کو بھی- چناں چہ ابلیس نے کہا کہ میں بھی تو شے ہوں-'' (۱۹) ایک ضعیف حدیث سے بھی، جس کا ذکر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، ابلیس کے اس قول اور اظہار امید کا ثبوت ملتا ہے- (۱۹)

امام غزالی کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت ہمارے تصور سے بہت زیادہ وسیع ہے- وہ لکھتے ہیں: ''اللہ کی وسیع ترین رحمت کا تصور کرو اور امور الٰہیہ کو اپنے مختصر اور رسمی پیمانے سے مت ناپو-'' **فاستوسع رحمة اللّٰه تعالٰی ولا تزن الامور الالٰهية بالموازين المختصرة الرسمية.** (۲۰)

فیصل التفرقہ میں ایک جگہ انہوں نے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ: **أ نـا اقـول ان الـرحـمة تشـمل كثير ا من الامم السالفة......بل اقول ان اكثر نصارىٰ الـروم والتـرک فی هذا الزمان تشملهم الرحمة ان شاء الله تعالى .اعنى الذين هـم فـى اقـاصـى الـروم والتـرک ولـم تبلغهم الدعوة** (۲۱) یعنی میں کہتا ہوں کہ اللہ کی رحمت سابق امتوں میں سے بھی بہتوں کے شامل حال ہوگی...... بلکہ میں کہتا ہوں کہ آج کے زمانے کے روم وترک کے اکثر عیسائی اللہ کی رحمت سے فیض یاب ہوں گے- ان عیسائیوں سے میری مراد وہ ہیں جو ممالک روم وترک کے دور دراز حصوں میں رہتے ہیں اور ان تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی ہے- ایسے لوگوں کی انہوں نے تین قسمیں کی ہیں: پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن تک رسول اللہ ﷺ کا نام ہی نہیں پہنچا یا دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ کی بعثت کی ان کو خبر ہی نہ ہوسکی، یہ معذور ہیں- دوسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو اسلامی ممالک کے پڑوس میں رہتے ہیں- انہیں مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے کے مواقع حاصل ہیں اور ان تک اللہ کے رسول کا نام اور آپ کی سیرت وصفات کے بارے میں معلومات پہنچیں، لیکن وہ اپنے انکار پر مصر رہے- یہ لوگ کفار وملحدین میں سے ہیں- تیسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جن تک آپ کا نام تو پہنچا یا نام کی خبر تو ہوئی لیکن سیرت وصفات کا ان کو علم نہ ہوسکا، بلکہ آپ کے بارے میں انہیں اس طرح اطلاع ملی کہ جیسے ہمارے محلے کے بچے سن لیتے ہیں کہ ابن مقفع نام کے ایک شخص نے نبوت کا دعوا کیا تھا تو چوں کہ انہوں نے آپ ﷺ کی اصل صفات کی بجائے اس کا برعکس سنا، اس لیے صرف اتنی بات ایسے لوگوں کے اندر طلب وجستجو کے داعیے کو ابھارنے کے لیے کافی نہیں ہے- اس لیے یہ لوگ بھی پہلی ہی قسم میں داخل ہیں- (۲۲)

اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ کسی مذہب کا وہ شخص جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتا ہو، حقیقت یہ ہے کہ تلاش حق سے دور نہیں رہ سکتا تو ایسا جو شخص تلاش حق کے راستے میں ہو اور اس میں پوری طرح کوشاں ہو لیکن حق کی دریافت سے قبل اس کی موت واقع ہو جائے تو خدا کی رحمت ومغفرت اس کے بھی شامل حال ہوگی- (۲۳)

اسی طرح ان کا یہ نقطۂ نظر بھی نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ حدیث میں تہتر مسلم فرقوں میں سے صرف ایک مسلم فرقے کی نجات کی جو بات کہی گئی ہے، اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے

جن سے کوئی حساب وکتاب نہیں لیا جائے گا اور ان کو اس کے بغیر جنت میں بھیج دیا جائے گا- اسی طرح جس حدیث میں ہزار میں سے ۹۹۹ افراد کے جہنم میں ڈالے جانے کی خبر دی گئی ہے، اس سے متعلق بھی امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہزار میں سے صرف ایک شخص معصوم عن المعاصی ہوگا، باقی لوگ گناہ گار ہوں گے جنہیں شفاعت کے بعد اور معمولی سزا کاٹ کر جہنم سے نکال کر بالآخر جنت میں پہنچا دیا جائے گا- (۲۴)

خلاصہ یہ ہے کہ امام غزالی نے تکفیر کے باب کو حتی الامکان بند کرنے اور شریعت کی وسعت اور خدا کی رحمت شاملہ کو سامنے لانے کی سعی کی ہے- موجودہ دور میں اگر غزالی کے اصول و نظریات کو برتنے کی کوشش کی جائے تو بین مسلکی و جماعتی کش مکش اور تصادم کو کم کرنے میں اس سے مدد مل سکتی ہے- غزالی کی شخصیت فقہ اور تصوف دونوں کی جامع تھی- وہ صاحب نظر ہونے کے ساتھ صاحب دل بھی تھے- فکر ونظر کے افراط وتفریط کو کم کرنے اور بین جماعتی ہم آہنگی کے قیام کے لیے فقیہ کی گہری نظر کے ساتھ صوفی کے وسیع دل کی بھی ضرورت ہے- غور وفکر کا ایک اہم پہلو جو غزالی کے خدا کی رحمت واسعہ کے تصور کے سیاق میں سامنے آتا ہے، وہ موجودہ دور میں اسلام کی دعوت کو اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے- یہ ذمہ داری عمومی سطح پر تمام مسلمانوں اور خصوصی سطح پر تمام اسلامی جماعتوں اور علما ودعاۃ پر عائد ہوتی ہے- یہ اہم سوال ہے کہ کیا ہم نے اسلام کی بے کم وکاست دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری کر دی ہے تاکہ کل یہ نہ کہا جاسکے کہ وہ انہی معذورین میں سے ہیں جن کا ذکر غزالی نے کیا ہے؟

حواشی وحوالہ جات

۱- الدکتور حسن الفاتح قریب اللہ: دور الغزالی فی الفکر، الامانۃ، مصر، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۵۸، ۱۵۷

۲- یوسف القرضاوی: الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ، الرسالۃ، بیروت، ص: ۱۷، ۷۶، ۷۷

۳- الاقتصاد فی الاعتقاد، (ضبط وتقدیم: مونس الفوزی الجسر) ط، ۱، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۱۱

۴- فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ، مکتبہ دار البیرونی، ط: ۱، ۱۹۹۲ء، ص: ۶۱

۵- ایضا: ص: ۱۷

۶- ایضا

۷- ایضا، ۱۹

۸- ایضا، ص: ۲۲

۹- ایضا، ص: ۷۶

۱۰- ایضا، ص: ۲۵

۱۱-الاقتصاد فی اصول الاعتقاد،ص:۲۰۹
۱۲-فیصل التفر قہ،ص:۶۳،۶۴
۱۳-ایضا،ص:۴۹
۱۴-ایضا،ص:۲۷
۱۵-ایضا،ص:۲۷تا۳۱
۱۶-الاقتصاد فی الاعتقاد،ص:۲۱۳
۱۷-فیصل التفر قہ،ص:۶۵،پہلی حدیث یہ ہے:الحجر الاسود یمین الله فی الارض. ''حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے-(الدیلمی،مسند الفردوس،حدیث نمبر:۲۶۳۰)دوسری حدیث ہے:قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمن. ''مؤمن کا دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے-''(مسلم،حدیث نمبر:۲۶۵۴،ترمذی،حدیث نمبر:۲۲۴۰)تیسری حدیث ہے:انی لاجد نفس الرحمن من قبل یمن . ''یمن کی طرف سے نفس رحمٰن کا ادراک کرتا ہوں-''
۱۸-الجامع لاحکام القرآن،دار الکتب العلمیہ،بیروت،ط:ا،۱۹۸۸،ج:۷،ص:۱۸۹
۱۹-ابن کثیر:(المجلد الثانی)دار عالم الکتب للطباعۃ والنشر والتوزیع،۱۹۹۷ء،ص:۳۱۷
۲۰-فیصل التفر قہ،ص:۸۷
۲۱-ایضا،ص:۸۴
۲۲-ایضا
۲۳-ص:۸۷
۲۴-ایضا،ص،۸۱-۸۳

○○○

شاہ صفی اکیڈمی کی فخریہ پیش کش

داعی اسلام عارف باللہ شیخ **ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی** مدظلہ العالی
کی قلبی واردات، گنجینۂ معانی، بحر حقائق و معارف، مثنوی

نغمات الاسرار فی مقامات الابرار

جو

سلیس اردو زبان میں شریعت و معرفت کا انمول خزانہ ہے

تیسرا ایڈیشن

اپنے نئے رنگ و آہنگ اور ضروری توضیحی حواشی کے ساتھ
منظر عام پر آچکا ہے-

حواشی نگار

ذیشان احمد مصباحی

زیرِ اہتمام
شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ / جامعہ عارفیہ سید سراواں، کوشامبی، الہ آباد

بحث ونظر

عصر حاضر میں احیاے تصوف کا کام کن اصولوں کے تحت ممکن ہے؟

مدارس میں طریقت اور خانقاھوں میں شریعت کا نفاذ ھو

"مدارس کو چاھیے کہ اپنے نصاب میں تصوف کی کتابیں بھی شامل کریں اور ساتھ ھی طلبہ کی عملی تربیت بھی ھو اور خانقاھوں کو چاھیے کہ مکمل طور پر اپنی اصلاح کریں، خود علم شریعت سے آراستہ ھوں اور وابستگان کو علم شریعت دیں"

مفتی محمد نظام الدین رضوی

تصوف اسلامی جس نے ارواح کو پاکیزگی اور قلوب کو صفائی وتابندگی بخشی تھی، آج کتابوں کی زینت تو رہ گئی ہے مگر ہماری عملی زندگی کا حصہ نہیں ہے- یہی وجہ ہے کہ ہماری کائنات دل کی بستیاں ویران اور محفلیں سونی سونی نظر آتی ہیں-تصوف کی بنیاد تین باتوں پر تھی:

علم شریعت، اس پر عمل واستقامت، اخلاص وللّٰہیت

علم شریعت کے عموم میں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے علم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ یہ دونوں شریعت کا سرچشمہ ہیں- فقہ اور عقاید کے سوتے بھی انھیں سے جاری ہوئے-

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو ایک ایک سانس، ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ مرتے دم تک ہے اور طریقت میں قدم رکھنے والوں کو اور زیادہ، کہ راہ جس قدر باریک اسی قدر ہادی کی زیادہ حاجت، لہٰذا حدیث میں آیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: **المتعبد بغیر فقه کالحمار فی الطّاحون** بغیر فقہ کے عبادت کرنے والا ایسا ہے جیسے چکی کھینچنے والا گدہا کہ مشقت جھیلے اور نفع کچھ نہیں- **رواہ ابو نعیم فی الحلیة عن واثلة بن الاسقع رضی الله تعالیٰ عنه.** (مقال عرفا ص:۹)

نیز فرماتے ہیں:

حق سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق بندوں کے لیے پانچ علم ہیں: (۱) علم ذات (۲) علم صفات (۳) علم اسما (۴) علم افعال (۵) علم احکام- ان میں ہر پہلا دوسرے سے مشکل تر ہے، جو سب سے آسان علم احکام میں عاجز ہوگا، سب سے مشکل علم ذات کیوں کر پا سکے گا- (مقال عرفا: ص:۱۲،۱۳)

شریعت پر عمل واستقامت کے ذریعے اللہ عزوجل کا قرب حاصل ہوسکتا ہے- رسالہ قشیریہ میں ہے: جو اپنے اوپر آداب شریعت لازم کرلے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نور معرفت سے روشن کردے گا اور کوئی مقام اس سے بڑھ کر معظم نہیں کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام،

افعال، عادات سب میں حضور کی پیروی کی جائے۔ (مقال عرفا، ص: ۲۵)

اخلاص وللّٰہیت کا مطلب یہ ہے کہ علم وعمل سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دل حب الٰہی وحب رسول سے معمور ہو، برے خصائل مثل حرص، حسد، بغض وغیرہ سے پاک اور اچھے خصائل واوصاف سے مزین ہو۔ تصوف اسلامی کا احیا ان تینوں عناصر کی اساس مستحکم کر کے ہی ممکن ہے اور یہ تینوں دین کے اہم اجزا ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

تصوف کا مطلب ہے: ☆ اخلاق کی اصلاح ☆ باطن کی صفائی ☆ صفات کاملہ سے موصوف ہونا ☆ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف ہونا ☆ راہِ حق پر قائم رہنا ☆ حقوق ادا کرنا ☆ دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مختص کر دینا ☆ اس کے ماسوا سے بے رغبت ہونا ☆ (مذموم) انسانی اوصاف کا فنا ہو جانا ☆ دین کے بارے میں یقین حاصل کرنا ☆ دنیا کا ترک کرنا ☆ بے فائدہ کاموں سے گریز کرنا ☆ تقویٰ کی پابندی اور مولائے کریم جل شانہ کی محبت۔

حضرت جنید بغدادی سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

☆ مخلوقات کی موافقت سے دل صاف کرنا ☆ طبعی (نفسانی) اوصاف سے جدا ہونا ☆ بشری صفات کا فنا کرنا ☆ نفسانی خواہشات سے گریز کرنا ☆ روحانی صفات کا طلب گار ہونا ☆ حقیقی علوم سے متعلق ہونا ☆ دائمی اچھے کاموں کا اختیار کرنا ☆ تمام امت کا خیر خواہ ہونا ☆ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا وفادار ہونا ☆ شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیرو کار ہونا اور ایسی ہی دیگر صفات اور برکات کا حامل ہونا۔

عارف باللہ، سیدی علامہ احمد برنسی معروف بہ شیخ زروق رحمہ اللہ تعالیٰ "**کتاب الجمع بین الشریعة والحقیقة**" میں فرماتے ہیں: کہ تصوف کی تقریباً ہزار تعریفیں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ ان سب کا حاصل اللہ تعالیٰ کی طرف سچی توجہ ہے۔ تصوف کے بارے میں یہ مختلف تعبیریں ہیں اور اس کی تفصیل بیان کرنے والے مختلف اقوال ہیں، جن میں ہر شخص کے علم وعمل اور حال و ذوق کا اعتبار کیا گیا ہے۔ جس شخص کو مولائے کریم کی طرف سچی توجہ کا حصہ حاصل ہے اسے تصوف کا ایک حصہ حاصل ہے، پس ہر شخص کا تصوف اس کی سچی توجہ ہے اور سچی توجہ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اس طرح ہو کہ اللہ کریم جل شانہ اس سے راضی ہو اور یہی ایمان ہے اور ایسے طریقے پر ہو جسے وہ پسند کرے اور یہی اطاعت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مشروط بغیر شرط کے صحیح نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ تمہارے لیے اسے پسند فرمائے گا، لہٰذا اسلام پر عمل ضروری ہے۔ اور تصوف بغیر فقہ کے نہیں ہو سکتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری احکام فقہ ہی سے

حاصل ہوتے ہیں اور فقہ بغیر تصوف کے نہیں، کیوں کہ عمل بغیر سچی توجہ کے نہیں ہو سکتا۔ عمل اور سچی توجہ ایمان کے بغیر نہیں پائے جاتے، کیوں کہ ایمان کے بغیر ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا، ان تینوں امور (ایمان، عمل اور صدق توجہ) کا جمع کرنا ضروری ہے۔ ان میں باہمی ربط و تعلق وہی ہے جو جسم وجان میں ہے پس فقہ "مقام اسلام" ہے، علم عقاید کے اصول "مقام ایمان" اور تصوف "مقام احسان" ہے جس کی تفسیر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں کی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا تصوف دین کا ایک جز ہے جس کے بارے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صرف اس لیے سوال کیا تا کہ امت اس کا علم حاصل کرے۔

آج ہماری خانقاہوں کا جو حال ہے وہ تو ناگفتہ بہ ہے ہی، مدارس کا حال بھی کوئی بہت اچھا اور لائق ستائش نہیں ہے۔ مدارس میں ان عناصر میں سے ہر آخری عنصر پہلے سے زیادہ کم زور ہے کیوں کہ ان پر توجہ بھی اسی اعتبار سے ہوتی ہے۔

مدارس کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں تصوف کی کتابیں بھی شامل کریں اور ساتھ ہی ان کی عملی تربیت بھی ہو اور خانقاہوں کو چاہیے کہ مکمل طور پر اپنی اصلاح کریں، خود علم شریعت سے آراستہ ہوں اور وابستگان واہل اسلام کو علم شریعت دیں، ساتھ ہی اس پر عمل واستقامت کا سچا نمونہ بنیں اور بنائیں پھر تزکیۂ قلوب واصلاح احوال میں ذکر وفکر کے ساتھ متوجہ ہوں۔ خود ستائی، تفوق، پروپیگنڈا اور مہم جوئی سے باز آ کر عجز ونیاز کے خوگر بنیں اور یاد رکھیں کہ مشک وہ ہے جو خود مہکے نہ کہ عطار کو بتانا پڑے، پھل دار شجر سے عبرت حاصل کریں، اگر ایسا ہو گیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ تصوف کا احیا ہو گا اور مدارس، مساجد، خانقاہیں ہر جگہ تصوف کے جلوے نظر آئیں گے۔

○○○

اکابر صوفیہ کے طرز عمل کو اپنے رویے کا حصہ بنائیں!

"خانقاہ نہ بنیے کی دوکان تھی اور نہ علماے سو کی حویلی، یہاں جبر نہیں، صبر سے کام لیا جاتا، مایوسی ان کے یہاں کفر تھی، آج بھی یہی وہ سوچ، طریقہ اور عمل ہے جو خانقاہوں سے لوگوں کو جوڑ سکتا ہے"

پروفیسر اختر الواسع

پہلی بات یہ کہ تصوف مرغ بادنما نہیں ہے کہ اس کا رخ ادھر ہی پھر جائے جدھر کی ہوا چلے- دوسری بات یہ کہ احیا اس کا ہوتا ہے جو ناپید ہو جائے یا بہت احتیاط سے کہیں تو خاتمے کے قریب ہوتا ہے لیکن تصوف اور اصحاب تصوف پر کتنا ہی خراب وقت آیا ہو مگر ایسا کبھی نہیں ہو سکا کہ زمانہ تصوف کو مٹانے میں کامیاب ہو پایا ہو اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا؛ کیوں کہ تصوف مبنی برحق ہے اور حق کو نہ زوال آتا ہے اور نہ اسے مٹایا جا سکتا ہے-زوال اور مٹنا قرآن کے لفظوں میں صرف باطل کا مقدر ہے-

ہاں! اسی سوال کو اگر یوں بیان کیا جائے کہ تصوف کو کس طرح عام لوگوں تک پہنچایا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے-تصوف کی رسائی اور آشنائی کا رشتہ عام انسانوں سے اسی آزمودہ طریقے سے قائم ہوگا جیسا کہ اکابر صوفیہ نے قائم کر کے دکھایا ہے- اکابر صوفیہ ہر انسان سے من و تو کے ہر فرق سے بالاتر ہو کر ملتے، لوگوں کو گلے لگاتے، جن کی کوئی سننے والا نہیں تھا، ان کے دکھ درد کو نہ صرف سنتے بلکہ اپنے وجود میں اتار لیتے، وہ سب کے کام آتے، مگر اپنی حاجت روائی کے لیے خدا کے علاوہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے-

عہد وسطیٰ میں جب مطلق العنانی کا راج تھا، ایسے وقت میں غریب اور مظلوم عوام کے لیے صوفیہ کی خانقاہیں ایسی ہی پناہ گاہیں تھیں- ان سے حال دل کہہ کر ان کے کندھوں پر سر رکھ کر اور ان کے دامن کو اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں سے تر کر کے دکھیارے لوگ اپنے دلوں کو کچھ آرام دے دیتے تھے، غموں کا بوجھ کم کر لیا کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہو پاتا کچھ نہ کچھ مادی امداد بھی پا جاتے تھے- ان خانقاہوں میں عام سماجی زندگی کی طرح کوئی بھید بھاؤ نہ ہوتا تھا- صوفی کی خانقاہ میں صرف دو منتر کام کرتے تھے، تخلقوا باخلاق اللہ اللہ جیسا اخلاق پیدا کرو اور الخلق عیال اللہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور یہ دونوں منتر ان کے یہاں نعرہ نہیں ایک جیتی جاگتی حقیقت کا مظہر ہوتے تھے- غرض عام انسان کی خوشی اور غم دونوں میں اسی طرح سے شریک ہوتے جیسے کہ یہ انہیں کا غم ہو یا ان کی ہی خوشی ہو-

خانقاہ نہ بنیے کی دوکان تھی اور نہ علماے سو کی حویلی، یہاں حکم رانوں کی طرح جبر نہیں، بلکہ مہربانوں کی طرح صبر سے کام لیا جاتا، اور اسی کی تربیت بھی دی جاتی تھی- یہاں حکم نہیں مشورے کا طریقہ تھا- یہاں لوگوں کو پابند نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتے تھے- مایوسی ان کے یہاں کفر تھی- آج بھی یہی وہ سوچ، طریقہ اور عمل ہے جو خانقاہوں سے لوگوں کو جوڑ سکتا ہے- خاک ساری لیکن صرف خاک ساروں کے ساتھ اور سربلندوں کے ساتھ کوئی انکسار نہیں- عزت نفس کی پامالی نہ ہو اس کی تلقین، یہی خانقاہوں کا منشور تھا- آج بھی اگر ہم ان تمام اوصاف کو اپنا لیں تو دنیا ایک بار پھر آپ کی طرف جوق در جوق چلی آئے گی اور جسے یقین نہ ہو وہ اجمیر سے دلی اور اسی ملک کے طول و عرض میں محض دو گز زمین میں محو خواب صوفیہ کے مزاروں پر چلے جائیں وہاں موجود لوگوں کا ازدحام آپ کو اس کا زندہ ثبوت دے دے گا کہ اگر ان کے پردہ کر لینے کے بعد صدیوں سے ان کے پاس آنے والوں کا سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے تو پھر ان کے طریقے اور حکمت کو اپنا کر ہم بھی نہ صرف ان کو اپنا بنا سکتے ہیں بلکہ ایک نئے انقلاب کی داغ بیل پڑ سکتی ہے-

○○○

تصوف کا احیا صرف متقدمین کے اصولوں پر ہی ممکن ہے

"جن اصول وصفات سے آراستہ ہونے کی وجہ سے متقدمین حضرات "صوفی" کہلائے اور پوری دنیا میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا، انہی اصول وصفات کو اپنا کر ہم عصر حاضر میں بھی تصوف کا احیا کرسکتے ہیں"

ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی

تصوف نظریے سے زیادہ عمل کا نام ہے- جب تک عمل نہیں ہوگا نظریے سے کوئی فائدہ نہیں-عمل کے بعد یہ ایک حال بن جائے، یہی تصوف کا مقصود ہے- جہاں تک تصوف کے احیا کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آخر تصوف کی بنیاد کن اصولوں پر قائم ہے اور متقدمین صوفیہ کن اصول وصفات سے متصف ہونے کی بنیاد پر ''صوفی'' کہلائے- جن اصول وصفات سے آراستہ ہونے کی وجہ سے متقدمین حضرات ''صوفی'' کہلائے اور پوری دنیا میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا، انہی اصول وصفات کو اپنا کر ہم عصر حاضر میں بھی تصوف کا احیا کر سکتے ہیں- یہاں پر عرب کے ایک بے مثال خطیب زیاد بن ابیہ کی ایک بات پوری طرح فٹ بیٹھتی ہے جو اس نے اسلام کے سلسلے میں کہی تھی: ''لا یصلح آخر هذه الامة إلا بما صلح اوله'' اس امت کے متاخرین کی اصلاح انہی اصول وصفات سے ہوگی جن کو اپنا کر اس امت کے اولین حضرات صلاح وفلاح سے بہرہ ور ہوئے- یہی حال تصوف کا بھی ہے- متقدمین تصوف نے جن اصول اور اساس کو اختیار کر کے کامیابی حاصل کی انہی اصول کو اختیار کر کے آج بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے-

اب رہی یہ بات کہ وہ اصول کیا ہیں جن پر تعلیمات تصوف کی بنیاد ہے اور وہ امتیازات کیا ہیں جن پر تصوف کی اساس ہے تو اس سلسلے میں میں یہ کہوں گا کہ تصوف کی اساس مندرجہ ذیل عناصر پر ہے:

۱- حب الٰہی، ۲-اتباع رسول، ۳- خوف آخرت، ۴-فکر امت ، ۵- خدمت خلق، ۶ -مساوات، ۷-آزادی اظہار خیال-

یہ وہ عناصر ہیں جو صوفیہ کے امتیازات سے ہیں اور سارے جہان میں وہ ان اوصاف و خصائل سے مشہور ومعروف رہے ہیں- اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مندرجہ بالا عناصر آج کے تصوف اور موجودہ صوفیہ میں موجود ہیں یا نہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ عموماً آج صورت حال ایسی

نہیں ہے- اس طرح کا تصوف مفقود نہیں تو کم یاب ضرور ہے، اور ایسے صوفیہ عام طور سے پائے نہیں جاتے- لہٰذا اگر ہم تصوف کا احیا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے دلوں میں حب الٰہی کا جذبہ موج زن کریں، اپنے تمام اعمال وافعال کی بنیاد رب تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور ان کی پیروی پر رکھیں اور صرف اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے اپنا کوئی بھی کام انجام دیں، غیر کی آلائشوں سے اس کو پاک وصاف کر دیں اور صرف زبانی طور پر محبت الٰہی کا دعویٰ نہ کریں اور اپنے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کریں- آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارے دلوں سے آخرت کا خوف نکل چکا ہے- ہمارے قلوب سے آخرت کا یقین رخصت ہو چکا ہے- موجودہ دور کے علما عموما باہمی بغض وحسد، کبر ونخوت میں ڈوبے ہوئے ہیں- افتراق وانتشار، تکفیر وتفسیق میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں- علم نافع کی ترویج واشاعت کے بجائے دینی علوم کی اشاعت بھی اس طرح کر رہے ہیں کہ مدارس کے فارغین اللہ کا بندہ بن کر نکلنے کے بجائے دنیا کا بندہ بن کر نکل رہے ہیں اور یہ احساس بھی نہیں ہے کہ ایک روز ایسا بھی آئے گا جو جزا اور سزا کا ہوگا اور رب العالمین کی بارگاہ میں حساب وکتاب دینا ہوگا-

یہی حال آج ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنے آپ کو صوفیہ کے گروہ سے قرار دیتے ہیں- وہ علم وعمل سے دور اور اپنے مشن سے غافل ہیں- اپنے امتیازات سے نابلد ہیں- صرف لوٹ کھسوٹ اور خلق خدا کو اپنے زیر نگیں رکھنے کے حیلوں کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور آخرت کا ذرہ برابر کوئی خوف نہیں ہے- امت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کی فکر اور ان کی سعادت وسرفرازی کی کوشش جو صوفیہ کی خاص چیز تھی، اس سے صوفیہ کی جانب انتساب کرنے والے دونوں گروہ، مدارس کے علما اور خانقاہوں کے سجادہ نشینان عموما مجرمانہ حد تک لاپروا ہیں؛ بلکہ پوری امت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کی باتیں کرنے والے مشکوک نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں- اسلام کی وسعت ورحمت شاملۃ کا تصور جیسے محو سا ہو گیا ہے- یوں ہی تصوف کی ایک مضبوط بنیاد خدمت خلق تھی- ''الخلق كله عيال الله'' صوفیہ کی پیشانی کا ٹیکہ اور ان کے رخ تاباں کا غازہ تھا- اسی نظریے کے تحت اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے ذیل میں لنگر کی روایت شروع ہوئی اور اس طرح خلق خدا کی دل جوئی، ان سے محبت وشفقت اور رأفت ورحمت کا مظاہرہ کیا گیا- صوفیہ کے دروازے سب کے لیے بلا تفریق کھلے ہوتے تھے- وہاں کوئی چھوت چھات، اونچ نیچ، بھید بھاؤ نہیں تھا- ہر طرح کے لوگ صوفیہ کی خانقاہوں میں آتے، اپنا دکھ درد سناتے اور اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کرتے- وہاں مساوات (Equality) اور آزادی اظہار رائے (Freedom of Speech) کے عملی نمونے اور زندہ مظاہر ملتے تھے- انہوں نے اسلام و

شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان مقامی رسوم و رواج کو اختیار کیا جو شریعت سے متصادم نہیں تھے اور صوفیہ کی انہی خصوصیات کی وجہ سے خلق خدا کا ان کی طرف رجوع ہوتا- لوگ ان سے محبت کرنے لگتے اور پھر آہستہ آہستہ اسلامی تعلیمات کو اپنے اندر جاگزیں کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر اس کے ناصر و مددگار ہو جاتے- اس طرح صوفیہ نے کام کیا ہے- انہی اصولوں سے تصوف پھیلا ہے اور انہی اصولوں کو کھو دینے کی وجہ سے تصوف کا دائرۂ اثر سمٹا ہے- بعض ناقدین تصوف نے خانقاہی نظام کی تنقید و تردید تو کی لیکن اس نظام کا کوئی متبادل نہیں پیش کر سکے، جب کہ تنقید و تردید کے لیے ضروری ہے کہ اگر کسی نظام میں کوئی عیب ہے تو اس سے بہتر اس کا متبادل پیش کیا جائے- اس سے بھی تصوف کا نقصان ہوا- بہر حال اگر پھر سے انہی اصولوں کو اپنا لیا جائے، ایسے ہی صوفیہ کے نقوش قدم کو نشان منزل بنا لیا جائے تو آج بھی تصوف کا احیا ہو سکتا ہے اور پھر سے تصوف کی باد بہاری چل سکتی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ ان اصولوں سے ہٹ کر اگر تصوف کی بنیاد خلق خدا سے گریز، دنیا سے فرار، سماج اور سوسائٹی سے لاتعلقی اور خالص تقشّف پر رکھی گئی تو پھر ایسے تصوف کا انجام رہبانیت ہوگا جو اسلام کا مطلوب اور مقصود نہیں ہے- لہٰذا عصر حاضر میں احیائے تصوف کی جو بھی آواز اٹھے اور اس سلسلے میں جو بھی کوششیں ہوں وہ مذکورہ بالا اصولوں کے تحت ہوں- اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یقیناً انسانیت کی یہ عظیم خدمت ہوگی اور بھٹکے ہوئے مسافر اپنی منزل شوق کی طرف پھر سے تیز گام ہو جائیں گے-

○○○

شناسائی

مفتی عبید الرحمٰن رشیدی صاحب سے گفتگو

حضرت علامہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی دامت برکاتہم القدسیہ عصر حاضر کے ایک بلند پایہ محقق، وسیع نظر مفتی، عالم شریعت اور عارف طریقت ہیں- آپ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قابل فخر فرزند اور قدیم تاریخی آستانہ خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ نشیں ہیں- ۱۳۶۲ھ میں پورنیہ بہار کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، متوسطات تک کی تعلیم دار العلوم مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ سے حاصل کی، پھر مدرسہ حمیدیہ رضویہ بنارس اور مدرسہ مظہر اسلام بریلی سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے فراغت حاصل کی- آپ کے اساتذہ میں حافظ ملت شاہ عبد العزیز محدث مرادآبادی، مولانا شمس الدین جعفری، مولانا عبد الرؤف بلیاوی، مولانا مبین الدین امروہوی اور مولانا سید حامد اشرف کچھوچھوی جیسے نام ور علما کے نام شامل ہیں- جامعہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد فیض العلوم جمشید پور سمیت ملک کے کئی بڑے مدارس میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں- ادارۂ شرعیہ بہار واڑیسہ کے دار القضا کے مفتی و قاضی بھی رہے- اختیار نبوت، بیان حقیقت اور جواہر الحدیث کے نام سے کئی علمی اور تحقیقی کتابیں بھی آپ نے مرتب کیں اور بدمذہبوں سے کئی مناظرے بھی کیے- جدید فقہی مسائل میں اپنا محققانہ موقف رکھتے ہیں- ۱۹۸۶ء میں خانقاہ رشیدیہ کے ۱۰ ارویں سجادہ نشیں منتخب ہوئے اور اس وقت سے اس سلسلے کی اشاعت، مریدین ومتوسلین کی تربیت وتزکیہ اور سلسلے کے تحت قائم مختلف مدارس اور خانقاہوں کی توسیع وتعمیر میں آپ کے شب وروز گزر رہے ہیں- مفتی صاحب کا یہ انٹرویو ان کی شخصیت اور خانقاہ رشیدیہ کا مستند دستاویز ہے- حسن سعید صفوی

....

سوال(۱)اپنی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میری پیدائش ماہ رجب المرجب بروز سہ شنبہ۱۳۶۲ھ میں ہوئی- ابتدائی تعلیم سے لے کر شرح ملا جامی تک میری تعلیم دارالعلوم مصطفائیہ درگاہ شریف چمنی بازار پورنیہ میں ہوئی- یہ جگہ حضرت قطب الاولیا بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق عثمانی قدس سرہٗ کی آخری آرام گاہ ہے- آپ حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفیٰ جون پوری قدس سرہٗ کے والد ماجد اور پیر طریقت ہیں- ابتدائی کتابیں میزان ومنشعب تک خود اپنے والد بزرگ وار سے ہی پڑھیں- پھر اس کے بعد شرح ملا جامی تک حضرت استاذی مولانا غلام محمد یٰسین صاحب سے، جو ضلع پورنیہ بہار کے نام ور عالم اور حضرت صدرالشریعہ مصنف بہار شریعت کے تلامذہ سے تھے-

میری خواہش ہوئی کہ اب باہر کے کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کروں مگر حضرت استاذی مولانا شاہ غلام محمد یٰسین قدس سرہٗ کو یہ پسند نہیں ہوا اور انہوں نے یہاں اپنے مدرسے میں ایک لائق وفائق استاذ حضرت مولانا معین الدین خاں اعظمی کو بلالیا مگر یہ ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد یہاں سے چلے گئے- بالآخر حضرت موصوف نے مجھے اثنائے سال ہی میں مدرسہ حمیدیہ رضویہ بنارس بھیج دیا- یہاں اس وقت حضرت مولانا شمس الدین جعفری جون پوری اور حضرت مولانا سلیمان احمد بھاگل پوری قدس سرہما العزیز منصب تدریس پر فائز تھے- میری کتابیں انھیں دونوں حضرات کے پاس تھیں-

پھر میں بریلی شریف مدرسہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی چلا گیا- یہاں ایک سال رہا- میرے اساتذہ میں یہاں حضرت مولانا مبین الدین امروہوی وحضرت مولانا تحسین رضا خاں وغیرہما تھے- شرح جامی، شرح وقایہ، شرح تہذیب، قطبی وغیرہ کی تعلیم یہیں ہوئی اور مجھے معقولات کا شوق بھی یہیں پیدا ہوا جب کہ ابتدا میں مجھے علم نحو سے خاصی دل چسپی تھی-

پھر اس کے بعد۱۹۶۴ء میں دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کا رخ کیا- الحمد للہ یہاں کا تعلیمی ماحول کافی عمدہ پایا اور ملاحسن وغیرہ کی جماعت میں میرا داخلہ ہوا- اساتذۂ کرام کی شفقت ونوازش نے مجھے کافی حوصلہ بخشا اور یہیں سے فراغت حاصل کی- یہاں معقولات میں میری بیش تر کتابیں حضرت استاذی حافظ عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہیں- ملاحسن، ملا جلال، رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام یحیٰ، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، امور عامہ مع حاشیہ میر زاہد، یہ سب کتابیں انہیں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا- حضرت استاذ موصوف ہمارے نزدیک جان اشرفیہ تھے- ان کی منکسر المزاجی وسادہ لوحی اپنی مثال آپ تھی- آپ ایک زبردست جامع علوم وفنون تو تھے ہی، اپنے معاصرین میں بھی ایک نمایاں اور امتیازی مقام رکھتے تھے- ان کی تفہیم کی جس قدر

تعریف کی جائے کم ہے- ادق سے ادق مضامین کو وہ اس طرح سمجھاتے تھے جیسے یہ کوئی ادق اور مشکل مضمون ہی نہیں- کتابوں کی تکرار میرا محبوب مشغلہ تھا اور میں یہاں ایک طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ معین المدرسین بھی تھا اور مختلف جماعت کی کتابیں میرے زیر تدریس رہیں- شرح مأۃ عامل ایک جماعت کو پڑھاتے ہوئے مجھے ترکیب نحوی میں کچھ خلجان ہوا- وہ عبارت جس کی ترکیب میں مجھے خلجان ہوا یہ تھی **وهذه الحروف الخمسة تنصب الاسم**. اس میں مجھے یہ خلجان پیدا ہوا کہ معنوی حیثیت سے تو ''خمسۃ'' حروف کی صفت ہے، مگر ظاہری طور پر وہ ''ھذہ'' کی صفت ثانیہ ہے، جب کہ کسی موصوف کی چند صفتیں ہوں تو حسب قاعدہ کسی بھی صفت کو کسی کی جگہ رکھنے میں کوئی معنوی خرابی پیدا نہ ہو اور یہاں ''الخمسۃ'' کو اگر ''**الحروف**'' کی جگہ رکھیں اور ''**الحروف**'' کو ''**الخمسۃ**'' کی جگہ تو اس میں معنوی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ یہ ''ھٰذہ'' کی صفت بننے کے قابل نہیں- اس لیے کہ درحقیقت معنوی طور پر ''**الخمسۃ**'' ''**الحروف**'' ہی کی صفت ہے- یہ تو میرا اصل خلجان تھا مگر جب ''بشیر الکامل'' دیکھی تو دوسرا خلجان بشیر الکامل نے یہ پیدا کر دیا کہ اس نے ''**الخمسۃ**'' کی تا کو بجائے تانیث کے تذکیر کا لکھ دیا جب کہ حسب قاعدہ موصوف صفت میں تذکیر وتانیث میں مطابقت ضروری ہوا کرتی ہے اور تا کو تذکیر کے لیے ماننے کی صورت میں موصوف صفت میں مطابقت نہیں پائی جاتی - چناں چہ میں نے صاحب بشیر الکامل حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی کی خدمت میں یہ سوال لکھ بھیجا- انھوں نے میرے سوال پر میری تحسین فرمائی اور یہ فرمایا کہ اب ایسے دور میں جب کہ علم نحو کی دل چسپی طلبہ میں کم ہوگئی ہے، آپ کا یہ سوال علم نحو میں دل چسپی کو ظاہر کرتا ہے- انہوں نے جواب میں یہ فرمایا: عام علمائے نحو تو اعداد کی تا کو تانیث کا ہی مانتے ہیں مگر میں نے اپنے نحو کے استاذ علامہ گل علیہ الرحمۃ کے اتباع میں اس کو تذکیر کا لکھ دیا- پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ موصوف وصفت کے درمیان مطابقت کی جہاں تک بات ہے تو یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ عمومی ہے- اس پر انھوں نے یہ دلیل دی کہ قرآن مجید کی آیت ''**والفجر ولیال عشر**'' میں لفظ عشر مذکر ہے جبکہ اس کا موصوف مونث اس لیے کہ ''لیال'' ''لیلۃ'' کی جمع ہے، نہ کہ ''لیل'' کی- لہٰذا یہاں موصوف وصفت کے درمیان مطابقت نہیں پائی جاتی - پھر حضرت میرٹھی صاحب سے پوچھ گچھ کا سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا اور میری دل چسپی اس فن میں کافی بڑھ گئی-

الحاصل ۱۹۶۷ء میں میری فراغت ہوئی اور میں نے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں- سب سے پہلے مدرسہ فیض العلوم جمشید پور گیا، پھر بنارس جامعہ حمیدیہ رضویہ، پھر بمبئی دارالعلوم محمدیہ، پھر بریلی مدرسہ مظہر اسلام، پھر ناگ پور دارالعلوم امجدیہ، پھر مدرسہ ندائے حق جلال پور فیض آباد، پھر گھوسی مدرسہ شمس العلوم- طالب علمی کے دور میں مجھے علوم دینیہ: فقہ، حدیث، تفسیر

سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی مگر جب فراغت کے بعد سب سے پہلے جمشید پور پہنچا تو علامہ ارشدالقادری صاحب نے میرا سخت امتحان لیا اور دارالافتا کا پورا قلم دان میرے حوالے کر دیا جب کہ فتویٰ نویسی تو دور کی بات ہے میں فتویٰ نویسی کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا- مگر پیران کرام کی مدد ہوئی کہ میں نے اس پر کافی محنت اور عرق ریزی کی اور الحمدللہ! میں اس امتحان میں کامیاب رہا- اسی سال علامہ ارشدالقادری صاحب نے سیوان میں ایک کانفرنس کرائی تھی جس میں انھوں نے اکابر علما کی رائے سے یہ تجویز پاس کرائی کہ ہمارا اپنا ایک دارالقضا ہونا چاہیے اور یہ دارالقضا سر دست بہار، بنگال اور اڑیسہ کے لیے قائم کیا جائے اور اس کا ہیڈکوارٹر پٹنہ ہو- چناں چہ سر دست سبزی باغ پٹنہ میں کرایہ کا ایک روم لے کر دارالقضا قائم کر دیا گیا اور دارالقضا سے متعلق جتنے مسائل تھے ان سب کا دستورالعمل مرتب کرنے کی ساری ذمہ داری اور ساتھ ہی آئے ہوئے استفتوں کے جوابات دینے کی بھی ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی-

اب آپ سوچیے کہ ایک ایسا طالب علم جو ابھی ابھی فارغ ہوا ہو اور فتویٰ نویسی کے ابجد سے بھی واقف نہ ہو اور نہ کسی مفتی سے مشق استفتا کرنے کا موقع ہو تو اس کے لیے یہ کام کتنا مشکل ہے مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور کتب فقہ کی ورق گردانی بالخصوص فتاویٰ رضویہ کے غائر مطالعے سے میں نے یہ سارے کام بحمدہٖ تعالیٰ انجام دیے- پھر میں بنارس جامعہ حمیدیہ رضویہ چلا آیا- اس وقت وہاں حضرت شمس العلما مولانا شمس الدین صاحب جعفری رضوی صدرالمدرسین تھے اور میں ان سے پڑھ چکا تھا- ان کی نوازشیں شامل حال رہیں- کچھ دن گزرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ عبید الرحمٰن فتویٰ کے کام میں تم میرا ہاتھ بٹاؤ! میں نے بطیّب خاطر اس کو منظور کر لیا- ان کی ہدایت تھی کہ پہلے تم کاغذ میں اس کا جواب لکھو اور مجھے دکھا دو، تب استفتا کے کاغذ میں جواب لکھنا- چناں چہ میں نے ویسا ہی کیا- چند دنوں کے بعد فرمایا کہ ماشاءاللہ تم صحیح لکھتے ہو، اب مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں، تم فتویٰ دیا کرو- الحمدللہ کہ وقت کے مانے ہوئے ایک بلند پایہ عالم وفقیہ نے مجھے فتویٰ نویسی کی سند عطا فرمائی- ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بنارس میں ایک حکیم صاحب رہتے تھے جن کا نام جلال الدین تھا- وہ شمس العلما کے خاص دوستوں میں تھے اور برابر ان سے ملنے آیا کرتے تھے- ایک ایسا استفتا میرے پاس لے کر آئے اور کہا کہ حضرت شمس العلما نے آپ کو اس کا جواب لکھنے کو فرمایا ہے- میں نے کہا کہ آپ تو حضرت کے مخلص دوستوں میں ہیں- اس کا جواب آپ نے ان سے کیوں نہیں لے لیا؟ انھوں نے کہا کہ میں نے ان سے پر زور گزارش کی کہ اس کا جواب آپ ہی دیں تو انھوں نے فرمایا عبیدالرحمٰن اچھا لکھتے ہیں- مجھے ان کے فتویٰ پر پورا اعتماد ہے- یہ سن کر میرا حوصلہ کافی بلند ہوا اور پھولے نہیں سمایا- المختصر یہ کہ میرا ذوق معقولات سے ہٹ کر اب منقولات کی طرف

بڑھ گیا- البتہ منقولات بالخصوص فتویٰ نویسی میں معقولات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے-

جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس میں کئی سال رہنے کے بعد میں ممبئی چلا گیا- وہاں صرف ایک سال رہنے کا اتفاق ہوا- وہاں حضرت استاذی حامد اشرف کچھوچھوی صاحب نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا- انھوں نے مجھے دورۂ حدیث کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے بلا لیا- وہاں کی دنیا عجیب و غریب تھی- در و دیوار سے دنیا کی بو آ رہی تھی- زر طلبی کی ہوس ہر چہار جانب چھائی ہوئی تھی- میرا مزاج اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا- میں وہاں سے چلا آیا- پھر بحکم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بریلی شریف مدرسہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی چلا گیا- وہاں بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا اور دارالعلوم امجدیہ ناگ پور پہنچا- وہاں کئی سال رہا- پھر دارالعلوم ندائے حق قصبہ جلال پور فیض آباد میں پڑھایا- اس وقت جناب مفتی شریف الحق صاحب امجدی اس کے صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث تھے-

اسی سال حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا وصال ہو گیا اور حضرت مفتی صاحب وہاں چھوڑ کر اشرفیہ مبارک پور چلے آئے اور مجھے ان کا عہدہ سنبھالنا پڑا- کئی سال کے بعد میں گھوسی مدرسہ شمس العلوم چلا آیا اور یہاں پانچ سال تک طلبہ کو پڑھایا اور افتا کا کام بھی انجام دیا- یہاں میں نے ایک کتاب بنام ’’اختیار نبوت‘‘ لکھی جو ایک غیر مقلد صفی الرحمٰن اعظمی کی کتاب ’’رزم حق و باطل‘‘ کے جواب میں تھی- جب بنارس میں تھا تو وہاں ایک کتاب ’’بیان حقیقت‘‘ کے نام سے لکھی جو ایک شر پسند دیوبندی مولوی کی کتاب ’’نور حق‘‘ کے جواب میں تھی- جب بمبئی میں تھا وہاں ایک چند ورقی کتاب ’’جواہر الحدیث‘‘ لکھی جس میں مسئلہ تقلید پر روشنی ڈالی- یوں جرائد و اخبار میں وقتاً فوقتاً میرے مضامین شائع ہوئے- جب جمشید پور تھا تو علامہ ارشدالقادری صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہ نامہ ’’جام نور‘‘ کے ’’خورشید رسالت نمبر‘‘ میں میرا ایک مضمون ’’نبی خاتم‘‘ شائع ہوا جس کو علامہ نے کافی پسند فرمایا- پھر اس میں میرے فتوے بھی شائع ہوتے رہے- ان ہی تدریسی ایام میں بحمدہٖ تعالیٰ میں نے کئی باطل شکن مناظرے بھی کیے- پہلا مناظرہ جب میں جلال پور فیض آباد میں تھا تو اس وقت ہمارے دیار میں کچھ فتنہ پرور دیوبندی مولویوں نے ’’ھل من مبارز‘‘ کی صدا بلند کی اور مناظرہ کا چیلنج کر دیا- الحمدللہ! کہ اس مناظرہ میں چار گھنٹے کے اندر انھیں شکست فاش ہوئی اور اقرار شکست کرنا پڑا- جب اس کا علم علامہ ارشدالقادری صاحب کو ہوا تو وہ حیرت میں پڑ گئے- پھر دوسرا مناظرہ بنگال کی سرزمین آسا پور میں کیا اور تیسرا مناظرہ بردوان کے قریب گلسی بازار میں- الحمدللہ! کہ یہ سارے مناظرے بہت کامیاب رہے- یہاں ممکن ہے کہ لوگ اسے خودستائی پر محمول کریں مگر میں نے یہ باتیں تحدیث نعمت کے طور پر کہیں، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا- خیر یہ تو ایام تدریس کی باتیں تھیں جنھیں میں نے اختصار سے ذکر کیا گو کہ بعض جگہ کچھ طویل بھی ہو گئیں-

سوال(۲) خانقاہ رشیدیہ کی سجادگی کے منصب تک کیسے پہنچے، اس بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میری ابتدائی تعلیم ایک خانقاہ کے مدرسے میں ہوئی اور یہ خانقاہ، خانقاہ رشیدیہ سے منسلک ہے اور میرے والد بزرگوار اس خانقاہ کے خلفا میں تھے اور میری تعلیم وتربیت پر ان کی خاص توجہ تھی- انھوں نے مجھے خلافت واجازت سے بھی سرفراز فرمایا تھا مگر میری طبیعت کا میلان اس جانب نہ تھا چوں کہ میرا محبوب مشغلہ درس وتدریس کا تھا- اچانک ۱۹۸۶ء میں ہمارے مربیوں اور مرشدوں نے یہ بارگراں میرے دوش ناتواں پر ڈال دیا- ناچار ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بارگراں یہ سمجھ کر اٹھالیا کہ-

خیر تیری طرف سے جو کچھ ہو
میری سعی اور میری ہمت کیا

اس خانقاہ کی سجادگی کوئی آسان چیز نہیں- یہ ایسی خانقاہ ہے، جہاں نام ونمود، حرص وطمع اور جاہ پسندی انتہائی مذموم وقبیح ہے- مریدی اور دعا تعویذ کو پیشہ بنانا سخت ممنوع وناپسندیدہ ہے- اس لیے میں اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا-

سوال(۳) آپ اتنی بڑی خانقاہ کو جس کے تحت کئی شاخیں ہیں، کیسے سنبھالتے ہیں؟

جواب: دیکھیے اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کارساز اور ہر کام میں ناصر ومددگار ہے، ورنہ اتنی بڑی خانقاہ کے تمام مراکز کی خدمات کو انجام دینا میرے بس کی بات نہیں؛ اور خاص بات یہ بھی ہے کہ پیران کرام اور بزرگان دین کی خصوصی توجہات اور دعائیں شامل حال رہتی ہیں- ہر کام بڑی آسانی سے انجام پاتا ہے- ہر جگہ ہمارے کارندے موجود ومقرر ہیں جو ہدایت کے مطابق اپنی اپنی جگہ بڑی خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں اور یہ حضرات ہر چھوٹے بڑے معاملے میں مجھ سے رائے اور مشورہ لیتے ہیں اور میں خود بھی ان کی سرگرمیوں اور ذمے داریوں کا معائنہ اور جائزہ لیتا رہتا ہوں-

سوال(۴) آپ کے بعض محبین کا خیال ہے کہ خانقاہ میں آنے کی وجہ سے آپ جیسی علمی شخصیت علمی دنیا سے کٹ گئی جو فقہ وافتا کے لیے بہت بڑا نقصان ہے- آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: یہ ان حضرات کا اپنا خیال ہے، ویسے میں کوئی بھاری بھرکم شخصیت بھی نہیں کہ فقہ وافتا کی لائن سے الگ ہو جانے پر کوئی نقصان یا خلا پیدا ہو- ہماری جماعت میں ایک سے ایک عالم دین ہیں جو اس خدمت کو پوری ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں؛ اور علمی دنیا سے کٹ جانے کی جہاں تک بات ہے، تو ایسا بھی نہیں ہے- میں آج بھی علمی دنیا سے وابستہ ہوں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ فتویٰ نویسی کا کام نہیں کرتا- اس کی وجہ میری دیگر مصروفیات ہیں اور فتویٰ نویسی خاصی مصروفیت

کا کام ہے جس کا میں متحمل نہیں-

سوال(۵) سلسلۂ رشیدیہ کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالیں؟

جواب: حضرت شیخ محمد رشید جون پوری سلسلۂ رشیدیہ کے بانی ہیں- آپ اپنے عہد کے ایک زبردست عالم اور درویش کامل تھے- آپ اپنے والد بزرگوار حضرت بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق سے کم سنی میں مرید ہوئے تھے اور باپ سے مختلف سلاسل کی اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، مگر آپ کو اپنے والد بزرگوار سے کسب فیض کا موقع نہیں ملا- ظاہری تعلیم کے بعد جب آپ کی توجہ باطنی تعلیم کی طرف ہوئی تو آپ نے مختلف مشائخ سے کسب فیض فرمایا- ان میں چند بزرگوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت شاہ طیب بنارسی، حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ حلیم اللہ مانک پوری، حضرت سید شمس الدین کالپی بخاری-

آپ کے بعد آپ کے منجھلے صاحب زادے حضرت شیخ محمد ارشد اپنے والد گرامی کے جانشین ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے پوتے حضرت قمر الحق شیخ غلام رشید منصب سجادگی پر فائز ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے نواسے حضرت حیدر بخش امام الدین سجادہ نشیں ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت شاہ امیر الدین صاحب سجادہ ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت شاہ غلام معین الدین سجادہ نشیں ہوئے، پھر حضرت شاہ سراج الدین ہوئے، ان کے بعد حضرت آسی غازی پوری سجادگی کے منصب پر فائز ہوئے، ان کے بعد حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری سجادہ نشیں ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش سجادہ نشیں ہوئے- وہ ہمارے پیر ارادت بھی ہیں-

سوال(۶):- خانقاہ اور بانی خانقاہ کے حالات پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب:- بانی خانقاہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری ہیں اور ان ہی سے منسوب اس خانقاہ کا نام خانقاہ رشیدیہ ہے- آپ موضع برونہ ضلع جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی- آپ کے بچپن کے زمانے میں ایک بزرگ شیخ عبد الجلیل لکھنوی نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا عالم عامل اور عارف کامل ہوگا اور گنا بہت کھائے گا- چناں چہ ایسا ہی ظہور میں آیا- آپ کی ولادت سے بہت پہلے ایک بزرگ حضرت شیخ عبد العزیز جون پوری نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک درویش کی ولادت ہونے والی ہے جس کا نام نامی محمد رشید ہوگا- یہ شیخ عبد العزیز جون پوری جون پور میں پیدا ہوئے اور دلّی میں رہا کرتے تھے- قاضی خاں ظفر آبادی کے مرید تھے- سماع کا شوق رکھتے تھے- قرآن مجید کی آیت: **فسبحن الذی بیدہ ملکوت کل شیء والیه ترجعون** جب سنی تو واصل بحق ہوئے-
حضرت شیخ محمد رشید نے متوسطات سے لے کر اوپر کی ساری کتابیں حضرت ملا افضل

جون پوری اور حضرت مولانا شمس الدین سے پڑھیں- پھر دلّی جا کر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحب زادے حضرت شیخ نورالحق سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور سند حدیث سے سرفراز ہوئے- حضرت محمد رشید تو علم حدیث کی تعلیم کے لیے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پاس پہنچے مگر وہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے- آپ نے فرمایا کہ تم نورالحق سے میری موجودگی میں پڑھا کرو، چناں چہ اس طرح آپ نے ان دو بزرگوں سے علم حدیث کی تکمیل کی- صاحب شمس بازغہ ملا محمود علی جون پوری آپ کے ہم سبق رہا کیے- پڑھنے کے زمانے میں یا بعد کو جب کسی مسئلے پر بحث ہوتی تو ملا محمود پر آپ بھاری پڑتے-

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلما حضرت ملا افضل جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ فن مناظرہ کی کتاب شریفیہ پڑھا رہے تھے- آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ متن تو خوب ہے، اگر کوئی اس کی شرح لکھتا تو بہت اچھا ہوتا- اس کے ایک ہفتے کے بعد آپ نے شرح شریفیہ لکھ کر پیش کر دی، دیکھ کر بہت پسند فرمایا- یہی شرح شریفیہ آج مناظرۂ رشدیہ کے نام سے معروف ومشہور ہے اور درس گاہوں میں آج بھی داخل نصاب ہے- آپ کے شیخ طیب بنارسی کا حکم تھا کہ تم وظیفۂ صبح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے- انہوں نے آپ کو جون پور رخصت کیا، چناں چہ آپ آخر عمر تک اس حکم پر عمل پیرا رہے- آپ کی وصیت تھی کہ جب میں مر جاؤں تو ان پتھروں کو جن پر طلبہ اپنی جوتیاں اتارا کرتے رہے، میری قبر میں ان کا تختہ دیا جائے- چناں چہ ایسا ہی کیا گیا- پہلے بیر کے تختے دیے گئے پھر ان پتھروں کا تختہ دیا گیا-

ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جب آپ اپنے شیخ سے ملنے گئے تو انہوں نے اعتکاف کا حکم دیا- اس اعتکاف میں آپ پر بہت سے عجائب وغرائب منکشف ہوئے- عین عید کے دن مجمع عام میں حضرت مخدوم نے حضرات چشت کی طرف سے پیراہن پہنایا اور اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا- حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سلسلۂ قادریہ بھی عطا فرمایا- میرے خیال میں یہ سلسلۂ قادریہ کہیں اور کسی خانقاہ میں نہیں ہے- آپ نے اپنے مرشد گرامی حضرت راجی سید احمد ابن مجتبیٰ حلیم اللہ مانک پوری کے حکم سے جون پور میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا- غالباً یہ شاہ جہاں کا دور تھا- اب اس خانقاہ کو قائم ہوئے ساڑھے تین سو برس سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے- اس خانقاہ کے ماتحت کئی خانقاہیں ہیں جو مختلف جگہوں پر ہیں- (۱) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڈیہہ، بنارس (۲) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار (۳) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان بہار (۴) خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور جہاں حضرت آسی کا آستانہ مبارکہ ہے-

اس خانقاہ کے سلاسل مجاریہ یہ ہیں: چشتیہ مصطفائیہ، چشتیہ احمدیہ، چشتیہ طیبیہ، چشتیہ اشرفیہ، قادریہ مصطفائیہ، قادریہ احمدیہ، قادریہ شمسیہ، قادریہ طیبیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، مداریہ، جنیدیہ، طیفوریہ، زاہدیہ، ان کے علاوہ اور بھی سلاسل ہیں جو اب رائج نہیں ہیں-

حضرت شیخ محمد رشید جونپوری ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور آپ کی وفات ۱۰۸۳ھ میں ہوئی- تاریخ وصال ۹ر رمضان المبارک اور وقت وصال عین حالت نماز فجر اور روز جمعہ مبارکہ ہے- آپ مرتبۂ قطبیت پر فائز تھے اور دیوان جی کے لقب سے ملقب، آپ ولایت وبزرگی اور فضل وکمال میں یگانۂ روزگار تھے- تحدیث نعمت کے طور پر آپ کا ارشاد ہے:

من بیک دم سیر عالم می کنم
روح را دستے وپائے دیگر است

اپنے مریدین سے فرماتے ہیں:

راہ را گم کردہ حیرانی چرا
شمس حق را یاد کن گو یار شید

چوں کہ آپ کا لقب شمس الحق بھی تھا، اس لیے فرماتے ہیں تم ادھر ادھر بھٹکتے کیوں ہو اور حیران وپریشان کیوں ہو، شمس الحق کو یاد کرو اور یار شید کہو! چناں چہ یارشید کا وظیفہ ہماری خانقاہ کے مریدین میں اکثر رائج ہے-

سوال(۷) خانقاہ رشیدیہ کا میدان دعوت وتبلیغ میں کیا کردار رہا ہے؟

جواب: خانقاہ رشیدیہ اپنے اصول کی پابندی کرتے ہوئے دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتی چلی آئی اور آج بھی انجام دے رہی ہے- خاک ساری اور تواضع پر یہاں زیادہ زور دیا جاتا ہے- نفسانیت اور خودغرضی کی مذمت بیان کر کے اس سے اجتناب کا حکم دیا جاتا ہے- عجب وخودبینی وخودنمائی سے بچنے کی زیادہ تاکید کی جاتی ہے- غرض کہ طریقت کے تقاضے اور لوازمات کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے- طریقت محض گدڑی پہن لینے کا نام نہیں بلکہ اوصاف ذمیمہ کو دور کرنے اور اوصاف حمیدہ سے اپنے آپ کو متصف کرنے کا نام ہے- شیخ سعدی شیرازی گلستاں میں فرماتے ہیں:

دلقت بچہ کار آید وتسبیح ومرقع
خود را ز عملہائے نکوہیدہ بری دار

تمہاری یہ گدڑی اور پیوند لگے کپڑے اور تسبیح کس کام آئیں گے، جب تک کہ تو اپنے کو اوصاف ذمیمہ سے پاک نہ کرے-

چنانچہ یہ خانقاہ حتی المقدور اس کے مطابق دعوت وتبلیغ کا کام انجام دیتی چلی آ رہی ہے-

سوال(۸) خانقاہ رشیدیہ کے علمی کارناموں کے بارے میں بتائیں؟

جواب: اس کے علمی کارنامے بہت ہیں جن پر اس خانقاہ کے بزرگوں کی تصنیفات شاہد عدل ہیں، مگر اس کے علمی ذخائر منظر عام پر نہیں آسکے؟ میری کوشش ہوگی کہ انھیں منظر عام پر لاؤں؟

سوال(۹) اس قدیم خانقاہ کے معمولات، رسومات اور امتیازات کیا رہے ہیں؟

جواب: اس خانقاہ میں جتنے بھی سجادہ نشیں ہوتے آئے سب کی حالت عموماً یہ تھی کہ کبھی ملازمت نہ کی نہ دولت وحشمت کی طمع رکھی، ریا وحب جاہ سے سخت متنفر رہے، کشف وکرامات کے اظہار کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے، کیوں کہ بزرگوں کے نزدیک ان کا اظہار تین موقعوں کے سوا کبھی جائز نہیں- حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحیٰ منیری کے ایک مکتوب میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اظہار کرامت جائز نہیں، اگر گرمی وقت ہو، یا حالت سکر ہو، یا مریدین کی ترغیب مقصود ہو تو جائز ہے- یہاں کے مشائخ نے دنیا طلبی کے واسطے خانقاہ سے کبھی قدم باہر نہیں نکالا- بزرگان سلاسل کی زیارت اور کسب فیض کے لیے اکثر دور دراز کے مقامات کا سفر کیا اور اس سفر میں بندگان خدا کی ہدایت بھی فرماتے رہے- اگرچہ بانی خانقاہ اور ان کے بعد اکثر سجادگان سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے، آگے چل کر ان کو سماع میں نہ غلو تھا نہ اس سے انکار- مریدوں کے گھر کبھی بے بلائے نہ گئے اور غیر مرید کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے- ملکیت کی طرف کبھی راغب نہ ہوئے- فقر وقناعت کو اپنا شعار بنائے رکھا- غیر مریدین کی نذر قبول نہیں کرتے اور مریدین سے طلب وسوال نہیں کرتے- بے طلب اگر کسی مرید نے کچھ دے دیا تو قبول کر لیتے- عام حالات میں امرا واغنیا کے یہاں نہیں جاتے-

اس خانقاہ کے کسی بزرگ کا اگر رات میں عرس وقل ہوتا ہے تو سجادہ نشین اس رات کو کھانا نہیں کھاتے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زائرین میں کوئی بھوکا رہ گیا ہو-

عموماً قل شریف ٹھیک وصال کے وقت ہی ہوتا ہے، اس میں قوالی وغیرہ نہیں ہوتی، کبھی کبھی قل شریف سے پہلے نعت خوانی ومنقبت خوانی بھی ہوجاتی ہے- فاتحہ وقل کے بعد چادر پوشی سے پہلے گلاب، صندل، عطر، مزار شریف پر چھڑکے جاتے ہیں، تب سفید چادر مزار شریف پر چڑھائی جاتی ہے- پھر مریدین ومعتقدین اپنی اپنی طرف سے چادریں چڑھاتے اور عطر وگلاب چھڑکتے ہیں، پھر اخیر میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے جاتے ہیں- فاتحہ وقل میں چھوہارے کو خانقاہ کی طرف سے لازم سمجھا جاتا ہے- مریدین ومعتقدین بھی اپنی اپنی جانب سے قل میں شیرینی ومٹھائی رکھتے ہیں- عام طور پر مزار شریف پر قل ختم ہوجانے کے بعد قبولی پر فاتحہ ہوتی ہے اور یہی قبولی زائرین کو کھلائی جاتی ہے- کبھی کبھی بعض اعراس میں شربت اور چھوہارا دونوں ہوتے ہیں- چھوہارے کو پہلے دھو کر پاک کر لیا جاتا ہے، پھر اس کی گٹھلی نکال دی جاتی ہے، تب اس کو قل شریف میں فاتحہ کے لیے رکھا جاتا

ہے- ڈالی کو صاحب سجادہ یا سلسلہ کے خلیفہ اپنے سر پر لے کے مزار شریف پر جاتے ہیں اور ان کے ساتھ زائرین کی جماعت ہوتی ہے- قل شریف میں پہلے حضور اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور شہدائے کربلا کے نام سے فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر صاحب عرس کے مشائخ کے نام سے، اس کے بعد صاحب عرس کے لیے مخصوص فاتحہ پڑھی جاتی ہے- صاحب سجادہ اور خلفا عام طور پر مریدین کو وظیفہ پنج گنج رشیدی پڑھنے کو دیتے ہیں اور ذکر واذکار کے جو لائق ہوتے ہیں ان کی لیاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ذکر واذکار کی تعلیم دیتے ہیں- مریدین کو حلقۂ ذکر میں نہیں بٹھاتے، بلکہ جس کو ذکر واذکار کی تعلیم دینی ہوتی ہے اسے الگ سے ذکر کی تعلیم دیتے ہیں- بیعت کے وقت مرید کو شیرینی لے کر حاضر ہونا ہوتا ہے- اگر مرید ہونے والا مرد ہوتا ہے تو اس کو مرید کرنے کے بعد کلاہ چہارتر کی پہناتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کلاہ چہارتر کی پہنانے سے پہلے مقراض رانی کرتے ہیں- پہلے پیشانی کے چند بال کاٹتے پھر داہنی جانب کے کچھ بال پھر بائیں جانب کے بال- اگر مرید کے سر پر بال نہ ہو تو صرف مقراض رانی کر دیتے ہیں اور اگر عورت کو مرید کرنا ہوتا ہے تو اس کے سر پر مقراض رانی نہیں کرتے، صرف دامنی اوڑھاتے ہیں، پھر ہدایتیں کرتے- یہ ہدایتیں کچھ طویل ہوتی ہیں- پھر دوگانہ شکرانۂ بیعت کی نماز پڑھنے کو کہا جاتا ہے-

راحت رسانی خلائق پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے- کوئی اگر کسی کی برائی بیان کرتا تو اس کو سننا پسند نہیں کرتے، ممکن ہوتا تو اس کی کوئی اچھی تاویل کرتے- مخالفین ومعاندین کے حق میں بھی نرم گوشہ رکھتے اور انہیں بھی اچھائی سے یاد کرتے- مشکل کشائی وحاجت روائی میں کوتاہی نہیں کرتے- خانقاہ میں آنے جانے والوں کو بغیر کچھ کھلائے رخصت نہیں کرتے- ان کے علاوہ اور بھی معمولات ورسومات ہیں جن کے بیان کا موقع نہیں-

سوال(۱۰) خانقاہ رشیدیہ کے دوسری خانقاہوں اور علمی مراکز سے روابط کیسے رہے ہیں؟

جواب: خانقاہ رشیدیہ ایسی خانقاہ ہے جس کا ہر خانقاہ سے ربط رہا ہے- اس کے بانی حضرت شیخ محمد رشید کا قول ہے ''**الفقراء کلھم کنفس واحدۃ**'' جتنے اللہ والے ہیں وہ مثل ایک جان کے ہیں- یہی وجہ ہے کہ بانی خانقاہ حضرت محمد رشید نے باوجودیکہ وہ اپنے والد بزرگ وار کے مرید وخلیفہ تھے، دوسری خانقاہوں کے بزرگوں سے بھی اکتساب فیض کیا- خانقاہ شہبازیہ بھاگل پور کے بانی حضرت مولانا شہباز بھاگل پوری سے بھی آپ نے اکتساب فیض فرمایا- خانقاہ حسامیہ مانک پور کے شیخ حضرت احمد ابن مجتبیٰ حلیم اللہ سے بھی خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے اور فیوض وبرکات حاصل کیے- اسی طرح حضرت مخدوم شاہ طیب بنارسی سے بھی نعمتیں حاصل کیں- الغرض جہاں کہیں بھی موقع ملا آپ نے وہاں کے بزرگوں سے اکتساب فیض فرمایا،

تعصب اور تنگ نظری کو اس راہ میں حائل ہونے نہیں دیا، جیسا کہ آج کل عموماً دیکھا جاتا ہے-

سوال (۱۱) ہند و بیرون ہند کے ان مشائخ اور محققین کے بارے میں کچھ بتائیں جو اس قدیم خانقاہ سے روابط رکھتے ہیں؟

جواب: ہندوستان میں ایسے مشائخ و محققین بہت ہیں جن کے اس خانقاہ سے روابط رہے ہیں، مثلاً حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی، حضرت ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری اور حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھوی وغیرہم- ان سے پہلے حضرت سید مردان شاہ جو کہ حضرت شاہ سلیمان تونسوی کے مرید تھے ان کو ان کے پیر نے حضرت آسی غازی پوری کے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت میں بھیجا تا کہ ان سے ذکر و اذکار وغیرہ کی تعلیم حاصل کریں چنانچہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد حضرت شاہ غلام معین الدین نے انہیں بنگال کی طرف رشد وہدایت کے لیے مامور فرمایا- یہاں یہ بھی ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ حضرت ملک العلما کو ہماری خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ شاہد علی کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ ایوب ابدالی نے خلافت واجازت سے بھی سرفراز فرمایا ہے-

پھر یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ جب ۱۹۴۶ء میں بنارس کی سرزمین پر چہار روزہ سنی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی ہماری خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش سے ملے اور ان سے اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کو بیان فرمایا تو آپ نے ایک اشتہار شائع کرایا جس میں یہ مضمون تھا:

آج تمام اہل باطل منظّم ہیں اور ان کی تنظیم حق اور اہل حق کے مٹانے کے لیے ہے- وہ اسی دھن میں ہیں- وہ جس قدر منظّم ہیں اہل حق اسی قدر منتشر ہیں- ہمارے انتشار سے اعدا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اگر ہم انفرادی طور پر کچھ کام بھی کریں تو وہ چنداں مفید نہیں ہوگا، اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اہل حق جو اہل سنت میں منحصر ہیں خواہ وہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، یا چشتی، قادری، سہروردی، رفاعی، شاذلی وغیرہ سب مجتمع ہو جائیں اور ایک نظام پر متحد ہو کر کام کریں- اس مقصد کے لیے ”جمہوریت اسلامیہ“ (آل انڈیا سنی کانفرنس) قائم کی گئی ہے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں-

سوال (۱۲) یہ قدیم خانقاہ مخطوطات ومکتوبات کے حوالے سے بھی جانی جاتی ہے- یہاں کے اہم مخطوطات ومکتوبات اور علمی ذخائر کے بارے میں بتائیں؟

جواب: اس میں شک نہیں کہ یہ خانقاہ مخطوطات ومکتوبات اور علمی ذخائر کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی حفاظت کما حقہٗ نہیں ہوئی- بہت سارے مخطوطات وغیرہ ضائع ہو گئے، مگر اس کے باوجود اب بھی بحمدہٖ تعالیٰ بہت کچھ محفوظ ہیں-

ذیل میں ہم کچھ کا ذکر کر رہے ہیں:

شرح رشیدیہ: یہ کتاب آداب باقیہ کے جواب میں ہے جس میں ملا محمود جون پوری صاحب شمس بازغہ کے ایک شاگرد ملا عبد الباقی نے ”مناظرۂ رشیدیہ“ پر اعتراضات کیے تھے-

گنج رشیدی: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری بانی خانقاہ رشیدیہ کے ملفوظات وارشادات کا مجموعہ ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے مگر یہ غیر مطبوعہ اور قلمی ہے-

ملفوظات قطب الاقطاب: یہ بھی حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید جون پوری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جو مطبوعہ ہے-

مکتوبات رشیدیہ: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں آپ نے وقتاً فوقتاً اپنے خلفا و مریدین کے نام سے تحریر فرمایا ہے-

مکتوبات ارشدی: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے صاحب زادے اور جانشین حضرت شیخ محمد ارشد کے خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں آپ نے اپنے مرید کے نام سے تحریر فرمایا ہے-

مکتوبات جمالیہ: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے والد بزرگوار اور پیر و مرشد حضرت بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق کے خطوط کا مجموعہ ہے-

گنج ارشدی: یہ حضرت شیخ محمد ارشد رشید مصطفیٰ کے ملفوظات وارشادات کا مجموعہ ہے اور کئی جلدوں میں ہے- اس کی بڑی شہرت ہے-

گنج فیاضی: یہ صاحب گنج ارشدی کے پوتے اور جانشین حضرت ابو الفیاض غلام رشید قمر الحق کے ملفوظات کا مجموعہ ہے-

زاد السالکین، کرامات فیاضی، بدایۃ النحو، ترجمہ معینیہ، دیوان شمسی، مناقب العارفین، مقصود الطالبین، عین المعارف، دیوان فانی؛ یہ سب کتابیں بزرگان رشیدی کی تصانیف ہیں- حضرت شیخ محمد رشید نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فتوحات مکیہ پر جا بجا حاشیہ تحریر فرمایا ہے، جسے شرح بھی کہہ سکتے ہیں- شیخ اکبر کی ایک دوسری کتاب اسرار المخلوقات پر بھی بسیط شرح تحریر فرمائی ہے-

سوال (۱۳) شریعت وطریقت کے باہمی رشتے کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: طریقت، شریعت سے علاحدہ کوئی چیز نہیں- حضرت مولانا رومی کا یہ مقولہ مشہور ہے: ”طریقت از شریعت نیست بیروں“ طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں- طریقت تقویٰ اور صلاح باطنی سے عبارت ہے- لہٰذا یہ شریعت سے علاحدہ نہیں- مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ طریقت، شریعت کا اعلیٰ درجہ ہے- مثلاً وہ نماز جو خشوع وخضوع سے خالی ہو تو از روئے شرع اس کے صحیح ہو جانے کا حکم ہوگا مگر از روئے طریقت یہ نماز نامکمل ہوگی، مگر یہ حکم شریعت کے خلاف نہیں-

پس جہاں طریقت، شریعت کے خلاف نظر آتی ہے تو یہ صرف بادی النظر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ غائر نظر کے اعتبار سے- حضرت علامہ عبد الغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ جو جامع شریعت و طریقت تھے، انھوں نے اپنی کتاب مستطاب '**الحدیقة الندیة فی شرح الطریقة المحمدیة**' کی پہلی جلد میں اس مسئلے پر بھرپور روشنی ڈالی ہے- واضح رہے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں؛ ایک ظاہر، دوسرے باطن- باطن کو طریقت کہتے ہیں اور ظاہر کو عام اطلاقات میں شرع، ورنہ ظاہر و باطن دونوں ہی کا تعلق شرع سے ہے- یہ بحث تفصیل طلب ہے مگر مجھے اس وقت اس کا موقع نہیں-

سوال(۱۴) فلسفۂ تصوف کا تعلق حقیقت تصوف سے کتنا ہے؟

جواب: فلسفۂ تصوف قال ہے اور حقیقت تصوف حال، قال اگر حال کے مطابق ہو تو محمود ورنہ غیر محمود، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

زباں سے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سوال(۱۵) آپ کے خیال میں مرشد اور خانقاہ کی ضرورت کیوں ہے؟

جواب: یہ سوال کافی معنویت رکھتا ہے- مرشد کی ضرورت راہ سلوک طے کرنے کے لیے ہے اور یہ عام طور پر شیخ کامل کے بغیر ممکن نہیں- فرصت کی کمی کی بنا پر اسی پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس سوال کا جواب تفصیل چاہتا ہے-

سوال(۱۶) آج عالمی سطح پر تصوف موضوع بحث ہے- تصوف کا مستقبل کیسا ہے؟

جواب: عربی کا مقولہ ہے "**الناس اعداء لما جھلوا**" لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس کے مخالف ہو جاتے ہیں- محدث ابن جوزی کو تصوف سے چڑھ تھی، اسی لیے انھوں نے تصوف کے خلاف "تلبیس ابلیس" نامی کتاب لکھ ڈالی- پھر ان کے بعد بھی یکے بعد دیگرے علمائے ظاہر نے تصوف کی مخالفت کی مگر بات وہی ہے کہ تصوف جن کے پلے نہیں پڑا انہوں نے اس کی مخالفت کی یا پھر ان کی نظر میں اس سے فساد کا پہلو غالب نظر آیا تو انھوں نے دین کی حفاظت وصیانت کی غرض سے اس کی مخالفت کی- علاوہ ازیں جب متصوفین نے صوفیہ کی جگہ لینا شروع کر دیا تو چار و ناچار تصوف کی مخالفت پر علما میدان میں آگئے تاکہ چہرہ مسخ نہ ہو- میرے خیال میں تصوف کا مستقبل اچھا نظر نہیں آتا-

سوال(۱۷) تصوف کے نام پر آج عالمی سطح پر جو فکری و عملی بے اعتدالی عام ہو رہی ہے، اس کا علاج آپ کی رائے میں کیا ہو سکتا ہے؟

جواب: جب دنیا طلبی غالب آجائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہے- یہ بے اعتدالی جو عام ہو رہی ہے اس میں یہی چیز کارفرما ہے- اب دین برائے دنیا ہو کر رہ گیا ہے، جب کہ حدیث میں ہے

"**الدنیا جیفة وطالبها کلاب**" دنیا مردار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں- صوفی جو نام و نمود اور حب جاہ بلکہ حب دنیا سے متنفر ہو، درحقیقت وہی صوفی ہے، مگر آج یہ کبریت احمر ہے- شاید موجودہ خانقاہوں کے مشائخ منظم طور پر اس جانب توجہ فرمائیں تو اس کا کسی حد تک علاج ہو سکتا ہے-

سوال(۱۸) آج اس دور میں تصوف اور صوفیہ کا انسانی معاشرے پر کتنا اثر ہے؟

جواب: کچھ تو اثر ضرور ہے، مگر یہ کافی نہیں-

سوال(۱۹) کیا تصوف اور صوفیہ انسانوں کو بے عملی، تجرد اور جمود کا سبق دیتے ہیں؟

جواب: تصوف اور صوفیہ بے عملی اور جمود کا سبق نہیں دیتے، رہی بات تجرد کی تو یہ بعض حالات میں بعض صوفیہ نے اس کو اپنایا ہے، مگر جہاں تک سبق دینے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے-

سوال(۲۰) رواداری و صلح جوئی کے تعلق سے تصوف اور صوفیہ کا مسلک کیا رہا ہے؟

جواب: رواداری و صلح جوئی تو صوفیہ کا خاص مسلک رہا ہے- یہ الگ بات کہ آج کے علمائے ظاہر اس میں کافی تشدد برتتے ہیں اور صوفیہ کو ہدف ملامت کرنے میں دریغ نہیں کرتے- ایسا لگتا ہے کہ یہ حضرات غالباً تصوف کو دین و شریعت سے الگ غیر اسلامی نظریہ سمجھتے ہیں جب کہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے والد بزرگوار حضرت مولانا نقی علی خاں اپنی کتاب "**الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح**" میں فرماتے ہیں: فقیر کے مذہب میں کسی کو برا سمجھنا جائز نہیں- (ص:۴۲۰) پھر فرماتے ہیں: جب سالک تمام ذرات عالم کو آئینۂ جمال مطلق جانتا ہے، سب سے صلح کرتا ہے، کسی کو برا نہیں سمجھتا- جب مرتبۂ فرق و تمیز وغیرہ کہ عبارت اسلام طریقت سے ہے حاصل ہوتا ہے، اس وقت مسلمان کو مسلمان اور کافر کو کافر اور اچھے کو اچھا اور برے کو برا جانتا ہے- (ص،۴۲۲)

حضرت میر عبد الواحد بلگرامی سبع سنابل میں فرماتے ہیں:

ہمہ عالم چوں مظہر عشق اند
ہمہ را بر کمال می بینم

جب تمام عالم عشق کا مظہر ہے تو ہم ہر چیز میں کمال دیکھتے ہیں-

قاضی عین القضاۃ فرماتے ہیں: ارادت کی ابتدا یہ ہے کہ تو ایمان و کفر سے نہ لڑے اور ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح نہ دے اور بہتر حلقوں (فرقوں) میں کچھ فرق نہ کرے-

(ترجمہ سبع سنابل، ص:۳۳۱)

تصوف اور صوفیہ کا اس سلسلے میں جو مسلک ہے اسے میں نے بڑے اختصار کے ساتھ

بیان کر دیا، ورنہ یہ مسئلہ تفصیل چاہتا ہے اور میری گونا گوں مصروفیات مجھے فرصت نہیں دیتیں-

سوال (۲۱) کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ آج خانقاہوں میں صرف مجاور یا گورکن رہ گئے ہیں؟

جواب: عام طور پر ایسا ہی ہے مگر دنیا اہل اللہ و اہل طریقت سے خالی نہیں، ابھی بھی کچھ خانقاہوں میں جان باقی ہے-

سوال (۲۲) کیا عصر حاضر میں تحریک احیائے تصوف کی ضرورت ہے؟ اگر ہاں تو اس کے خطوط کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: جب تصوف دین ہی کا ایک اہم اور اعلیٰ شعبہ ہے تو اس کی تو ہر حال میں ضرورت ہے مگر اس کے لیے یہ موجودہ خانقاہی نظام و دستور سود مند نہیں، اگر اس کو سود مند بنانا ہو تو گزشتہ دور کے بزرگوں کی سیرت پر چلنا ضروری ہوگا-

سوال (۲۳) تصوف کے موافقین اور مخالفین سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

جواب: موافقین کو چاہیے کہ تصوف کو صحیح ڈھنگ سے سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں، صرف زبانی جمع خرچ کوئی معنیٰ نہیں رکھتا اور مخالفین کو چاہیے کہ آیت قرآنی "**فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون**" کو سامنے رکھیں اور اہل ذکر سے تصوف کو سمجھنے کی کوشش کریں- بے سمجھے انکار کر بیٹھنا حماقت و بے وقوفی ہے-

سوال (۲۴) مجلّہ الاحسان اور اس کے مدیر و مرتبین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب: علم تصوف پر ایک تحقیقی مجلّہ الاحسان الٰہ آباد کا نقش ثانی موصول ہوا لیکن میں اپنی گونا گوں مصروفیت کی بنا پر اس کا مکمل طور پر مطالعہ نہ کر سکا، صرف بعض مقامات پر سرسری نظر ڈالنے کا موقع میسر ہوا- زبان و بیان میں صفائی و سادگی اور پاکیزگی غالب ہے- باتوں کو دلائل کی روشنی میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے- عناوین و مقالات کی ترتیب و تنظیم اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہے- اس سے ادارہ الاحسان کی علمی و عملی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے اور تصوف سے ان کے خاص لگاؤ اور شوق و ذوق کا اندازہ بھی- یہ نسل نو کے لیے بڑی خوش آئند اور حوصلہ افزا بات ہے-

الغرض رسالہ اپنی جامعیت اور معنویت میں لاجواب ہے اور سلوک و تصوف پر مشتمل ایک گراں قدر اور بیش بہا ذخیرہ ہے- ان شاء اللہ یہ طریقت و معرفت کے فروغ میں زبردست محرک ثابت ہوگا- میں خلوص دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کی اہمیت اور مقبولیت کو عوام و خواص میں عام کرے اور اس کو ان کی ہدایت اور روحانی تسکین کا ایک اہم وسیلہ بنائے اور اس کے کارکنوں اور مربیوں کو حاسدین کی نظر بد سے محفوظ و مامون رکھے اور ان کے دینی و علمی حوصلے و جذبے کو سلامت رکھ کر زیادہ سے زیادہ خدمات دین متین کی توفیق بخشے- آمین بجاہ حبیبہ الکریم ﷺ! ○○○

مجیب الرحمٰن علیمی

خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور
تاریخ اور کارنامے

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے سلطان فخر الدین محمد تغلق عرف جونا شاہ نے دریائے گومتی کے کنارے ہموار زمین پر ایک شہر قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ارادہ پایۂ تکمیل کو پہنچتا کہ ۲۰؍ سال تک ہندوستان کی بادشاہت کی ذمہ داری ادا کر کے ۷۵۲ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا- اس کے بعد اس کا چچازاد بھائی سلطان فیروز شاہ تخت نشیں ہوا اور ۷۷۲ھ میں جب وہ ملک بنگال کی بغاوت و سرکشی کو مٹا کر واپسی میں قصبہ مظفر آباد متصل جون پور خیمہ زن ہوا تو بادشاہ کی نگاہ جانب مغرب لب دریائے گومتی ایک ہموار زمین پر پڑی، چاہا کہ یہاں شہر آباد کرے، اسی شب بادشاہ نے ملک جونا کو خواب میں دیکھا کہ وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یہ شہر میرے نام سے موسوم ہو- صبح کو سوار ہو کر موقع کے معائنے کے بعد ایک بلند مقام تجویز کر کے قلعہ بنانے اور اس کے اطراف میں شہر جون پور بسانے کا حکم دیا- سخن وران شاہی نے شہر جون پور کے لفظ سے تاریخ بنا نکالی- اس میں بادشاہ نے ہر فن کے اہل کمال کو نزدیک و دور سے بلا کر آباد کرایا تھا، اسی وجہ سے ایک زمانے میں یہ شہر سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت بن گیا جن کی وجہ سے اس شہر کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی- علمائے عظام اور صوفیۂ کرام کثرت سے یہاں پیدا ہوئے، جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں- سر دست اس وقت اسی قدیم تاریخی شہر کے ایک قدیم روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کی تاریخ اور اس کی دعوتی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے-

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید کا خاندانی پس منظر

آپ کے آبا و اجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولو العزم اولیا و علما گزرے ہیں- آپ کے اجداد میں بارہویں پشت میں شیخ بخشیٰ رومی کا نام آتا ہے، جنہوں نے اس خاندان میں

ولایت کا جھنڈا گاڑا، جن کے بعد اس خاندان میں برابر اہل علم وعرفان پیدا ہوتے رہے- حضرت شیخ بخشیؒ رومی کے اجداد عرب سے آ کر ملک روم میں کلد نامی مقام کو جائے سکونت بنایا- اسی وجہ سے آپ رومی کہے جاتے ہیں- روم میں تین پشت گزرنے کے بعد چوتھی پشت میں شیخ بخشیؒ رومی نے روم سے دہلی کا سفر کیا- اس وقت دہلی میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا سورج نصف النہار پر تھا- آپ سلطان المشائخ کے مرید ہوئے اور بارہ بنکی میں امیٹھی پرگنہ میں قیام پذیر ہوئے- سلطان المشائخ کے وصال کے بعد روحانی نعمتیں آپ نے شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی سے حاصل کیں- شیخ بخشیؒ رومی کے بعد دسویں پشت میں شیخ عبدالحمید نامی ایک بزرگ ہوئے جو حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید، خلیفہ(۱) اور بانی خانقاہ رشیدیہ، شیخ محمد رشید کے حقیقی دادا تھے- آپ کے دو لڑکے ہوئے؛ مصطفیٰ اور عثمان- ان دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہ پورنیہ بہار میں ہے- شیخ عثمان کی اولاد امیٹھی میں بسی ہوئی ہے اور شیخ مصطفیٰ نے شیخ محمد رشید جیسا متبحر عالم اور عارف باللہ فرزند پایا جس نے اپنے علم وعرفان سے ایک جہاں کو روشن کر دیا-
(سمات الاخیار، ص:۳۲ تا ۳۴ ملخصاً)

بانی سلسلۂ رشیدیہ کا نسبی شجرہ

شیخ محمد رشید بن شیخ مصطفیٰ جمال الحق بن شیخ عبدالحمید بن شیخ راجو بن شیخ سعدی بن شیخ عارف بن شیخ عبدالواسع بن شیخ منجھلے بن شیخ بڑے بن شیخ عبدالملک بن شیخ مٹھن بن شیخ نصیر الدین بن حضرت مخدوم شیخ بخشیؒ رومی بن سلطان تول بن شیخ حسام الدین بن شیخ سلطان نظام الدین بن سلطان شہاب الدین بن شیخ عبدالمنان بن شیخ عبدالسبوح بن حضرت شیخ سری سقطی بن حضرت شیخ مفلس سقطی بن شیخ ابان بن امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم-
(سمات الاخیار، ص:۶۱)

ولادت، تعلیم وتربیت اور اجازت وخلافت

بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید(۲) نے اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالم گیر چار بادشاہوں کا دور دیکھا- آپ کی پیدائش عہد اکبری میں ۱۰۰۰ھ میں ہوئی اور جب آپ چودہ سال کے ہوئے تو جہاں گیر تخت نشین ہوا اور جب آپ کی عمر ۲۷ سال کو پہنچی تو شاہ جہاں نے تخت شاہی کو سنبھالا اور جب ۶۸ سال آپ کی عمر کا گزر گیا تو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ ہوا- اس کی تخت نشینی کے پندرہویں یا سولہویں سال آپ نے ۸۳ سال کی عمر پا کر ۱۰۸۳ھ میں اس دار فانی کو خیر باد کہہ دیا-(سمات الاخیار، ص:۴۳ ملخصاً)

آپ ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ میں ضلع جون پور کے برونہ موضع میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما

پائی- جون پور کے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز جون پوری ثم دہلوی نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا- ان کے علاوہ ایک اور بزرگ شیخ عبدالجلیل لکھنوی جو آپ کے بچپن میں برونہ میں تشریف لاتے تھے، آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ لڑکا عالم، عامل اور عارف کامل ہوگا-(سمات الاخیار، ص:۶۲ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، متوسطات کی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی آپ نے اپنے حقیقی ماموں مولانا شمس الدین اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی- علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے دہلی کا سفر کیا- شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے علم حدیث حاصل کرنا چاہتے تھے مگر شیخ نے پیرانہ سالی کی وجہ سے فرمایا کہ تم میری موجودگی میں میرے لڑکے سے علم حدیث حاصل کرو، اس طرح شیخ محمد رشید نے شیخ نور الحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے علم حدیث اور اس کی سندیں حاصل کیں-(سمات الاخیار، ص:۶۳/۶۴ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کی عمر جب نو سال کی ہوئی تو آپ اپنے والد گرامی شیخ مصطفیٰ جمال الحق سے سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوئے اور کلاہ ارادت وخرقہ خلافت آپ کو آپ کے والد نے پہنا دیا- اگرچہ کم سنی کی وجہ سے والد کی حیات میں طریقۂ صوفیہ کی تحصیل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے لیکن خرقہ نے دل میں ایک جذبہ تو پیدا کر ہی دیا تھا- اس کے بعد ایک مدت تک تحصیل علوم میں مصروف رہے اور فراغت کے بعد درس وتدریس کی طرف مائل ہو گئے مگر تصوف کا ذوق ضرور تھا اور کسی مرشد کامل کی تلاش بھی تھی- اسی زمانے میں حضرت قدوۃ السالکین مخدوم شیخ طیب بنارسی جون پور میں تشریف لاتے تھے- آپ نے حضرت مخدوم سے ملاقات کی مگر اس مرتبہ دل مائل نہیں ہوا- کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب میں آپ منڈواڈیہ بنارس تشریف لے گئے اور حضرت مخدوم سے ملے- بمقتضائے کل امر مرھون باوقاتھا اس بار دل میں ایک محبت پیدا ہوگئی اور کچھ دنوں مخدوم کی خدمت میں رہ گئے اور اتنے دنوں میں سلوک کا ذوق وشوق ایسا پیدا ہوا کہ آپ نے درس وتدریس کا مشغلہ ترک کر کے خدمت میں رہنا چاہا- حضرت مخدوم نے اس بات کو پسند نہ کر کے فرمایا کہ تم وظیفۂ صبح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے- اس کے بعد آپ کو جون پور رخصت کر دیا-

حضرت شیخ محمد رشید تعمیل ارشاد میں برابر مصروف رہے- رفتہ رفتہ مخدوم کی محبت وعقیدت بڑھتی گئی- اس درمیان اکثر آپ منڈواڈیہ جایا کرتے تھے اور دس پانچ دن رہ کر چلے آیا کرتے تھے- ایک مرتبہ آپ رمضان شریف میں وہاں گئے اور مخدوم کے حکم سے عشرۂ آخر میں اعتکاف کیا- اس اعتکاف میں بہت سے عجائب وغرائب آپ پر منکشف ہوئے- عین عید کے دن ایک

مجمع عام میں مخدوم نے حضرات چشت کی طرف سے اپنا پیراہن پہنایا اور سلسلۂ چشتیہ کے اذکار اور تلقین کی اجازت دی اور جون پور رخصت فرمایا- آپ کی طبیعت، عالی اور ہمت بلند واقع ہوئی تھی-نعمتوں اور فیوض کی طلب میں آپ حریص تھے مگر ساتھ ہی دوسروں کو فیوض پہنچانے میں بھی سخی تھے-جس بزرگ کا نام سنتے اس کے پاس جاتے- اگر اس میں اپنے سے زائد کچھ پاتے تو حاصل کرتے اور کم پاتے تو عطا کرتے- باوجودیکہ حضرت مخدوم نے آپ کو مستغنی بنا دیا تھا، مگر آپ کی بلند ہمت نے اتنے ہی پر قانع رہنے نہ دیا- آپ کبھی کبھی منڈواڈیہ پہنچتے تھے اور دوسرے سلسلوں کے اشغال حاصل کرتے تھے حتیٰ کہ سلسلۂ قادریہ وسہروردیہ وغیرہ کی اجازت وخلافت بھی حضرت مخدوم ہی سے حاصل کیا- (سمات الاخیار، ص:۶۶/۶۷/۶۸/۶۹ ملخصاً)

اسی طرح میر سید شمس الدین کالپی بخاری جون پور آیا کرتے تھے- ایک روز شیخ محمد رشید جب درس وتدریس میں مشغول تھے، میر صاحب آپ کے قریب تشریف لائے اور متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو روحانی نعمت تمہارے حوالے کرنے کو بھیجا ہے، لو خدا نے مفت دیا ہے اور آپ نے سلسلۂ قادریہ کی خلافت عطا فرمائی- حضرت شیخ محمد رشید کو جب اشغال قلندریہ کے اخذ کا شوق ہوا تو آپ شیخ عبدالقدوس قلندر جون پوری کی خدمت میں جانے لگے اور ایک سال کامل حاضری دی- اس مدت میں نہ کبھی شیخ نے پوچھا کہ کیوں آتے ہو، نہ آپ نے ظاہر کیا کہ اس لیے آتا ہوں- سال بھر کے بعد ایک مرتبہ شیخ نے فرمایا کہ اچھا آدھی رات کے بعد آیا کرو- آپ بہت خوب کہہ کر واپس آئے اور یہ نہ کہا کہ آدھی رات سے پہلے ہی پل کا پھاٹک بند ہو جاتا ہے- اولاً تیرنے کا فن سیکھا اور شب کو تیر کر اس پار جاتے، اور علم قلندریہ سیکھتے- چند روز میں آپ نے فراغت واجازت حاصل کی- بعدۂ سلسلۂ مداریہ وفردوسیہ بھی آپ سے حاصل کیا- اس کے بعد شیخ عبدالقدوس قلندر کے پاس جب کوئی طالب آتا تو یہی فرماتے کہ اب میں ضعیف ہوا، میاں محمد رشید ذکر خوب کرتے ہیں، ان کے پاس جاؤ- (سمات الاخیار، ص:۷۱/۷۳ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کو جب یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ سلسلۂ چشتیہ وقادریہ حضرت شاہ حسام الحق مانک پوری کے خاندان سے بھی حاصل کرلیں تو آپ تین بزرگوں کے ساتھ مانک پور حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ کے پاس حاضر ہوئے- اندر سے کھانا آیا جس میں شیر برنج بھی تھا- شیخ محمد رشید نے تو ہر قسم کے کھانے کھائے اور ایک نے کچھ نہ کھایا- حضرت راجی نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ جس نے سب کچھ کھایا اس نے دین ودنیا سب کچھ پایا جس نے شیر برنج کھایا وہ فقط عقبیٰ لے گیا، جس نے کچھ نہیں کھایا کچھ نہیں پایا- مختصر یہ کہ حضرت راجی بکمال عنایت وشفقت پیش آئے اور چند روز رکھ کر اپنے سلسلے کی اجازت وخلافت عطا فرمائی- (سمات الاخیار ص ۷۵ تا ۷۷ ملخصاً)

خانقاہ رشیدیہ جون پور کا قیام

حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ سے روحانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد مانک پور سے جب واپس ہوئے تو جون پور میں حضرت راجی کے حکم کے مطابق ایک خانقاہ قائم کی اور پھر رشد وہدایت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا، جو آج تک جاری ہے- یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس خانقاہ کے قیام کی تاریخ کیا تھی، مگر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس وقت حضرت محمد رشید بانی خانقاہ کی عمر تقریباً ۴۰ رسال کی تھی، گویا ۱۰۴۰ھ کے آس پاس ہی اس خانقاہ کا قیام عمل میں آیا- اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ تقریباً چار سو سال قدیم خانقاہ ہے جہاں سے آج بھی علم وعرفان، رشد وہدایت اور خدمت خلق کا کام اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جاری وساری ہے اور موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف قیادت میں یہ خانقاہ اور اس سے متعلق چند دیگر خانقاہیں آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں- صاحب سمات الاخیار تحریر فرماتے ہیں: اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد کس سال پڑی مگر میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے عمر کی چالیسویں سال میں خانقاہ تعمیر ہوئی ہوگی اور یہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے- اگر یہ مان لیا جائے تو تادم تحریر اس کو بنے ہوئے تین سو برس ہوتے ہیں- بہر حال حضرت شیخ محمد رشید قدس سرہ نے حضرت راجی سید مجتبیٰ سجادہ نشین خانقاہ مخدوم شیخ حسام الحق مانک پور کے حکم سے اور تمام قبائل آپ کے موضع برونہ سے چلے آئے- آپ نے خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی، کنواں کھدوایا، مسجد پہلے مسطح تھی بعد کو گنبدی بنی اور خانقاہ پہلے پوش نہ تھی اس پر چھپر پڑا تھا، چنانچہ اس نقل سے ظاہر ہے کہ حضرت قطب الاقطاب خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور پانی برس رہا تھا چھپر ٹپکا تو کسی نے عرض کیا کہ چھپر خوب نہیں بنا جس سے پانی رکتا، آپ نے فرمایا کہ چھپر پانی کو روکنے کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ دھوپ کو روکنے کے لیے، کیوں کہ بارش کا زمانہ صرف چار مہینہ ہے، اس میں بھی اول آخر میں پانی کم برستا ہے- کچھ دن، رات پانی نہیں برستا اگر حساب کیا جائے تو بارش کا زمانہ کل پندرہ سولہ روز ہی ہوگا پس عاقل کا کام نہیں کہ اتنے دن کے لیے گھر بنائے، ہاں آفتاب ہمیشہ رہتا ہے، گھر اس کے لیے ہونا چاہیے-

(سمات الاخیار، ص:۴۳/۴۴)

بانی سلسلۂ رشیدیہ کی سیرت

شیخ محمد رشید آپ ایک متبحر عالم، عارف باللہ اور زبردست صاحب تصرف بزرگ تھے- آپ سے مدعائے دل ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی- اٹھتے بیٹھتے اللہ کا لفظ زبان پر جاری رکھتے- قناعت اور استغنا آپ کے مزاج میں ہی داخل تھا- سلاطین اور امرا کے دروازے پر جانا پسند نہ

تھا- جس کام کو شروع کرتے اس کو پورا کرتے- کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ نہ فرماتے- تہذیب و
ادب کا لحاظ رکھتے- ہر کام میں بزرگوں کی پیروی کرتے- مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم دیتے
اور اس کی پابندی کا حکم فرماتے- بیمار ہوتے تو بہت کم دوا لیتے اور فرماتے کہ دوا میں توکل اچھی چیز
ہے اور دوا کرنے کا حکم بھی ہے- سماع سے آپ کو انکار نہ تھا- آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے تھے- اگر
کوئی ناواقف غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل فرماتے-
مثلاً ایک مرتبہ حاجی جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ
میرے سامنے کوئی کسی کی بدی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل درپیش آتی ہے، کیوں
کہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے- لامحالہ
مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے- مثلاً اگر کسی کو رمضان میں سر بازار کھاتے ہوئے دیکھوں تو
گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبے سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا
ہے- اگر کسی کو ننگے بدن اس طور سے نماز پڑھتا ہوا دیکھوں کہ عورت غلیظہ چھپا ہوا ہو، تو سمجھوں گا
کہ مالکی المذہب ہے- اگر کسی کو دیکھوں کہ وضو کے بعد بلا تجدید وضو نماز پڑھ رہا ہے تو خیال
کروں گا کہ شافعی المذہب ہے- اگر کسی کو جانوں کہ اس نے شراب پی ہے، کہوں گا توبہ کر لی
ہوگی- ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حاکم شہر ظالم اور رافضی ہے مگر نماز عید اس نے جماعت سے پڑھی
تھی آپ نے فرمایا کہ جب تم نے نماز جماعت سے پڑھتے ہوئے دیکھا پھر کیوں اس کے حق میں
برا گمان کیا، انسان کو نیکی پر نظر کرنی چاہیے نہ کہ بدی پر- (سمات الاخیار، ص: ۸۲/۸۳ ملخصاً)

اقوال زریں

مورخین نے آپ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے اور آپ کے اقوال و عادات اور اطوار کو
تفصیل سے تحریر کیا ہے- یہاں سب کی گنجائش تو نہیں، ذیل میں آپ کے چند اقوال قلم بند کیے
جاتے ہیں:

(۱) سالک کو چاہیے کہ وہ صف نعال میں بیٹھے تا کہ اپنے کو پستی میں دیکھ کر بلندی کی
طرف ترقی کرے اور شیخ کو چاہیے کہ صدر میں بیٹھے تا کہ نعال نشینوں کی طرف متوجہ ہو اور ان کی
تعلیم اور ترقی کی کوشش کرے-

(۲) طلب کامل وہی ہے جو اپنی زبان سے کہنے کی نوبت نہ آئے اور شیخ خود اس کی عرضی
کی طرف توجہ کرے-

(۳) اہل دنیا چاہتے ہیں کہ فقرا کو ایک دو ملاقات میں پہچان لیں، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے
کہ فقیر کو غیر فقیر پہچان لے-

(۴) کل سر جاوز الاثنین شاع اس حدیث میں اثنین سے مراد دو آدمی نہیں ہیں
بلکہ دو لب ہیں- معنی یہ ہوئے کہ بھید جب دو لب سے گزر جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے-
(سمات الاخبار، ص: ۸۸ تا ۹۰ ملخصاً)

نکاح واولاد

۱۰۳۲ھ میں حضرت حاجی ارزانی فاروقی کی نیک بخت صاحب زادی سے آپ کا نکاح
ہوا- اس وقت آپ کی عمر ۳۲ رسال تھی، جن سے چار فرزند ہوئے؛ (۱) شیخ محمد حمید (۲) شیخ محمد
ارشد (۳) شیخ غلام معین الدین (۴) شیخ غلام قطب الدین- ان میں سے ہر ایک علوم ظاہر و باطن
سے بہرہ مند تھے- ان میں سے حضرت شیخ محمد ارشد ملقب بہ بدر الحق، جن کو ہر امر میں ترجیح حاصل
تھی، اکابر سلسلہ کے اتفاق سے والد کے بعد سجادہ نشیں ہوئے- (سمات الاخیار، ص: ۹۳ ملخصاً)

وصال پُر ملال

آپ کو ماہ شعبان کے آخر سے بخار آنا شروع ہوا اور روز بروز مرض بڑھتا گیا، طاقت گھٹتی
گئی- اس کے باوجود معمولات میں کوئی فرق نہ آیا- نماز با جماعت ادا کرتے- رمضان کی آٹھویں
تاریخ کو ظہر کے وقت آپ نے وضو کیا، تخت پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، عصر کے وقت اتنی
قوت نہ رہی کہ تخت پر جاتے، ناچار تیمم کر کے پلنگ پر نماز پڑھی، مغرب و عشا بھی اسی پلنگ پر ادا
کی، رات کو حالت متغیر ہوتی رہی، کرب زائد تھا مگر آدھی رات کے بعد آپ نے تیمم کا ظرف طلب
کیا، تیمم فرمایا، تہجد اور ذکر واذکار کیا، فجر کی نماز ادا کی پھر پلنگ پر لیٹ گئے، جب لوگوں نے دیکھا
تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے- یہ جمعہ کا دن، رمضان کی نویں تاریخ، ۱۰۸۳ھ کا سال تھا-
خاص باغ میں جو اس وقت درگاہ کا احاطہ ہے، مدفون ہوئے- شیخ محمد ماہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی
اور شیخ محمد ارشد و ملا ملتانی کے ساتھ قبر میں بھی اترے- پہلے بیر کے تختے دیے گئے پھر وصیت کے
مطابق ان پتھروں کا تختہ دیا گیا جن پر آپ کے طلبہ وتلامذہ کی جوتیاں اترتی تھیں-
(سمات الاخیار، ص: ۹۹/۱۰۰ ملخصاً)

آپ کے خلفا ایک نظر میں

سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ یوں تو آپ کے خلفا کثرت سے ہیں مگر
۳۴ر آدمی ایسے کامل اور جید خلیفہ تھے کہ اگر ہر ایک کا تفصیلی ذکر لکھوں تو اچھی خاصی ایک دوسری
کتاب ہو جائے- طوالت کے خیال سے محض ان کی فہرست دیتا ہوں:

(۱) حضرت شیخ عبد المجید قدس سرہٗ

(۲) حضرت ملا عبد الشکور منیری قدس سرہٗ

(۳) حضرت شیخ مبارک محی الدین قدس سرہٗ-
(۴) مولانا نورالدین مداری جون پوری قدس سرہٗ
(۵) حضرت شیخ آیت اللہ قدس سرہٗ
(۶) حضرت نصرت جمال ملتانی جامع گنج رشیدی قدس سرہٗ
(۷) حضرت شیخ محبّ اللہ قدس سرہٗ
(۸) حضرت شیخ عبداللہ مٹھن پوری قدس سرہٗ
(۹) شیخ ہارون رشید قدس سرہٗ ساکن پوردیوہ
(۱۰) میر محمد صادق قدس سرہٗ جون پوری
(۱۱) سید محی الدین قدس سرہٗ محمد آبادی
(۱۲) حاجی شیخ جلال الدین قدس سرہٗ جون پوری
(۱۳) ملا محمد نعیم قدس سرہٗ ساکن مدوسرائے
(۱۴) شیخ عبدالحی قدس سرہٗ ساکن فتح پور ہسوہ
(۱۵) شیخ مرتضیٰ پسر شیخ عبدالمجید قدس سرھما
(۱۶) میر سید نور قدس سرہٗ پٹنوی
(۱۷) شیخ عبداللہ قدس سرہٗ بنگالی
(۱۸) شیخ عبدالواحد مشتاق قدس سرہٗ فتح پوری
(۱۹) شیخ حبیب اللہ قدس سرہٗ بہاری
(۲۰) میر سید سیف الدین قدس سرہٗ مدن پوری
(۲۱) شیخ ضیاء الدین قدس سرہٗ خویشگی
(۲۲) میر سید نور قدس سرہٗ ساکن شہر پورنیہ
(۲۳) میر محمد غوث قدس سرہٗ ساکن موضع مندول
(۲۴) قاضی محمد مودود قدس سرہٗ جون پوری پسر قاضی محمد حسین قاضی شہر
(۲۵) حضرت راجی صدرالدین قدس سرہٗ خویش
(۲۶) حضرت راجی خضر قدس سرہٗ مانک پوری
(۲۷) شیخ غلام محی الدین متوکل قدس سرہٗ جون پوری
(۲۸) شیخ محمد نصیب منیری قدس سرہٗ
(۲۹) میر سید محمد اسماعیل قدس سرہٗ سیوانی

(۳۰) حضرت سید محمد ارشد رشید قدس سرہٗ
یہ سب بزرگ اہل کمال، عارف کامل اور ذاکر و شاغل تھے-
(سمات الاخیار، ص:۱۰۱ تا ۱۰۴)

ان کے علاوہ تین اور اولوالعزم خلفا یہ ہیں:
(۳۱) حضرت میر سید قیام الدین قدس سرہ گورکھ پوری
(۳۲) حضرت میر سید محمد جعفر قدس سرہ پٹنوی
(۳۳) حضرت شیخ یٰسین قدس سرہ جھونسوی
ان میں سے بعض کا اجمالی تذکرہ آئندہ صفحات میں قلم بند کیا جائے گا-

بانی سلسلہ رشیدیہ کی دعوتی خدمات

سلسلہ رشیدیہ کو جاری ہوئے تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا، مگر آج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے- مخلوق خدا کی خدمت اور رشد و ہدایت کا کام بحسن و خوبی انجام پا رہا ہے- اس سلسلے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادگی میراثی نہیں ہے- پورے سلسلے میں جو اولوالعزم علما و مشائخ اور صالحین ہوں گے وہ اتفاق رائے سے سلسلے کے کسی فرد کو جو اجازت اور خلافت یافتہ ہوگا اس کو سجادگی کے لیے منتخب کرتے ہیں- یہ طریقہ منہاج نبوت و خلفاے راشدین کے طریقے کے مطابق ہے- دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جو اس سلسلہ کا سجادہ ہوگا اس کے ذمے اس سلسلے کی فقط ایک خانقاہ کی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس کی چند خانقاہوں کی مکمل ذمہ داری ادا کرنا اس کا دینی اور روحانی فریضہ قرار پاتا ہے- بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی سجادہ خانقاہی فرائض اور دینی اور روحانی ذمہ داریوں اور خدمت خلق سے لاتعلقی کا ثبوت دیتا ہے، تو اس سلسلے کے اصحاب حل و عقد نے جس طرح ان کو منتخب کیا تھا اسی طرح ان کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس عہدے کے لیے منتخب کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں- آج جب کہ ہم زمانۂ نبوت سے چودہ سو سال دور ہو چکے ہیں، یہ خانقاہ اپنی مثال آپ ہے- دوسری تمام خانقاہوں کو اس سے سبق لینا چاہیے-

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ و رسول ﷺ کی رضا کے مطابق دعوت و تبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام قائم کیا تھا وہ آج بھی قائم ہے اور آپ کے خلفا اور سلسلے کے افراد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں- بانی سلسلہ نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ آج بھی جاری ہے اور اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں آج بھی مصروف ہیں- ان خانقاہوں کے

ذریعے مخلوق خدا کی علمی اور روحانی سیرابی کا سامان آج بھی فراہم کیا جا رہا ہے- بانی سلسلہ کے خلفا اور پھر ان کے خلفا کا جو ایک لمبا سلسلہ چلا اور چل رہا ہے، ان تمام کا سہرا بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ کے سر جاتا ہے-

بانی سلسلہ رشیدیہ کی علمی خدمات

آپ کی ذات علمی دنیا میں نہ کل محتاج تعارف تھی اور نہ آج ہے- آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں اور محققین پر سبقت لے گئے- آپ کے ہم عصر علما و مشائخ نے جہاں آپ کی روحانی حیثیت کو تسلیم کیا وہیں آپ کی علمی قدر و قیمت کو بھی سراہا ہے-(۳) آپ کے اساتذہ نے بھی آپ پر فخر کیا ہے- صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے- ملا موہن بہاری آپ کے مداحوں میں شامل ہیں- آپ اپنے اساتذہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے گھر کے در و دیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے- آپ ہمیشہ طالبان علوم نبویہ کو درس دیا کرتے تھے اور ان کی قدر کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ نے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ جس پتھر پہ طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے-

(سمات الاخبار، ص:۶۵ ملخصاً)

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلما شیخ محمد افضل کی خدمت میں تشریف لے گئے، وہ علم مناظرہ کی کتاب شریفیہ کسی کو پڑھا رہے تھے، آپ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھے تو اچھی ہوگی- دوسرے ہفتے میں جب آپ ملنے گئے تو شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر لیے گئے- استاذ العلما نے دیکھ کر بہت پسند فرمایا- یہ شرح ایسی جامع و مانع اور سلیس واقع ہوئی ہے کہ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا اور کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی-(سمات الاخبار، ص:۶۵)

جس طرح آپ کی تصانیف کی کثرت ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آپ کے جید تلامذہ کی تعداد ہے- آپ کے تلامذہ میں سے اکثر نے آپ ہی سے طریقت میں بھی اجازت و خلافت حاصل کی یا کم از کم آپ کے مرید ہوئے-

تصانیف

صاحب سمات الاخیار لکھتے ہیں کہ آپ کی تصانیف بہت ہیں، چند کتابیں جو خانقاہ میں موجود ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رشیدیہ: یہ شریفیہ کی شرح ہے، فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے اور درس میں داخل ہے-

(۲) تذکرۃ النحو: نحو کے مسائل میں چند ورقوں کا رسالہ ہے جس کو آپ نے اپنے

صاحب زادے حضرت شیخ محمد ارشد کے کے لیے لکھا تھا- اس کی ابتدا میں **اعلم ارشدک اللہ تعالیٰ** لکھا ہے- اب خلاصۃ النحو کے سے نام مشہور ہے اور نحو میر کے آخر میں طبع ہے-

(۳) زاد السالکین: یہ رسالہ تصوف سے متعلق ہے، جس کو آپ نے اپنے پہلے مرید حضرت شیخ عبد المجید کے لیے تحریر فرمایا ہے-

(۴) مقصود الطالبین: یہ کتاب بھی تصوف میں ہے- اس میں معارف اور حقائق کی باتیں مرقوم ہیں- حضرت نصرت جمال ملتانی کے لیے لکھی گئی تھی-

(۵) ترجمہ معینیہ: یہ رسالہ تذکرۃ النحو کی شرح ہے- حضرت شیخ غلام معین الدین کے پڑھنے کے لیے تحریر فرمایا تھا-

(۶) بدایۃ النحو: یہ بھی نحو کا رسالہ ہے، جس کو اپنے بیٹے شیخ محمد حمید کے لیے لکھا تھا-

(۷) مکتوبات: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اکثر خلفا کے نام بطور جواب کے لکھے تھے-

(۸) دیوان شمسی: آپ کے فارسی و ہندی اشعار کا مجموعہ ہے- آپ شمسی کا تخلص فرماتے تھے- صاحب خزینۃ الاصفیا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شیخ اکبر کی تصنیف اسرار المخلوقات پر ایک بسیط شرح لکھی ہے- رشیدیہ اور تذکرۃ النحو کے سوا سب رسالے قلمی ہیں، اب تک چھپے نہیں-

سلسلۂ رشیدیہ کے سجادگان ایک نظر میں

(۱) شیخ محمد ارشد جون پوری
(۲) شیخ قمر الحق غلام رشید
(۳) حضرت حیدر بخش امام الدین
(۴) حضرت شاہ امیر الدین
(۵) حضرت شاہ غلام معین الدین
(۶) حضرت شاہ سراج الدین
(۷) حضرت محمد عبد العلیم آسی غازی پوری
(۸) حضرت شاہ شاہد علی سبز پوش
(۹) حضرت شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش
(۱۰) حضرت شاہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی

سلسلۂ رشیدیہ کی سجادگی کے تحت آباد خانقاہیں

(۱) خانقاہ رشیدیہ، جون پور
(۲) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڈیہہ، بنارس

(۳) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار

(۴) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان، بہار

(۵) خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور

سلسلۂ رشیدیہ کے چند ممتاز علماو مشائخ

شیخ محمد رشید قدس سرہٗ جہاں علمی اعتبار سے مرجع خلائق تھے وہیں دوسری طرف طریقت، حقیقت اور معرفت کے لحاظ سے اپنے دور کے شیخ المشائخ تھے- بے شمار لوگوں نے آپ سے اپنی علمی اور روحانی تشنگی دور کی- تلامذہ اور خلفا کی ایک بڑی جماعت آپ نے تیار کی- ۳۴؍خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے- ان کے علاوہ بھی آپ کے خلفا تھے جن کا ذکر نہیں ملتا- ذیل میں اس سلسلے کے بعض اولوالعزم خلفا اور مشائخ کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے-

(۱) میر سید قیام الدین گورکھ پوری قدس سرہٗ (م: ۸صفر ۱۱۲۸ھ) آپ کا اصلی وطن سگڑی اعظم گڑھ تھا- بعد میں آپ نے گورکھ پور کو شرف بخشا- شیخ محمد رشید قدس سرہٗ سے آپ کو ارادت و خلافت دونوں حاصل تھی- آپ بڑے زاہد، صائم الدہر، قائم اللیل درویش تھے- آپ کے بارے میں آپ کے مرشد گرامی نے فرمایا: ''تم اور سید محمد جعفر کل اس فقیر کی نجات کے سبب ہوگے-'' آپ کے خاندان میں سجادگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے- شاہ شاہد علی سبز پوش قدس سرہٗ کے آپ مورث اعلیٰ ہیں-

(۲) حضرت شیخ محمد ارشد قدس سرہٗ (پ: ۱۰۴۱ھ) آپ کا نام محمد ارشد، کنیت ابوالکشف اور لقب بدرالحق تھا- آپ قطب الاقطاب شیخ محمد رشید بانی سلسلۂ رشیدیہ کے منجھلے صاحب زادے اور سلسلۂ رشیدیہ کے پہلے سجادہ تھے- آپ نے علوم شرعیہ متداولہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الٰہداد جون پوری، ملا نورالدین مداری جون پوری اور اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولید اور استاذ العلما شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی جب کہ کتب تصوف کا علم اپنے والد گرامی سے حاصل کیا- ۲۱ سال کی عمر میں ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہوچکے، پھر طالبان علوم نبویہ کی خدمت میں مصروف ہوگئے- ۲۲؍سال کی عمر میں اپنے والد کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوئے اور انہی سے اجازت وخلافت بھی حاصل کی- آپ اپنے والد ہی کی طرح جواں مرد اور باہمت تھے- خاندانی نعمتوں کے حصول کے بعد مزید کوشش جاری رہی- شیخ عبداللطیف مٹھن پوری جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کی اولاد سے تھے اور سلسلۂ جنیدیہ اور سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ میں صاحب اجازت وخلافت تھے، آپ شیخ محمد ارشد کے خسر ہوئے- شادی کے بعد ان دونوں سلسلوں کی اجازت وخلافت بھی آپ نے حاصل کی- حضرت قطب الاقطاب کے آپ

قابل فخر فرزند اور جانشین تھے- ایک دفعہ پٹنہ میں کسی بزرگ نے حضرت قطب الاقطاب سے پوچھا کہ دوست جب دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ ہدیہ لے کر جاتا ہے- آپ جب خدا کے سامنے جائیں گے اگر خدا نے پوچھا کہ میرے واسطے کیا ہدیہ لائے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ اس پر آپ آب دیدہ ہوئے اور فرمایا ''دست محمد ارشد گرفتہ پیش خواہم کرد کہ ہمیں راہدیہ آوردہ ام-''

(سمات الاخیار، ص: ۱۱۸/۱۱۹)

شیخ محمد ارشد بدرالحق ایک بار دہلی کے سفر پر تھے، لکھنؤ کے قریب سے گزر رہے تھے تو حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی نے حاضرین سے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور حضرت بدرالحق نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات میں خدا کے دوست کی بو آرہی ہے- (سمات الاخیار، ص: ۱۲۴؍بحوالہ بحر زخار)

آپ کی طبیعت میں موزونیت تھی- شاعری کا ذوق رکھتے تھے- آپ کے چند کلام بھی ملتے ہیں- ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے- شاعری میں اپنا تخلص والہ کرتے تھے- یہ اشعار آپ کی قادرالکلامی کی شہادت ہیں:

رخ او بے نقاب باید دید
روز را آفتاب باید دید
لب لعل تو با پیالہ مدام
مست را با شراب باید دید
والہا غیر او مبیں ہر گز
آب را با حباب باید دید

(سمات الاخیار، ص: ۱۲۸/۱۲۹)

اولاد

شیخ محمد ارشد کی دو شادیاں ہوئیں- پہلی شادی ۱۰۶۲ھ میں شیخ مبارک محی الدین ابن نور اللہ انصاری ہروی کی صاحب زادی سے ہوئی- ان سے دو لڑکے ہوئے؛ ایک شیخ نوراللہ اور دوسرے شیخ ثناء اللہ- دوسری شادی شیخ عبداللطیف مٹھن پوری کی صاحب زادی سے ہوئی- ان سے بھی دو لڑکے ہوئے- ایک شیخ محبّ اللہ اور دوسرے شیخ محمد- (سمات الاخیار، ص: ۱۳۰؍ملخصاً)

خلفاو مریدین

سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ۱۷۲۹؍افراد نے مختلف سلسلوں میں آپ سے بیعت کی اور تیس نفوس قدسیہ نے آپ سے روحانی سلسلوں کی اجازت وخلافت حاصل کی-

ذیل میں بعض ممتاز خلفا کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے-

(۱) میر سید محمد باقر پٹنوی (پ: ۱۷ر ربیع الآخر ۱۰۷۲ھ، م: ۷ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۸ھ)

آپ میر سید جعفر پٹنوی کے بڑے صاحب زادے ہیں- اپنے والد ہی سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے- بعد میں حضرت محمد ارشد کی بارگاہ میں سلوک کی تکمیل کی اور تمام عمر درس وتدریس، ہدایت خلق اور ارشاد فقرا میں مشغول رہے- آپ اپنے شیخ اجازت وخلافت سے بے حد محبت کرتے تھے- ان کے انتقال کے چند ہی سال بعد آپ کا بھی انتقال ہو گیا اور پٹنہ محلّہ شریعت آباد میں اپنے والد کے روضے میں مدفون ہوئے-

(سمات الاخیار، ص: ۱۳۸/۱۳۹ ملخصا)

(۲) حضرت میر سید محمد اسلم پٹنوی (م: ۲۱ر شوال ۱۱۳۸ھ)

آپ کا لقب عبدالقدوس تھا- میر سید محمد جعفر کے منجھلے بیٹے تھے- علوم متداولہ کے علاوہ اجازت وخلافت بھی اپنے والد ہی سے حاصل کی اور پھر شیخ محمد ارشد بدرالحق سے مزید نعمتیں میسر آئیں- آپ نے اپنی ساری عمر مخلوق خدا کی رشد وہدایت اور طالبان علوم نبویہ کے درس وتدریس میں صرف کر دی- رسالہ **عمدة النجاة فی حل الزلات** آپ نے تحریر فرمایا-

(سمات الاخیار، ص: ۱۳۹ تا ۱۴۱ ملخصاً)

(۳) حضرت میر سید سعد اللہ (م: ۱۲ر رجب المرجب ۱۱۱۷ھ)

آپ بہار ضلع سارنگ کے رہنے والے اور بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے مرید اور خادم خاص تھے- شیخ محمد ارشد سے اجازت وخلافت حاصل تھی- آپ کا مزار پسونڈ میں ہے-

(سمات الاخیار، ص: ۱۴۱ تا ۱۴۳ ملخصاً)

مختصر یہ ہے کہ شیخ محمد ارشد بدرالحق نے اپنے والد سے جن نعمتوں کو پایا تھا ان میں اضافہ بھی کیا اور دعوت وارشاد کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا اس کو مزید وسیع پیمانے پر جاری رکھتے ہوئے خدمت خلق اور تزکیۂ نفوس کی غرض سے مریدین اور خلفا کی ایک بڑی جماعت تیار کی-

(۴) حضرت سید محمد جعفر پٹنوی قدس سرہٗ (م: ۳۰ر رمضان ۱۱۰۵ھ)

آپ کا نام محمد جعفر اور لقب بحر الحقائق نجم الحق تھا- سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے- آپ جب آٹھ برس کے تھے تو آپ کے والد سید ابوالحسن نے وفات پائی- دادا نے پرورش کی اور سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے خرقۂ خلافت دے کر اپنا جانشین بنایا- جب سن شعور کو پہنچے تو تحصیل علوم کے لیے جون پور آئے اور حضرت قطب الاقطاب (شیخ محمد رشید) کے مدرسہ میں مقیم ہوئے- تکملۂ علوم کے بعد چوں کہ پہلی بیعت صغرسنی کی وجہ سے ٹھیک یاد

نہ تھی، حضرت سے سلسلۂ قادریہ میں مرید بھی ہو گئے اور چند دن خدمت میں رہ کر مرتبۂ کمالات کو پہنچے- اس کے علاوہ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، فردوسیہ ومداریہ کی بھی خلافت واجازت حاصل کی اور بحکم شیخ پٹنہ میں قیام کیا- ایک مدت تک مجرد رہے اور ایک مسجد میں بسر کی- جب آپ کی عمر زیادہ گزر گئی تو آپ کی والدہ کی تحریک سے حضرت قطب الاقطاب نے آپ کو سنت نبوی کے اتباع پر مجبور کیا اور خود ہی میر سید نورالدین نبیرۂ حضرت سید فضل اللہ عرف سید گوشائیں دامادِ حضرت قطب بینادل قلندر کی صاحب زادی سے نسبت مقرر کر کے شادی کرا دی- پھر وہ مادرزاد ولی پیدا ہوئے- آپ عالم، عامل اور عارف کامل تھے- طریقۂ نبوی ہر امر میں ملحوظ رہتا-

کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کے پیر سماع سنتے ہیں، آپ کیوں نہیں سنتے؟ جواب دیا کہ پیر نے رخصت کے وقت فرمایا تھا کہ حضرت امام اعظم کی فقہ پر عمل کرنا، میں پیر کی اطاعت کو سعادت دارین جانتا ہوں- آپ کا قول مشہور ہے: ''میں نے رشید (خدا) کو رشید کے سبب سے پہچانا- اگر رشید نہ ہوتے تو میں خدا کو نہ پہچانتا-'' آپ کا مرتبہ اسی سے روشن ہے کہ ایک بار حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ ''قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر پٹنوی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے-''

آپ نے کل تبرکات وخرقۂ خلافت اپنے بیٹوں میر محمد باقر ومیر محمد اسلم میں تقسیم کر دیا- صرف ایک رومال رکھ لیا اور وصیت کی کہ کفناتے وقت اس رومال کو میرے سر پر باندھ دینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا- آپ نے رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ کی تیسری تاریخ کو پنج شنبہ کے روز وصال فرمایا اور شریعت آباد بیرون شہر پٹنہ میں مدفون ہوئے- آپ کے گزراوقات کے لیے ایک مرید نے ایک موضع دینا چاہا تھا، مگر قبول نہ فرمایا- اس کے اصرار پر آپ نے چند بیگہہ زمین لے لی اور اس کا نام شریعت آباد رکھا- (سمات الاخیار، ص: ۱۰۷ تا ۱۰۹)

(۴) حضرت شیخ یٰسین جھونسوی قدس سرہٗ (تاریخ وصال معلوم نہیں، مزار جھونسی میں ہے-)

آپ شیخ احمد ابن شیخ محمد ابن شیخ عبدالرحیم ابن بندگی شیخ اوجھڑ صدیقی جون پوری کے بیٹے تھے- چوں کہ آپ سعید ازلی تھے اس وجہ سے آپ کو بچپن ہی سے حضرت مخدوم طیب بنارسی کی صحبت نصیب ہوئی- حضرت مخدوم نے آپ کی پرورش اور تعلیم مربیانہ فرمائی- گیارہویں برس سلسلۂ چشتیہ میں مرید کر کے اپنا خلیفہ بنایا- شہاب الدین دولت آبادی ثم جون پوری کا رسالہ نحو ارشاد پڑھایا، پھر جون پور بھیجا- استاذ العلما شیخ افضل الہ آبادی اور حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید سے کتابیں پڑھیں- سات برس تک جون پور میں رہے- درمیان میں وقتاً فوقتاً حضرت مخدوم کی زیارت کو جا کر فیض یاب بھی ہوا آتے تھے- بیسویں برس جمیع سلاسل کے خرقے اور

خلافتیں حضرت مخدوم نے عطا کیے- حضرت مخدوم کے بعد جو کسر رہ گئی تھی حضرت دیوان جی شیخ محمد رشید نے پوری کر دی اور خلافت واجازت بخشی- ان باتوں کے باوجود حضرت دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدم بوس ہونا چاہتے تھے تو آپ بھی اپنا ہاتھ ان کے پاؤں تک ضرور پہنچاتے تھے- آپ پر کشف کی حالت بہت طاری رہا کرتی تھی- آپ نے تصوف کے بہت سے مشکل مسائل بذریعۂ تحریر پوچھے ہیں اور حضرت دیوان جی نے ان کے جواب میں مکتوب لکھے ہیں- اپنے پیرانِ سلاسل کے حالات میں مناقب العارفین آپ کی عظیم تصنیف ہے-

آپ کا سال وصال معلوم نہیں آپ کا مزار قصبہ جھونسی، الٰہ آباد میں شیخ نصیرالدین اسدالعلما کے روضے کے اندر ہے- (سمات الاخیار، ص:۱۱۱/۱۱۲)

(۵) **شیخ غلام رشید** (پ: ۸ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ، م: ۵ صفر ۱۱۶۷ھ)

آپ کا نام غلام رشید، کنیت ابوالفیاض اور لقب قمر الحق ہے- آپ شیخ محب اللہ کے لڑکے اور شیخ محمد ارشد کے پوتے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے دوسرے سجادہ نشیں تھے- آپ چودہ دن کے تھے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا اور ایک سال چار ماہ کے ہوئے کہ والد کا سایہ بھی اٹھ گیا- آپ کے دادا شیخ محمد ارشد نے آپ کی پرورش کی اور کامل و مکمل بنا دیا- علوم ظاہرہ متداولہ آپ نے مختلف علمائے وقت سے حاصل کیا اور اس کی بھی تکمیل اپنے دادا شیخ محمد ارشد ہی سے کی اور دعوت و تبلیغ، درس و تدریس میں اپنی عمر عزیز صرف کر دی- شیخ حیدر بخش آپ کے نواسے تھے، جن کی تعلیم کے لیے آپ نے رسالہ ''درایۃ النحو'' کی نہایت بسیط شرح لکھی تھی- آپ متبحر عالم اور کامل درویش ہونے کے ساتھ زود گو شاعر بھی تھے- آپ کا فارسی کلام بھی ملتا ہے-

پٹنہ کے سفر میں جب آپ خانقاہ جعفریہ میں مقیم تھے تو آپ سے ملاقات کی غرض سے خانقاہ مجیبیہ کے بانی حضرت مجیب اللہ پھلواروی تشریف لائے اور اپنی خانقاہ میں حاضری کی دعوت دی- آپ تشریف لے گئے- پٹنہ سے پورنیہ گئے اور پھر طبیعت خراب ہوئی- اسی سفر میں آپ کا انتقال بھی ہوگیا- آپ کی وصیت کے مطابق خانقاہ رشیدیہ جون پور میں دفن کیا گیا- کثرت سے آپ کی کرامتوں کا ذکر ملتا ہے- (سمات الاخیار، ص:۱۴۴ تا ۱۶۲/ملخصاً)

خلق خدا نے کثرت سے آپ کے دست مبارک پر توبہ کیا- مخلوق خدا کی اصلاح، تزکیۂ قلوب اور تصفیہ نفوس کے لیے آپ نے چالیس سے زائد نفوس قدسیہ کو اپنی روحانی نعمتوں کی اجازت وخلافت سے سرفراز فرما کر رشد و ہدایت کا بہتر انتظام فرما دیا-

(سمات الاخیار، ص:۱۶۳ ملخصاً)

(۶) **شاہ حیدر بخش** (وصال: ۲۵ رشوال ۱۲۲۴ھ)

آپ کا نام حیدر بخش اور لقب نور الحق اور قطب الدین ہے- آپ محبوب الحق شاہ فصیح الدین کے لڑکے اور حضرت قمر الحق غلام رشید کے نواسے و جانشیں اور سلسلۂ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ تھے- آپ کا نسبی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق سے جاملتا ہے- آپ پانچ بھائی تھے- ۱۱۶۳ھ میں آپ اپنے نانا کے دست مبارک پر سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے- آپ کی تعلیم وتلقین اور تکمیل نانا کے ہاتھوں ہو چکی تھی- نانا کے بعد بھی آپ نے اپنے والد سے مزید فیض حاصل کیا- آپ کی دو شادیاں ہوئیں- پہلی سے نجیب الدین اور دوسری سے شاہ امیر الدین پیدا ہوئے-

آپ کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا- اردو زبان میں آپ کے چند اشعار ملتے ہیں-

آپ سیوان بہار کا اکثر سفر کرتے اور مہینوں قیام فرماتے- بہمن برہ نامی گاؤں میں آپ نے خانقاہ اور مسجد بنوائی تھی- ساٹھ سال سے زائد عمر پاکر ۲۲۵ رشوال ۱۲۲۴ھ کو سیوان ہی میں آپ وصال فرما گئے اور یہیں مدفون بھی ہوئے- اس مقام کو تکیۂ حیدری کہا جاتا ہے-

(سمات الاخیار، ص:۱۷۸ تا ۱۸۲ ملخصاً)

آپ کے بعد آپ کے صاحب زادے شاہ امیر الدین سجادہ ہوئے اور سلسلۂ رشیدیہ کے دعوتی و علمی اور رفاہی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دیا- شاہ امیر الدین کے علاوہ آپ کے ۱۲ر خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے- ان ۱۲ر کے علاوہ بھی خلفا کے بارے میں بتایا جاتا ہے-

(۷) **شیخ قیام الحق شاہ امیر الدین** (وصال: ۹ رمحرم الحرام ۱۲۲۵ھ)

آپ کا نام امیر الدین اور لقب قیام الحق ہے- آپ شاہ حیدر بخش کے چھوٹے لڑکے و جانشین اور سلسلۂ رشیدیہ کے چوتھے سجادہ نشیں تھے- آپ اپنے والد سے سلسلۂ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے اور تمام سلاسل کی اجازت وخلافت اور خاندانی فیوض وبرکات سے شرف یاب ہوئے-

آپ میں متانت، وقار، توکل اور قناعت بے حد تھی- دنیا کی باتوں سے زبان کو بچانے کے لیے بہت کم بولتے تھے اور بلاضرورت کبھی زبان نہیں کھولتے تھے- اگر کبھی تکلیف تکلم گوارا فرماتے تو پیران سلاسل کا ذکر زبان پر لاتے- اپنے خاندانی بزرگوں کی طرح برابر درس و تدریس اور بندگان خدا کی ہدایت و تعلیم میں اپنے اوقات صرف کیے-

آپ کی تین شادیاں ہوئیں- پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی- دوسری سے شاہ ولی بخش اور دو بیٹیاں ہوئیں- تیسری بیوی سے شاہ معین الدین قطب الہند اور ایک صاحب زادی پیدا ہوئی-

(سمات الاخیار، ص:۱۸۷/۱۸۸/ملخصاً)

کثرت سے آپ کی کرامات کا تذکرہ ملتا ہے- آپ کے مریدین و متوسلین دور دور تک

پھیلے ہوئے تھے- سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابوالعلائی یوسف پوری جو اپنے وقت کے ایک جلیل القدر بزرگ تھے، جنہوں نے ہند سے عرب تک کی سیاحت اور تمام متبرک مقامات کی زیارت کی تھی، عرب میں ایک بزرگ سے ملے جو نہایت مشغولی اور استغراقی حالت میں تھے- آپ کو حیرت ہوئی کہ ایسے بزرگ اس زمانے میں بھی موجود ہیں- پوچھا آپ کس کے مرید ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے باپ کے مرید ہیں- پھر پوچھا کہ ان کے شیخ کون ہیں؟ جواب دیا کہ حضرت شاہ امیرالدین جون پوری جو ملک ہندوستان کے رہنے والے تھے- (سمات الاخیار، ص:۱۹۰) ۹محرم الحرام ۱۲۲۵ھ کو آپ کا وصال ہوا اور رشید آباد میں مدفون ہوئے-

آپ کے مریدین اور خلفا کی تعداد بہت زیادہ تھی- آپ کے بعض خلفا کا تذکرہ بھی ملتا ہے- ان میں سے چند کے اسما یہ ہیں: (۱) شاہ غلام معین الدین، آپ حضرت کے صاحب زادے تھے اور جانشین بھی ہوئے- (۲) شیخ قنبر حسین سکندر پوری، آپ شاہ معین الدین کے ہم عمر اور شاہ قیام الحق کے مرید و خلیفہ ہونے کے ساتھ سکندر پور کے رئیس اور شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری کے والد تھے- ۱۰/محرم الحرام ۱۲۸۰ھ کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے- شاہ رشید الحق میر سید حسین علی جعفری (پ:۱۲۲۶ھ، م:۱۶/رجب ۱۳۰۳ھ) آپ مولوی سید جعفر علی کے بیٹے اور اپنے حقیقی چچا فیاض الحق سید سجاد علی کے مرید و خلیفہ اور سجادہ نشین تھے- شاہ قیام الحق سے بھی مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ قطب الہند شاہ غلام معین الدین سے بھی اجازت و خلافت رکھتے تھے- سمات الاخیار کے مصنف نے ان تین کے علاوہ آپ کے چار اور خلفا کا بھی ذکر کیا ہے-

(۸) شاہ غلام معین الدین امیری (وصال:۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ)

آپ کا نام غلام معین الدین، کنیت ابوالخیر اور لقب قطب الہند تھا- آپ حضرت قیام الحق کے چھوٹے لڑکے، مرید و خلیفہ، جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے پانچویں سجادہ تھے- اپنے والد سے مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت کے علاوہ شیخ بدر الدین بدر عالم زاہدی سے سلسلۂ زاہدیہ کی بطریق اویسیہ اجازت و خلافت رکھتے تھے-

آپ نے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے مکہ شریف کا سفر کیا تو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی چشتی صابری نے آپ سے ملاقات کی اور جو کچھ مطلوب و مقدر تھا لے گئے- دوسرے دن جب دوبارہ تشریف لائے تو اپنا ایک رسالہ مع اجازت نامہ کے دے گئے-

صاحب سمات الاخیار تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابوالعلائی یوسف پوری جو بڑے سیاح اور بڑے مشائخ کی صحبت اٹھائے ہوئے درویش تھے، ان کا بیان ہے کہ ہند سے

عرب تک میں نے اس جامعیت کا شیخ کہیں نہیں پایا- کسی نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ شاہ معین الدین اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی میں کیا نسبت ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مولانا کی مثال اس شخص کی ہے جس نے بذات خاص ایک دولت پیدا کی ہو اور شاہ صاحب کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے خود بنفس نفیس بھی دولت پیدا کی ہو اور اس کو اپنے باپ دادا کئی پشتوں کی دولت بھی ہاتھ لگی ہو- ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ کا دن قیامت ڈھانے والا تھا- اس شام کو مغرب کی فرض اور سنت نماز کے درمیان طالب مطلوب سے، عاشق معشوق سے جا ملا-

(سمات الاخیار، ص:۲۰۰/۲۰۳/۲۰۶/۲۳۳ ملخصاً)

تعمیری اور دعوتی خدمات: آپ کو اپنے مشائخ سے جو روحانی نعمتیں میسر آئی تھیں اس کی حفاظت کے ساتھ توسیع تو کی ہی ساتھ ہی خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت قائم دیگر خانقاہوں میں وسیع پیمانے پر تعمیری و توسیعی کام بھی کرایا- خانقاہ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ ہی باضابطہ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ شاعر، مدرس اور مصنف بھی تھے- شاہ معین الدین قطب الہند بھی باضابطہ عالم تھے، شعری ذوق بھی رکھتے تھے، آپ کے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں، مگر آپ نے زیادہ توجہ افراد سازی اور خانقاہ کی توسیع و تعمیر پر صرف کی- مریدین و متوسلین کی تربیت و تزکیہ کے ساتھ آپ نے کچھ ایسے افراد تیار کیے جو بعد کی نسلوں کے لیے عظیم مربی و مرشد ثابت ہوئے- حضرت آسی غازی پوری اور شاہد حسین راج گیری، محمد سجاد جعفری بہاری، واجد علی شاہ سبز پوش گورکھ پوری جیسے اشخاص آپ کے خلفا میں پیدا ہوئے- سمات الاخیار کے مصنف نے آپ کے دس خلفا کا مختصراً تذکرہ کیا ہے-

(۹) شاہ سراج الدین (پ:۱۲۹۱ھ، م:۷/ذیقعدہ ۱۳۱۴ھ)

آپ کا نام سراج الدین عرف محمد حسین ہے آپ قاضی باسط علی کے، جو قیام الحق کے نواسے تھے، حقیقی پوتے اور حکیم مولوی قاضی محمد ناصر کے بیٹے اور قصبہ نظام آباد، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے- شاہ سراج الدین قطب الہند شاہ غلام معین الدین کے مرید و خلیفہ اور جانشین اور متولی اوقاف اور سلسلہ رشیدیہ کے چھٹے سجادہ بھی ہوئے- ۱۳۱۴ھ میں آپ نے اس دنیا کو خیرباد کہا اور خانقاہ رشیدیہ جون پور میں مدفون ہوئے- آپ کا مزار اس سلسلے کے تمام سجادہ نشینوں کی طرح خام ہے-

(سمات الاخیار، ص:۲۳۹ تا ۲۴۵ ملخصاً)

(۱۰) مولانا محمد عبدالعلیم آسی غازی پوری (پ:۱۹/شعبان ۱۲۵۱ھ، م:۲/جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ)

آپ کا نام محمد عبدالعلیم اور تخلص آسی ہے- آپ اچھے شاعر، متبحر عالم اور زبردست صاحب استغراق صوفی، سلسلۂ رشیدیہ کے ساتویں صاحب سجادہ تھے- دنیا آپ کو بحیثیت صوفی

شاعر کے آسی غازی پوری سے جانتی ہے- آپ ۱۹/شعبان ۱۲۵۱ھ سکندر پور میں پیدا ہوئے- تاریخی نام خلیل اشرف رکھا گیا- بچپن ہی میں آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا- آپ کے نانا مفتی احسان علی قاضی پوری، شاہ آباد نے آپ کی پرورش کی اور ابتدائی تعلیم سے بذات خود آراستہ کیا، پھر آپ اپنے والد کے پیر خانہ خانقاہ رشیدیہ میں حاضر ہوئے اور صاحب سجادہ شاہ غلام معین الدین سے بقیہ تعلیم حاصل کی- مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی آپ کے اساتذہ میں آتے ہیں- آپ کے اساتذہ کو بھی آپ کی ذکاوت پر ناز اور شاگردی پر فخر تھا-

حضرت آسی غازی پوری سلسلۂ قادریہ احمدیہ میں شاہ غلام معین الدین سے مرید ہوئے اور ایک مدت تک آپ ہی کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے- سفر میں بھی آپ ساتھ رہتے- بالآخر مختلف اشغال واذکار کی تعلیم کے ساتھ تمام سلاسل کی اجازت وخلافت سے نوازے گئے-

آپ اپنے وقت کے طبیب حاذق بھی تھے حالاں کہ فن طبابت میں کوئی استاد نہ رکھتے تھے- سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ شاہ سراج الدین کی جانشینی سات ہی برس میں ختم ہوگئی اور ضرورت نے یہ سہرا آپ کے سر باندھا- سجادہ نشینی کے بعد جون پور میں مستقل قیام فرمایا- خانقاہ کے مشاغل اور اہل طلب کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ طبابت چھوٹ گئی-

(سمات الاخیار، ص:۲۵۴/۲۵۵)

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں کہ جب تک سجادہ نشینی کی خدمت آپ کے متعلق نہیں ہوئی تھی تب تک باوجود تکمیل مراتب ظاہری و باطنی و تحصیل اجازت وخلافت کبھی کسی کو مرید نہیں کیا اور اپنے آپ کو طبابت کے بھیس میں ایسا چھپا رکھا کہ بجز اہل نظر کوئی پہچان نہ سکا اور آپ کی درویشی کی طرف کسی کا وہم وگمان بھی نہ جاسکا- (سمات الاخیار، ص:۲۵۳)

آپ کی طبیعت میں قدرت اور ضبط کا اتنا مادہ تھا کہ مجال نہ تھی کہ کسی حالت میں کوئی راز کھل جائے- اواخر عمر میں چشتیت غالب آگئی تھی- بلا مزامیر کے سماع سنتے تھے- اس کی صورت یہ تھی کہ قاضی عبدالبصیر معصوم پوری اور حافظ فریدالدین احمد غازی پوری آپ کی غزلیں شب کو سوتے وقت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے- ہاں منڈواڈیہہ کے عرس میں گاگر اٹھتے وقت جو باقاعدہ قوالی ہوتی ہے اس میں آپ شریک ہوتے تھے- وجد کی حالت میں صرف آنکھیں سرخ ہوجاتی تھیں اور بس- آپ کی شادی ہوئی اولاد بھی ہوئے مگر نسبی سلسلہ قائم نہ رہا-

(سمات الاخیار، ص:۲۵۶/۲۷۴/۲۷۵ ملخصاً)

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جانشینی کے سلسلے میں غور وفکر کیا اور سلسلے کے اصحاب حل وعقد سے مشورہ اور روحانی اشارات کے بعد شاہ سید شاہد علی سبز پوش کو اپنا جانشین بنا دیا- اس

واقعے کو سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ جانشینی کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ تھا جو اکثر مریدین یا احباب کبھی کبھی آپ سے پوچھ بیٹھتے تھے کہ آپ نے کس کو تجویز فرمایا ہے، اس لیے کہ آپ کے بعد اول تو انتخاب میں دقت پڑے گی دوسرے انتخاب صحیح ناممکن بھی ہے- اس وقت آپ یہی فرماتے تھے کہ میں نے شاہ سراج الدین اور مفتی غلام قادر دولڑکوں کو منتخب کیا تھا لیکن خدا کی مشیت اور تھی اب میں اپنی رائے سے کچھ نہ کروں گا- اگرچہ آپ اسی جواب سے دوسروں کو ساکت و صامت فرما دیتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ خود بھی اس سوال کی اہمیت خوب سمجھتے تھے- جب وقت آیا تو آپ نے حضرت قطب الاقطاب ابوالبرکات شمس الحق شیخ محمد رشید مصطفیٰ قدس سرہ کے خلیفۂ اجل واکمل حضرت میر سید قیام الدین گورکھ پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے جناب سید شاہد علی صاحب کا انتخاب فرمایا اور اپنی صحبت کیمیا خاص میں رکھنے لگے-

۱۳۲۹ھ میں آپ کا لقب شہود الحق اور نام رشید الدین ارشاد ہوا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نام و لقب پیروں نے میرے دل میں ڈالا ہے- اس کے بعد آپ نے خلافت نامہ بھی زیب رقم فرمایا-

(سمات الاخیار، ص:۲۷۶/۲۷۷)

حضرت آسی غازی پوری کا آخری دور استغراقی دور تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ سالوں تک حالت استغراق میں رہے اور ۱۳۳۵ھ میں وصال ہوگیا- سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں وصال کے قریب زمانے میں آپ کی ہیبت بہت بڑھ گئی تھی- خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے والے اور ہر وقت بات کرنے والے مقربین کو بھی لب کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی- مریدانِ خوش اعتقاد روزانہ بعد نماز مغرب حاضر ہوتے مگر سلام کرنے یا قدم بوس ہونے کی جرأت نہ ہوتی- آہستہ پلنگ کی پٹی چوم کر تخت پر بیٹھ جاتے- کبھی آپ آہٹ پا کر اگر پوچھ لیتے کہ کون؟ تو بتا کر سلام عرض کرتے اور اگر اس سے زیادہ متوجہ پاتے تو جرأت کر کے قدم بوس بھی ہو لیتے، ورنہ پٹی چوم کر واپس آجاتے- وصال کے وقت تک بجز افراط استغراق وغلبۂ محویت کوئی مرض نہ تھا-

(سمات الاخیار، ص:۲۷۹)

وقت وصال جانب قبلہ اس شوق سے ملاحظہ فرما رہے تھے کہ دیکھنے والے بھی اس کا امتیاز اچھی طرح کر سکے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کو اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے- آخر وہ قیامت خیز تاریخ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ کی دوسری پہنچ گئی اور وہ محشر انگیز روز اتوار آہی گیا جس میں اپنے وابستگان دامن ارادت کی چشم ظاہر سے آپ نے ہمیشہ کے لیے پردہ فرما لیا- یعنی وہ مستغرق دریائے شہود، غواص محیط وحدۃ الوجود، فانی فی اللہ، باقی باللہ، قطب المشائخ والعالمین، شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم رشیدی قدس سرہ پچاسی برس کی عمر میں اول وقت

ظہر ایک بج کر بیس منٹ پر واصل بحق ہوئے۔

آج آسی نے کر لیا پردہ
ہم غریبوں سے وہ کریم چھپا

آپ کے وصال کے بعد آپ کے جانشین حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش نے جن رسومات کی ادائیگی کی اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں جناب سید صاحب نے جون پور کی خانقاہ میں حسب معمول خاندان رشیدی سوم، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ کیا جس طرح حضرت نے اپنے پیر و مرشد کا سوم وغیرہ بمہن برہ سے آکر خانقاہ جون پور میں فرمایا تھا۔ ہر سال حسب آداب خاندان رشیدی غازی پور میں عرس کرتے ہیں اور مہمانوں کی میزبانی و راحت رسانی کو سعادت دارین سمجھتے ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ جو اہل غازی پور کی خدمت میں روزانہ بلا ناغہ حاضر ہوا کرتے تھے، وہ اب بھی بلا ناغہ بعد نماز مغرب فاتحہ کے لیے حاضری کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ہر جمعرات کی شام کو مزار مبارک پر قل ہوا کرتا ہے۔ (سمات الاخیار، ص:۲۸۲)

سلسلۂ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کرتے اور اسی کے پردے میں مقامات تک پہنچانے کی کوشش کرتے یعنی علم و عمل کے پردے ہی میں سارا کام ہو جاتا۔ اسرار و معارف کی باتیں بہت کم ظاہر ہو پاتیں۔ اس سلسلے کے مشائخ اور ان کے اخلاف کا حلقہ بہت بڑا تھا۔ حضرت آسی غازی پوری کے خلفا میں زیادہ تر ایسے اصحاب تھے جن کو ارادت بھی آپ ہی سے تھی مگر بعض وہ تھے جن کو صرف خلافت و اجازت آپ سے تھی۔ وہ علما و مشائخ جن کو ارادت و خلافت دونوں آپ سے تھی۔ ان میں سے سمات الاخیار کے مصنف نے ۹؍ کا ذکر کیا ہے جس میں شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری جو آپ کے جانشین بھی ہوئے ان کے علاوہ سید شاہ عبد العزیز بہاری، سید شاہ نذیر احمد بہاری، شاہ عبد الحق ظفر آبادی بھی شامل ہیں۔

جن مشائخ کو صرف خلافت میسر آئی، ان میں مولوی عبد السبحان غازی پوری بھی ہیں۔ بیعت و تعلیم آپ کو مولانا عبد القادر شاہ غازی پوری سے حاصل تھی۔ ۲۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ بنگال میں وصال ہوا، غازی پور میں مدفون ہوئے۔ دوسرے مفتی محمد وحید قادری جو آسی صاحب کے ماموں زاد بھائی اور قاضی عنایت حسین چریا کوٹی کے مرید تھے۔ تیسرے شاہ محمد فصیح شیخ پوری، آپ خواجہ محمد عیسیٰ تاج کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ اپنے والد شاہ عنایت حسین بلیاوی کے مرید تھے اور بعد میں حضرت آسی سے اجازت و خلافت میسر آئی۔ چوتھے شیخ محمد امیر معصوم پوری، آپ بلیا کے رئیس اور شاہ علی حبیب سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواروی کے مرید اور فیض یافتہ تھے۔ چوں کہ آپ کے بزرگوں کو

مشائخ خانقاہ رشیدیہ سے برابر بیعت رہی، اس نسبت کو باقی رہنے کے لیے آخر عمر میں آپ حضرت آسی سے طالب ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ ان کے علاوہ شاہ محمد ادریس پھلواروی، شاہ ذاکر حسین چوکی قتال پوری، مولوی عبد الرحیم سیوانی، مولوی محبّ اللہ غازی پوری، شاہ الفت حسین غازی پوری اور مولانا سید محمد فاخر بے خود اجملی الٰہ آبادی کو بھی حضرت آسی غازی پوری سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

آسی غازی پوری کی علمی خدمات

یوں تو سلسلۂ رشیدیہ کے تمام مشائخ و علما نے علمی اور دعوتی خدمات میں اپنی حصہ داری پیش کی مگر بعض وہ مشائخ جو علمی اور دعوتی خدمات کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، ان میں ایک نام حضرت آسی غازی پوری کا بھی آتا ہے۔ آپ نے خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت چلنے والی خانقاہوں کی تعمیر و ترقی، رفاہ عام، خدمت خلق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ارشاد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ سارے میدانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ ایک طرف علمی اور روحانی اعتبار سے جہاں اچھے اور مفید افراد تیار کیے، وہیں دوسری طرف تصنیف و تالیف اور صوفیانہ و عارفانہ شعر گوئی اور غزل گوئی میں آپ نے ایک مثال قائم کی۔ آپ کی تصنیفات میں سراج الصرف، فواید صدیقیہ اور قواعد جوہریہ کا ذکر ملتا ہے۔ شعر گوئی کے ذریعے ناسخ جیسے شعرا نے زبان کی صفائی و شستگی میں جو سعی بلیغ تھی اسے حضرت آسی نے آگے بڑھایا اور مزید نئی راہیں ہموار کیں بلکہ حضرت آسی نے اس فن میں جو کمال حاصل کیا اور جیسے تلامذہ پیدا کیے ان کی بنیاد پر آپ کو ناسخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ حضرت آسی کا کلام مجاز کے پردے میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے، خود فرماتے ہیں:

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ
وہ شعر لغو ہے آسی کلام ناکارا

آپ کے خلیفہ و جانشین سید شاہ شاہد علی نے آپ کے وصال کے بعد عین المعارف کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ تیار کیا اور عارف ہسوی نے آپ کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت آسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاق سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے۔ انداز بیان کی متانت و پختگی، مضامین کا علو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت؛ ان کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجے پر پہنچا دیتی ہیں۔ ایک خاص خوبی حضرت آسی کے کلام کی یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے۔ سوقیت و عامیانہ مذاق سے کلام پاک ہے۔ نیز جرأت و داغ کی طرح ہوس ناکی، سفاہت بھی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ آسی ایک صاحب حال، صاحب دل،

صاحب نسبت بزرگ تھے، اس لیے فطرتاً ان کا کلام تصوف کی چاشنی سے معمور ہے- وہ کبھی تو ایسے اشارات صوفیانہ کر جاتے ہیں جس سے کلام کی رنگینی و رعنائی حد درجہ دل پذیری کی شان اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی خاص مسئلۂ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں اور کبھی مجاز کے پردہ میں رموز حقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں چوں کہ تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدۃ الوجود کا ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے واردات قلب کو قالب شعر میں ڈھال کر پیش کر جاتے ہیں جن کو سنتے ہی سامع پر ایک بےخودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذاق سلیم پہروں سر دھنتا ہے-'' (سمات الاخیار، ص:۲۷۰)

حضرت آسی کی غزل اور آپ کی رباعیوں کے حوالے سے فراق گورکھ پوری کہتے ہیں:

''آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے- کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پور سناتن دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجنوں جواب بی اے پاس کر چکے تھے گورکھ پور ہی میں تھے- ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی ربط کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس رباعیاں کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں، ہم دونوں اب تک اس حسنِ اتفاق پر حیرت کرتے ہیں-'' (عین المعارف، ص:۳۳-۳۴)۔

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید محمود مرحوم سابق وزیر خارجہ حکومتِ ہند) کو جون پور کی خانقاہ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا- یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلے میں بیعت بھی تھے لیکن ان کو اسی سلسلے کے مشہور شیخ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نو جوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے- اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوش عقیدت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے-'' (عین المعارف، ص:۳۴)

ایسے ہی مولانا محمد علی جوہر تحریر کرتے ہیں:

''اس سفر (بسلسلۂ مقدمۂ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گزار دیے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر وردِ زبان رہا:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد''

(عین المعارف، ص:۳۴)

مجنوں گورکھ پوری تحریر کرتے ہیں:

''مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے مجاز کی حقیقت اور قدسیت کو کما حقہ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو ''مجازیت'' کہا جا سکتا ہے- ایک تو حافظ دوسرے آسی'' (عین المعارف، ص:۲۰)

ان حضرات کی ان تحریروں سے حضرت آسی کے کلام کی اثر انگیزی اور غزل کی شہرت کا علم ہوتا ہے-

(۱۱) شاہ شاہد علی سبز پوش (پ: ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۸ء- م: ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء)

آپ کا نام شاہد علی اور لقب رشید الدین و شہود الحق اور تخلص فانی تھا- آپ حضرت آسی غازی پوری کے مرید و خلیفہ اور سلسلۂ رشیدیہ کے آٹھویں سجادہ جانشیں تھے- آپ کے والد کا انتقال آپ کی پیدائش سے ۳ ماہ ۳ دن قبل ہو گیا- آپ کا نسبی سلسلہ ۲۹ر واسطوں سے حضرت علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے-

آپ اپنے وقت کے اچھے شاعر اور متبحر عالم شریعت اور عارف باللہ تھے- (۴) مخلوق خدا کے ساتھ وقت کے بڑے نام ور شعرا سے بھی آپ کے اچھے تعلقات تھے- چند نام ور شعرا جو آپ سے اپنے تعلقات پر فخر کرتے تھے ان میں حفیظ جون پوری، جگر مراد آبادی، وصل بلگرامی وغیرہم ہیں-

(دیوان فانی، ص: ا رتا ۳۰ ملخصاً)

اور ان جیسے دیگر علما و شعرا مثلاً علمائے فرنگی محل، اصغر گونڈوی، ہادی مچھلی شہری، حسرت موہانی، سیماب اکبر آبادی سے بھی آپ کے خاص روابط تھے- (سمات الاخیار، ص ۳۰۱ تا ۳۰۳ ملخصاً) آپ نے دیوان فانی کے نام سے ایک شعری دیوان چھوڑا ہے جو عارفانہ اور صوفیانہ شاعری کا مجموعہ ہے- دعوت و تبلیغ کو جاری رکھتے ہوئے روحانی نعمتوں کو عام کرنے اور رہتی دنیا کے لیے رشد و ہدایت کا سلسلہ باقی رکھنے کی غرض سے آپ نے کچھ افراد کی تعلیم و تربیت کر کے ان کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا- ان میں سے چند جن کا نام کتابوں میں ملتا ہے وہ یہ ہیں: سید مصطفیٰ علی سبز پوش، سید شاہ ایوب ابدالی سجادہ نشیں خانقاہ اسلام پور پٹنہ، سید عبد الشکور سادات پوری، مولوی محمد یٰسین چمنی بازار پورنیہ، مولوی ذاکر حسین چوکی قتال پور، سیوان، بہار، حکیم لطیف الرحمٰن چمنی بازار، پورنیہ بہار-

(سمات الاخیار، ص ۳۰۸)

(۱۲) سید شاہ مصطفیٰ علی سبز پوش (وصال: ۱۸ر ذی القعدہ ۱۳۸۵ھ/۱۱ر جولائی ۱۹۵۸ء)

آپ سید شاہد علی سبز پوش کے لڑکے و جانشین اور خانقاہ رشیدیہ کے ۹ر ویں سجادہ اور

موجودہ سجادہ نشیں مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مدظلہ العالی کے شیخ ارادت تھے- مدرسیہ صولتیہ مکہ معظّمہ کے سند یافتہ عالم اور صاحب تصرف صوفی تھے- بہار کے ضلع چمپارن میں جہاں وہابیوں کا زور تھا آپ نے زبردست دعوت وتبلیغ کی جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں نے توبہ کی اور جماعت اہل سنت میں شمولیت اختیار کی- (سمات الاخیار، ص:۳۰۹)

۱۸/ ذی القعدہ ۱۳۷۸ھ/ ۱۱/ جولائی ۱۹۵۸ء کو گورکھ پور میں شہادت کی موت پائی اور واصل بحق ہوئے- جون پور، رشید آباد میں مدفون ہوئے- آپ کے بعد خانقاہ کا انتظام وانصرام کچھ دنوں تک سید ہاشم علی کے سپرد کیا گیا پھر رشد وہدایت کا کام سید شاہد علی کے خلیفہ سید شاہ ایوب ابدالی جو شاہ مصطفیٰ علی شہید کے مرشد کامل ہوتے ہیں، ان کے حوالے کیا گیا-

(سمات الاخیار، ص:۳۰۹ تا ۳۱۱ ملخصاً)

سلسلۂ رشیدیہ کی موجودہ علمی ودعوتی سرگرمیاں

بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید جن کی عارفانہ حیثیت کو ان کے ہم عصر مشائخ وصوفیہ نے تسلیم کیا اور جن کے تبحر علمی کی شبلی اور ان جیسے دیگر علما اور دانش وروں نے قصیدہ خوانی کی ہے، اس سلسلے کے مشائخ کی علمی اور روحانی حیثیتوں کو ملک العلما ظفر الدین بہاری جیسی عبقری شخصیات نے بھی تسلیم کیا اور ان کے ادبی اور شعری شہ پاروں کو دیکھ کر غالبؔ اور ناسخؔ جیسے فن کار شعر وسخن نے رشک کیا ہے- اس عظیم خانقاہ کی علمی اور روحانی حیثیت آج بھی باقی ہے- اس وقت ایک صاحب سجادہ کی نگرانی میں اس سلسلے کی پانچ خانقاہیں مختلف مقامات پر چل رہی ہیں- سب کے سب دعوت وتبلیغ اور خدمت خلق میں مصروف ہیں اور اپنے مشائخ کے نقش قدم پر عمل کرتے ہوئے اشاعت علم ومعرفت کا سلسلہ جاری رکھی ہوئی ہیں- یہاں کے موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کی لائق تعریف اور حکیمانہ قیادت میں مختلف مقامات پر اس سلسلے کے ترجمان مختلف معیاری علمی ادارے چل رہے ہیں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں طالبان علوم نبویہ اپنی علمی تشنگی بجھا رہے ہیں- ان اداروں کے اسما یہ ہیں: (۱) دار العلوم مصطفائیہ، چمنی بازار، پورنیہ، بہار (۲) دار العلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا (۳) دار العلوم طیبیہ معینیہ، بنارس (۴) دار العلوم رشیدیہ، جون پور (۵) دار العلوم حیدریہ معینیہ، سیوان (۶) دار العلوم علیمیہ شاہدیہ، غازی پور

مشائخ سلسلۂ رشیدیہ کا اعتقادی، فقہی اور صوفی مسلک

خانقاہ رشیدیہ ہندوستان کی قدیم روحانی اور علمی خانقاہ ہے- یہاں کے مشائخ نے اپنی علمی اور دعوتی دونوں حیثیتوں کو ثابت کیا اور ان دونوں میدانوں میں بے لوث خدمات انجام

دیں- اس سلسلے کے مشائخ نے اعتقادی، فقہی اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں- خود بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی رشیدیہ کے نام سے جو شرح کی ہے وہ ان کے دینی افکار اور خیالات کو ثابت کرتی ہے- یوں ہی اس سلسلے کے مشائخ کی تصنیفات وتالیفات اور ملفوظات مثلاً: گنج رشیدی، گنج ارشدی، گنج فیاضی، کرامات فیاضی، مناقب العارفین، سمات الاخیار، عین المعارف، دیوان فانی وغیرہ کے مطالعے سے واضح طور پر جن افکار و نظریات اور خیالات کا علم ہوتا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے:

اعتقادی مسلک

ہندوستان کی دیگر خانقاہوں اور خانوادوں کے علما ومشائخ کی طرح سلسلۂ رشیدیہ کے علما ومشائخ اعتقادی طور پر حضرت امام ابو منصور ماتریدی قدس سرہ کے پیروکار رہے ہیں اور صدیوں سے متواتر طور پر چلے آرہے اہل سنت کے معتقدات ومعمولات خواہ وہ ضروری ہوں یا ظنی، ان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں-

فقہی مسلک

ہندوستان کی اکثر مسلم آبادی فقہ وفتاویٰ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت قدس سرہ کی پیروی کرتی ہے- ہندوستانی علما ومشائخ نے فقہ حنفی کی صرف پیروی ہی نہ کی بلکہ وسیع پیمانے پر اس مسلک ومذہب کی ترویج واشاعت بھی کی ہے- سلسلۂ رشیدیہ کے علما ومشائخ نے بھی دعوت وتبلیغ اور درس وتدریس کے ساتھ اپنی تصنیفات وتالیفات کے ذریعے بھی فقہ حنفی اور مسلک امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہ کی ترویج واشاعت اور تبلیغ میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے-

صوفی مسلک

حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ کی حکیمانہ دعوت وتبلیغ کی بنیاد پر چشتی نسبت نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی روحانیت سے منور اور پرسکون بنا دیا- بہت سے دوسرے مشائخ نے قادریت، نقش بندیت اور سہروردیت کی بھی ترویج وتبلیغ کی اور ان تمام روحانی چشموں سے خود بھی فیض یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب فرمایا- البتہ چشتیت اور قادریت کا غلبہ ہندوستان میں زیادہ رہا- خانقاہ رشیدیہ جون پور بھی اصلاً چشتی خانقاہ ہے لیکن یہاں کے مشائخ کو دیگر مختلف سلاسل کی اجازت وخلافت شروع سے چلی آرہی ہے- یہاں کے اکثر مشائخ نے زیادہ تر بیعت، سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ میں کی ہے اور اجازت سے نوازا ہے-

یہاں کے بعض مشائخ چشتی صوفی رسوم مثلاً رقص وسماع وغیرہ سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے ہیں- (۱)

تعلیقات

(۱) بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے جد امجد حضرت شیخ عبدالحمید حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر کچھوچھوی کے مرید و خلیفہ تھے- اس روایت کے تعلق سے نوجوان فاضل مولانا ابرار رضا مصباحی جو خانقاہ رشیدیہ سے اپنا روحانی رشتہ اور اس سلسلے کے مشائخ کے تعلق سے معلومات رکھتے ہیں، لکھتے ہیں: ''یہ روایت و عبارت بھی ناقابل تسلیم اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے- کیوں کہ خانوادۂ رشیدیہ کی تاریخ پر معتبر و مستند کتاب ''گنج ارشدی شریف'' اور دیگر کسی کتب تاریخ و سیرت میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ حضرت بندگی شیخ جمال الحق مصطفیٰ کے والد بزرگ وار امام العارفین حضرت شیخ عبدالحمید حضرت سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مرید و خلیفہ تھے اور پھر یہ کہ ان دونوں حضرات کے زمانے میں بھی کافی تفاوت اور بون بعید ہے- لہٰذا یہ روایت کسی بھی طریقے سے درست نہیں ہے- البتہ ''گنج ارشدی شریف'' میں یہ ہے کہ حضرت شیخ عبدالحمید کی شادی شیخ عبدالقادر کی دختر سے ہوئی اور شیخ عبدالقادر کے والد قاضی عبدالصمد شیر شاہ سوری کے لشکر کے قاضی تھے- آپ کا سلسلۂ نسب حضرت قاضی محمد عرف متھن صدیقی سے ملتا ہے جو کہ حضرت مخدوم میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت معروف شبلی کی اولاد سے ہیں-''

(ماہ نامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۰۱۲ء، ص:٦۲)

(۲) بانی سلسلۂ رشیدیہ شیخ محمد رشید کا نام عبدالرشید بھی ملتا ہے- آپ کے پیر بھائی اور خلیفہ شیخ یٰسین جھونسوی ''مناقب العارفین'' میں اپنے شیخ ارادت مخدوم شاہ طیب بنارسی قدس سرہ کے اولوالعزم خلفا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''دوسری شخصیت استاذی و استاذ العالمین، ملاذی و ملاذ الصالحین، زبدۃ الاحبار، عمدۃ الابرار، محبوب قلوب الشطار، صاحب الرشاد والسداد، والمتمکن فی مقام الارشاد، قدوۃ اہل التجرید والتفرید، بندگی میاں شیخ عبدالرشید ابداللہ تعالیٰ ظلال عاطفہ علی روس المعتقدین والمریدین کی ہے-'' (مناقب العارفین، ص:۸٦)

شیخ محمد رشید کے ہم عصر اور خواجہ تاش نے جن الفاظ و القاب میں آپ کا ذکر کیا ہے، اس سے جہاں آپ کی عظمت، رفعت اور مقام ولایت کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عبدالرشید بھی کہا اور لکھا گیا ہے- یوں ہی مآثر الکرام کے مصنف میر سید غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی آپ کا نام عبدالرشید اور لقب شمس الحق لکھا ہے- (مآثر الکرام، ص:۳۱۱) حدائق الحنفیہ میں آپ کا تعارف کراتے ہوئے یوں تحریر ہے: ''مخدوم شیخ عبدالرشید بن شیخ مصطفیٰ عبدالحمید عثمان: پہلا نام آپ کا محمد رشید تھا اور اسی کو دوست رکھتے تھے اور مراسلات و مکاتبات میں لکھتے تھے- لقب آپ کا شمس الدین تھا (حدائق الحنفیہ ص:۴۲۹) حدائق الحنفیہ میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۵۵ھ

بتائی گئی ہے جو دیگر تمام مراجع سے مختلف ہے- اس کے علاوہ تمام مراجع و مصادر میں ۱۰۸۳ھ ہے اور یہی درست ہے- صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی آپ کا نام محمد رشید اور گنج ارشدی کے حوالے سے تاریخ وصال ۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ لکھا ہے- (نزہۃ الخواطر، ج:۵، ص:۳۹۹، ۴۰۰)

صاحب تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمٰن علی صاحب نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے: مولانا عبدالرشید جون پوری ابن شیخ مصطفیٰ بن عبدالحمید، ان کا لقب شمس الحق تھا، شمس تخلص کرتے تھے، شیخ فضل اللہ جون پوری کے شاگرد اور اپنے والد شیخ مصطفیٰ (مرید نظام الدین امیٹھوی) کے مرید تھے، جو اولیائے کبار اور علمائے کرام سے تھے- (تذکرہ علماء ہند، ص:۲۹۷)

سمات الاخیار کے مصنف نے جو بات تحریر کی ہے وہ یہ ہے: آپ کا نام نامی محمد رشید ہے اور آپ کی بعض تحریروں سے عبدالرشید بھی ثابت ہے مگر کم، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو محمد رشید زیادہ مطبوع و محبوب تھا- آپ کی کنیت ابوالبرکات اور لقب شمس الحق ہے- لوگ آپ کو قطب الاقطاب اور دیوان جی کہا کرتے تھے- (سمات الاخیار، ص:٦۰) اب ان تفصیلات کے بعد آپ کے نام و لقب کے تعلق سے مزید کچھ لکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی-

(۳) شیخ محمد رشید کے شیوخ میں مخدوم شاہ طیب بنارسی حضرت عبدالقدوس قلندر، میر سید شمس الدین کالپی اور راجی احمد مجتبیٰ مانک پوری جیسے مشائخ کا نام آتا ہے اور شیخ نورالحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی شارح بخاری اور افضل العلماء شیخ محمد افضل جیسے متبحر علما آپ کے اساتذہ ہوتے ہیں- ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (۱۲ر ربیع الاول ۱۰٦۷ھ) ملا عصمت اللہ سہارن پوری (۱۰۳۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی جیسے نامور علما و مشائخ آپ کے ہم عصر اور ملا محمود جون پوری جیسے منقولی اور معقولی عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے- آپ کے استاذ شیخ محمد افضل کہتے تھے کہ جس وقت علامہ تفتازانی اور جرجانی دنیا سے گئے اس وقت سے کسی نے بھی اتنے بڑے فاضلوں کو ایک شہر میں اکٹھا ہوتے نہیں دیکھا یعنی ملا محمود اور شیخ عبدالرشید- (مآثر الکرام، ص:۳٦)

(۴) آپ کے بارے میں خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمٰن رشیدی مدظلہ العالی تحریر کرتے ہیں: آپ حضرت سرکار آسی مولانا الشاہ محمد عبدالعلیم قدس سرہ کے مرید خاص اور خلیفۂ اول اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین رہے ہیں- آپ کی ذات والا صفات محتاج تعارف نہیں- حضرت ملک العلما مولانا ظفر الدین فاضل بہاری مصنف صحیح البہاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''موذن الاوقات'' میں آپ کے جو آداب و القاب ذکر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں ''عارف باللہ، مقبول بارگاہ، ملحق الاصاغر بالاکابر، وارث العلم والفضل والمجد والشرف، کابراً عن کابرٍ، جامع شریعت و طریقت، حاوی اسرار حقیقت و معرفت، عالی جناب، معلیٰ القاب

سید شاہد علی صاحب سبز پوش سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ علیمیہ، جون پور، دام بالفیض والسرور الی مرالدہور۔'' (خطبات رشیدیہ، ص:۳۰)

حضرت مفتی صاحب نے الاحسان کو دیے گئے اپنے تحریری انٹرویو میں یہ بات بھی تحریر کی ہے کہ حضرت ملک العلما ظفر الدین بہاری، حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش کے خلیفہ شاہ ایوب ابدالی خانقاہ اسلام پور پٹنہ کے اجازت یافتہ بھی تھے، اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں بنارس میں چار روزہ سنی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی خلیفۂ اعلی حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے خانقاہ رشیدیہ کے ۹/ویں سجادہ نشیں سید شاہ شاہد علی سبز پوش قدس سرہ سے ملاقات کی اور ان کو کانفرنس کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کیا۔

(۵) سماع اور وجد وکیف اور رقص کے تعلق سے مناقب العارفین کے مصنف شیخ یٰسین جھونسوی اپنے شیخ ارادت مخدوم شاہ طیب بنارسی جو شیخ محمد رشید بانی سلسلۂ رشیدیہ کے شیخ اجازت اور شیخ تربیت ہیں، کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: ''ابتدا میں آپ قدس سرہ کو سماع سے بہت شغف تھا اور وجد ورقص بہت فرماتے تھے اور اکثر صالح قسم کے قوال آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی سماع کے جوش میں جنگل کی طرف چلے جاتے، دور دراز جنگل میں رہتے اور کوئی نہ جانتا کہ آپ کہاں ہیں، لیکن جب قوال اس نواح میں جاتے اور گانا شروع کرتے تو اس کو سنتے ہی آپ کسی طرف سے ظاہر ہوجاتے اور رقص میں مشغول ہوجاتے۔ جب آپ پر حال طاری ہوتا اور آپ رقص فرماتے تو در و دیوار مست ہوجاتے اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ہر چیز عالم رقص میں ہے۔ بہت سی راتیں اسی حال میں گزر جاتیں۔ آخر وقت میں سماع سے پرہیز فرمایا اور اپنے اختیار سے نہیں سنتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ اس دور میں سرود نہیں سننا چاہیے کیوں کہ اس کی کوئی شرط باقی نہیں رہ گئی ہے، زمانہ فاسد ہوچکا ہے، یاران موافق نہیں رہ گئے ہیں اور قوالوں میں طمع جاگزیں ہوگئی ہے، اس لیے ایسے وقت میں سرود کا سننا فقرا کے طریقہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔'' (مناقب العارفین، ص:۷۵،۷۶)

اور شیخ محمد ارشد ابن شیخ محمد رشید کے بارے میں سمات الاخیار کے مصنف ایک واقعہ یوں تحریر کرتے ہیں: ''سماع کا سننا بعض روایتوں سے ثابت ہے۔ حضرت راجی سید احمد حلیم اللہ مانک پوری کا عرس تھا، بہت سے بزرگان دین مل کر گاگر بھرنے چلے، قوال ساتھ تھے، واپسی میں جب یہ شعر گایا:

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رستے

آپ پر ایسی حالت طاری ہوگئی کہ دستار مبارک اتار کر قوال کو عطا فرمایا۔ پھر دوسروں نے بھی تبعاً اپنی اپنی دستار دے ڈالی۔ آپ کی حالت نے ایسی تاثیر پیدا کی کہ دیکھنے والوں کی بھی

حالت متغیر ہوگئی۔ اسی طرح حضرت مخدوم طیب بنارسی کے عرس میں آپ کو حال آیا۔ پہلے آپ نے بہت کچھ ضبط کیا مگر ضبط نہ ہوسکا تو فرمایا کہ حضرت مخدوم کی روح (روحانیت) نے غلبہ کیا۔ بزرگان چشتیہ نے سماع کی تعریف یوں کی ہے کہ سماع ایک تازیانہ ہے جو محبّ کو محبوب کی طرف ہنکاتا ہے اور ایک وسیلہ ہے جو دلوں کو معشوق کے قریب پہنچاتا ہے۔ رموز رحمانی میں سے ایک رمز ہے جو بیان سے کھل نہیں سکتا اور زبان سے ادا ہوسکتا نہیں۔ شوریدگان محبت اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور ہشیار وخود پرست اس سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ سچ ہے ؎

حدیث عشق باخبار در نمی گنجد　　بیان شوق بگفتار در نمی گنجد

(سمات الاخیار، ص:۱۲۱)

معلوم ہوا کہ یہاں کے مشائخ نے سماع کے جو شرائط ہیں، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے، سماع کا لطف اٹھایا ہے۔ جب جب شرائط پائے گئے تو سماع کیا اور جب شرائط کا فقدان رہا تو پرہیز کیا۔ یہی صوفیہ صافیہ کا طریقہ چلا آرہا ہے۔ آج بھی اگر شرائط یعنی زمان، مکان اور اخوان پائے جائیں تو اس کا لطف لیا جاسکتا ہے، ورنہ پرہیز بہتر ہے۔

کتابیات

(۱) سمات الاخیار، مولوی محمد عبدالمجید وسید محمد اصغر ایوبی، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی مطبع: جمیل برادرز، لیاقت آباد، کراچی، ۱۴۱۹ھ
(۲) دیوان فانی، سید مصطفیٰ علی رشیدی، ناشر، انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ
(۳) مناقب العارفین، شیخ یٰسین جھونسوی، مترجم ناشر: خانقاہ رشیدیہ جون پور شریف
(۴) عین المعارف، مولف: شاہ شاہد علی رشیدی، ناشر: انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ
(۵) انوار الاولیا، مؤلف: مولوی حبیب اللہ مختار، خرم پرنٹنگ پریس، کراچی، ۲۰۰۰
(۶) ماہ نامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۱۰۲ء
(۷) تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمٰن علی، مطبع منشی نول کشور لکھنو، ۱۹۱۴ء
(۸) حدائق الحنفیہ، مولوی فقیر محمد جہلمی، مکتبہ رضویہ، دہلی، ۲۰۰۶ء
(۹) نزہۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی، مکتبہ دار عرفات، دائرہ الشیخ علم اللہ، رائے بریلی، ۱۹۹۲ء
(۱۰) مآثر الکرام، غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم: یونس رضا اویسی، جامعۃ الرضا، بریلی، ۲۰۰۸ء
(۱۱) خطبات رشیدیہ، مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی، مکتبہ آسی، بلیا، ۱۴۱۴ھ

○○○

صوفی ادب

پروفیسر عبدالحمید اکبر

تعلیمات تصوف اور مثنوی مولانا روم

تصوف وہ مبارک علم ہے جس میں حق تبارک وتعالیٰ کی ذات اور صفات کی کنہ وحقیقت سے بحث کی جاتی ہے- اس علم کو ایک کنزِ مخفی اور پاک طریق سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جو قرآن و احادیث سے مستنبط اور مستخرج ہے، جسے صراطِ مستقیم کہتے ہیں- یہی وہ صراط مستقیم ہے جس پر گام زن رہنے سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوجاتی ہے- اسی وجہ سے اس علمِ شریف کا موضوع ذات وصفاتِ خداوندی اور اس کی غرض وغایت اللہ جل شانہ کی ''معرفت'' قرار دی گئی-

رب کائنات کی معرفت اور اس کی حقیقت تک رسائی، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے بغیر ممکن نہیں- تزکیۂ نفس کے لیے شریعت مطہرہ کی پابندی لازم ہے- اس کے بعد سالک واصل الی اللہ ہوتا ہے یعنی اس کے انوار وتجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے جس کا نام ''حقیقت'' ہے- وہاں تک رسائی کے لیے پیر کامل کی رہبری کی حاجت ہوتی ہے- اب اس سالک کے سامنے دنیا ایسی ہی ہوجائے گی جس طرح ہتھیلی کے اوپر رائی کا دانہ- حضرت سیدنا غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

نظرتُ اِلیٰ بلاد اللہ جمعاً
کخردلۃ علیٰ حکم اتصالِ

علم تصوف کی یہی وہ عظمت اور اہمیت ہے جس نے دنیا کے بڑے بڑے اربابِ علم و کمال کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے اور بعض دانشورانِ علم وادب کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے- الغرض سرِّ حق کو پانے کا نام ''تصوف'' ہے، جس کا طریقہ مولانا جلال الدین رومی علیہ رحمۃ السامی نے کچھ اس طرح بتایا ہے کہ

لب بند و گوش بند و چشم بند
گر نہ بینی سرِ حق برما بخند

حضرت امام محمد باقر بن علی بن امام حسین رضی اللہ عنہم کا ارشادِ فیض بنیاد ہے: ''**التصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف**، یعنی تصوف پاکیزہ اخلاق کا نام ہے جس کے جتنے پاکیزہ اخلاق ہوں گے اتنا ہی وہ زیادہ صوفی ہوگا -حضرت جنید بغدادی کا خیال ہے: ''**التصوف ھو ان یمیتک الحق عنک و یحییک بہ**'' یعنی تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیری اپنی ذات سے فنا کردے اور اپنی ذات کے ساتھ تجھے زندہ کردے-

ایسے وہ تمام افراد جنہوں نے اس علم شریف سے اپنا رشتہ جوڑا۔اس خارزار وادی میں قدم رکھا اور معرفت باری تعالیٰ کے صبر آزما دور سے گذرے اصطلاح تصوف میں انہیں ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''**الصوفی لایریٰ فی الدارین مع اللہ غیر اللہ**'' یعنی صوفی وہ ہے جو دونوں جہاں میں بجز ذاتِ خداوندی کے کسی چیز کو نہ دیکھے۔

تصوف دراصل دین اسلام کی روح ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : ''**بعثت لا تمم مکارم الاخلاق** '' یعنی میں مکارم اخلاق کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں یہ مکارمِ اخلاق کیا ہیں علماء ان سے واقف ہیں اور صوفیہ ان کے حامل ہیں۔

فوائد الفواد میں ایک عارفانہ لطیفہ کا ذکر ہے کہ بوعلی سینا جب حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمہ سے ملاقات کر کے چلے گئے تب کسی نے پوچھا کہ بوعلی سینا کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمہ نے کہا: ''مکارم اخلاق ندارد'' بوعلی سینا کو جب معلوم ہوا تو کہا کہ میں نے تو مکارمِ اخلاق کے موضوع پر پوری ایک کتاب رقم کی ہے۔شیخ نے فرمایا، میں نے یہ کب کہا تھا کہ مکارمِ اخلاق نداند، یہ کہا تھا کہ مکارم اخلاق ندارد۔جو علم مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ سب علم کا ظاہر ہے جسے صوفیہ کرام حجاب سے تعبیر کرتے ہیں، پھر اس کا باطن ہے جسے صوفیہ عظام عشق کہتے ہیں۔علماء اہل عقل اند و درویشاں اہل عشق۔عشق دراصل دین کا قلب ہے اور یہ علم ظاہر سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ غالبًا اسی لیے امام غزالی علیہ الرحمہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی ملازمت سے استعفیٰ دے کر راہِ سلوک طے کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔

اس لیے خانقاہ میں بتلائے جانے والے عمل کے لیے ''علوم باطن'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔اس مدرسۂ عشق میں داخلے کا تعلق ارادت یا بیعت سے ہے۔ بیعت یہ ایک معاہدہ یا اقرار ہے، جو پیر کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

پیر را بگزیں کہ بے پیرایں سفر
ہست بس پُر آفت وخوف وخطر

یعنی کسی کامل کو اپنا پیر بنا کہ بغیر پیر کے یہ سفر آفت وخوف وخطرات سے بھرپور ہے۔

پھر فرماتے ہیں:

گر تو کردی ذاتِ مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

یعنی اگر تو نے مرشد کو قبول کرلیا تو اللہ اور اس کے رسول کا نور تیرے دل میں منور ہوجائے گا۔

ایک اور جگہ مولانا رومی فرماتے ہیں:

قال را بگزار مردِ حال شو
پیشِ مرد ے کاملے پامال شو

قال یعنی زبانی جمع خرچ کو ترک کر کے صاحب حال ہوجا، کسی شیخ کامل، عارف باللہ کی قدم بوسی کر کے پامال ہوجا اور پیر کے آداب بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

چوں گرفتی پیر ہمیں تسلیم شو
ہمچو موسیٰ زیرِ حکم خضر رو

جب تمہیں پیر مل جائے تو خبردار اس کی نافرمانی نہ کرنا بلکہ اس کا تابع فرمان بن کر رہنا اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے حکم کے مطابق چلتے تھے اُسی طرح تم بھی چلو-

صوفیہ کرام کی تعلیمات میں عبادت الٰہی اور خدمت خلق بنیادی شعبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہر دو میں اخلاص کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔حضرت حذیفہ مرعشی کے نزدیک ظاہر و باطن میں یکسانیت کا نام اخلاص ہے۔اخلاص کے علاوہ، زہد وتقویٰ، صبر وشکر، خوف ورجا، فقر و توکل اور ادب وحیا جیسے اخلاق حسنہ صوفیانہ تعلیمات کے لوازم ہیں جبکہ عبادات، مراقبات ومجاہدات، اذکار واشغال اور خلوت واستقامت صوفیہ کرام کے گویا مشاغل ہیں، جن کے دوران، بغض وکینہ، تکبر وغرور، کذب وغیبت، حرص وحسد اور بخل جیسی خواہشاتِ نفسانی سے بچنے اور ان سے پرہیز کرنے کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔تصوف کی تعلیمات کا اصل منشا انسانی قلب سے تمام ناپسندیدہ خصلتیں اور نفسانی خواہشات کا دور کردینا ہے۔

زہد کے سلسلے میں حضرت امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ حرام کا ترک کردینا عوام کا زہد ہے، حلال چیزوں سے فضولیات کا ترک کردینا یہ خواص کا زہد ہے اور بندے کو

اللہ سے غافل کردینے والی تمام چیزوں کا ترک کرنا عارفین کا زہد ہے۔

دنیا کیا چیز ہے اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا روم کہتے ہیں:

''چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن''

یعنی اگر تمہارے پاس بال بچے ہوں اور مال و دولت بھی ہو، لیکن تم احکام خدا اور رسول پر عمل پیرا ہو تو ایسی صورت میں تم دنیا دار نہیں بلکہ دین دار ہی ہو۔

تعلیمات صوفیہ میں توکل سے متعلق حضرت سہل بن عبداللہ تستری علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ توکل کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے اور کسب کرنا آپ کی سنت ہے۔ لہٰذا حضور اقدس کے حال پر قائم رہنے والے کو سنتِ رسول ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مولانا روم ارشاد فرماتے ہیں:

گر توکل می کنی در کار کن
کار کن پس تکیہ بر جبار کن

ادب اور اخلاق کے سلسلے میں حضرت علی ہجویری علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف ''کشف المحجوب'' میں حضرت ابوالحسن علیہ الرحمہ کا قول ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔ ''تصوف رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق و ادب کا نام ہے''۔ امام قشیری علیہ الرحمہ کے نزدیک نیک خصلتوں کے اجتماع کا نام ادب ہے۔ حضرت ابوحفص رحمہ اللہ نے ظاہری حسن ادب کو باطنی حسن ادب کا آئینہ دار ہونا قرار دیا ہے اور مولانا رومی علیہ الرحمہ ادب کے حصول میں اس طرح نغمہ سنج ہیں:

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

یعنی ہم اللہ کی بارگاہ بے نیاز سے ادب جیسی گراں قدر چیز مانگتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔

مولانا روم علیہ الرحمہ کا مکمل نام جلال الدین محمد ہے۔ مولانا رومؔ کے لقب سے مشہور ہیں۔ 6/ربیع الاول 604ھ کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا ددھیال صدیقی اور ننھیال علوی ہے۔ آپ کے والد بزرگوار ایک عظیم صوفی تھے۔ مولانا روم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد، آپ ملک شام میں تحصیل علوم کے لیے تشریف لے گئے۔ سات سال تک دمشق میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔

اسی زمانے میں آپ کی ملاقات حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ ظاہری، باطنی مکالمے کے بعد مولانا روم ان سے مرید ہوئے اور ایک ہی سال میں اس مردِ مومن کی نگاہِ کیمیا اثر نے مولانا کی زندگی میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا جس نے ایک متبحر عالم و فاضل اور واعظ کامل کو صوفی اور خانقاہی بنا دیا۔ 68 سال 3 ماہ کی عمر میں 5/جمادی الاخری 672ھ کو وصال ہوا۔ قونیہ (ترکی) میں آپ کا مزار پُر انوار زیارت گاہِ ابرار و اخیار ہے۔ مولانا روم علیہ الرحمہ کی شہرہ آفاق تصنیف ''مثنوی معنوی'' کی 6 جلدیں ہیں۔ جو آپ کے مرید خاص حسام الدین چلپی کی فرمائش پر دس سال کے عرصہ میں مکمل ہوئیں۔ یہ ایسی مشہور زمانہ تصنیف ہے کہ ہر زمانے میں اہلِ نسبت اس کا مطالعہ کر کے قلبی و روحانی کیف و جذب سے سرشار ہوتے رہے ہیں اور آج بھی کامل دلچسپی کے ساتھ مثنوی شریف پڑھی اور سنی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

یعنی اگر کسی کو مردِ کامل تلاش کے باوجود بھی نہ ملے تو اُس کو چاہئے کہ وہ مولانا رومؔ کی مثنوی شریف کا مطالعہ کرے تا کہ خدا تیرے اندر سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دے اور اس کی برکت سے تجھے پیرِ کامل مل جائے گا۔

مولانا رومؔ کے علم و فضل اور اعلیٰ تحقیق کا سب سے بڑا شاہد اور سب سے زیادہ روشن دلیل مثنوی شریف ہے جس سے مولانا کی وہ وقعت اور دستگاہ ظاہر ہو جاتی ہے جو ان کو علم تفسیر و حدیث، عقائد و تصوف اور دیگر تمام علوم میں حاصل ہے۔ آیاتِ قرآنی کی شرح جس خوبی سے کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ ارشادات نبوی کا محمل و منشا جس طرح وہ سمجھاتے ہیں دوسرے کے بس کا کام نہیں، عقائد و تصوف کے باریک و دقیق مسائل کو بیان کر کے واضح اور صاف مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین کرانے میں تو انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عام نصائح جس کثرت کے ساتھ مثنوی میں موجود ہیں شاید و باید کسی کتاب میں ہوں اور خاص صوفیانہ امثال و نصائح کا گویا خزانہ ہے۔ مثنوی کی اس جامعیت اور حسن نے سب کی زبان سے یہ کہلوا دیا ہے:

مثنوی مولویِ معنوی
ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مولانا رومؔ کی مثنوی شریف کی حقیقت بیان کرنا اور اُس پر پوری طرح نظر ڈالنا اور اس کے حقائق و دقائق کو دکھلانا اُن ہی اہل کمال کا کام ہے جو کتاب موصوف کے ماہر اور بحرِ تصوف

کے شناور ہونے کے علاوہ تمام علوم میں اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت نے ظاہری عقل کامل وذہن ثاقب، معرفتِ باطنی اور بصیرت حقیقی بھی عطا فرمائی ہو۔ لہٰذا ہم جیسے کم سواد و بے بضاعت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم بقدر ظرف سنتے، پڑھتے اور سمجھتے رہیں اور روحانی سکون حاصل کرتے ہیں۔

اخیر وقت میں مولانا روم نے اپنے خاص لوگوں کو جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

اُوصیکم بتقوی اللہ فی السّر والعلانیة و بقلة الطعام، وقلة المنام و هجرانِ المعاصی والآثامِ و مواظبة الصیام و دوام القیام و ترک الشهواتِ علی الدوام و احتمال الجفاءِ من جمیع الآثام و ترکِ مجالسة السفهآء والعوام. و مصاحبة الصالحین والکرامِ و ان خیرا الناس من ینفع الناس و خیر الکلام ما قل ودل.

یعنی میں تم کو ان باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: ظاہر و پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنا۔ کم کھانا، کم سونا، گناہوں کو چھوڑنا۔ اکثر روزے رکھنا اور رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہنا۔ ہمیشہ خواہشاتِ نفسانی کو ترک کرنا۔ جو لوگ ایذا پہنچائیں اس کو برداشت کر لینا۔ عوام کم عقل اور بے وقوفوں کے پاس نہ بیٹھنا- نیک شریف، دین داروں کی صحبت میں رہنا۔ بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور بہترین بات وہ ہے جو مختصر ہو اور مفید و مدلل ہو-

صحبتِ صالح تُرا صالح کند
صحبتِ طالح تُرا طالح کند

○○○

امیر خسرو کی عربی نثر نگاری

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ امیر خسرو فارسی کے ایک بے مثال شاعر ہیں لیکن اس وقت جو سوال زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ امیر خسرو کو عربی نثر نگاری پر قدرت تھی یا نہیں، بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ امیر خسرو عربی زبان وادب سے اچھی طرح واقف نہیں تھے، انہیں مورخین میں ایک وحید مرزا بھی ہیں (۱)۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے بعض فارسی اشعار میں اپنے ترکی الاصل ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے اور اپنے ہندنژاد ہونے پر مسرت وشادمانی کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ انہیں عربی نہیں آتی، چنانچہ اپنے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن
(۲)

لیکن بحث ونظر کے بعد جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نظریہ کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے، جس نے بھی ان کی تصنیفات اور ان کے دیوان کا مطالعہ کیا ہوگا اس پر یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ ان کو عربی زبان وادب پر بڑی قدرت ہے، ان کے سیکڑوں عربی اشعار موجود ہیں، اور ان کی کتابوں میں عربی نثر کے بہت سے خوبصورت نمونے موجود ہیں۔

اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ لفظ ادب عربی زبان سے آیا ہے، اور مختلف ادوار میں اس کے مختلف معانی مراد لیے جاتے رہے ہیں، اور علماء نے بڑے بحث ونظر کے بعد ادب کی یہ تعریف کی ہے:

''ادب وہ کلام ہے جو عقل وشعور کی بڑی دقیق عکاسی کرے''۔ (۳)

ادب کا اطلاق شعر ونثر دونوں پر ہوتا ہے، ہمیں اس مقام پر شعر وشاعری پر کوئی گفتگو نہیں کرنی ہے البتہ نثر کے تعلق سے ابن رشیق نے لکھا ہے کہ بکھرے ہوئے موتی کا نام نثر ہے

(۴)۔ گویا نثر ہراس کلام کو کہیں گے جو منظوم نہ ہو، جس میں وزن اور قافیہ نہ ہو، اس لحاظ سے ہم جو روزمرہ کی گفتگو کرتے ہیں وہ بھی نثر میں شامل ہوگی، لیکن مورخین ادب کو اس قسم کی نثر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس نثر پر گفتگو کرتے ہیں جس پر ادب کا اطلاق ہو سکے، جس میں کوئی فنی جمال، جس نثر میں کوئی تاثیر ہو، جس میں نثر نگار نے خاص اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے جذبات اپنے خیالات اور اپنی خوبصورت فکر کی رنگ آمیزی کی ہو۔

امیر خسرو کی کتابوں اور ان کے دیوان کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں عربی فنی نثر کے بہت سے نمونے موجود ہیں، جن کی ایک فنی تاثیر ہے، جن کی جانب دل کا میلان ہوتا ہے، اور طبیعت ان کے پڑھنے پر مجبور نظر آتی ہے، امیر خسرو کے مجموعۂ آثار میں فنی نثر کے عربی نمونے کئی طرح کے ہیں، چند عربی خطبے ہیں جو انہوں نے اپنی فارسی کتابوں کے آغاز میں لکھے ہیں، سو سے زائد عربی مقولے ہیں جو ان کے طبع زاد ہیں، اس کے علاوہ بہت سے رنگا رنگ عربی جملے ہیں جو انہوں نے مختلف مواقع پر استعمال کے لیے لکھے ہیں مثلاً زندوں اور مردوں کے لیے دعا اور بددعا کے جملے، عاشق ومعشوق کی زبانوں سے ممکنہ طور پر نکلنے والے جملے، مبارکبادی کے جملے، اور ان کے علاوہ بہت سے جملے جو انہوں نے مختلف مواقع پر استعمال کے لیے لکھے ہیں، ان جملوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ بالکل انوکھے ہیں، اور یہ سب کے سب امیر خسرو کے طبع زاد ہیں، جو ان کی تفصیلات دیکھنے کے خواہش مند ہوں ان کو امیر خسرو کی کتاب اعجاز خسروی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہم یہاں ذیل میں ان کی مختلف کتابوں سے عربی نثر کے مختلف النوع نمونے ذکر کرتے ہیں:

خزائن الفتوح کے خطبے میں لکھتے ہیں:

"الحمد لله الفتاح الذی فتح خزائن الفتوح علی دین محمد وأعز جمیع انصاره بنصر موبد، أعز شانه واعلی سلطانه، والصلوٰة والسلام علی نبی السیف الذی شق باشارة قلب القمر والصدد، ووضح من برهانه القاطع ولقد نصركم الله ببدر، والتحیة والسلام علی آله واصحابه الكرام المنبهین للنیام باللسان والحسام". (۵)

اعجاز خسروی کے پہلے رسالہ کے خطبے میں لکھتے ہیں:

"الحمد لله الذی خلق القلم للرقم، وخلق النسم لرقم القلم وأجری قلمه علی الخلق بالحكم والحكم، وجعل القلم علما للعلم فی العالم، كما قال عز وجل: علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم، والصلوٰة علی الرسول الذی أنزل إلیه الكتاب

وبرئ به اللوح والقلم، لما یصدر منهما الصدق والصواب، وعلی آله واصحابه ذوی الفضل والآداب، ثبتنا الله علی اتباعهم للنجاة یوم الحساب." (٦)

دیوان نہایۃ الکمال کے خطبے میں لکھتے ہیں:

"بسم الله الواهب الذی وهب الشعراء المتبحرة أقلاما جاریة علی بحور الاشعار وجعل محابرهم آبارا تفیض من قطر قطراتها البحار، حتی یجری منها الظلام والضیاء، ذلک فضل الله یوتیه من یشاء، أحمده وأمدح أحمده محمدا الذی فاح طیب الوحی من فیه وأنزل إلیه لاریب فیه، علیه صلوٰة الحكیم العلیم، ذی الفضل العظیم، وعلی أصحابه الذین فضلهم الله علی أفاضل الأمم بفضائل النعم، انه طلعنا رویّا من بحور رحمته، نزل علیهم اجمعین. (٧)

امیر خسرو نے اپنے استاذ علامہ شہاب الدین کو تحریر کردہ اپنے ایک طویل عربی خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک مختصر اقتباس ہے:

"أما بعد فان مرقوقک القدیم خسرو ین لاجین یعرف بالندیم وضع المقلة الیمنی علی سدتک العلیاء وسود التراب بمس السواد حتی یصیر كحلا، فكحل بعین الوداد، ثم امضی علی رأیک المنیر مضی البدر المنیر أن الصانع تعالی عن الخطاء قلمه فی إنشاء المصنوعات وتنزه عن الغلط رقمه فی إبداع المنشآت، وهب لی بفضله العظیم فهیّا فیها الاهواء، إن الفضل بید الله یوتیه من یشاء "(٨)

اب تک جو نمونے پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق خطبات اور مکتوبات سے تھا، اب ہم ان مقولوں، دعاؤں اور مختلف چھوٹے چھوٹے نثری جملوں کو ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ہمارے لیے یادگار چھوڑے ہیں، لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ فنی نثر میں امثال اور مقولوں کی کیا اہمیت ہے اس پر تھوڑی سی روشنی ڈال لی جائے۔

مبرد کہتے ہیں کہ مثل مثال سے ماخوذ ہے، اور مثل اس مشہور قول کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کے حال کی پہلے کے حال سے مشابہت پائی جاتی ہو، ابن السکیت کہتے ہیں: مثل وہ لفظ ہے جس کے الفاظ تو مضروب لہ کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں لیکن معنی اسی کے حال کے موافق ہوتے ہیں۔

ابراہیم نظام مثل کے اجزائے ترکیبی کے تعلق سے لکھتے ہیں: مثل میں چار ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے کلام میں نہیں ہوتی، پہلا ایجاز، معنوی کمال، حسن تشبیہ، عمدہ کنایہ، اور اسی پر تو بلاغت مکمل ہو جاتی ہے، ابن المقفع لکھتے ہیں: مثل بولنے میں واضح، سننے میں پیارا اور معنوی لحاظ

سے سب سے زیادہ وسعت لیے ہوتا ہے۔(۹)

امثال کے ذریعہ خطیب اپنی تقریر کو آراستہ کرتا ہے، نثر نگار اپنی نثر میں رنگ و روغن لگاتا ہے اور شاعر اپنے شعر میں گل بوٹے جڑتا ہے، اور عام لوگ بھی اپنی گفتگو میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث میں بھی کثرت کے ساتھ مثلیں بیان کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**مثل الحیوۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض فاصبح ھشیما تذروھا الریاح**" (۱۰)۔ اور حدیث پاک میں ہے: "**مثل المنافق کالشاۃ العائرۃ بین الغنمین**" (۱۱)۔

امیر خسرو نے جو عربی مثلیں لکھی ہیں ان میں مختلف قسم کی چیزوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً کچھ مثلیں ایسی ہیں جن کا تعلق دین سے ہے، کچھ کا تعلق آسمان اور آسمان کے ستاروں سے ہے، کچھ کا تعلق برجوں سے ہے، عناصر اربعہ اور دوسری فلکیات کی چیزوں کی مدد سے بھی بہت سی مثلیں تیار کی گئی ہیں، کچھ میں جانوروں، چوپایوں، پرندوں، پودوں اور جمادات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔

دینی امور کا سہارا لے کر تیار کیے گئے امثال کچھ اس طرح ہیں:

(۱) **ما أضحی نور الله فی خلد الظالم** (ظالم کے دل میں اللہ کا نور نہیں رہتا) (۲) **حفظ الله لحیة هارون من أخذ موسی** (اللہ تعالیٰ ہارون کی ریش کو موسیٰ کی گرفت سے بچائے) (۳) **لن یامن احد من ابی یحییٰ ولو خضر وعیسی** (ابو یحیٰ (موت) سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا خواہ وہ خضر اور عیسیٰ ہی کیوں نہ ہو) (۴) **کل من مات فی حیّ عیسی لیس یجب أن یحی** (ہر وہ شخص جس کو عیسیٰ علیہ السلام کی گلی میں موت آجائے ضروری نہیں کہ اس کو حیات مل جائے) (۵) **الضعیف من کنف ذی الامان کنمل علی کتف سلیمان** (پناہ دینے والے کے پہلو میں کمزور انسان ایسے ہی ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے شانے پر چیونٹی) (۶) **سکین إبراهیم لایذبح إسماعیل** (ابراہیم کی چھری اسماعیل کو ذبح نہیں کر سکتی) (۷) **لذة الدنیا للأنام کلذة الاحتلام فی المنام** (لوگوں کے لیے دنیا کی لذت ایسی ہے جیسے احتلام کی لذت) (۸) **من مال إلی المال مات فی الآمال** (جو مال کی طرف مائل ہوتا ہے آرزوؤں میں ہی اس کو موت آتی ہے)۔

عناصر اربعہ سے تیار کی گئی مثلیں اس طرح ہیں:

(۱) **قلیل النار تخمد بالریح وکثیرها توقد منها** (تھوڑی سی آگ ہوا سے بجھ جاتی ہے اور زیادہ آگ ہوا سے روشن ہوتی ہے) (۲) **أمر الریاح علی الغبار نافذ وعلی الجبال نافذ** (ہوا کا حکم غبار پر چلتا ہے، پہاڑ پر نہیں) (۳) **لایمضغ الجمر بأسنان البرد**

(انگارے کو اولے کے دانت سے نہیں چبایا جا سکتا) (۴) **لم تحصل الری برؤیة الاسنان** (برف جیسے دانتوں کو دیکھ کر پیاس نہیں بجھ سکتی) (۵) **اذا سقط الریاحین فالتراب مسکی** (اگر پھول مٹی پر گر جائے تو مٹی بھی خوشبودار ہو جاتی ہے)۔

جانوروں، چوپایوں اور پرندوں اور جمادات کے استعمال سے تیار کی گئی مثلیں کچھ اس طرح ہیں:

(۱) **الاعتلاق بناب الفیل اسهل من التعلق بباب البخیل** (ہاتھی کے دانت سے چمٹنا بخیل کے در سے چمٹنے سے زیادہ آسان ہے) (۲) **اذا زاد شعیر الفرس جال علی جو** (گھوڑے کا چارہ جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ فضا میں اڑتا ہے) (۳) **رقص البعیر یلیق بصوت الحمیر** (اونٹ کا رقص گدھے کی آواز پر ہی مناسب ہے) (۴) **أذن الارنب علم للفرار** (خرگوش کے کان فرار کی نشانی ہیں) (۵) **تمکن العنقاء فی القاف تمکن القاف فی العنقاء** (عنقاء پرندہ کوہ قاف میں ایسے رہتا ہے جیسے لفظ عنقاء میں قاف) (۶) **ما بلغ ماء البحر علی نحر البط** (سمندر کا پانی بھی بطخ کی گردن تک نہیں پہنچتا) (۷) **بلغ اجل العصفور حین لعب مع البازی** (جب گوریا باز کے ساتھ کھیلے تو سمجھ لو کہ گوریا کی موت آگئی) (۸) **ریش الدیک لیس من المحاسن** (مرغ کی ڈاڑھی حسن نہیں ہے)، **إذا حان بضفدع البئر منیته اعتصم بحبل الحیة** (جب کنویں کے مینڈک کی موت آتی ہے تو وہ سانپ کی رسی تھامتا ہے) (۹) **سنان البطل لسان الاجل** (بہادر کا نیزہ موت کا پیغام بر ہوتا ہے) (۱۰) **اذا خرج الحیة من حجر قتلت بالحجر** (جب سانپ سوراخ سے نکلے تو اس کو پتھر سے قتل کر دیا جائے)۔(۱۲)

امیر خسرو نے رنگا رنگ دعاؤں کے جو نمونے ذکر کیے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) **شوس القبول صدغها کتشویس القلوب** (پروائی ہوا اس کی کنپٹی کے بال کو ایسے پریشان رکھے جیسے اس نے عاشقوں کے دلوں کو پریشان کیا) (۲) **دام شبکة صدغها** (اس کی کنپٹی کا بال دام عاشقاں بنا رہے) (۳) **لا زالت ذوائبها مسودة** (اس کی زلفیں سیاہ رہیں) (۴) **جعل الله ترائبها نوراً لشعاع خدها** (اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو اس کے رخسار کا نور بنا دے) (۵) **أنبت الله عشقة العشق علی قبرها من دموع العاشقین** (اللہ تعالیٰ عاشقوں کے آنسو سے اس کی قبر پر عشق کا پودا اگائے) (۶) **عذبها الحنّان بنیاحة المتهمین** (اللہ تعالیٰ غم عاشقی میں رونے والوں کے سبب اسے عذاب دے) (۷) **نور بیاض عینیه بسواد خالنا** (ہمارے تل کی سیاہی سے اس کی آنکھوں کی پتلی منور ہو) (۸)

حشره الله مع المجنون (اللہ اسے مجنون کے ساتھ اٹھائے)(۹) **طال لياله كأصداغي** (اس کی رات میرے کنپٹی کے بال کی طرح طویل ہو)(۱۰) **طال عليه سلسلة العذاب كجعده** (اس کے گھنگھریلے بال کی طرح اس پر عذاب کا سلسلہ طویل ہو۔)(۱۳)

امیر خسرو کی عربی نثر نگاری پر کچھ لکھتے ہوئے علم بلاغت میں ان کی مہارت کا ذکر فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، کیوں کہ کوئی بھی نثر نگار جب تک علم بلاغت سے اسے حصہ نہ حاصل ہو وہ اچھی نثر نہیں لکھ سکتا۔ ان کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ علم بلاغت پر انہیں زبردست مہارت حاصل تھی، اور اس دعوی پر ان کی کتاب اعجاز خسروی اور غرۃ الکمال کا دیباچہ شاہد ہے، خاص طور سے اعجاز خسروی جس کو رسائل الاعجاز کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اس میں امیر خسرو نے مختلف بلاغی بحثیں کی ہیں اور ان کے جو نمونے انہوں نے پیش کیے ہیں وہ عموماً طبع زاد ہیں۔

علم بلاغت کا اطلاق علم معانی، بیان اور بدیع پر ہوتا ہے، علم معانی، علم بیان اور بدیع پر ان کی مہارت کا اندازہ تو مذکورہ نمونوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ علم بدیع میں ان کو جو ابداعی قوت اور تخلیقی صلاحیت عطا ہوئی ہے وہ دوسروں سے بہت ممتاز ہے بلکہ انہوں نے بہت سے محسنات لفظی اور معنوی کے تعلق سے انفرادیت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ وہ دعوی کتنا درست ہے ہمیں اس سے بحث نہیں، ہمیں بحث اس بات سے ہے کہ ان کو علم بلاغت پر بڑی قدرت حاصل ہے اور اس کے ذریعہ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان کو عربی نثر نگاری پر کتنی قدرت رہی ہوگی۔

ہم ذیل میں ان چند صنائع کا ذکر کرتے ہیں جن میں تفرد کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے:

۱۔ ذو الوجہین یہ صنائع کی ایک قسم ہے جس میں کسی عبارت کو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ لفظوں میں تبدیلی کر کے اس کو مختلف زبانوں میں پڑھا جا سکے، مثلاً امیر خسرو لکھتے ہیں:

رسیدی، بدیدی، مرادی، بہ خانے
زمانے بہ باشی بہ یاری نسائی

اس کلام منظوم کو عربی میں اس طرح پڑھا جا سکتا ہے:

رشيدي، نديدي، مرادي نجاتي
رماني بباس تباري نسائي
(۱۴)

۲۔ قلب اللسانین: یہ بھی صنائع کی ایک قسم ہے اور ایسا جملہ لکھنا جس میں اس جملہ کو دوسرے کنارے سے پڑھا جائے وہ دوسری زبان میں بامعنی بھی ہو جائے، اسے قلب اللسانین

کہتے ہیں:

حضرت امیر خسرو لکھتے ہیں:

بیائی یار کہ ما کاری کنیم بہم
ہر جا کہ باش بامن باش

اس شعر کو دوسری طرف سے پڑھا جائے تو عربی میں اس طرح عبارت بنے گی:

مهب مينك يراك أمك رأى يائب
شاب نم آب شابهك أجره
(۱۵)

۳۔ وصل الحرفین: یہ بھی صنائع کی ایک قسم ہے جس میں استعمال کیے گئے کلمات مفرد نہیں ہوتے بلکہ دو حرفی ہوتے ہیں:

امیر خسرو لکھتے ہیں:

عش نزهة حاطك فاليم سائل
فاجب لربك ماتوقع عويل
(۱۶)

خاتمہ

مختلف گوشوں سے کی گئی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر خسرو کو عربی نثر نگاری پر بڑی قدرت تھی اور ان لوگوں کا نظریہ درست نہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ امیر خسرو عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہیں تھے لیکن ہم ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ امیر خسرو کی نثر نگاری قاضی فاضل اور حریری و ہمدانی کے طرز کی ہے، اور ظاہر ہے کہ امیر خسرو کے عہد میں خود عرب نثر نگاروں کی بھی صورت حال یہی تھی کہ ان کا عمومی سرمایہ نثر فارسی اسلوب، فارسی تشبیہات اور فارسی مواد سے بھرا ہوا تھا، صنائع لفظی و معنوی کے دلدادہ تھے۔ جناس توریہ، اشتقاق کا کثرت سے استعمال کیا کرتے تھے، اور جس طرح اس دور میں کی گئی عربی نثر نگاری کو تاریخ ادب عربی سے نکالا نہیں جا سکتا ہے اسی طرح اس زمانے میں یا بعد کے زمانے میں غیر عرب قلم کاروں کی جانب سے اس طرز کی عربی نثر نگاری کو بھی تاریخ ادب سے خارج نہیں کیا جا سکتا اور بے وقعت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

حاصل یہ کہ امیر خسرو عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے بھی اپنے زمانے میں رائج اسلوب میں عربی نثر نگاری کی ہے، وہ جہاں ایک عہد کی نمائندگی کرتی ہے وہیں

امیر خسرو کی مختلف الجہات شخصیت کو واضح کرتی ہے، اور یقیناً ان کی عربی نثر نگاری ان کے معاصرین کے لحاظ سے کسی بھی طرح کمتر نہیں ہے، خصوصاً خیال کی رنگینی سے جوانہوں نے مختلف طبع زاد مقولے اور مثلیں لکھی ہیں اور جدت طرازی سے پر جو دعائیں انہوں نے انشا کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔

حواشی اور حوالے

(۱) The life & works of Ameer Khusru, V:I P: 34, Calcutta- 1935.

(۲) دیباچہ غرۃ الکمال، ص:۳، مطبوعہ ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ، بہار-۱۹۸۸ء

(۳) فصول فی النقد، ص:۳۷، مطبوعہ شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

(۴) طٰہ حسین، من تاریخ الادب العربی، ج:۲ ص:۴۱۳، دارالعلم للملائین، بیروت، ۱۹۸۲ء

(۵) امیر خسرو، خطبہ خزائن الفتوح، ص:۱، مطبوعہ، علی گڑھ:-۱۹۲۷ء

(۶) خطبہ اعجاز خسروی، رسالہ اولی، مطبوعہ منشی نول کشور، لکھنؤ-۱۸۷۶ء۔

(۷) خطبہ دیوان نہایت الکمال، مطبوعہ مکتبہ قیصریہ، دہلی ۱۳۳۲ھ۔

(۸) امیر خسرو، اعجاز خسروی، رسالہ ثانیہ، خط سادس، ص:۱۶۹، منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۶ء

(۹) المیدانی، ابوالفضل احمد بن محمد النیشاپوری، مقدمہ مجمع الامثال، ص:۶، المطبعۃ البہیۃ

(۱۰) القرآن الکریم، الکہف:۴۵۔

(۱۱) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان۔

(۱۲) اعجاز خسروی، رسالہ ثانیہ، خط سابع ص:۱۸۳-۱۸۹۔

(۱۳) نفس مصدر، ص:۱۹۰-۲۳۱۔

(۱۴) نفس مصدر، رسالہ ثالثہ، ص:۸۷، مطبوعہ منشی نول کشور، لکھنؤ-۱۸۷۶ء

(۱۵) نفس مصدر، ص:۶۴۔

(۱۶) نفس مصدر، ص:۸۷۔

(نوٹ: یہ مقالہ شاہ صفی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام سید سراواں الہ آباد میں اکتوبر ۲۰۱۰ء میں منعقد سیمینار بعنوان ''حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن'' میں پڑھا گیا تھا۔

○○○

مولانا ارشاد عالم نعمانی

امیر خسرو کی فارسی نعتیہ شاعری

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ (۶۳۸ھ/ ۷۲۵ھ) ہندوستان کے ایک شہرۂ آفاق فارسی شاعر اور صاحب دل صوفی بزرگ تھے- آپ اپنے وقت کے ولی کامل، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی ثم دہلوی کے بڑے چہیتے اور محبوب نظر مرید تھے- حضرت محبوب الٰہی کی صحبت و بیعت کے نتیجے میں جہاں آپ کی عملی زندگی میں انقلاب آیا وہیں آپ کی فکری، علمی اور فنی صلاحیتیں بھی خوب خوب پروان چڑھیں- متعدد سلاطین کے دربار سے وابستگی کے باوجود آپ کی عملی زندگی مرشد طریقت کی صحبت، عقیدت اور والہانہ وابستگی کے لحاظ سے مثالی ہے-

آپ کی شاعرانہ عظمت ولیاقت، بلند فکری اور قادرالکلامی پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اصحاب علم وادب نے آپ کی فارسی شاعری کے ساتھ ہندوی کلام نیز ان کی فارسی زبان دانی کے حوالے سے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے اور مختلف زاویۂ نظر سے جائزہ لیا ہے- تاہم آپ کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے- ارباب ادب جس طرح اردو شاعری میں نعتیہ شاعری کو ادبی مقام دینے اور اس کا ادبی تجزیہ کرنے سے دانستہ صرف نظر کرتے ہیں، اسی طرح فارسی شعرا کے کلام کے تجزیہ میں دوسرے اصناف وعناصر کو تو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں جب کہ نعتیہ شاعری سے صرف نظر کر جاتے ہیں- چنانچہ یہی کچھ حضرت امیر خسرو کے ساتھ بھی ہوا ہے- آپ کی شاعری کے دیگر پہلوؤں کو تو خوب خوب اجاگر کیا گیا ہے لیکن نعتیہ شاعری کا جائزہ اب تک تشنہ ہے-

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شاعرانہ کمالات کا ایک سرسری جائزہ پیش کر دیا جائے-

کمالات خسرو

حضرت امیر خسرو ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے- شاعری کا ملکہ آپ کے اندر فطری تھا- غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور رباعی سبھی اصناف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی-

متعدد زبانوں کے ماہر تھے-عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندوی میں ان کو کمال حاصل تھا-آپ کی شاعری کے نمونے ان زبانوں میں خوب ملتے ہیں- آپ ہندوستان میں فن موسیقی کے متعدد راگوں کے موجد تسلیم کیے جاتے ہیں-مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''انہوں نے اس فن کو اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا-''(۱)

فارسی شاعری کے تو وہ مسلم الثبوت استاذ تھے جس کا اعتراف ایرانی فضلا نے بھی کیا ہے-
بقول رام بابو سکسینہ: ''وہ اردو کے بھی سب سے پہلے شاعر تھے-''(۲)

عشق و محبت اور سوز و گداز ان کی خمیر کے نمایاں اجزا تھے-عشق مجازی سے جب عشق حقیقی کی طرف مائل ہوئے تو اس میدان میں ان کے پیر و مرشد محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا نے ان کی صحیح رہ نمائی فرمائی-عمر کے ابتدائی ایام سے ہی خسرو کو ایک پیر کامل کی صحبت میسر آ گئی- پیر و مرشد محبت میں آپ کو ''ترک اللہ'' کہا کرتے تھے-

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے حضرت امیر خسرو کو سلطان الشعراء، برہان الفضلاء اور شاعری میں ''یگانۂ عالم'' کے القاب سے یاد کیا ہے-وہ لکھتے ہیں:

''آپ سلطان الشعراء، برہان الفضلاء، وادی خطابت و سخن کے عالم فرید و وحید، نوع انسانی کے دونوں جہان میں منتخب اور بے پایاں تھے-مضمون نگاری، معنی آفرینی، شعر گوئی اور تمام اقسام سخن میں آپ کو وہ کمال حاصل تھا جو متقدمین و متاخرین شعراء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا- انہوں نے اپنے اشعار کو اپنے پیر کے فرمان و ارشاد کے مطابق اصفہانی طرز اور نہج پر کہا ہے-''(۳)

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ شعراء میں آپ کو ''خاتم الکلام فی آخر الزمان'' اور ''در دریائے معانی'' کے القاب سے یاد کیا ہے-خواجہ حافظ شیرازی نے انہیں ''طوطی ہند'' کے لقب سے یاد کیا ہے-ڈاکٹر نور الحسن خسرو کی نعتیہ شاعری کی نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کا نعتیہ کلام نہایت ہی دلکش، روح افزا اور ایمان پرور ہے-اگرچہ مقدار میں کم ہے مگر جو کچھ ہے وہ امتیازی شان کا حامل ہے اور مقبول خاص و عام ہے-اکثر شعرا زور بیان اور شدت جذبات کی وجہ سے اس راہ میں بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں-کوئی عبد و معبود کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے-کوئی سراپا نگاری میں ایسی بے سر وپا باتیں کہتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شایان شان نہیں-کسی نے نعت کی پاکیزہ صنف کو غزل بنا ڈالا اور کوئی صرف معجزات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے-

خسرو ادب شناس محبت اور رمز گاہ حقیقت تھے-وہ اپنے جذبات عقیدت کا اظہار خلوص کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن پاسِ ادب ملحوظ رکھتے ہیں-(۴)

امیر خسرو بحیثیت ثنا خوان مصطفیٰ

خدا کی محبت کے ساتھ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جزو ایمان ہے-قرآن کریم کا ارشاد ہے:''قل ان کنتم تحبون اللّٰه فاتبعونی یحببکم اللّٰه''-(۵)

اے محبوب! آپ فرما دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا-

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:''لا یؤمن احدکم حتی اکون احب إلیه من والده وولده والناس اجمعین''. (٦)

تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں-

حضرت امیر خسرو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے-اطاعت واتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ صادق ان کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتا تھا-اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ آپ بارگاہ رسول میں مقبول تھے-بارگاہ حبیب خدا میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے-آپ اپنے مرشد کی زبانی خود فرماتے ہیں:

''ایک دن میں نے مرشد کی زبانی سنا، آپ نے فرمایا: آج رات مجھے ایک آواز سنائی دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خسرو کو ''مداح'' (تعریف کرنے والا) کے لقب سے یاد فرما رہے ہیں-غیب سے ہمارے پاس یہ خطاب آیا ہے جو حضور سراپا نور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ہے اور ان شاء اللہ اس نام و خطاب کی بدولت یہ خادم بہت سے دیگر انعامات کا امیدوار ہے-''(۷)

حضرت امیر خسرو نے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں اپنی مثنوی اور غزل میں جگہ جگہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ و کمالات نبوت کا ذکر بڑے عارفانہ اور والہانہ انداز میں کیا ہے-

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کما حقہ مدح و ثنا بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، ہاں! صرف یہ ہو سکتا ہے کہ نعت گو شاعر کچھ اوصاف و کمالات محمدی کے بیان کے ساتھ اپنے قلبی احساسات و جذبات کا اظہار کر کے اپنی محبت و عقیدت کا خراج پیش کر سکے- چنانچہ یہی بات امیر خسرو پر بھی صادق آتی ہے-وہ حضرات جنہوں نے امیر خسرو کی شاعری کے نعتیہ عناصر کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے صاف طور سے خسرو کے والہانہ عشق رسول کا اعتراف کیا ہے بلکہ بعض نے تو ''فنا فی الرسول'' کے درجے پر آپ کا فائز ہونا بھی تسلیم کیا ہے-سید صباح الدین عبد الرحمٰن اپنی کتاب ''صوفی امیر خسروؔ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیر و شیخ نظام الدین اولیا کی طرح فنافی الرسول کے درجہ پر فائز تھے"۔ (۸)

حضرت امیر خسرو نے اپنے نعتیہ کلام میں جن خیالات و افکار کا خصوصیت سے بیان کیا ہے ان میں یہ موضوعات نعت بطور خاص قابل ذکر ہیں:

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث تخلیق کائنات ہونا۔

۲۔ آپ کا پرتو جمال الٰہی و مظہر ذات خداوندی ہونا۔

۳۔ بروز حشر عاصیوں کی شفاعت فرمانا۔

۴۔ نور من نور اللہ ہونا۔

۵۔ آپ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا۔

۶۔ آپ کا خیر الانام ہونا۔

۷۔ خلق خدا کی دعا مقبول ہونے کے لیے آپ کی ذات مقدسہ کا وسیلہ اور آپ کا شفیع ہونا۔

مندرجہ بالا اوصاف وہ ہیں جن کا ذکر انہوں نے بار بار کیا ہے۔ بطور نمونہ ذیل میں اس تعلق سے ان کی مثنویوں اور غزلوں میں سے کچھ منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور نور محمدی کی اولیت بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

شاہ رسل شفیع مرسل   خورشید پسیں و نور اول
ہم نور دہ چراغ بینش   ہم چشم و چراغ آفرینش
ثنا ہست تخت آسمانی   خوانندۂ تختۂ نہانی
سلطانِ ممالک رسالت   طغرائے صحیفہ جلالت

یا رسول اللہ! آپ رسولوں کے بادشاہ ہیں، شفیع خلائق ہیں، آپ کا نور پہلے اور آفتاب بعد میں پیدا ہوا۔ آپ عقل کے چراغ کو نور عطا کرنے والے ہیں۔ آفرینش کے چشم بھی ہیں اور چراغ بھی۔ آسمانی تخت کے شہنشاہ، لوح محفوظ کی تحریر پڑھنے والے۔ مملکت رسالت کے سلطان اور صحیفہ جلالت کے طغرا ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات باعث تخلیق کائنات ہے بلکہ اصل وجود کائنات ہے۔ اسے بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

زمویش چراغ را منشور لولاک   ز زلفش کعبہ را زنجیر افلاک
مسیحا از دم خود رفتہ جایش   خضر از آب حیواں شستہ پایش

یا رسول! اگر آپ نہ ہوتے تو آسمان پیدا نہ کیا جاتا اور کعبے کو بھی رفعت حاصل نہ ہوتی۔

حضرت عیسیٰ نے اپنے دم سے آپ کی جگہ صاف کی اور حضرت خضر نے آب حیات سے آپ کے قدم دھوئے۔

اولیت محمدی کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

ہنوز آدم اندر گل و آب بود   کہ او قبلہ ہفت محراب بود
خلیل از وجودش پر انوار گشت   کہ بروے گل نار گلنار گشت
سلیماں کہ شد شاہ دیو و پری   ازو یافتہ تاج و انگشتری
لقا پیش ازو کہ دہ موسی ہوس   نمودند سنگش کہ ایں پیش و بس
چوں ادریس در خلد شد پیش او   نگہداشت طوبی برخویش ازو
سماعیل رو مایہ داشت پاک   ازاں دشنہ نہ فگند خویش آفاک
بہ ملاحیتش نوح چوں در نشست   زبے آبی قدم خود باز دست
چناں سجدہ کردش مہ و آفتاب   کہ یوسف نہ دید آں کرامت بہ خواب
چوں جاں بخش شتر بہ نطق فصیح   نمانده زحیرت دم اندر مسیح
چوں از معجزاتش برانم سخن   فتد لرزہ در آسمان کہن

اختیارات مصطفیٰ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اے سخنت گنج خدا را کلید   گوہر آں گنج تو کردی پدید
از تو صلائے بہ الست آمدہ   نیست بہ مہمانی ہست آمدہ
غرۂ ماہ از خم ابروئے تست   طرۂ شام از شکن موئے تست

آپ کی بات خدا کے خزانے کی کنجی ہے۔ اس خزانے کا گوہر آپ ہی نے ظاہر کیا۔ آپ ہی کی وجہ سے الست کی آواز بلند ہوئی اور نیست ہست میں تبدیل ہو گیا۔ آپ ہی کا خم ابرو ہلال میں ہے۔ آپ ہی کے موئے مبارک کی شکن شام ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول قوی حجت آشکار   بہ حکمت درست و بہ حکم استوار

آپ رسول قوی اور آپ حق کے واضح ثبوت ہیں۔ آپ کی حکمت درست ہے اور آپ نے جتنا حکم دیا ہے وہ ہر طرح مضبوط ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم صفت شفیع عاصیاں ہونا بھی ہے۔ آپ دنیا و آخرت دونوں میں امت کے شفیع ہیں، لیکن حقیقی شفاعت کا اظہار و اعلان میدان محشر میں ہوگا۔ جہاں سب اولین و آخرین لواء الحمد کے نیچے جمع ہوں گے۔ حضرت امیر خسرو نے جگہ جگہ حضور

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصف خاص کا اظہار فرمایا ہے- چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عاصیاں را در آفتاب نشور　　ظل ممدود داد از منشور
ذات او خلق را کلید نجات　　ہم حیات جہاں ہم آب حیات

گناہ گاروں کو قیامت کے روز کے آفتاب کے نیچے آپ ہی کے حکم سے لمبا سایہ کیا جائے گا- آپ کی ذات مقدس مخلوق کے نجات کی کنجی ہے- دنیا کے لیے حیات بھی ہے اور آب حیات بھی-

امیر خسرو نے جہاں اپنی نعتوں میں اپنے مرشد کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کی ہے وہیں اساتذۂ فن کی تقلید میں بھی نعتیں کہی ہیں-

ذیل میں حضرت نظامی گنجوی اور امیر خسرو کے کچھ متوازی نعتیہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اے ختم پیغمبرانِ مرسل　　خلوائے پسین وملح اول　(نظامی)
شاہ رسل وشفیع مرسل　　خورشید پسین ونور اول　(خسرو)
اے عالم کشور کفایت　　فرمان دہ جملہ ولایت　(نظامی)
سلطانِ ممالک رسالت　　طغرائے صحیفۂ جلالت　(خسرو)
اے خاک تو توتیائے بینش　　روشن بہ تو چشم آفرینش　(نظامی)
ہم نوردہ چراغ بینش　　ہم چشم و چراغ آفرینش　(خسرو)
خاک تو ادیم روئے آدم　　نور تو چراغ ہر دو عالم　(نظامی)
گنجینۂ کیمیائے عالم　　پیش از ہمہ پیشوائے عالم　(خسرو)
ستون شد خرد مند از پشت او　　مہ انگشت کش گشت ز انگشت او　(نظامی)
حمایت نشیں چرخ ازمشت او　　مہ از داغداران انگشت او　(خسرو)

ان اشعار کو سید صباح الدین عبدالرحمٰن نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”مقابلہ وموازنہ سے قطع نظر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ نظامی گنجوی نے جس جذبۂ پاک سے اپنی نعتیں کہی ہیں اسی والہانہ جذبے سے خسرو نے بھی اپنے نعتیہ اشعار کہے اور جس طرح نظامی نے ہر نعت کے بعد معراج کا ذکر کیا ہے، اسی طرح خسرو نے معراج محمدی لکھ کر اپنی عقیدت ومحبت کے نذرانے پیش کیے ہیں، جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد ہی کی طرح عشق رسول میں فانی تھے-(۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات اس قدر بلند پایہ ہیں کہ اس کے بیان سے انسانی عقل عاجز ہے- ہر شاعر وصف رسول کے بیان میں اپنی کوتاہ نظری اور عجز کا اعتراف کرتا

ہوا نظر آتا ہے- حضرت امیر خسرو نے بھی ایک جگہ اپنے اعترافِ عجز کا اظہار یوں کیا ہے:

وصفش از حد عقل وجاں برتر　　بارگاہش از لامکاں برتر

آپ کا وصف بیان کرنا عقل سے باہر ہے- آپ کی بارگاہ لامکاں سے بہتر ہے-

مآخذ و مراجع

۱- شعر العجم ج:۲، ص:۱۳۵، مطبوعہ اعظم گڑھ

۲- تاریخ ادب اردو، سکسینہ

۳- اخبار الاخبار مترجم: ص:۲۶۱، مطبوعہ، دہلی

۴- ص: ۲۵، مقدمہ دیوان امیر خسرو، مطبوعہ لکھنؤ

۵- آل عمران

۶- متفق علیہ

۷- اخبار الاخیار مترجم، ماہ نور پبلیکیشنز، دہلی ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء

۸- ص: ۱۳۵_ صوفی امیر خسرو، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دار المصنفین اعظم گڑھ

۹- ایضاً

(نوٹ: یہ مقالہ شاہ صفی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام سید سراواں الہ آباد میں اکتوبر ۲۰۱۰ء میں منعقد سیمینار بعنوان ”حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن“ میں پڑھا گیا تھا-

○○○

زاویہ

حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں پر خصوصی گوشہ

آئینۂ حیات

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

نام: احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی

عرف: مجدد الف ثانی

لقب: شیخ لاثانی، امام ربانی، مجدد الف ثانی

ولادت: ۱۴ شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء

اساتذہ ومشائخ: والد ماجد شیخ عبدالاحد سرہندی، شیخ کمال الدین کشمیری، شیخ یعقوب صرفی، قاضی بہلول بدخشی، شاہ سکندر کیتھلی، شیخ رضی الدین محمد باقی باللہ عرف خواجہ باقی باللہ دہلوی

کمالات: مجدد، صوفی، واعظ، مصنف، شاعر، فقیہ، محدث

مسلک: حنفی، ماتریدی

اجازت وخلافت: شیخ عبدالاحد چشتی (۱۰۰۷ھ) شاہ سکندر کیتھلی قادری (۱۰۲۳ھ) خواجہ باقی باللہ نقش بندی (۱۰۱۲ھ)

خرقۂ قادریت: حضرت شاہ کمال قادری کیتھلی نے شاہ سکندر کیتھلی قادری کو خرقۂ قادریت عطا کرتے ہوئے حضرت مجدد تک پہنچانے کی وصیت کی تھی۔ حضرت شاہ سکندر کیتھلی قادری نے اسے مجدد صاحب کو عطا کیا اور آپ نے اسے زیب تن فرمایا۔

ممتاز تلامذہ وخلفا: خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد معصوم، خواجہ آدم بنوری، بدیع الدین سہارن پوری، بدرالدین سمرقندی، خواجہ عبید اللہ، خواجہ عبداللہ، عبدالہادی بدایونی، صالح کولابی، احمد برکی، یار محمد جدید بدخشی، یوسف سمرقندی، نور محمد پٹنی، میر محمد نعمان، حمید بنگالی، محبّ اللہ مانک پوری، طاہر لاہوری۔

تجدیدی اور اصلاحی کارنامے :امراوسلاطین کودعوت-علماے سواور جاہل صوفیہ کی اصلاح-ملکی اور بین الاقوامی سطح پر دعوتی وفود کی روانگی-شریعت وسنت کا احیا-سالکین وطالبین کی تربیت-مکتوبات کے ذریعے اصلاح واحیاے دین-زمانۂ اسیری میں غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ-وعظ ونصیحت-مخلوق کا رجوع عام اور توبہ وانابت وغیرہ-

تصنیفات: تعلیقات عوارف، حاشیہ عقائد جلالی، رسالہ فی اثبات النبوۃ، مبدا ومعاد، مکاشفات غیبیہ، معارف لدنیہ، ردالرفضہ، مقصود الصالحین، مسئلۂ وحدۃ الوجود، جذب وسلوک، آداب المریدین، مجموعۂ تصوف، مکتوبات شریف تین جلدیں وغیرہ-

معاصر علماو مشائخ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ محبّ اللہ الٰہ آبادی، شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ شہباز محمد بھاگل پوری، شیخ طیب بن معین بنارسی، شیخ تاج الدین سنبھلی، میر سید عبدالواحد بلگرامی، میر سید عبدالجلیل بلگرامی، ملا عبدالقادر بدایونی، مولانا عبداللہ انصاری، شیخ نظام الدین تھانیسری، شیخ نورالحق بن عبدالحق دہلوی وغیرہ-

وفات: ۲۹صفر ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء

پروفیسر اختر الواسع

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء-۱۶۲۴ء) عہد اسلامی کے ہندوستان کی وہ عظیم شخصیت ہیں جس نے انتہائی نازک عہد میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی- شیخ احمد کو دو وجہوں سے مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے-ایک تو آپ تاریخ اسلامی کے دوسرے ہزارے میں پیدا ہوئے اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ اس امت میں ہر سو سال پر ایک شخص اٹھے گا جو دین کی تجدید کرے گا اور مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارنامے ہزار سال کے سرے پر ظہور پذیر ہوئے اس لیے ان کو الف ثانی یعنی دوسرے ہزارے کا مجدد کہا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے نظریۂ الف ثانی یعنی یہ کہ اسلام اپنی تاریخ کے ہزار سال مکمل کر چکا جو کسی مذہب کی طبعی عمر ہوتی ہے، اب نئے ہزارے میں نئے دین کی ضرورت ہے- شیخ احمد نے اس نظریے کو اپنے قول وعمل سے باطل قرار دیا اور بتایا کہ اسلام کی عمر کو پہلے یا دوسرے ہزارے میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ رہتی دنیا تک چراغ ہدایت ہے-اس لیے شیخ احمد کو مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے-شیخ کے ایک معاصر اور بہت بڑے عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے آپ کو یہ لقب دیا اور ایسا مشہور ہوا کہ اب صرف مجدد الف ثانی بھی کہا جائے تو اس سے مراد شیخ احمد سرہندی ہی ہوتے ہیں-علامہ اقبال نے شیخ احمد کے دربار میں حاضری دے کر اس طرح خراج عقیدت پیش کیا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

شیخ احمد نے جو تجدیدی کارنامہ انجام دیا اس کے تین پہلو ہیں-ایک سرکاری، دوسرے علما اور تیسرے صوفیہ، سرکاری سطح پر اس دور میں اکبر کے دین الٰہی کا چرچا تھا-اکبر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب اسلام کو آئے ہوئے ایک ہزار سال پورے ہو گئے جو کسی بھی مذہب کی طبعی عمر ہے، اس لیے اب اسلام کو ختم کر کے نئے دین کا آغاز ہونا چاہیے-اکبر کے بعض درباری علما جیسے ابوالفضل، فیضی اور ان کے والد ملا مبارک، میر فتح اللہ شیرازی اور شریف آملی وغیرہ نے اکبر کی اس سلسلے میں بڑی مدد کی بلکہ سچ یہ ہے کہ انہی درباری علما نے اکبر کو یہ راہ سجھائی اور اکبر نے مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کو یکجا کر کے ایک نیا دین تیار کروایا جس کا نام دین الٰہی رکھا اور سرکاری طور پر اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا۔لیکن یہ مذہب تو پورے طور پر ناکام ہو گیا اور چند درباری لوگوں کے سوا کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا- البتہ اس کے اثرات اسلام پر بہت ناروا مرتب ہوئے-رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو کھلے عام تنقید کا نشانہ بنایا جاتا-وحی کا مذاق اڑایا جاتا-قیامت اور حشر ونشر کے تصورات کو نشانۂ تضحیک بنایا جاتا-شریعت کے محرمات کو حلال کرنا شروع کر دیا گیا اور حلال چیزوں پر پابندی لگائی گئی-خطبۂ جمعہ میں سے صحابہ کے نام نکال لیے گئے۔عربی مدارس کی امداد موقوف کر دی گئی، مجوسیت کے زیر اثر آگ کی عظمت کا بیان ہونے لگا وغیرہ، بہت سے اعمال ہیں، جن کا تذکرہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں، ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اور خود شیخ احمد سرہندی نے مکتوبات میں کیا ہے-

ان نامساعد حالات میں اسلام کے لیے بحیثیت ایک مذہب زندہ رہنا مشکل ہو گیا- متعدد مقامات پر مسجدیں شہید کی گئیں اور اسلامی اعمال کی انجام دہی مشکل ہو گئی- اسلام کے ارکان کو نشانۂ تضحیک بنایا جانے لگا حتی کہ بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جانیں بھی محفوظ نہیں رہیں-شیخ احمد نے اپنے خطوط میں اسلام کی اس زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے- مثال کے طور پر دیکھیے :(مکتوبات جلد اول، مکتوب نمبر ۹۲، ۱۹۵ اور ۴۷)

اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلے میں جہانگیر کو بعض ایسے درباری امرا کی حمایت حاصل ہو گئی جو اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف تھے-خاص طور پر صدر جہاں، امیر خاں اور شیخ فرید کی حمایت مل جانے سے جہانگیر تخت نشین ہوا-شیخ احمد نے ان تمام امرا کو خطوط لکھے اور ان کو توجہ دلائی کہ وہ اسلام کو از سر نو نافذ کرنے کی جدو جہد کریں-مثلاً صدر الصدور صدر جہاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''اب جب کہ صورت حال بدل چلی ہے، لوگوں کی عداوتیں کم ہو چکی ہیں، اسلامی زعما، صدر اسلام اور علمائے اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کریں-اسلام کے جو ارکان منہدم ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ رائج کریں-اگر بادشاہ شریعت مصطفویہ کے نفاذ میں کوشاں نہ ہوا اور اس کے قریبی لوگ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھیں اور وقت کو اسی طرح گزار دینا چاہیں تو آگے چل کر عام مسلمانوں کے لیے جن کو کوئی قوت حاصل نہیں ہے، زندگی دشوار ہو جائے گی-''

اس طرح شیخ احمد نے اکبری عہد میں اسلام اور مسلمانوں پر ہوئے اثرات بد کے ازالے کے لیے کوششیں کیں اور دوسرے ہزارے کے تصور کے تحت اسلام کی جو چیزیں ترک کر دی گئی تھیں ان کا احیا کرنے کے لیے درباری امرا کو متوجہ کیا-

شیخ احمد سرہندی کا دوسرا بڑا کارنامہ علما کی اصلاح کا تھا-اس زمانے میں بہت سے علما، خاص طور پر دربار سے وابستہ علما کے زیر اثر بدعات اور مشرکانہ اعمال کا زور بڑھ گیا تھا، تاریخ اسلامی خاص طور پر عہد صحابہ پر سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، قاضی نور اللہ شوستری، ملاّ محمود ہروی اور ان کے ہم خیال علما نے صحابۂ کرام پر سب وشتم شروع کر دیا تھا- بہت سے علما وحی اور نبوت پر شک کرنے لگے-شیخ احمد سرہندی نے ان اثرات کے ازالے کے لیے اثبات النبوۃ اور رد روافض دو کتابیں لکھیں اور دلائل سے ثابت کیا کہ نبوت، خلاف عقل نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ آخری نبی ہیں-نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جو وہ اپنے منتخب بندوں کو دیتا ہے-یہ کسبی چیز نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے-کشف اور الہام کے ذریعے نبوت کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہے لیکن یہ کشف والہام سے بدرجہا بلند ہے-اسی طرح صحابۂ کرام کے بارے میں لکھا کہ مشاجرات صحابہ اجتہادی عمل ہیں-حضرت علی برسر حق تھے اور ان کے مخالفین غلطی پر تھے لیکن ان کی غلطی بھی اجتہادی تھی-اس لیے ان کو سب وشتم کرنا جائز نہیں ہے اور صحابۂ کرام کی اس تنقیص سے خود نبی ﷺ پر حرف آتا ہے کہ آپ نے (نعوذ باللہ) ایسے لوگ تیار کیے جنھوں نے آپ کی وفات کے فوراً بعد آپ کی ہدایات کو چھوڑ دیا- اس طرح شیخ احمد نے علما کی غیر شرعی موشگافیوں پر تنقید کی اور صحیح افکار کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی-کتابوں کے علاوہ انھوں نے خطوط لکھ کر بھی لوگوں کی اصلاح کی کوششیں کیں-

شیخ احمد سرہندی کے تجدیدی کارناموں اور اصلاحی کوششوں کا تیسرا بڑا میدان جاہل صوفیہ کی اصلاح اور ان کے اثرات کا ازالہ تھا-اس دور میں صوفیہ کے اندر سماع، وجد اور رقص عام تھا-فرائض اور سنن کے مقابلے میں ذکر واذکار کو اہمیت دیتے تھے-پیروں کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ ان کے اندر ایسی قوت ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی سے ناراض ہو جائیں تو اس کو روحانی ترقی

سے محروم کر سکتے ہیں- پیروں کو سجدۂ تعظیمی کیا جاتا تھا، مزاروں پر منت مانگی جاتی تھی، وجودی صوفیہ تو شریعت کو حجاب قرار دیتے تھے، زندگی کا مقصد فنا اور بقا کے تجربات بن گیا تھا، کشف و کرامات پر بے انتہا اعتماد کیا جاتا تھا، بعض صوفیہ اپنے وضو کے ماء مستعمل کو بطور تبرک مریدوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ان تمام امور پر تنقید کی اور ان کو بدعت قرار دیا- رقص و موسیقی اور سماع و وجد پر تنقید کی- سجدۂ تعظیمی کی شدید مذمت کی- کشف و کرامات پر تنقید کی اور بتایا کہ یہ ولی کی عظمت کی نشانی نہیں ہیں- انہوں نے دلیل دی کہ جتنے بڑے صوفیہ گزرے ہیں جیسے حضرت خواجہ جنید بغدادی ان سے چند کرامات بھی منسوب نہیں ہیں- اگر کرامتیں ولی کے لیے معیار ہوتیں تو بڑے صوفیہ سے زیادہ کرامات کا صدور ہوتا- وحدۃ الوجودی صوفیہ پر ان کی تنقید اور سخت ہے، انہوں نے وحدۃ الوجود کے مقابلے میں ایک مستقل فلسفہ اور نظریہ پیش کیا جس کے مطابق انہوں نے وحدۃ الوجود کی کیفیت کو غیر حقیقی اور صرف بندے کے ذہن کا تخیل قرار دیا- انہوں نے بتایا کہ وحدۃ الوجود راہ سلوک کی ایک منزل ہے، آخری منزل نہیں- آخری منزل عبدیت کا اثبات ہے- بندہ کی معراج یہ ہے کہ اس کو اپنی عبدیت کا احساس ہو جائے، وحدۃ الوجود نہیں- اس لیے انہوں نے زور دے کر کہا کہ وحدۃ الوجود جو مقام جمع کی ایک کیفیت ہے وہ صرف احساس اور مشاہدہ ہے، اس کو وحدۃ الشہود کہنا زیادہ موزوں ہے- بندے کی اس منزل جمع کے بعد فرق کا اثبات ہے جب بندہ اس کیفیت سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ مقام جمع یا وحدۃ الوجود صرف ایک تخیل تھا، حقیقت اس کے برعکس ہے- بندہ کی معراج عبدیت کا اثبات ہے وحدۃ الوجود نہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"فنا اور بقا شہودی ہے وجودی نہیں- بندہ نہ تو خدا بن سکتا ہے اور نہ خدا کے ساتھ متحد ہو سکتا ہے- بندہ ہمیشہ بندہ رہتا ہے اور خدا ہمیشہ خدا- جو لوگ فنا اور بقا کو وجودی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندہ اپنے وجودی تعینات سے بالاتر ہو کر ذات حق سے جو تعینات اور قیود سے بالاتر ہے، متحد ہو جاتا ہے، یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قطرہ تھا جو دریا میں مل گیا اور دریا ہو گیا اور ان کی وجودی انفرادیت ذات واحد میں گم ہو گئی، وہ لوگ ملحد اور زندیق ہیں- اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کے ملحدانہ افکار سے محفوظ رکھے-" (مکتوب، جلد اول۔ مکتوب نمبر ۲۳۰)

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے سترہویں صدی کے پس منظر میں شریعت کی زبردست خدمت کی- انہوں نے علمائے سو کے ذریعے شریعت کی من مانی تعبیر کی اصلاح کی- حکمران وقت نے مذہب کو جو زک پہنچائی تھی اور ایک نئے دین کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی، اس کا مقابلہ کیا اور جاہل صوفیہ نے تصوف کو من مانے معنی پہنا کر جو گمراہی پھیلائی، اس کی اصلاح کی

اور ان تمام فتنوں کے درمیان اسلام کی حقیقی تصویر کو از سر نو اجاگر کیا- انہوں نے بتایا کہ دین کی اصل بنیاد نہ فصوص الحکم ہے نہ فتوحات مکیہ اور نہ صوفیہ کے کشف و کرامات، بلکہ دین کی بنیاد قرآن و سنت ہے اور یہی دونوں دین کا معیار ہیں- اگر کسی صوفی کا کشف قرآن و سنت کے مطابق ہے تو اس کو اہمیت دی جا سکتی ہے لیکن جو کشف ان دونوں بنیادوں کے خلاف ہو، وہ قابل رد ہے- شریعت کا مصدر قرآن و سنت ہے، کوئی اور چیز نہیں، چاہے وہ صوفی کا کشف ہو یا سالک کا مشاہدہ- ان سب کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر جانچا جائے گا-

شیخ احمد سرہندی کے یہ افکار جتنے ان کے عہد میں اہم تھے، اتنے ہی اہم آج بھی ہیں- آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ مختلف افکار و نظریات اور فلسفہائے حیات کے درمیان شریعت مطہرہ کی حقانیت کو اس کے بنیادی مصادر و مآخذ کی روشنی میں جانا جائے اور ان سب کا جائزہ قرآن و سنت کی روشنی میں لیا جائے- شیخ احمد سرہندی کی یہ فکر اور ان کا پیغام آج بھی زندہ و تابندہ اور اہم ہے-

مصادر

۱- شیخ احمد سرہندی: مکتوبات امام ربانی، تحقیق نور محمد، لاہور ۱۹۶۴

۲- اثبات النبوۃ مع اردو ترجمہ، کراچی، بدون سنہ

۳- سلطان جہانگیر: تزک جہانگیری، تحقیق سرسید احمد خاں، علی گڑھ ۱۸۶۴

۴- ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، لکھنؤ ۱۹۸۰

۵- Rizwi, S.A.A.: Muslim Rivivalist movement in Northern India in the sixteenth seveneteeth century, Agra,1965

(نوٹ: یہ مقالہ مجدد الف ثانی کی حیات و خدمات پر چنڈی گڑھ کے سمینار میں بطور خطبۂ صدارت پیش کیا گیا- (ادارہ)

○○○

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی - حیات اور کارنامے

سولہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری میں جس عبقری شخصیت نے عالم اسلام کو اپنے تجدیدی، اصلاحی، دعوتی اور علمی خدمات سے متاثر کیا، عرب وعجم میں اسلامی نظریات، شریعت محمدی کے احکام وقوانین اور اسلام کی حقیقی روحانی تعلیمات کا احیا فرمایا، بدعتوں کا خاتمہ کیا اور سنتوں کو زندگی نوبخشی وہ ذات عارف ربانی، آیت رحمانی، شیخ لاثانی، مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی قدس اللہ سرہ الباقی کی ہے، اس صدی میں مسلم معاشرہ کا رخ جس طرح سیاسی مصالح، ذاتی اغراض ومقاصد، وسیع المذہبی نظریات اور دوسرے اسباب کی بنا پر اسلامی تہذیب وتمدن اور حجازی روحانیت سے پھیر کر اس میں Uniformation لانے اور ''وحدت ادیان'' کی طرف موڑا جارہا تھا اور معاشرے کے افراد بھی ''الناس علی دین ملوکھم'' کے مظہر بنتے جارہے تھے تو حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی روحانی اور علمی قیادت کے ذریعہ سیاسی، سماجی، علمی، دینی اور تہذیبی سطح پر اصلاح وتجدید کا فرضہ انجام دیا، اس کے لیے آپ نے حکیمانہ طریقۂ کار کے ذریعہ ایک طوفان تھام دیا۔ اپنے پیدا کردہ افراد کے ذریعہ ہندوستان اور اس کے باہر مما لک میں اللہ کے کلمہ کو بلند فرمایا، اکبری دور کے جاہل صوفیہ اور آزاد منش سجادہ نشینان کی خرابیوں سے مسلم معاشرے کو آگاہ فرمایا، رفض وتفضیلیت کا پردہ فاش کیا۔ غوث وقطب، مہدی اور نبی ہونے کے دعوے داروں کی خبر لی، ارکان سلطنت اور سلاطین وقت کے سامنے روح اسلام اور دین محمدی کی اصلی صورت پیش فرمائی، مختصر یہ کہ ہر سطح پر الا للہ الدین الخالص کا صور پھونک دیا، احترام شریعت محمدی کا جذبہ بیدار کردیا، دلوں میں خداطلبی کی روح ڈال دی اور اپنے خلفا اور تلامذہ کے ذریعہ عالم اسلام کے کونے کونے تک آوازۂ اسلام کو پہنچادیا، جس کی گونج آج تک واضح طور پر محسوس ہورہی ہے۔ اور جن کا ہر نقش قدم دعوت وارشاد کے میدان میں دلیل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا کہ دلیل راہ گزر نہ ہو

ذیل کے صفحات میں اسی ذات اقدس کی حیات، اور آپ کے کارناموں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے، یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے اور لکھی گئی بھی ہے ظاہر ہے اس مختصر مقالے میں طوالت کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہر عنوان کے تحت بنیادی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔

حیات مجدد کے چند درخشاں پہلو

حضرت احمد مجدد الف ثانی قدس سرہ کی پیدائش پٹیالہ کے قصبہ سرہند (پنجاب) میں شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں حضرت عبدالاحد چشتی فاروقی (۱۰۰۷ھ/ ۱۵۹۸ء) خلیفہ حضرت رکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہم کے گھر ہوئی، آپ نسباً فاروقی ہیں، آپ کا سلسلۂ نسب بہ قول حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی قدس سرہ ۳۱ واسطوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ (۱)

تعلیم وتربیت

اکثر مورخین کے مطابق آپ کی تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن پاک سے ہوئی۔ والد بزرگوار سے اکثر علوم معقول ومنقول کی تحصیل کی، بعدہ سیال کوٹ کا سفر فرمایا، شیخ کمال الدین کشمیری (م ۱۰۰۷) نزیل سیال کوٹ سے محققانہ انداز میں معقولی علوم کی کتابیں پڑھیں، حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیری (م ۱۰۰۳ء) سے سند حدیث حاصل کی، شیخ صرفی کو حدیث کی اجازت حضرت شیخ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی سے حاصل تھی۔ (۲) حدیث مسلسل بواسطۂ واحد اور دیگر مفردات کی اجازت اس زمانے کے ایک مقدس عالم حضرت قاضی بہلول بدخشی سے حاصل کی، ان سے حسب ذیل کتب کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ امام واحدی کی تفسیر بسیط، تفسیر وسیط، اسباب النزول، تفسیر بیضاوی اور دوسری تصنیفات مثلاً منہاج الوصول اور الغایۃ القصویٰ وغیرہ کے علاوہ امام بخاری کی صحیح اور دوسری تالیفات مثل ثلاثیات، ادب المفرد، افعال العباد اور تاریخ وغیرہ، مشکوۃ المصابیح، شمائل ترمذی، جامع صغیر للسیوطی اور قصیدہ بردہ وغیرہ غرضیکہ ہر علم وفن کو اس کے مشہور اور مستند اساتذہ سے حاصل کیا اور اس میں مہارت وکمال پیدا کیا۔ (۳)

تدریس

سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کرلی، فراغت کے بعد ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۳ء حضرت مجدد اکبرآباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور فقہائے عصر نے آپ سے استفادہ کیا، اس زمانے میں اکبر تخت ہند پر متمکن ہوچکا تھا اور پایۂ تخت

ہونے کی وجہ سے اکبر آباد (آگرہ) علمی مرکز بنا ہوا تھا، اس عرصے میں ابوالفضل (م۱۶۰۲) اور
اس کے بھائی ابوالفیض فیضی (م۱۵۹۵ء) سے آپ کے مراسم ہوئے، یہ دونوں بھائی آپ کی علمی
صلاحیت کے معترف تھے، شروع میں احترام بھی کرتے تھے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی ان دونوں
بھائی کی آزادروی سے بےزار تھے انہیں علما کی صحبت کے لائق نہیں گردانتے تھے۔ (۴)

شادی خانہ آبادی

۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء کو والد محترم حضرت عبدالاحد چشتی اپنے فرزند سے شوق ملاقات میں
آگرہ آئے اسی سال اکبر کے مقربین میں شیخ سلطان رئیس تھانیسری کی صاحب زادی سے نکاح
ہوگیا، اس کے بعد والد ماجد کے ہمراہ آپ سرہند تشریف لے آئے۔

خلافت، تعلیم وتلقین

حضرت مجدد الف ثانی نے ابتدا میں اپنے والد ماجد سے ہی روحانی فیوض و برکات حاصل
کیا ہے، سب سے پہلے سلسلۂ چشتیہ کے فیوض آپ تک والد محترم کے توسط سے پہنچے۔ والد ماجد
نے آپ کو بیعت وخلافت سے سرفراز فرمایا، آپ والد ماجد کی حیات تک انہیں کی خدمت میں
رہے، ان سے بیش بہا فوائد باطنی حاصل کیے، انہیں کی فیض صحبت میں ایک دور رس اصلاح
وانقلاب کے لیے سلسلہ چشتیہ کا سلوک طے کیا حضرت مجدد خود رقم فرماتے ہیں:

''اس فقیر کو نسبت فردیت اپنے والد بزرگوار سے ملی ہے، والد بزرگوار نے اس کو ایک
عزیز شیخ کمال کیتھلی (۱۵۷۳ء) سے حاصل کیا تھا جو قوی جذبہ رکھتے تھے اور خوارق وکرامات میں
مشہور تھے، اس کے علاوہ اس فقیر کو عبادت نافلہ خصوصاً نماز نافلہ کی توفیق اپنے والد بزرگوار سے ملی
ہے اور انہوں نے یہ سعادت سلسلہ چشتیہ کے ایک مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۹۴۴ھ)
سے حاصل کی تھی۔'' (۵)

سلسلۂ قادریہ میں کیتھل کے بزرگ شاہ سکندر قدس سرہ (۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء) سے اجازت
وخلافت حاصل کی تھی، حضرت موصوف عارف کامل حضرت شاہ کمال کیتھلی قدس سرہ کے خلیفہ
وجانشین تھے حضرت شاہ سکندر نے اپنے مرشد کے اشارۂ باطنی سے حضرت مجدد الف ثانی کو
حضرت غوث اعظم قدس سرہ کا جبہ شریف عطا فرمایا، خرقہ شریف زیب تن فرمانے کے بعد دولت
کدے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا:

''حضرت شاہ کمال کا خرقہ پہننے کے بعد عجیب حالت رونما ہوئی'' (۶)

حضرت مجدد قدس سرہ کو سلسلۂ نقشبندیہ میں خرقۂ خلافت حضرت خواجہ رضی الدین محمد باقی
باللہ قدس سرہ (م۱۰۱۲ھ) نے عطا فرمایا تھا، ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد آپ

کمالات و درجات کے کن مقامات پر فائز ہوئے ہوں گے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ نے ان
نعمتوں کی وجہ سے اپنے اوپر ہونے والے فیضان نبوت کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ یہ ہیں:

''مجھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے واسطوں سے نسبت حاصل
ہے۔ طریقہ نقشبندیہ میں ۲۱ واسطوں سے، طریقہ قادریہ میں ۲۵ واسطوں سے اور طریقہ چشتیہ میں
۲۷ واسطوں سے۔ میرا سلسلہ رحمانی ہے کیوں کہ میں رحمٰن کا بندہ ہوں، میرا رب رحمٰن ہے اور میرا
مربی ارحم الراحمین۔ میرا طریقہ سبحانی ہے کیوں کہ میں تزکیہ کی راہ سے پہنچا ہوں، اسم وصفت سے
مقصود سوائے ذات حق کے کچھ نہیں ہے'' (۷) لیکن ان ساری نسبتوں میں آپ پر نسبت نقش
بندیت حاوی ہوئی۔ خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد کو نقش بندیت کی جو دولت سونپی تھی، اس کا
فروغ، اس کا احیا اور اس کی تجدید آپ سے مزید ہوئی، یہاں تک کہ اس کا فیضان تمام عالم اسلام
میں عام ہوگیا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت باقی باللہ کی یہ بشارت تواتر کے ساتھ
مورخین نے نقل کی ہے جو بعد میں حقیقت واقعہ ثابت ہوئی: ''سرہند کے ایک شخص شیخ احمد نامی نے
جو کثیر العلم اور قوی العمل ہے فقیر کے ساتھ کچھ دنوں تک نشست و برخاست رکھی ہے اس کے
حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا آفتاب ہوگا کہ دنیا اس سے روشن ہو جائے گی'' (۸)

روحانی اور دعوتی اسفار

حصول تعلیم کے بعد آپ نے سرہند سے پہلا سفر اکبر آباد (آگرہ) کا کیا تھا جس کا مقصد
درس وتدریس تھا، سرہند واپسی کے بعد والد ماجد کا انتقال ہوگیا اور آپ نے ۱۰۰۸ھ میں نفلی حج
کے ارادے سے کعبۃ اللہ کے لیے رخت سفر باندھ لیا، اثنائے سفر مولانا حسن کشمیری نے خواجہ محمد
باقی باللہ قدس سرہ سے ملاقات کا اشتیاق بیدار کیا، آپ کو باریابی نصیب ہوئی اور دو تین ماہ رہ کر
روحانی فیوض وبرکات سے مالا مال ہو کر واپس ہوگئے، حضرت خواجہ کی ملاقات نے دل کی دنیا بدل
دی اور ایک رحمانی نور آپ کے قلب مطہر پر نازل ہوگیا جس نے آپ کے ظاہر و باطن کو منور
کر دیا۔ اس سفر ایمانی سے جو ترقیاں حاصل ہوئیں حضرت مجدد نے مولانا حسن کشمیری کا نیاز
مندانہ شکریہ ادا فرمایا ہے۔ اور مشائخ کی صحبت کے متعلق فرمایا کہ ''گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
شرف صحبت سے مشرف نہیں ہوا، لیکن اس صحبت کی سعادت سے محروم بھی نہیں رہا''۔

دوسرا سفر

دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت بابرکت میں دوبارہ حاضری ۱۰۰۹ھ/
۱۶۰۰ء میں نصیب ہوئی اور عرصہ دراز تک صحبت وتربیت سے مستفیض ہوتے رہے، اس بیچ شیخ
ومرید میں بے حد موانست ومودت پیدا ہوگئی اور روحانی معاملے میں:

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

کی مثال بن گئے، داراشکوہ اور دوسرے مشائخ نے اس صحبت کو عجائب روزگار میں شمار کیا ہے۔ صحبت و تربیت کا یہ دوسرا روحانی سفر انتہائی کامیاب ثابت ہوا، حضرت خواجہ باقی باللہ نے اپنے مرید خاص کو روحانی کمالات سے نواز کر بیعت وارشاد اور مریدین کی ہدایت و تربیت کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت دے دی اور مقام مشیخت کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کر دیں۔(۹)

تیسرا سفر

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے دہلی کا تیسرا سفر ۱۶۰۲ اور ۱۶۰۳ کے درمیان فرمایا، حضرت خواجہ قدس سرہ کے یہ آخری ایام تھے، اس مرتبہ مرشد گرامی نے اپنے مرید خاص سے اپنے صاحبزادگان خواجہ عبیداللہ اور خواجہ عبداللہ اور ان کی والدہ کی طرف توجہ باطنی فرمانے کے لئے کہا تو حضرت مجدد پیر کا حکم بجا لائے، توجہ فرمائی اور اس باطنی توجہ سے تربیت کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ اسی سفر میں پیرومرشد نے لاہور میں دعوت وارشاد کے لیے ہدایت فرمائی، چنانچہ آپ لاہور گئے، اصلاح و تربیت اور ہدایت وارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا، مخلوق آپ کی صحبت و تربیت سے مستفیض ہونے لگی مگر اسی بیچ پیرومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کا ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ میں وصال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چوتھا سفر

سانحۂ ارتحال کی خبر سن کر فوراً دہلی تشریف لائے، مرقد اطہر کی زیارت کی، فاتحہ خوانی اور اہل خانہ کی تعزیت کے بعد سرہند واپس لوٹ گئے۔(۱۰)

پانچواں سفر

اس کے بعد ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں اپنے پیرومرشد خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے عرس میں شمولیت کی غرض سے آپ نے پانچویں مرتبہ دہلی کا سفر کیا(۱۱) واپسی کے بعد مستقل سرہند ہی میں رہے۔ بہ قول پروفیسر محمد مسعود احمد دو تین مرتبہ اکبرآباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور آخری عمر میں جہاں گیر کی مزاحمت کی وجہ سے لشکر شاہی کے ساتھ چند مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔(۱۲)

معمولات واوصاف

حضرت مجدد الف ثانی کی عادات واطوار اور معمولات روز و شب پڑھنے کے بعد امام غزالی کی وہ بات یاد آتی ہے کہ صوفیہ کی سیرت اور ان کے اخلاق سے بہتر کوئی دوسرا متبادل ماڈل نہیں، حکما کی حکمت، اہل دانش کی دانش اور علما کا علم صوفیہ کی سیرت کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ صوفیہ کے تمام معاملات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور اس زمین میں نور نبوت

سے بڑھ کر کوئی ایسا نور نہیں جس سے ہدایت کی منزل کا سراغ مل سکے۔ حضرت مجدد کی عادات واطوار پر خلق محمدی اور قرآنی اخلاق کی جلوہ نمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

روز و شب کا ایک ایک لمحہ دین کی سربلندی اور اللہ کے فکر و ذکر میں بسر ہوتا تھا، کثرت سے عبادت کرتے تھے۔ اپنے خدام اور رفقا کو بھی بکثرت دوام ذکر، حضور اور مراقبہ کی تاکید فرماتے تھے، مذہب حنفی کے مقلد تھے، عقائد میں امام ماتریدی کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔ قرأت خلف الامام کرتے تھے حتی کہ اس کو مستحسن گردانتے تھے، نماز میں اکثر امامت خود فرماتے تھے۔ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قراءت کی حکمت یہ بیان فرماتے تھے کہ ''چونکہ میں مذاہب کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے آسان صورت یہی معلوم ہوئی کہ خود امامت کروں۔''(۱۳)

رات کو نصف اخیر میں اور کبھی ثلث اخیر میں نوافل پڑھتے، مراقبہ کرتے، منقول دعائیں پڑھتے، فجر کے لیے تازہ وضو فرماتے، سنت گھر پر ادا کرتے، فجر کی نماز آخر غلس (اندھیرے) اور اول اسفار (روشنی) میں ادا کرتے تاکہ دونوں مذہبوں پر عمل ہو جائے، نماز فجر کے بعد اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے، نماز اشراق، تسبیحات اور ماثورہ دعائیں پڑھ کر دولت خانہ میں تشریف لاتے، گھر کے معاملات کی خیر وخبر کے بعد تلاوت کرتے، اور پھر طالبین کی تربیت و تزکیہ اور علمی مذاکرے میں مشغول ہو جاتے، لوگوں کو اتباع سنت اور اخفائے حال کی ترغیب دیتے اور کلمہ طیبہ کی عظمت بیان کرتے، علما سے احکام شریعت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے، علامہ ہاشم کشمی کے بیان کے مطابق مضامین عالیہ بیان کرتے وقت آنکھیں اشک بار اور سرخ ہو جاتیں اور رخسار مبارک تمتما جاتا، چاشت کی نماز کے بعد ضحوۂ کبریٰ کے وقت حرم سرا تشریف لے جاتے اور ماحضر مختصر تناول فرماتے، قیلولہ فرمانے کے بعد ظہر کی نماز میں سنت کے بعد کسی حافظ سے ایک پارہ یا کم وبیش ایک پارہ سنتے۔ عصر کی نماز کے بعد غروب تک اصحاب وخدام کے ساتھ سکوت و مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، طالبین کے باطنی کیفیات کی طرف توجہ فرماتے، مغرب کی سنت کے بعد اوابین ادا کرتے تھے۔ نماز عشاء اول وقت میں ادا فرماتے، رمضان میں اعتکاف کرتے، دعائیں پڑھتے اور کثرت سے تلاوت کرتے۔ تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ہر روز سیکڑوں علما، صلحا اور حفاظ کو آپ کی خانقاہ سے کھانا ملتا تھا، مریضوں کی عیادت کے لیے بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے، ان کے لیے دعائیں کرتے، قبروں کی زیارت فرماتے۔ زکوٰۃ کے لیے حولان حول کا انتظار نہ فرماتے، فتوحات کا فوراً حساب لگا کر حاجت مندوں تک پہنچا دیتے، اہل قرابت کو ترجیح دیتے، اخلاق و تواضع، مخلوق پر شفقت، قناعت و صبر، اور تسلیم و رضا میں مشائخ متقدمین کا نمونہ تھے، خلاصہ یہ کہ خلق محمدی میں اسوۂ حسنہ کی زندہ مثال تھے۔(۱۴)

آپ کے باطنی تصرفات وکمالات اور مقامات واحوال کو مجھ جیسا کم سواد کیا بیان کرسکتا ہے۔بس صرف اتنی بات عرض کرنی ہے کہ آپ کی ذات کے متعلق خود آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس نے اپنے اقوال وخطوط میں جن خوبیوں اور کمالات باطنی کو صراحتاً بیان فرمایا ہے وہ آپ کے باطنی اوصاف اور اعلیٰ مقامات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں، جنہوں نے زندگی ہی میں مشیخت کی ذمہ داریاں آپ کے حوالے کردی ہو اور مخلوق کو آپ کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی ہو ان کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ آپ کی ذات وہ مرکز روحانیت ہے جس کو مشہور سلاسل طریقت کے ارباب تصوف نے ظاہری اور باطنی علوم ومعارف سے مالا مال کر کے مخلوق کے لیے آفتاب ہدایت بنادیا کہ جن سے سارا عالم روشن ہوگیا۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ کو آپ سے کچھ مسائل میں اختلاف تھا مگر اس کے باوجود آخر عمر میں حضرت شیخ محقق کو آپ سے جس قدر باطنی لگاؤ ہوگیا وہ حضرت مجدد کے باطنی تصرفات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔فرماتے ہیں:

’’ان دنوں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ سے فقیر کی صفائی حد سے متجاوز ہے۔درمیان میں پردۂ بشریت وفطرت نہیں ہے۔ انصاف وعقل اور طریقے کی رعایت سے قطع نظر باطن میں ذوق ووجدان اور غلبۂ (محبت) میں وہ چیز دل میں آتی ہے جسے زبان بیان کرنے سے عاجز ہے۔پاکی ہے اس ذات کے لیے جو دلوں کو پھیرنے والا ہے، احوال کو بدلنے والا ہے، شاید ظاہر بینوں کو یہ بات مستبعد معلوم ہو لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کس طرح ہے؟ (۱۵)

حضرت مجدد کے دعوتی اور اصلاحی کارنامے

حضرت مجدد الف ثانی کی علمی خدمات اور دعوتی اور اصلاحی کارناموں کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔حضرت مجدد کی خدمات اور ان کے کارناموں کی معنویت کا اندازہ صحیح طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے جب اکبری دور کی مذہبی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال ہمارے سامنے ہو، اس صورت کو تفصیل سے واضح کرنے کے لیے مقالہ نہیں پوری کتاب کی تصنیف درکار ہے، کئی مورخین نے اس پر داد تحقیق بھی دی ہے، خاص طور پر ڈاکٹر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی کتاب ’’دین الٰہی اور اس کا پس منظر‘‘ اس حوالے سے کئی تاریخی حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے۔ذیل کے سطروں میں اس کی ایک جھلک پیش کر کے حضرت مجدد کے تجدیدی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکبری دور (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کو آزاد مورخین نے جس طرح مسلمان میں تکثیریت پسند سماج کی ضروریات کو پورا کرنے والا دور قرار دے کر اس کی بے پناہ تعریف کی ہے وہیں یہ دور مذہبی اور اسلامی سلطنت ہونے کے نقطۂ نظر سے بے شمار خرابیوں کا مجموعہ بھی تھا۔ خود اکبر گمراہ اور ملحد ہوگیا تھا، اس نے تمام مذاہب کو ملا کر ایک نیا دین ایجاد کرلیا تھا جسے ملا عبدالقادر

بدایونی نے ’’توحید الٰہی‘‘ اور ’’دین الٰہی‘‘ کا نام دیا ہے، اس دین میں ہر طرح کی خرافات وبدعات درآئی تھیں، اس میں خدا کے علاوہ ہندوانہ رسوم کے مطابق مظاہر کی پرستش کی جاتی تھی، شراب حلال کردی گئی تھی، زنا اور دوسری برائیوں پر پابندی تو درکنار بلکہ حلال کردی گئیں تھیں، اس مذہب میں تمام مذاہب کی عبادتیں روادارانہ طریقے پر ادا کی جاتیں۔آگ کی پرستش ہوتی، عیسائی طریقے پر بھی عبادت کی جاتی۔نقطوی تحریک کے اثرات بھی اکبر کی تحریک پر نمایاں ہیں، نقطوی تحریک کو ہندوستان میں عروج دلانے میں ابوالفضل اور فیضی کا بنیادی کردار رہا ہے، اسی طرح اکبر کے مشیر خاص ابوالفضل اور فیضی نے شیعی اور تفضیلی عقائد ونظریات کو فروغ دینے اور امرائے سلطنت کو دین حنیف سے برگشتہ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، اکبر نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا تھا، حتی کہ مسجدیں گروا کر مندر بنوائے تھے، مسلمانوں کو تہ تیغ کیا تھا۔حضرت مجدد رقم طراز ہیں:

’’اسلام کمزور ہوگیا ہے، کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو منہدم کررہے ہیں اور اس کی جگہ مندر بنارہے ہیں‘‘ (مکتوبات: مکتوب نمبر ۶۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

’’مسلمان احکام اسلام کے اظہار کرنے سے عاجز آگئے ہیں، اور اگر کرتے ہیں تو انہیں قتل کردیا جاتا ہے‘‘۔(تذکرہ مجدد الف ثانی ص: ۱۰۴)

ایک طرف سلطنت کے امراء، حکام اور سلاطین کا یہ حال تھا دوسری طرف مسلم سماج میں فکری اور عملی انحراف کا دور دورہ ہوچکا تھا، بدعات کا نفوذ، علما کی ظاہر داری اور مداہنت اور جاہل صوفیہ کی خرافات اور گمراہیاں زوروں پر تھیں- وحدۃ الوجود، صوفیہ کے یہاں جس کا تعلق محض سالک کے حال سے ہوتا ہے جاہل صوفیہ نے اس کا سہارا لے کر حلقۂ شریعت سے اپنی گردنیں آزاد کرلی تھیں اور شیطان نما آدم زادے مسند ارشاد کے دعوے دار تھے۔شعبدے بازی، جعل سازی ان کا شیوہ تھا، ان کے عقائد واعمال حدود شریعت سے نکل کر مشتبہ عقائد، تناسخ اور حلول واتحاد تک پہنچ چکے تھے۔یہ وہ رستہ خیز حالات تھے جس نے ملت کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا، حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے ان سارے محاذ پر اپنے جہادی، اجتہادی اور تجدیدی کارناموں سے مقابلہ کیا، اور منہاج نبوت کے طریقے پر دعوت وارشاد کا کام انجام دیا، امرا سے لے کر عوام تک، علما سے لے کر صوفیہ تک خطاب وکتاب دونوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی، اسلام کو دوبارہ حقیقی روحانی اور اصلی بنیادوں پر قائم کیا، اور شریعت اسلامی کو غلبہ عطا فرمایا- اس عظیم کارنامے کے لیے آپ نے مندرجہ دعوتی طریقوں پر اسلامی شریعت کا احیا فرمایا ہے-

دعوتی وفود کی روانگی

حضرت مجدد الف ثانی نے امراء، علما، عوام اور صوفیہ چاروں گروہوں کی اصلاح وتربیت کے لیے اجتماعی کوشش فرمائی ہے۔ ان کے اندر در آئی فکری انحراف، بدعملی، خود غرضی، نفس پرستی، جاہ وحشمت کی چاہ، جاہلانہ رسوم وروایات، موہوم خیالات کو دور فرمایا۔ مسلم سوسائٹی کو دوسرے مذاہب ومسالک کے مزعومات سے نجات دلائی۔

آپ نے ان کاموں کے لیے اولاً: اپنے مریدین کی بڑی تعداد اس کام کے لیے تیار کی اور انہیں ہر طرف اسلام کی تبلیغ، لوگوں کو دائرہ شریعت میں واپس لانے اور سنتوں کو زندہ کرنے کے لیے باضابطہ وفود کی شکل میں ملک وبیرون ملک روانہ فرمایا۔ ۱۰۲۶ھ میں خلفا اور مریدین میں سے ستر مولانا محمد قاسم قدس سرہ کی قیادت میں ترکستان کی طرف بھیجے گئے، چالیس حضرت مولانا فرخ حسین کی امارت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے گئے، دس ذمہ اور تربیت یافتہ حضرات مولانا محمد صادق کابلی کے ماتحت کاشغر کی طرف اور تیس خلفا مولانا شیخ احمد برکی (م ۱۰۲۶ھ) کی سرداری میں توران، بدخشاں، اور خراسان گئے۔ ان مقامات پر خلفا کا استقبال کیا گیا، بندگان خدا نے ان سے استفادہ کیا اور جب یہ قافلے واپس آئے تو مختلف بادشاہوں کے تحفے ساتھ لائے۔ (۱۶)

خود ہندوستان میں آپ نے اپنے خلفا کو ارشاد وہدایت پر مامور فرمایا، خواجہ میر نعمان (م ۱۰۵۰ھ) کو خلافت عطا فرما کر دکن بھیجا، شیخ بدیع الدین سہارن پوری (م ۱۰۴۲ھ) کو خلافت سپرد فرما کر سہارنپور پھر شاہی لشکرگاہ آگرہ میں متعین کردیا، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقے میں داخل ہوگئے، میر محمد نعمان کشمی کو اجازت نامہ مرحمت فرما کر برہان پور روانہ کردیا، آپ وہاں مرجع خلائق بن گئے، شیخ طاہر لاہوری (م ۱۰۴۰ھ) کو شہر لاہور کے طالبان معرفت کی رہنمائی کے لئے روانہ فرمایا، شیخ نور محمد پٹنی کو شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ حمید بنگالی (م ۱۰۵۰ھ) کو تعلیم وطریقت کی اجازت دے کر بنگال کی زمین میں ہدایت کی شمع بنا کر بھیج دیا، شیخ طاہر بدخشی (م ۱۰۴۷ھ) کو جون پور روانہ فرمایا، مولانا احمد برکی تعلیم وتلقین میں مجاز ہونے کے بعد برک پہنچ کر ارشاد واصلاح کا فریضہ انجام دیا، سید محبّ اللہ مانک پوری کو مانک پور، الہ آباد روانہ فرمایا، شیخ نور محمد پٹنی دریائے گنگا کے کنارے بیٹھ کر ارشاد وہدایت کے چشمے سے مخلوق کو سیراب کرتے رہے۔

ایک سال مکمل ہوتے ہوئے حضرت مجدد کی شہرت وتربیت کی آواز عرب وعجم میں پھیل گئی، عالم اسلام کے چہار جانب سے مخلوق ٹوٹ کر اپنی اصلاح ظاہر وباطن کے لیے جوق در جوق آپ کے یہاں آتی، اور دریائے فیض سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹ جاتی۔ (۱۷)

تصانیف ومکتوبات

دعوت واصلاح اور تربیت وسلوک دوسرا بڑا ذریعہ اور میڈیم آپ نے تحریر وقلم کو بنایا آپ نے اپنی تصانیف ومکاتیب کے ذریعہ علمی، عقلی اور استدلالی طریقے پر شریعت محمدی، اور طریقت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت کیا اور سرفراز کیا، آپ کی تحریری خدمات کے ذریعے مذہبی حقائق سے پردے ہٹے، اتباع سنت کا جذبہ بیدار ہوگیا، خاص طور سے مکاتیب کے ذریعے اہل باطل کی تردید ہوئی اور سنتوں کا احیا ہوا، آپ کے مکاتیب علوم وفنون کا خزانہ ہیں یہ گمراہوں کے لیے نقوش ہدایت اور طالبین مولیٰ اور سالکین راہ طریقت کے لیے نسخۂ کیمیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد پروفیسر محمد مسعود احمد نے مندرجہ ذیل بنائی ہیں:

۱-الرسالۃ فی اثبات النبوۃ (عربی) ۲-تعلیقات العوارف ۳-الحاشیۃ علی شرح العقائد الجلالی ۴-المقدمۃ السنیۃ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ ۵-در المعرفت، جلد اول مکتوبات شریف، مرتبہ مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی، تعداد مکتوبات ۳۱۳، سنہ تالیف ۱۰۲۵ھ، ۶-نور الخلائق، جلد دوم، مکتوبات شریف مرتبہ مولانا عبد الحی حصاری، تعداد مکتوبات ۹۹-۱۰۲۸ھ، ۷-معرفۃ الخلائق جلد سوم مکتوبات شریف، مرتبہ محمد ہاشم کشمی برہانپوری، تعداد مکتوبات ۱۲۲، ۱۰۴۱ھ، ۸-مبدأ ومعاد ۹-مکاشفات غیبیہ ۱۰-معارف لدنیہ ۱۱-رد الرفضہ ۱۲-شرح رباعیات خواجہ بیرنگ ۱۳-رسالہ تعیین ولاتعین ۱۴-رسالہ مقصود الصالحین ۱۵-رسالہ در بیان مسئلہ وحدۃ الوجود ۱۶-اداب المریدین ۱۷-رسالہ جذب وسلوک ۱۸-رسالہ علم حدیث ۱۹-رسالہ حالات خواجگان نقشبندیہ ۲۰-مجموعہ تصوف ۲۱-رسالہ تہلیلیہ وغیرہ- (۱۸)

مکتوبات کی علمی اور دعوتی حیثیت

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی تمام تصانیف اور تحریروں کا مرکزی محور اور مقصد اسلامی سوسائٹی کے چار بڑے طبقے، علما، صوفیہ، حکمراں اور عوام کی اصلاح وتربیت اور اللہ ورسول سے قلبی رابطے کو مضبوط کرنا ہے۔

مکتوبات میں آپ نے امرا کے نام خطوط لکھ کر حکومت وقت میں غیر اسلامی عناصر کی جڑیں کمزور کردیں اور شریعت محمدی کا غلبہ اور اسلامی انقلاب کے لیے ایک ماحول برپا کیا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق آپ نے اپنے خلفا کو مختلف ممالک کے حکمراں طبقوں کے پاس بھیج کر اسلام کی تعلیمات اور نبوی وراثت سے آشنائی کرایا اور انہیں اپنی اصلاح کی دعوت دی، چنانچہ اس کے زبردست اثرات مرتب ہوئے- ہندوستان اور کئی دوسرے اسلامی ممالک میں حکمراں، امرا، اور وزرا نے آپ کی تربیت قبول کی اور شکریہ ادا کیا، اگر یہ سچائی ہے کہ قوم کے امرا و سلاطین جب راہ راست پر آجاتے ہیں تو پوری قوم ہدایت کی راہ پر گامزن ہوجاتی ہے، تو حضرت

مجدد الف ثانی کے دور میں اس سچائی کا مشاہدہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے، جب یمن، شام، ایران، عراق اور روس کے بہت سے ممالک سے آپ کی طرف مخلوق کا رجوع ہوا، اسی طرح مکتوبات اور تصانیف میں علمی جواہر پاروں اور حقائق ومعارف کے اسرار ورموز، حدیث وتفسیر، منطق وفلسفہ، انشاو ادب کی چاشنی اور فقیہانہ باریک بینی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑتا ہے، مکتوبات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ربانی کے نزدیک بنیادی کام مقاصد شریعت اور کار نبوت کو آگے بڑھانا ہے، اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ باقی ہمہ فسانہ۔ اگر علم نبوت سے نفوس کا تزکیہ، کتاب الٰہی کا ابلاغ، اور شریعت کی حکمتوں سے آشنائی حاصل ہوتی ہے تو وہ علم کارآمد ہے ورنہ بقول حضرت مجدد الف ثانی:

''جو علما دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں اور جنہوں نے علم دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے ان کا شمار علمائے سو میں ہے۔''

امرا اور سلاطین کو دعوت

آپ کی اصلاحی اور دعوتی خدمات کا ایک روشن باب یہ بھی ہے کہ آپ نے ہندوستان اور بیرون ہند کے امرا و حکام اور سلاطین کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہونے، اسلامی زندگی گزارنے اور رعایا کو اسلام کے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے دعوتی خطوط روانہ کیے ہیں۔ اکبر کے بعض ارکان وامرا کے نام حضرت کے خطوط ملتے ہیں، انہیں میں شیخ فرید بخاری معروف بہ مرتضیٰ خاں اور عبدالرحیم خان خاناں بھی شامل ہیں جو حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ حضرت مجدد نے اکبر کے انتقال (۱۰۱۴ھ) کے بعد اپنی دعوتی مساعی کو مزید تیز سے تیز کر دیا، اور سلطنت میں اکبر کے دین الٰہی کے اثرات اور خود جہاں گیر کی اصلاح کے لیے دربار کے بااثر افراد کا حکیمانہ طریقے پر استعمال کیا، جہانگیر کے مقربین وامرا میں بہت سے شیعہ حضرات وہ بھی تھے جو ابوالفضل اور فیضی کی باقیات کو آگے بڑھانا چاہتے تھے شیخ کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کے لیے جاں گیر کو طرح طرح سے ورغلاتے رہتے تھے۔ نتیجے میں ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانی کو کچھ مسائل کی صفائی کے لیے دربار میں بلایا گیا، مسائل میں لاجواب ہونے کے بعد امراء نے جہاں گیر کو ورغلایا کہ انہوں نے آداب شاہی (سجدۂ تعظیمی) نہیں بجالائے ہیں، اسی سبب جہانگیر نے آپ کو قلعۂ گوالیار میں محبوس کر دیا، قلعہ میں جو دعوتی کام ہوئے وہ تو اپنی جگہ مگر اسی بیچ حضرت مجدد الف ثانی نے شیخ فرید بخاری اور دوسرے بااثر افراد کے ذریعہ جہاں گیر کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، جہاں گیر نے متاثر ہو کر شیخ فرید کو مذہبی معاملات میں علما کا ایک مشاورتی بورڈ بنانے کے لیے کہا۔ اس بات کو سن کر حضرت مجدد الف نے شیخ فرید کو اس بورڈ میں علمائے آخرت کو شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ جہانگیر کے بیان کے مطابق آپ ایک سال قید میں رہے، جب آپ کی رہائی ہوئی تو حکیمانہ طریقۂ وعظ ونصیحت

سے اس کو اسلام کی طرف مائل کیا اور اکبری اثرات زائل کیے۔ جہاں گیر سے مجالس کے کچھ احوال آپ نے اپنے فرزندوں کو بہ شکل مکتوب لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے، نائبین انبیا کس قدر ہدایت کے لیے حریص ہوتے ہیں، ان صحبتوں کے اثرات صاف طور پر جہاں گیر کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے قلعہ کانگڑا کی فتح کو فضل ربانی قرار دیا، مسجدیں تعمیر کرائیں، مسلمانوں پر ظلم وجبر ختم ہوا، مسلمان اپنے اسلامی احکام وقوانین پر عمل کرنے کے معاملے میں آزاد ہو گئے۔ (۱۹)

علما اور صوفیہ کی اصلاح

اکبری دور اور جہانگیر کے دور میں بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ علما کی صف میں مداہنت اور تساہلی آ گئی تھی، حب جاہ اور حب دنیا نے زبانوں پر مہر لگا رکھے تھے، علما کے لیے حضرت مجدد نے ایک خط جس بات کی طرف صراحت فرمائی ہے وہ قابل عبرت ہے فرماتے ہیں کہ:

''علما کے لیے دنیا کی محبت ورغبت ان کے جمیل چہرے کا بدنما داغ ہے، جو علمائے دنیا سے محبت کرتے ہیں ان کے علم سے ممکن ہے دوسروں کو فائدہ پہنچ جائے مگر انہیں خود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اگر ان کی ذات سے دین یا ملت کو تقویت حاصل ہو جائے تو یہ کوئی قابل قدر بات نہیں، کیونکہ کبھی اللہ ایک فاسق وفاجر سے بھی اپنے دین کی تائید کر لیتا ہے'' (۲۰)

دوسری طرف جاہل صوفیہ کا حال یہ تھا کہ وہ وحدۃ الوجود جیسے پاکیزہ حالی مسئلے کا سہارا لے کر اپنے کو شریعت سے آزاد گردانتے تھے، صرف طریقت وحقیقت کے الفاظ کی رٹ لگاتے تھے، جن کے متعلق حضرت مجدد قدس سرہ نے لکھا ہے کہ:

''اکثر جہلا صوفی نمائے زمانہ، حکم علمائے سوء دارند، فساد اینہا نیز فساد متعدی است۔'' (مکتوبات، جلد اول ۴۷)

اس کے علاوہ اس دور میں کچھ مجاذیب کو عوام نے قابل تقلید واتباع بنالیا تھا جب کہ مجاذیب صاحب تمکین اور صاحب ارشاد نہ ہونے کی وجہ سے اتباع کے لائق نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی تردید کی جاتی ہے۔ بلکہ ان کے حق میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔ چوتھی طرف اکبری دور میں تصوف کے نظریات کو توڑ مروڑ کر دین الٰہی سے متاثر افراد نے اتحاد وحلول کا عقیدہ گڑھ لیا تھا، جس کی وجہ سے شریعت وطریقت بازیچۂ اطفال بن گئی تھی، حضرت مجدد الف ثانی نے ان سب کے خلاف سنت وشریعت کی آواز بلند کی، جاہل صوفیہ کا رد کیا، حلول واتحاد اور تناسخ جیسے ویدانتی عقائد کو مخالف اسلام قرار دیا، اور طریقت وحقیقت کی بھٹی میں خود تپ کر اس راہ کے مسائل اور نازک پہلوؤں کی نشان دہی فرمائی اور یہ کہا کہ توحید وجودی اور توحید شہودی سالک کے راہ سلوک میں دو الگ الگ حال کا نام ہے۔ باطنی معاملات کا تعلق دعاوی سے نہیں، احوال سے ہوتا ہے۔

حضرت مجدد توحید شہودی کو مقام مشاہدہ مانتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک وہ اعلیٰ ہے اور توحید وجودی کو سالک کا مقام فنا مانتے ہیں اور ماسوائے وجود مطلق کے تمام مظاہر کو تنوعات وتلوینات میں سے قرار دیتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت سلسلۂ نقش بندیہ سے منسلک ہونے کے کچھ سال بعد عیاں ہوئی ورنہ آپ خود توحید وجودی کے احوال سے گزر چکے تھے، یہ نعمت آپ کو والد ماجد سے وراثت میں ملی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ توحید شہودی کو آپ نے ظاہر شریعت سے زیادہ اقرب پایا ہے اس لیے آپ نے بعد میں اسی پر زور دیا تا کہ جاہل صوفیہ کے اثر ورسوخ کو ختم کیا جا سکے- اسی وجہ سے آپ نے شریعت پر سختی سے عمل ہی کو روحانی ارتقا کا ذریعہ قرار دیا ہے-

آپ شریعت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ظاہر کو شریعت غرا کے ظاہر سے آراستہ کرنا اور باطن کو ہمیشہ حق جل وعلا سے وابستہ رکھنا بڑا ہی اونچا کام ہے، دیکھیں کس خوش قسمت کو ان دو عظیم نعمتوں سے مشرف کیا جاتا ہے۔ آج ان دونوں نسبتوں کا ایک ہونا بلکہ صرف ظاہر شریعت ہی پر مستقیم رہنا بہت ہی نادر الوجود ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے کمال کرم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی متابعت پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے'' (۲۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

''شریعت کے تین حصے ہیں علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں چیزیں متحقق نہیں ہو جاتیں شریعت متحقق نہیں ہو سکتی، اور جب شریعت متحقق ہو گئی تو پھر حق سبحانہ کی رضا حاصل ہو گئی جو تمام دینی ودنیوی سعادات سے بڑھ کر ہے- ورضوان من اللہ اکبر'' (۲۲)

آپ کی انہیں مساعی جمیلہ کا ثمرہ یہ نکلا کہ ہندوستان وبیرون ہند کے مشاہیر علما ومشائخ نے آپ کے دریائے فیض سے استفادہ کیا، ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ارباب علم ومعرفت نے آپ کی ذات سے وابستہ ہو کر دعوت واصلاح کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ شریعت وطریقت کے میدان میں کامل ومکمل ہو کر تبلیغ دین کے لیے اکناف عالم میں پھیل گئے، خلافت واجازت سے سرفراز ہو کر مقرب بارگاہ الٰہی بن گئے، یہ سب تائید غیبی، غایت اخلاص، سنت وشریعت پر عمل اور غیر معمولی روحانی کمالات کے بغیر ناممکن ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آپ کے خلفا کی ایک لمبی تعداد ہے۔ پچھلے صفحات میں حضرت مجدد الف ثانی کے دعوتی طریقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ان سارے محاذ پر آپ نے کام کرنے کے لیے آدم گری اور مردم سازی کا کام انجام دیا ہے کیونکہ بغیر صالح افراد کے کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم

نے بتایا کہ کس طرح حضرت مجدد الف ثانی نے خلفا کی قیادت میں دعوتی وفود روانہ کیے ہیں، مذکورہ خلفا کے علاوہ اور بھی خلفا کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس کام پر مامور تھے، یہاں ان کے کارناموں کو مختصراً بھی پیش نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم نے ذیل میں ایک فہرست دینے پر اکتفا کیا ہے-

خلفا

۱-حضرت خواجہ محمد صادق ۲-حضرت خواجہ محمد معصوم عروۃ الوثقی ۳-حضرت سید آدم بنوری ۴-مولانا امان اللہ لاہوری ۵-مولانا بدر الدین سمرقندی ۶-حضرت خواجہ محمد سعید ۷-حاجی خضر خاں افغانی ۸-میر صغیر احمد رومی ۹-خواجہ عبید اللہ خواجہ کلاں ۱۰-خواجہ عبد اللہ خواجہ خرد ۱۱-شیخ عبد الحی حصاری ۱۲-مولانا عبد الاحد لاہوری ۱۳-شیخ عبد الہادی فاروقی بدایونی ۱۴-شیخ حسن ابدالی ۱۵-مولانا صالح کولابی ۱۶-مولانا صدیق کشمی ۱۷-شیخ مزمل ۱۸-حافظ محمود لاہوری ۱۹-شیخ یار محمد جدید بدخشی طالقانی ۲۰-مولا یار محمد قدیم ۲۱-شیخ یوسف برکی ۲۲-مولانا یوسف سمرقندی۔ (۲۳)

ان خلفا کے علاوہ بھی دوسرے مشاہیر علما نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ کے تجدیدی واصلاحی مشن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاص طور پر اس سیاق میں حضرت علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی قدس سرہ کی ذات انتہائی پیش پیش اور نمایاں رہی ہے، حضرت مجدد سے آپ کی وابستگی ۱۰۲۲ھ میں ہوئی، حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات، دعوتی اور اصلاحی کارناموں کی وسعت وہمہ گیریت اور تمام طبقات میں اس کے نمایاں اثرات دیکھنے کے بعد آپ ہی کی ذات نے حضرت شیخ احمد سرہندی کو ''مجدد الف ثانی'' قرار دیا اور ملت اسلامیہ نے اس کی تائید وتوثیق کی (۲۴)

مذکورہ اسما کے علاوہ بھی خانقاہ میں جاں نثار مریدین اور خلفا کی ایک بڑی تعداد تھی، بہ قول صاحب زبدۃ المقامات ان خلفا کے علاوہ بھی بہت سے صاحب دل خلفا ایسے ہیں جو زاویۂ فقر اور گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان سے اکثر خادمان آستانہ بھی واقف نہیں ہیں- (۲۵)

زمانۂ اسیری میں عملی دعوت

۱۰۲۸ھ میں جب جہانگیر نے سجدۂ تعظیمی کے انکار کی وجہ سے حضرت مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا، تو آپ نے اس صعوبت کو صعوبت نہیں بلکہ نعمت خداوندی اور انعام الٰہی قرار دیا۔ آپ نے خود فرمایا کہ یہاں مزید فیوض وبرکات الٰہی کا احساس ہو رہا ہے۔ پہلے میری تربیت جمالی طریقے پر ہوئی تھی اور اب جلالی طریقے پر ہو رہی ہے۔ یہ سفر آپ کے روحانی عروج وارتقا کے علاوہ دعوتی نقطۂ نظر سے نقطۂ انقلاب (Turning Point) ثابت ہوا، چنانچہ ملک اور بیرون ملک آپ کے واقعۂ اسیری سے حکام، امراء، علما اور عوام متحد ہو گئے، خود اراکین سلطنت میں اختلاف ہو گیا، امرا اور علما سے خط وکتابت جاری رہا، اور پھر رہائی کے بعد بادشاہ تک کلمۂ حق پہنچانے کا سنہرا

موقع ہاتھ آ گیا۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے ایک سال کے اندر قلعے کے اندر قیدیوں میں اسلام کی ایسی پرسوز تبلیغ کی جس سے ان کے دل ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے ڈاکٹر آرنلڈ نے اس واقعے کو اپنی کتاب The Preaching of Islam میں یوں لکھا ہے کہ:

''شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے۔ جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے، شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا، ان لوگوں نے کسی بہانے سے انہیں قید کروا دیا، دو سال وہ قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقائے زنداں میں سے سیکڑوں بت پرستوں کو حلقۂ بگوش بنا لیا'' (۲۶)

مذکورہ خدمات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حضرت کے مجدد کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے اور آپ نے ہر سطح پر کس طرح اصلاح وتربیت سے شریعت اسلامی کو نافذ کرنے میں تگ ودو فرمائی ہے، مسلم سوسائٹی کی فکری، اعتقادی اور عملی انحراف کو سنت نبوی اور اتباع طریقہ محمدی سے بدلا ہے۔ اکبر کے رائج کردہ دین الٰہی کی خرافات وبدعات کو سرہند کے اس بوریہ نشین درویش ہمہ صفات نے فیوض باطنی اور جہاد مسلسل سے خاتمہ فرمایا ہے، حضرت مجدد کے تمام تجدیدی کارناموں کا دائرہ طریقہ نبوی پر خطاب وکتاب کے ذریعہ ایمان وایقان کی تجدید واحیا تھی جس کو نافذ کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے، اور نیابت کا حق ادا کرتے ہوئے مخلوق کے قلوب کا تزکیہ، شریعت کے ظاہر وباطن کی تعلیم اور دلوں میں اتباع نبوی اور اسوۂ حسنہ کی دیپ جلا دی اور حجازی سرمایۂ ملت کو اقطار عالم تک پہنچا دیا۔

وفات پر ملال

علم وآفتاب کا یہ سورج حیات نبوی کے مطابق ۶۳ سال تک پوری آب وتاب کے ساتھ عالم کو منور کرنے کے بعد ۱۰۳۴ میں ضیق النفس کے عارضے کا شکار ہو گیا۔ وفات کی نشانیاں اور وصال کی خبر تواتر سے اپنے مقربین کو بتا چکے تھے اخیر وقت تک سنت نبوی پر عامل تھے، آخری وقت میں صاحبزادگان کو وصیت فرمائی کہ ''سنت را بدنداں خواہند گرفت'' (۲۷) اور میری قبر کسی گمنام جگہ بنا دینا، اللہ اکبر! جریدۂ عالم پر نشانیاں ثبت کرنے کے بعد اس طرح بے نشانی کی تمنا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۲۹ رصفر المظفر ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء کو سرمایہ ملت کے اس عدیم المثال نگہبان کا وصال ہو گیا۔

اولاد امجاد

پسماندگان میں آپ نے سات صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں۔

صاحبزادے

۱-خواجہ محمد صادق قدس سرہ (م ۱۰۲۵ھ)، ۲-خواجہ محمد سعید قدس سرہ (۱۰۷۰ھ)، ۳-خواجہ محمد معصوم قدس سرہ (۱۰۷۹ھ)، ۴-خواجہ محمد فرخ قدس سرہ (۱۰۲۵ھ)، ۵-خواجہ محمد عیسیٰ قدس سرہ (۱۰۲۵ھ)، ۶-خواجہ محمد اشرف قدس سرہ، ۷-خواجہ محمد یحیٰ قدس سرہ (۱۰۹۶ھ)

صاحبزادیاں

۱-بی بی رقیہ، ۲-بی بی خدیجہ بانو، ۳-بی بی ام کلثوم قدست اسرارہم

حضرت مجدد قدس سرہ کی تمام اولاد آپ کے راستے پر تھیں اور آپ کے مشن کو آگے بڑھانے میں آپ ہی جیسا کردار پیش کیا ہے، اولاد کی باطنی خصوصیات واوصاف کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے مکتوبات شاہد ہیں، یہ ایسی صالح اولاد تھیں جنہیں نسبی اور کسبی دونوں طرح کے کمالات حاصل تھے۔

معاصر علما ومشائخ

حضرت مجدد الف جس صدی میں اصلاح وتجدید کے فریضے انجام دے رہے تھے، حکومتی، سماجی، سیاسی اور علمی سطح پر خرابیوں کی اصلاح کر رہے تھے، اسی زمانے میں آپ کے معاصر علما ومشائخ کی ایک بڑی تعداد بھی اپنے اپنے دائرے میں اصلاح وتربیت اور علم نبوت کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف تھے- ملک بھر میں علم وفضل اور فیض وروحانیت کی ایک کہکشاں آباد تھی جس سے جڑے ستاروں میں ترجیح ایک مشکل امر ہے- ایسے دور میں مجدد صاحب کی ہمہ گیر اصلاحات ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے- ذیل میں آپ کے چند معاصرین کے نام درج کیے جاتے ہیں:

۱-شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری (۱۰۰۴ھ)، ۲-ملا عبد القادر بدایونی (۱۰۰۴ھ)، ۳-حضرت مولانا عبد اللہ انصاری (۱۰۰۷ھ)، ۴-حضرت شیخ بہلول دہلوی (۱۰۰۷ھ)، ۵-حضرت سید میر عبد الواحد بلگرامی (۱۰۱۷ھ)، ۶-شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (۱۰۲۳ھ)، ۷-حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری (۱۰۲۴ھ)، ۸-شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (۱۰۳۱ھ)، ۹-مولانا شکر اللہ شیرازی (۱۰۴۸ھ)، ۱۰-حضرت شیخ تاج الدین سنبھلی خلیفہ اول حضرت خواجہ باقی باللہ (۱۰۵۰ھ)، ۱۱-حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)، ۱۲-حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی (۱۰۵۳ھ)، ۱۳-حضرت سید میر عبد الجلیل بلگرامی (۱۰۵۷ھ)، ۱۴-حضرت شہباز محمد بھاگلپوری (۱۰۶۰ھ)، ۱۵-قاضی محمد اسلم (۱۰۶۱ھ)، ۱۶-حضرت طیب بن معین بنارسی (۱۰۶۲ھ)، ۱۷-ملا محمود جون پوری (۱۰۶۲ھ)، ۱۸-حضرت شیخ نور الحق دہلوی (۱۰۷۳ھ)، ۱۹-حضرت احمد بن عبد اللہ خضری، حیدر آبادی (۱۰۷۳ھ)، ۲۰-حضرت شیخ احمد بن محمد کاسیوی (۱۰۸۴ھ) (۲۸)

حواشی و تعلیقات

۱-مقامات خیر ص:۳۳

۲-تذکرۂ علمائے ہند (مترجم)، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء ص:۸۸

۳-تذکرہ مجدد الف ثانی مرتبہ مولانا منظور مطبوعہ لکھنؤ ۲۰۴ ۱ء، ص:۲۲۵-۲۲۴

۴-مجدد الف ثانی، پروفیسر محمد مسعود احمد، اسلامک پبلشرز دہلی ۲۰۰۳ء، ص:۲۵

۵-حوالہ سابق ص:۲۸

۶-زبدۃ المقامات ص:۱۳۴-۱۳۵ ملخصاً بحوالہ تاریخ مشائخ نقشبندیہ از مولانا نفیس احمد مصباحی، مطبوعہ لکھنؤ ۲۰۱۰ء، ص:۴۸۴-۴۸۳

۷-مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، مکتوب، ۸۷

۸-اخبار الاخیار مع مکتوبات از شیخ عبد الحق محدث دہلوی، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۹ء، ص:۳۲۴

کچھ تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کو سلسلہ سہروردیہ میں حضرت استاد محترم شیخ یعقوب صرفی کشمیری قدس سرہ سے خلافت واجازت حاصل تھی اور حضرت موصوف کو شیخ حسین خوارزمی سہروردی سے، لیکن خود شیخ مجدد نے جن نسبتوں سے استفادے کا ذکر مکتوبات میں فرمایا ہے وہ تین ہی ہیں، ممکن ہے عقیدت میں کچھ مورخین نے سہروردیہ کا اضافہ کر دیا ہو۔

ایک دوسری بات یہ عرض کرنی ہے حضرت مجدد قدس سرہ کی شخصیت کی عبقریت اور ان کے روحانی کمالات کے متعلق آپ کے پیر طریقت حضرت خواجہ باقی باللہ کے کئی اقوال مورخین نے نقل فرمائے ہیں ان میں کچھ وہ بھی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت مجدد کے روحانی کمالات اپنے پیر پر بھی فائق تھے۔ جب کہ طریقت کے ادنی طالب علم کے لیے یہ بات سرے سے نا قابل اعتبار ہے، کیوں کہ اس راہ میں جملہ فیوض و برکات پیر کے پردے میں ملتے ہیں- البتہ یہ عین ممکن ہے کہ حضرت مجدد سے غلبۂ محبت میں مورخین نے اس قسم کی باتیں لکھ دی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان اصحاب کے دل کدورت زدہ تھے۔ ہر گز نہیں۔ غلبۂ حال کی باتیں تحریر میں آ جانے سے تمام باتوں کا انکار علمی دیانت کے خلاف ہے لیکن تمام باتیں تسلیم کرنا بھی خلاف عقل ہے۔

۹-زبدۃ المقامات ص ۱۵۶ بحوالہ مجدد الف ثانی، پروفیسر مسعود احمد ص:۲۹

۱۰-حضرت مجدد الف ثانی مصنفہ پروفیسر محمد مسعود احمد ص:۴۲

۱۱-مجددی عقائد و نظریات از مولانا عبد الحکیم خاں اختر شاہجہاپوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء ص:۱۶

۱۲-حضرت مجدد ثانی، ص ۴۲۔ حضرت پروفیسر نے بقیہ اسفار کو اتفاقی کہا ہے جب کہ مشائخ کے اسفار محض اتفاقی نہیں ہوتے ہیں اس میں من جانب اللہ اسرار و حکمت کا جہاں پوشیدہ

ہوتا ہے، وہ کوئی قدم اپنی مرضی سے نہیں اٹھاتے ہیں خود حضرت مجدد الف ثانی نے جتنے دن قلعہ گوالیار میں قید و بند کی زندگی بسر کی ہے ان دنوں دعوت کا کام وہیں سے بحسن وخوبی انجام پاتا رہا ہے۔ قلعہ کے قیدیوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کیا اور ایمان لائے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ کے اسفار و اقدام حکمتوں سے پُر ہوتے ہیں۔ خود حضرت مجدد نے اس سفر کو غنیمت قرار دیا ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ آپ کی دعوتی زندگی کا یہ سفر Turning Point (نقطۂ انقلاب) ہے جہاں سے اسلامی تحریک کے احیا کا دور عروج شروع ہوتا ہے-

۱۳-زبدۃ المقامات ص:۲۰۹، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت چہار مصنفہ مولانا ابو الحسن علی ندوی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۸۸ء ص:۱۸۲

۱۴-تاریخ دعوت و عزیمت چہارم ملخصاً ۱۸۷-۱۸۱۔

۱۵- اخبار الاخیار ص: ۳۲۶- حضرت شیخ نے یہ کلمات خواجہ حسام الدین قدس سرہ (۱۰۴۳ھ) کے نام ارسال فرمائے تھے، جسے مورخین نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اخبار کا جو نسخۂ میرے پیش نظر ہے اس میں اصل متن میں حضرت شیخ مجدد کا ذکر نہیں ہے- البتہ کتاب کے اختتام پر کسی عزیز نے حضرت مجدد کا تذکرہ اضافہ کر دیا ہے۔

۱۶-روضۃ القیومیۃ: ۱۶۶-۱۶۷ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت ۴/ص:۱۶۰

۱۷-تاریخ دعوت عزیمت جلد ۴، ص:۱۶۲-۱۶۱ ملخصاً

۱۸-حضرت مجدد الف ثانی ص:۱۹۹-۱۹۵

۱۹-نزہۃ الخواطر، عبد الحی بن فخر الدین حسنی، جلد ۵ ص:۴۷-۴۸، ملخصاً

۲۰-مکتوبات امام ربانی، مطبوعہ کراچی، ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء، مکتوب نمبر ۳۳، ص:۹۵

۲۱-ایضاً، مکتوب:۸۳، ص:۱۸۲

۲۲-حضرت مجدد الف ثانی، پروفیسر محمد مسعود احمد ص:۹۹

۲۳-تاریخ دعوت و عزیمت، ۴، ص:۱۷۱

۲۴-وکیل احمد سکندر پوری ہدیہ مجددیہ، دہلی، ۱۳۰۹ھ ص:۹۸، بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی:۱۶۸

۲۵-بحوالہ تذکرہ مجدد الف ثانی، مولانا محمد منظور نعمانی ص:۳۵۰

۲۶-The Preaching of Isla 1953,P.988 بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی

۲۷-زبدۃ المقامات ص:۲۸۹-۲۹۰، بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی پروفیسر محمد مسعود احمد ص:۱۶۲

۲۸-معاصرین کے انتخاب میں نزہۃ الخواطر، حدائق الحنفیہ اور دیگر کتابوں سے مدد لی گئی ہے-

○○○

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات

سنن ابوداؤد کی مشہور حدیث ہے: **ان اللہ وعزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مئۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا** (بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر ایک ایسا عظیم الشان اور ہمہ جہت وہمہ گیر عالم پیدا فرمائے گا جو بدعات وخرافات کو مٹانے، گمراہی کو ختم کرنے اور احیائے سنت وتجدید دین کا فریضہ انجام دے گا-) اس حدیث پاک کو حاکم نے اپنی مستدرک میں اور ملا علی قاری نے مرقاۃ میں نقل کیا ہے- کنز العمال میں بھی یہ حدیث موجود ہے-

ایسے جید عالم باعمل کو مجدد دین وملت قرار دیا جاتا ہے جو لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر حق کا پرچم بلند کرتا ہے- ایسے شخص کو بدعتیوں، گمراہوں اور بدمذہبوں کی طرف سے سخت مخالفت اور ظلم وجور کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، سب وشتم، مصائب وآلام، تشدد اور قید وبند سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن ایسی پرعزم ہستیاں ہمیشہ رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کرتی ہیں- وہ کسی حال میں اہل ظلم وجور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتیں بلکہ سربلندی وسرفرازی ان کا شیوہ اور طریقہ ہوا ہے- ایسی ہی ہستیوں اور مجددوں میں شیخ احمد فاروقی سرہندی المعروف بہ 'مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام نامی اسم گرامی بہت نمایاں ہے- ان کی عظمت وشان کو ظاہر کرنے کے لیے علامہ اقبال کے یہ اشعار کفایت کرتے ہیں:

وہ ہند میں سرمائیہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمئی احرار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

عام طور سے ہر صدی کے اختتام پر کسی ایسے عالم دین کو جس نے خدمت دین مبین اور احیائے سنت کا فریضہ بہت نمایاں انداز میں انجام دیا ہو، مجدد عصر قرار دیا گیا ہے- چوں کہ یہ اعزاز خواص امت نے اپنے اپنے ذوق اور صواب دید کے مطابق عطا کیا ہے، اس لیے ایک ہی صدی میں کئی کئی افراد کو مجدد عصر کہا گیا ہے اور ان کے سلسلے میں اختلاف بھی کیے گئے ہیں لیکن شیخ احمد فاروقی سرہندی علیہ الرحمۃ والرضوان کا یہ امتیاز خاص ہے کہ انھیں سن ہجری کے دوسرے ہزارے کے آغاز پر مجدد الف ثانی، کہا گیا اور اس تواتر اور شدومد سے کہا گیا کہ آج ان کے نام کی جگہ یہ لقب ہی مشہور ومعروف ہے، نام پس منظر میں چلا گیا ہے- اب مجدد الف ثانی کہتے یا سنتے ہی ذہن صرف اور صرف آپ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے- یہ آپ کے حقیقی اور عظیم مجدد دین وملت ہونے کی ایسی دلیل قاہر ہے کہ جسے رد نہیں کیا جاسکتا-

شیخ احمد کی ولادت شب جمعہ ۱۴ شوال ۹۷۱ھ ۱۵۶۳ء میں مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں ہوئی تھی- والد گرامی شیخ عبدالاحد، صاحب نسبت بزرگ تھے- مشہور ومعروف بزرگ حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور پھر ان کے فرزند شیخ رکن الدین کی خدمت میں رہ کر منازل سلوک طے کر چکے تھے اور قادری چشتی سلاسل میں خرقۂ خلافت اور رشد وہدایت نیز تلقین وتربیت کی اجازت سے سرفراز تھے-

حضرت شیخ احمد نے حفظ قرآن کی تکمیل کے ساتھ دیگر علوم دین ۱۷ سال کی عمر میں ہی بکمال وتمام حاصل کر لیے تھے- کچھ عرصہ درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے- اس دوران کئی رسائل جیسے رسالہ تحلیلہ، اور رسالہ رد مذہب شیعہ، وغیرہ تحریر فرمائے- دہلی میں، معروف بزرگ شیخ عبدالباقی نقشبندی المعروف بہ خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ والرضوان سے اکتساب فیض کیا، بیعت وارادت کا رشتہ استوار کر کے چند روزہ قیام میں ہی راہ سلوک کی بہت سی منازل سر کر لیں - دوسری بار جب دہلی تشریف لائے تو خلافت واجازت سے سرفراز کر دیے گئے اور طالبان خدا کو تعلیم طریقت اور رشد وہدایت سے شاد کام کرنے کا حکم صادر ہوا- عام طور پر مریدین ومتوسلین ہی اپنے شیخ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں لیکن خود شیخ طریقت اپنے اس مرید خاص سے کس قدر متاثر اور ان کی صلاحیتوں اور آئندہ کی انجام پانے والی خدمات دین کے سلسلے میں کس قدر یقین اور مطمئن تھے، اس کا اندازہ آپ کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے ''شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ما ہزاراں سیارگار درضمن ایشاں گم اند'' (دیکھئے زبدۃ المقام، ۳۳۰) شیخ احمد آفتاب ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم جیسے ہزاروں سیارے گم ہیں)

حضرت والا اپنے احوال اور ترقیات باطنی کی تفصیلات سے نہ صرف خود آگاہ رہتے تھے بلکہ

ان کا اظہار بھی فرماتے تھے- آپ کو یقین کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے-''
(دیکھئے مکتوب ۴۷- دفتر دوم)

دراصل عہد اکبری میں اسلام کی بیخ کنی کا کام جس منصوبہ بندی، شدومد اور قوت سے کیا گیا تھا، شعائر اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی جیسی وسیع کوششیں کی گئی تھیں، اسلام کے بجائے دین الٰہی، اکبرشاہی کو رائج کرنے کی جیسی منظّم کوشش کی گئی تھی، فلاسفہ، نام نہاد عقلاء و دانش وروں، علمائے سوء اور جاہل صوفیہ و نام نہاد اہل طریقت نے اسلام کے نورانی چہرے کو داغدار کرنے کی جیسی سعی نامسعود کی تھی، ان سب کے ازالے کے لیے ایک ایسی باصلاحیت، ہمہ گیر و ہمہ جہت مجدد دین وملت شخصیت کی ضرورت تھی جو حکمت، تدبیر و تدبر کے ساتھ تمام نامعقول و نامسعود بدعات و خرافات اور خیالات و نظریات کا قلع قمع کر کے اللہ کے پسندیدہ دین کو پھر سے اس کی اصلی حالت میں لا کر بندگان خدا تک پہنچا سکے- اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کو اس خدمت عالیہ کے لیے منتخب فرمالیا تھا، اسی لیے آپ نے اس فریضہ کو آزادی اور اسیری دونوں میں اپنی تحریر سے، تقریر سے، تبلیغ سے اور جہد و عمل سے، اس احسن طریقے سے انجام دیا کہ ہر طرف سے آپ کو ''مجدد الف ثانی، کے خطاب لاثانی سے یاد کیا جانے لگا- آپ کے تفصیلی احوال وخدمات تو ضخیم کتابوں کا موضوع ہیں، اس لیے فی الوقت آپ کے تجدیدی کارناموں کا ذریعہ وآلہ یعنی آپ کے گراں قدر مکتوبات کا مختصر سا علمی و مذہبی تجزیہ ہی مقصود ہے-

مکتوبات امام ربانی'' کے نام سے موسوم مکتوبات، حضرت والا کی سب سے بڑی علمی و مذہبی اور اصلاحی و تجدیدی خدمت اور یادگار ہیں- یہ مکتوبات جنھیں جدید علمی اصطلاح میں مقالات کہا جاسکتا ہے، آپ کے علمی مقام، فارسی ادب پر آپ کی دسترس، آپ کی رشد و ہدایت کی صلاحیت کا آئینہ، تبلیغ و ارشاد کی مساعی کا نمونہ اور علوم و معارف کا گنجینہ ہیں- اسی لیے ان کے تراجم اردو، عربی، ترکی اور دیگر زبانوں میں بھی ہوئے؛ تا کہ ان سے وہ لوگ بھی استفادہ کرسکیں جو فارسی سے ناواقف ہیں، اس طرح ان کا فیض عالم اسلام کے بیشتر ممالک تک پہنچا- ان کی شرحیں بھی لکھی گئیں، علمی و روحانی مراکز میں انھیں نصاب میں شامل کیا گیا اور ان کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا- اہل علم ونظر اور اہل سلوک نے انھیں حرز جان بنایا-

ان مکتوبات کی مجموعی تعداد ۵۳۶ ہے، انھیں دفتروں یا حصوں میں منقسم کیا گیا ہے- دفتر اول ''دارالمعرفت'' کے نام سے موسوم ہے، اس میں شامل مکتوبات کی تعداد ۳۱۳ ہے، ۳۱۳ کا عدد متبرک سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ رسولوں کی تعداد بھی ۳۱۳ بتائی گئی ہے، حضرت داؤد نے جس لشکر کے ساتھ جالوت کی افواج کا مقابلہ کیا تھا، اس میں بھی ۳۱۳ مجاہدین تھے نیز رسول اکرم ﷺ کی

قیادت باسعادت میں کفر و اسلام کے درمیان میدان بدر میں جو معرکۂ کارزار گرم ہوا تھا اس وقت بھی حامیان اسلام اور اصحاب بدر کی تعداد ۳۱۳ ہی تھی- اسی لیے مکتوبات بھی ۳۱۳ ہی شامل کیے گئے- انھیں خود حضرت والا کے ایماء سے آپکے خلیفۂ خاص حضرت مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا تھا-

دفتر دوم میں کل ۹۹ مکتوبات ہیں چوں کہ اسمائے حسنی اور اسمائے رسول مقبول ﷺ کی تعداد بھی ۹۹ ہے اس لیے اس عدد کو بطور تبرک اختیار کیا گیا- ''نور الخلائق کے تاریخی نام سے موسوم اس دفتر کے مرتب مولانا عبدالحی حصاری شادمانی ہیں جنھیں ان کی ترتیب کا حکم حضرت والا کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم نے دیا تھا- ۱۰۲۸ھ میں یہ ترتیب پایۂ تکمیل کو پہنچی- دفتر سوم موسوم بہ معرفتہ الحقائق مرتبہ مولانا محمد ہاشم کشمی ہے، ۱۰۳۱ھ میں مرتب کیے گئے، اس مجموعے میں ابتداء ۱۱۴ مکاتیب تھے اور اس عدد کو سورہ ہائے قرآنی کے اعداد کی مناسبت سے اختیار کیا گیا تھا- بعد میں دس مکاتیب کا اضافہ کر کے اس تعداد کو ۱۲۴ تک پہنچا دیا گیا-

ان مکتوبات میں سے ۲۰ بیس مکاتیب حضرت والا نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی خدمت اقدس میں ارسال کیے ہیں- دو تین مکتوبات بہ عنوان یکے از صالحات لکھے گئے ہیں جو غالبا کسی مریدہ کے نام ہیں- ایک خط ہردے رام نام کے کسی ہندو کے نام ہے، بقیہ مکاتیب اپنے معاصرین، معتقدین و مریدین کو ارسال کیے گئے ہیں- ان میں سے اکثر مکتوب بجائے خود ایک کتابچے کی حیثیت رکھتے ہیں- ان کے مضامین میں وہ رفعت، جامعیت، افادیت اور تاثیر و طاقت ہے جو چار صدیوں سے اپنے قارئین کو متاثر و مرعوب کررہی ہے- انھیں علمی نکات اور حقائق و معارف سے بہرہ ور کررہی ہے- دراصل مکاتیب کے یہ دفاتر ایسا سدا بہار چمن ہیں کہ جن پر گزشتہ چار صدیوں سے خزاں کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے- تراجم کے ذریعہ، متعدد زبانوں میں ان کی طباعت واشاعت،، مطالعے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا- عہد مجدد الف ثانی کے فکری و دینی رجحانات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شش جہتی بگاڑ اور خرابیاں تھیں اور اس دور پر ہی کیا موقوف، یہ بگاڑ اور خرابیاں تواتر کے ساتھ جاری ہیں، آج بھی یہ اپنا کام کررہی ہیں- درحقیقت شیطانی مشن ہر دور میں اور ہر وقت مصروف کار رہتا ہے لیکن حضرت مجدد الف ثانی جیسی شخصیت صدیوں کے وقفے کے بعد ظہور میں آتی ہے- لیکن جب ظاہر ہوتی ہے تو شیطانی مشن کے تار و پود بکھیر دیتی ہے- بہر حال آپ کے دور کے شش جہتی بگاڑ اور ان کے خلاف آپ کی جد و جہد کو درج ذیل انداز سے سمجھا جاسکتا ہے:

ایک طرف علمائے سو تھے جو اپنے معمولی مفادات اور حرص وہوس کے لیے باہم دست وگر یباں رہتے تھے، طبقۂ امراء کی خوشنودی کے لیے حکام دین کی ایسی تاویل کرتے تھے، فقہی مسائل کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ جن سے امراء کے لیے آسانیاں فراہم ہوں اور وہ صلے میں انھیں انعام واکرام سے نوازیں- مثلاً انھوں نے حولان حول (زکوۃ کی ادائیگی کے لیے مال کے ایک سال تک ملکیت میں رہنے کی شرط) کو اس طرح موڑ دیا تھا کہ کل مال کا چھ، سات مہینہ شوہر مالک رہے پھر وہ مال بیوی کو ہبہ کر دیا جائے اور اس طرح دونوں باہم منتقل کرتے رہیں تو اس صورت میں زکوۃ کسی پر واجب نہ ہوگی- اسی طرح فریضۂ حج کو بھی راستوں کے مخدوش اور پر خطر ہونے کی بنا پر ملتوی کر دیا گیا تھا- انھوں نے شاہوں کی خوشنودی کے لیے سجدۂ تعظیمی کو بھی جائز قرار دے دیا تھا اور پسندیدہ عورتوں کو حاصل کرنے کے لیے بھی طرح طرح کے حیلے بہانے اور جواز تلاش کیے گئے تھے- ایسے ہی علما کی رکیک حرکتوں نے اسلام کے پر جوش معتقد مگر پر تجسس اکبر کو نہ صرف علما سے بلکہ خود اسلام سے بھی بدظن کر دیا تھا- آج کے علما سو بھی اپنے ''فرائض'' اسی تواتر سے انجام دے رہے ہیں- آج بھی حکومت وقت اور امراء کی کاسہ لیسی ان کا شعار ہے، ان کے اشاروں پر افتراق بین المسلمین میں مشغول ہیں- حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے دور کے علمائے سو کی خوب خبر لی- ان کی حرص وہوس کو بے نقاب کیا، ان کی تاویلوں اور رکیک حرکات کو اجاگر کیا اور درباری طبقہ امراء تک علمائے حق کو پہنچانے کی کوشش کی تا کہ ان کی صحیح رہنمائی ہو سکے- آپ کی مساعی جمیلہ بڑی حد تک ثمر آور ہوئیں اور علمائے سوء کے پھیلائے ہوئے جال بڑی حد تک دور ہوئے-

دوسری طرف فلاسفہ اور نام نہاد عقلاء واہل دانش کا آزاد خیال طبقہ تھا جو آزادروی کا دلدادہ تھا اور اسی کو شعار بنائے ہوئے تھا، وحدت ادیان کا راگ الاپ رہا تھا، اللہ کی ذات و صفات اور دین کے اصول ونظریات کو اپنی عقل خام کی کسوٹی پر کس رہا تھا اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کو رد کر کے ایک ایسا دین بنانے پر آمادہ تھا جو تمام ادیان کا معجون مرکب ہو جس میں ان کے خیال کے مطابق سبھی ادیان کی اچھی باتوں کو سمویا جائے اور مضر باتوں کو رد کر دیا جائے جو آسانیاں فراہم کرے اور مرضی ومنشاء کے تابع ہو- دراصل اس وقت ایران سے ہندوستان تک ایک شوشہ چھوڑا گیا تھا کہ نبوت محمدی ایک ہزار سال کے لیے تھی، اب یہ وقت پورا ہو گیا ہے اس لیے اس کا دور ختم ہوا- اب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ایک ایسے دین کی ضرورت ہے جو ضرورت وقت کے مطابق ہو، جس کی اساس عقل وفلسفے پر ہو- ایران کی صفوی تحریک، اور ہندوستان میں دین الٰہی اکبر شاہی، اس نظریے کا نتیجہ اور ردعمل تھے- یہ تحریکیں نہ صرف رسالت محمدی علیہ التحیۃ والثناء کی منکر تھیں اور شریعت محمدیہ کو از کار رفتہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں، بلکہ اللہ جل جلالہ کی ذات

وصفات کے متعلق بھی فلسفۂ یونان کے زیر اثر عجیب وغریب افکار ونظریات کا اظہار کر رہی تھیں اور بے پناہ قوتوں وقدرتوں کو محدود کر کے اسے لاچار ومجبور اور بے دست وپا الہ قرار دینے کے لیے کوشاں تھیں- سرکار ودربار میں اس گروہ کا بڑا اثر ونفوذ تھا- ابوالفضل اور فیضی جیسے اہل عقل ودانش کی قیادت میں یہ طبقہ بڑا سرگرم تھا- اس لیے انھیں سے سب سے بڑا معرکہ درپیش تھا- آپ نے اس امر پر زور دیا کہ عقل ودانش حقائق دینی کے ادراک میں ناکافی وناقص ثابت ہوتی ہیں- انوار نبوت کی رہنمائی کے بغیر اور اس کی رہنمائی ومدد کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ادراک کیا جا سکے یا احکام شریعت کو سمجھا جا سکے- اس ضمن میں فرماتے ہیں: عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدیٰ بنایا تھا، گمراہی کے بیابانوں میں نہ بھٹکتے اور حق تعالیٰ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پہچانتے'' (از مکتوب ۲۱۳، دفتر سوم بنا خواجہ ابراہیم قبادیانی)

ایک اور مکتوب میں ارشاد گرامی ہے:

''عقل کے ساتھ وہم وخیال، حرص وہوس خطا ونسیان اور غصہ وخواہشات بھی لگی ہوئی ہیں ان کے ہوتے ہوئے کیا عقل ہمیشہ صحیح نتائج تک پہنچا سکتی ہے؟''

(از مکتوب ٦٦٦، دفتر اول بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ)

ایک مکتوب میں کیا خوب فرماتے ہیں:

''نفس، خواہ تزکیہ کے بعد نفس مطمئنہ ہی کیوں نہ بن گیا ہو لیکن وہ اپنی صفات سے پوری طرح الگ نہیں ہو سکتا- اس لیے غلطی کا احتمال اس میں بھی باقی رہتا ہے-''

(از مکتوب ۱۴۱ بنام شیخ درویش)

حضرت والا کے یہ ارشادات اہل عقل ودانش کو قائل کرنے کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ واقعی ان کے پاس عقل سلیم، ہو- نہ ماننے والوں اور ضد وہٹ دھرمی پر قائم رہنے والوں کو کوئی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی-

دراصل اہل مذہب اور اہل عقل ودانش کا قضیہ بڑا قدیم ہے- مسلمانوں میں عہد عباسی میں یہ قضیہ اس وقت پیدا ہوا جب یونانی علوم اور فلسفے کو عربی میں منتقل کیا گیا- ان کے زیر اثر ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے بہت سے مسلم اعتقادات ونظریات کا انکار کرنا شروع کیا اور مذہبی معتقدات کو فلسفہ وتعقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا- نتیجہ میں اہل مذہب کے ساتھ ان کا مناقشہ ہوا- یہ طبقہ ''معتزلہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے عباسی خلیفہ مامون الرشید اور اس کے بعد اس کے دو تین جانشینوں کے عہد میں بڑا عروج پایا اور اپنے خیالات کو بزور قوت پھیلانے کی کوشش کی-

تقریبا ایسا ہی طبقہ ''عہد اکبری میں پیدا ہوا تھا جس کا مقابلہ اس دور کے علما نے کیا اور پھر حضرت مجدد الف ثانی نے ان کے نظریات کی کمزوریاں ظاہر کر دیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں بھی سائنسی ترقیوں اور ایجادات کے ظہور میں آنے کے بعد عقل کی کارفرمائی پر بہت زور دیا جانے لگا تھا۔ مغرب کے نام نہاد عقلاء، سائنس داں اور فلسفی اپنی عقل و دانش کے زعم میں ہر اس بات کے منکر تھے جو سمجھ میں نہیں آتی یا نظر نہیں آتی۔ چوں کہ مذہب کو عقل سے نہیں وجدان سے سمجھا جا سکتا ہے اس لیے ان لوگوں کے نزدیک مذہب از کار رفتہ اور بے کار محض قرار پایا۔ مشرق کے نقالوں اور مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا افراد تو مغرب کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے پر مصر تھے اس لیے مذہب کا انکار بلکہ اس کا مضحکہ ان کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو مذہب کو مطلقا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن ''دانائے مغرب'' کے ارشادات بھی ان کے لیے وحی الٰہی سے کم نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے دونوں میں تطبیق کی کوشش کی اور اس کی صورت یہ تھی کہ مذہب کی جو بات خلاف عقل محسوس ہو اس کا انکار کر دو اور مذہب کو سائنس و فلسفے کے تابع کر دو، مراد یہ تھی کہ سائنس و فلسفہ مذہب کی جس بات کو ماننے کی اجازت دے اسے مان لو بقیہ سب کو قصے کہانیاں، اسرائیلی اور لایعنی باتیں قرار دے کر رد کر دو۔ اس طرح مذہب بھی باقی رہے گا اور عقل و دانش کی علمبرداری بھی۔ اب اس کوشش میں ''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے'' والا معاملہ ہو تو ہو لیکن دو کشتیوں کی سواری کا مزہ تو مل ہی جائے گا۔ سرسید کی تحریک نیچریت کی بنا اسی پر تھی کہ جو بات سمجھ میں نہیں آتی اور جو چیزیں نظر نہیں آتیں، ان کا انکار ضروری ہے۔ ''دانایان فرنگ، جن باتوں کے منکر ہیں بھلا ہم انھیں کیسے مان سکتے ہیں؟ ایسے میں مغرب سے ہی ایک جرمن فلسفی کانٹ نے عقل کی حدود اور نارسائی دلائل و براہین سے ظاہر کی، اس کی معرکہ آرا کتاب Critique of the pure reason جس کا اردو ترجمہ ''تنقید عقل محض، کے نام سے ہو چکا ہے، تقریبا ان ہی خیالات کا اعادہ کرتی ہے جو کانٹ سے تقریبا دو سو سال قبل حضرت مجدد الف ثانی نے ظاہر فرمائے تھے۔ مغرب میں اس کے خیالات کی بڑی پزیرائی ہوئی۔ اس نے عقل کی نارسائی پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ بقول علامہ اقبال ''کانٹ نے روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا ہے، "Reduced the whole work of the rationalists to a beap of uins. the reconstructio of religious thought in Islam, P:5" حضرت مجدد الف ثانی کی عظمت اور آپ کا تجدیدی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے عقلیت پسندوں کے خیالات کو پر کاہ بنا کر اڑا دیا تھا اور ایسے خیالات کا اظہار فرمایا تھا جو ہمیشہ تر و تازہ

رہنے والے، ہمیشہ کام آنے والے اور عقلیت پسندوں کو خاموش کر دینے والے تھے۔

تیسری طرف جاہل صوفیا اور نام نہاد طریقت کے علمبرداروں کا گروہ تھا جنھوں نے کشف و کرامات کے قصوں کو الف لیلی کی کہانیاں بنا دیا تھا، جن میں ہر طرف مافوق الفطرت واقعات اور مسحور کن معاملات کی بھرمار تھی۔ یہ لوگ علی الاعلان کہتے تھے کہ شریعت اور طریقت دو الگ الگ راہیں ہیں۔ اہل طریقت کو شرعی پابندیوں کی ضرورت نہیں، معرفت الٰہی کے بعد بندہ تکالیف شرعیہ سے آزاد ہو جاتا ہے۔، واقعی ان لوگوں نے شریعت سے آزاد ہو کر طرح طرح کی بدعات و خرافات ایجاد کر لی تھیں جن کی تفصیلات حیرت انگیز بھی ہیں اور تکلیف دہ بھی۔ اس پر طرفہ کہ یہ ولایت کو نبوت سے بڑا درجہ دینے پر مصر تھا، دلیل یہ تھی کہ ولایت تو بڑی حد تک کسبی ہے ،سخت عبادت و ریاضت کے بعد ہی کوئی شخص درجہ ولایت کو پہنچا ہے جبکہ نبوت وہبی ہے، نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے۔ عطیۂ خداوندی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چاہا اپنے فضل و کرم سے نبی و رسول بنایا۔

اس باطل نظریے کا رد فرماتے ہوئے حضرت والا نے تحریر کیا تھا۔

''کمالات ولایت کا کمالات نبوت کے مقابلے میں کوئی شمار نہیں، وہ نسبت بھی تو نہیں، جو قطرے کو سمندر سے ہوتی ہے ...... افضلیت مطلق انبیاء ہی کو ہے........ کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ ولی کا سر نبی کے قدم کے نیچے ہوتا ہے''

(از مکتوب ۲۲۶ دفتر اول بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبیداللہ)

اسی طرح طریقت کو شریعت پر ترجیح دینے والوں کی خبر لیتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا:

''طریقت تابع و خادم شریعت ہے۔ کمالات شریعت احوال و مشاہدات پر مقدم ہیں ایک حکم شرعی پر عمل، ہزار سالہ ریاضت سے زیادہ نافع ہے..... حلت و حرمت میں صوفیہ کا عمل سند نہیں، کتاب و سنت اور کتب فقہ کی دلیل چاہیے۔ اہل ضلالت کی ریاضتیں موجب قرب نہیں باعث بعد ہیں ۔صور و اشکال غیبی داخل لہو و لعب ہیں تکلیف شرعی کبھی ساقط نہیں ہوتی۔'' آپ نے ہمیشہ شریعت کی بالادستی پر زور دیا اور طریقت کو اس کا تابع اور معاون قرار دیا۔

شیخ اکبر نے وحدت الوجود کے سلسلے میں جو کچھ کہا اور لکھا اس کی تفصیل اور منشا و مقصد کچھ اور تھا لیکن بعد میں اس کے معانی مطالب اور منشا و مقصد کو بالکل مسخ کر دیا گیا تھا اور اسے اس غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ بجائے خود ایک چیستاں اور گمراہ کن فلسفے کی شکل اختیار کر گیا، اسی لیے آپ نے اس مسخ شدہ صورت کی نفی کی اور وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود پر زور دیا۔ اول الذکر کے مطابق ،ہمہ اوست۔ تھا تو آپ نے فرمایا ''ہمہ از اوست، حقیقت میں یہ شریعت اسلامیہ کے منشاء و مقصد کے عین مطابق ہے۔ چوتھی طرف رفض و تفضیلیت کے نظریات

تھے جوحب اہل بیت کے پردے میں صحابۂ کرام اور خصوصا خلفائے ثلاثہ سے بدظن وبدگمان کر رہے تھے- یہ لوگ نہ صرف ان کے عظیم الشان کارناموں اور خدمات کے منکر تھے بلکہ انھیں اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور اسی کی تبلیغ واشاعت میں لگے ہوئے تھے- یہ طبقہ تاریخ اسلام کو ایسی مسخ شدہ شکل میں پیش کر رہا تھا جس سے اسلام کو ایک ناکام نظریہ ثابت کیا جا سکے اور اسلام سے بدظنی کا باعث ہو- انھوں نے عہد رسالت مآب ﷺ کی ۲۳ سالہ جدو جہد اور اس کے نتیجے میں عالم عرب میں برپا ہونے والے انقلاب اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ہو جانے کو اس طرح محدود کر دیا تھا کہ ان کے بقول آپ کے بعد صرف چھ مسلمان باقی رہ گئے تھے باقی سب گمراہ و بے دین ہو گئے تھے- آپ نے رفض وتفضیلیت کے نظریات پر کاری ضرب لگائی اور یہود و مجوس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دلائل و براہین کے ساتھ رد کیا، صحابہ کرام کی عظمت وفضیلت اور خدمات کو اجاگر کیا- خلفائے ثلاثہ کے انتخاب اور اس پر حضرت علی کس طرح ان کے ہر قدم پر ممدو معاون رہے- خلفائے ثلاثہ خصوصا شیخین کرام رضی اللہ عنہم کی ناقابل انکار خدمات پر آپ نے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی- سرکار و دربار میں شیعہ امراء کے اثرات کو کم کرانے کے لیے آپ نے سنی امرا کی غیرت وحمیت کو للکارا اور انھیں اپنے اثر ورسوخ استعمال کرنے کی دعوت دی- ان سب کا خاطر خواہ اثر ہوا- اس میدان میں آپ کی مساعی جمیلہ اور تجدید کارنامے بڑے وقیع اور بااثر ثابت ہوئے- پانچویں طرف راجپوت راجاؤں، رانیوں اور دربار میں داخل برہمنوں، پنڈتوں اور نجومیوں کا اثر ورسوخ تھا جو سرکار و دربار پر حاوی ہو کر انھیں ہندو رنگ میں رنگنے کی کوشش کر رہا تھا- دربار اور مغل امراء پر یا تو ایرانی رنگ غالب تھا یا ہندوستانی - انھیں کے رسم و رواج طور طریقوں اور تیوہار وتقریبات کو فخر سے اپنایا جاتا تھا- نوروز، ہولی، دیوالی، دسہرہ، اور بسنت وغیرہ تیوہار دھوم دھام سے اور انھیں کی روایات کے مطابق منائے جاتے تھے- اس کے برعکس اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا تھا- ان سب کی تفصیل کے لیے ملا عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ، اور اس دور کی دیگر تاریخی کتب کا مطالعہ کفایت کرے گا- پنڈت، نجومی اور راجپوت درباری اس امر میں کوشاں تھے کہ نام نہاد آزاد خیال علما کی راہ سے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ہندو تہذیب میں رنگ دیا جائے تاکہ کچھ عرصہ بعد یہ قوم بھی اسی طرح ہندو وتہذیب کا حصہ بن جائے جس طرح عربوں، اراجیوں، افغانوں اور ترکوں یعنی مسلمانوں سے قبل آنے والی قومیں ہندو تہذیب ومعاشرہ کا حصہ بن گئیں تھیں اور اپنی شناخت کھو بیٹھی تھیں- یہ لوگ حقیقت میں اپنے مقصد کی کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے- سنسکرت سے ہونے والے تراجم اور علوم وفنون نے ایک بڑے طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ خود کو ان کے رنگ میں رنگنے پر آمادہ تھے- چھٹی اور آخری

سمت میں عوام وخواص کا وہ طبقہ تھا جو یا تو مذہب سے آشنا ہی نہ تھا یا اس کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی مرضی ومنشا کی زندگی گزارنا چاہتا تھا- اسے تن آسانی اور من مانی کی کھلی چھوٹ درکار تھی- ان انتہائی مشکل پیچیدہ حالات میں حضرت مجدد الف ثانی کو یقیناً ''شش جہتی'' جنگ و جہاد کرنا تھا- حضرت والا نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ مذکورہ بالا باطل وگمراہ کن نظریات کا دلائل و براہین کے ساتھ رد کیا، صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی اور سرکار و دربار کی بااثر اور سعید شخصیتوں کو اس جہاد میں شرکت کے لیے آمادہ کیا- انھیں ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر، کے فریضہ کا احساس کرایا اس سلسلہ میں خصوصا شیخ فرید، خان جہاں، صدر جہاں اور لالو بیگ وغیرہ بااثر امراء کو آپ نے مخاطب کیا- انھیں عقائد واعمال کی درستی پر توجہ دلائی نیز ان کے اثر ورسوخ کو بدعات وخرافات کے مٹانے کا ذریعہ بنانے پر زور دیا- آپ کے ارشادات واحکامات میں درد واثر اور سوز وگداز تھا، اسلام کی سچی محبت اور اسکے نفاذ کا عمیق جذبہ تھا اس لیے ''از دل خیزد، بر دل ریزد، کے مصداق مخاطبوں کے دلوں پر اثر ہوا آپ کی پرسوز مساعی اور جہد مسلسل نے اپنا کام کیا- سرکار، دربار کا رنگ بدلا- جہاں گیر میں ہی کچھ تبدیلی آئی اور اس کے بعد تو شاہ جہاں جیسا نیک دل بادشاہ ہوا اور شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب جیسا حامی دین متین بادشاہ ہوا- برصغیر میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی غربت، کس مپرسی اور بے چارگی کے عالم میں آپ نے جیسا قلمی ولسانی جہاد فرمایا، اس کا صلہ تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کو حاصل ہوگا- اس دنیا میں بھی ''مجدد الف ثانی، جیسا خطاب لاثانی آپ کو حاصل ہوا- یہ دین و دنیا میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے- مغلوں کے آخری دور میں ہی سرہند مسلمانوں سے تقریبا خالی ہو گیا تھا- سکھ سردار بندہ بیراگی نے اسے تاخت وتاراج کر دیا تھا- برصغیر کی آزادی کے بعد تو پورا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا اور آج بھی تقریبا خالی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں سے ہی آپ اور آپ کے متعلقین کے مقابر ومساجد کی حفاظت کرائی- آپ کے عرس کے موقع پر ہر سال خاصا مجمع ہوتا ہے آج بھی آپ کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے-

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے مکاتیب کے تینوں دفاتر حقیقی اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے دل سوزی اور جذبۂ خدمت سے پر ہیں اور ان پر کلام خود ایک بڑے دفتر کا متقاضی ہے، یہاں تو بطور نمونہ چند اشارے ہی کیے جا سکے ہیں اور انھیں پر اکتفا کیا گیا ہے- ہاں اگر آپ کے شش جہتی کارناموں کو چھ ہی جملوں میں سمیٹنا مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے-

(۱) آپ نے مغلیہ دربار اور طبقہ امراء کی اصلاح کی کوشش کر کے ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کا بیڑا اٹھایا-

(۲) عہد اکبری میں شروع ہوئے اعتقادی، ذہنی اور تہذیبی وتمدنی ارتداد کو روکنے کی بھر

پورکوشش کی اوراس میں بڑی حدتک کامیاب رہے-تمام مغل بادشاہوں میں صرف اکبرو جہاں گیرہی بے ریش اور ہندورنگ میں نظرآتے ہیں باقی سب کم سے کم تہذیبی وتمدنی طور پر مسلمان ہی نظرآتے ہیں-

(۳) آپ نے وحدت ادیان کے نظریے اور گمراہ صوفیہ واہل طریقت کے نظریات اور بدعات وخرافات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی-

(۴) طریقت پر شریعت کی بالادستی کو شدومد سے پیش کیا اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ طریقت شریعت کی تابع ومحکوم اور مدومعاون ہے، اس سے الگ کوئی نظام نہیں ہے بلکہ اسی کا تتمہ اور تکملہ ہے-

(۵) وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کے نظریے پر زور دیا جس سے بہت سی فکری گمراہیاں دور ہوئیں-آپ نے ہمہ اوست، کے مقابلہ میں، ہمہ ازاوست، فرما کر راہ اعتدال اور صراط مستقیم واضح کی-

(۶) رفض وتفضیلیت کے نظریے پر ضرب لگا کر اہل سنت والجماعت کے نظریے کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی-

ان ہی تجدیدی خدمات اور جہد مسلسل نے بالاتفاق آپ کو' مجدد الف ثانی، بنادیا-

○○○

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی

مکتوبات امام ربانی میں تصوف کے رموز ونکات

''مکتوباتِ امامِ ربانی'' کے مطالعے سے قبل، حضرتِ مجددِ الف ثانی کے بارے میں چند کلمات عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے-

آپ کا نام شیخ احمد، تاریخِ ولادت شبِ جمعہ ۱۴-شوال ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۳ء اور جائے پیدائیش سرہند ہے-سلسلۂ نسَب حسبِ ذَیل ہے:

حضرت شیخ احمد بن مخدوم عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحیٔ بن محمد بن حبیب اللہ بن امام رفیع الدین بن سلیمان بن یوسف بن اسحاق بن عبداللہ بن شعیب بن احمد بن یوسف بن شہاب الدین علی فرّخ شاہ بن نورالدین بن نصیرالدین بن محمود بن سلیمان بن مسعود بن عبداللہ الواعظ الاصغر بن عبداللہ الواعظ الاکبر بن ابوالفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن ناصر بن عبداللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبداللہ بن حضرت عمر فاروقِ اعظم-

شیخ احمد مجدد الف ثانی کے اجداد میں ایک بزرگ امام رفیع الدین غالباً آٹھویں صدی ہجری میں کابل سے ہندوستان تشریف لائے-انھوں نے پہلے سنّام میں، پھر سرہند میں سکونت اختیار کی-

اُس زمانے میں سرہند کا نام سہرند تھا اور یہ ایک غیرآباد مقام تھا-اس سے ذرا فاصلے پر سرالیس کے نام سے ایک بستی تھی جہاں کے باشندوں کی درخواست پر مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری (متوفی ۷۸۵ھ) نے سلطان فیروز شاہ سے سہرند میں قلعہ تعمیر کرانے کی سفارش کی اور اس طرح ۷۶۰ھ کے آس پاس سہرند آباد ہوا-اپنے شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے حکم پر امام رفیع الدین نے اس شہر میں قیام فرمایا-

اسی خاندان کے ایک فرد مخدوم شیخ عبدالاحد تھے جنھیں شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے شرفِ بیعت، اوراُن کے صاحب زادے شیخ رکن الدین سے خلافت واجازت، اور قادری سلسلے کے مشہور بزرگ شاہ کمال کیتھلی سے نسبتِ خصوصی حاصل تھی-انھوں نے شاہ سکندر سے بھی کسبِ فیض کیا

تھا۔ کتبِ فقہ وحدیث پر اُن کی گہری نظر تھی۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی اُن ہی کے فرزند دل بند تھے۔

شیخ احمد مجدد الف ثانی کی تعلیم کا آغاز حفظِ قرآن سے ہوا۔ پھر والدِ گرامی سے اور بعد میں اُس دور کے جید علما و محدثین سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔

تحصیلِ علم کے بعد کچھ دِنوں اکبرآباد (آگرہ) میں بھی قیام فرمایا جو اُس زمانے میں مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہاں ابوالفضل اور فیضی سے اُن کی ملاقاتیں رہیں لیکن مزاج میں اختلاف کی وجہ سے تعلقات ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ادھر مخدوم شیخ عبدالاحد کو اُن کی جدائی شاق گزری اور وہ بیٹے کو گھر لے جانے کی غرض سے آگرہ تشریف لے گئے۔

واپسی کے سفر میں حاکمِ تھانیسر شیخ سلطان کی صاحب زادی شیخ احمد کے نکاح میں آئیں اور آپ والدِ محترم اور رفیقۂ حیات کے ساتھ سرہند لوٹے۔ والد کی ضعیفی کے پیشِ نظر آپ نے سرہند میں ہی قیام کو مناسب جانا۔ ۱۷۔ رجب ۱۰۰۷ھ کو آپ کے پدرِ بزرگوار شیخ عبدالاحد نے اَسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔

والدِ ذی شان کی رحلت کے بعد آپ حج کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ اُن ہی دِنوں حضرت خواجہ باقی باللہ (پ۹۷۱-۷۲ھ-م۱۰۱۴ھ) کابل سے دہلی تشریف لائے تھے۔

دہلی پہنچ کر آپ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحب نے آپ کی آمد پر مسرت کا اظہار فرمایا اور چند روز اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے سرِ تسلیم خم کیا۔ یہاں تک کہ ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا۔ اس درمیان آپ خواجہ صاحب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ داخلِ سلسلہ ہونے کے متمنّی ہوئے۔ درخواست قبول ہوئی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے جب ہندوستان آنے کا قصد فرمایا تھا تو انھیں کشف ہوا تھا کہ ایک نہایت خوب صورت اور شیریں مقال طوطی اُن کے ہاتھ پر آ بیٹھا ہے۔ خواجہ صاحب اپنا لعابِ دہن اس کے منہ میں ڈال رہے ہیں اور وہ اپنے منقار سے اُن کے دہنِ مبارک میں شکر دے رہا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے پیر و مرشد شیخ محمد املنگی نے اس کی یہ تعبیر بتائی تھی کہ ہندوستان میں تمھاری تربیت سے کوئی ایسا شخص سرفراز ہوگا جس سے عالم منور ہوگا اور تمھیں بھی اُس سے حصہ ملے گا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد کو اپنے کشف کی تعبیر خیال فرمایا، داخلِ سلسلہ کیا اور مزید چند دِنوں اپنی خدمت میں رکھ کر واپسی کی اجازت عطا فرمائی۔

اس کے بعد مرشد سے دہلی میں دو اور ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خرقۂ خلافت سے نوازے گئے۔ تیسری بار آپ خواجہ صاحب سے

دعائیں لینے دہلی پہنچے تو پیر و مرشد نے بڑی شفقت فرمائی۔ تحسینی کلمات سے نوازا اور رخصت کے وقت ارشاد فرمایا: اب امیدِ حیات کم ہے۔

اندیشہ درست ثابت ہوا۔ چہار شنبہ، ۱۴ جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ کو حضرت خواجہ باقی باللہ نے دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اُس وقت آپ کی عمر چالیس سال چار ماہ تھی۔

اُن دِنوں حضرت مجدد لاہور میں تھے۔ شیخ کے وصال کی خبر سنتے ہی دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ مرشدزادوں سے تعزیت کی اور چند روز بعد سرہند لوٹ کر تبلیغ و ارشاد کو وظیفۂ حیات بنایا۔

وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی شہرت اور مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ نیاز مندوں میں عوام، علما، امرا اور رؤسا سبھی شامل تھے۔ آپ نے زبانی وعظ و نصیحت کے علاوہ، طالبانِ حق، اُمرا اور اراکینِ سلطنت کی اصلاح کے لیے پے در پے مکاتیب لکھے اور تبلیغِ دین کے لیے متعدد خلفا ملک کے دور دراز علاقوں میں بھیجے۔ اُن دِنوں جہاں گیر سریر آرائے سلطنت تھا۔ مجدد صاحب کی دینی سرگرمیوں کو اس نے شبہ کی نظر سے دیکھا۔ اُسے تشویش ہوئی کہ سلطنت کے خلاف یہ کوئی خفیہ سازش تو نہیں؟ اس نے اپنے خدشے کو دور کرنے کے لیے حضرت کو بہانے سے طلب فرمایا۔ طلبی کی وجہ تزکِ جہاں گیری جلد دوم میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

''مجھے اطلاع دی گئی کہ شیاد، جس کا نام شیخ احمد سرہندی ہے، سرہند میں دامِ زَرق و سالوس (مکر و فریب) پھیلا رکھا ہے اور بہت سے لوگوں کو (ظاہر پرستوں کو) بغیر روحانیت کے شکار بنالیا ہے اور ہر شہر میں اور دیار میں اپنے مریدوں میں سے ایک کو بھیجا ہے جسے وہ خلیفہ کے نام سے پکارتا ہے اور جن کو اوروں کے مقابلے میں آئینِ دکان آرائی و معرفت فروشی اور مردم فریبی میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے بہت سی مُزخرفاتی (بناوٹی باتیں) اپنے مریدوں اور معتقدین کو لکھ بھیجی ہیں اور اسے ایک کتاب میں یکجا کر دیا ہے جس کا نام مکتوبات ہے۔ اس جُنگِ مہملات (یا اس مُہمَل ذخیرۂ خطوط) میں بہت سی لاطائل باتیں لکھی ہیں جس سے کفر و زَندَقہ ظاہر ہوتا ہے۔...

اس وجہ سے میں نے حکم جاری کیا کہ انھیں دربار میں پیش کیا جائے۔ حسب الحکم اُن کو پیش کیا گیا۔ میں نے جو بھی سوال کیا، اس کا کوئی معقول جواب نہیں ملا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی ناواقفیت ہی میں بہت مطمئن اور فخر محسوس کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ وہ کچھ دِنوں تک قید میں رہیں تاکہ ان کے دماغ کی گرمی اور حرارت اور مزاج کی پراگندگی کم ہو سکے اور لوگوں کا جوش بھی کم ہو جائے۔ اس لیے انھیں انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کیا گیا کہ انھیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے''۔(۱)

مُندرجہ بالا اقتباس کا یہ جملہ قابلِ غور ہے: ''مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی ناواقفیت ہی

میں مطمئن اور فخر محسوس کرتے تھے''-

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں گیر سے حضرتِ مجدد کا طرزِ تکلم کیا رہا ہوگا- یقیناً انھوں نے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہوں گی جس سے اُس کی کبیدگی میں مزید اضافہ ہوا- اقتباس کا ایک اور جملہ توجہ طلب ہے: ''میں نے سوچا کہ... وہ کچھ دِنوں تک قید میں رہیں تا کہ اُن کے دماغ کی گرمی اور حرارت اور مزاج کی پراگندگی کم ہو سکے اور لوگوں کا جوش بھی کم ہو جائے''-

یہ سطریں بھی اس بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ عوام وخواص میں حضرتِ مجدد کی غیر معمولی مقبولیت جہاں گیر کی فکر کا باعث تھی- یہ اور بات ہے کہ اس نے حضرت کی مذہبی سرگرمیوں بالخصوص اُس خط کو بنیاد بنایا جو آپ نے اپنے شیخ کی خدمت میں لکھا تھا اور جس میں اپنے بعض احوال اور علوم مرتبت کا ذکر تھا-

بہرحال تو زکِ جہاں گیری سے قطع نظر، حضرت کے سوانح نگاروں نے یہ معلومات فراہم کی ہے کہ جب امامِ ربانی دربار میں تشریف لے گئے تو انھوں نے وہ آدابِ شاہی، جو شرعاً ناجائز تھے، ادا نہ کیے- بادشاہ نے درباری رسوم وآداب سے روگردانی کا سبب جاننا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے آداب واحکام کے علاوہ، میں کسی اور رسم کو نہیں جانتا- جہاں گیر یہ سن کر خفا ہوا اور اس نے جبراً آپ سے سجدہ کرانا چاہا- آپ نے انکار کیا- برافروختہ ہو کر اس نے آپ کی نظر بندی کا حکم صادر کیا- ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ/ ۱۶۱۹ء کو آپ قید کیے گئے اور ایک سال بعد جمادی الآخر ۱۰۲۹ھ/ مئی ۱۶۲۰ء میں رہا ہوئے- تو زکِ جہاں گیری جلدِ دُوم میں پندرھویں سنہ جلوس کے احوال کے تحت مرقوم ہے:

''آج سرہند کے شیخ احمد، جن کو کچھ دِنوں سے دکان آرائی، خود فروشی و بے صرفہ گوئی کی وجہ سے قید کر دیا گیا تھا، اپنے پاس طلب کیا اور رہا کر دیا- ایک خِلعت اور ایک ہزار روپے خرچ کے لیے دے کر ان کو جانے یا رہنے کی آزادی دے دی''-(۲)

جہاں گیر کے قول کے مطابق حضرت نے اس کے ساتھ رہنا قبول کیا- بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ حضرت رخصت چاہتے تھے لیکن بادشاہ کی خواہش پر آپ نے لشکر میں قیام فرمایا- بہرحال لشکر میں حضرت کا قیام تقریباً ساڑھے تین سال تک رہا- اس درمیان فوج کے ہمراہ بعض شہروں اور مقامات سے حضرت کا گزر ہوا اور وہاں کے لوگ آپ سے مستفید ہوئے- ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ میں آپ شاہی لشکر سے رخصت ہوئے اور سہ شنبہ ۲۸- صفر ۱۰۳۴ھ کو تریسٹھ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا-......ع......اب جہاں گیر ہے، نہ ہوسِ جہاں گیری!

مگر وہ جو دِلوں میں اِخلاص کے بیج بوتے ہیں اور عملِ صالح کی فصل کاٹتے ہیں، خوفِ خدا سے لرزتے ہیں اور شوکتِ سنجر وسلیم کے آگے سر اٹھا کر باتیں کرتے ہیں، جن کی راتیں آنسوؤں میں نہا کر نکھرتی ہیں اور آہِ سحر گہی سے جن کے معمولات کا آغاز ہوتا ہے، دنیا اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوتی ہے، اور یوں ہی کھڑی رہتی ہے، اُن کے ارشادات کی منتظر اور نگاہِ کرم کی متمنی! اُن کا فرمایا ہوا ہر لفظ اور لکھا ہوا ایک ایک حرف، وقت کی ہتھیلی پر شعاعِ مہر کی طرح جگمگاتا ہے اور ہر تارِ نظر شہادت دیتا ہے کہ یہ محض بیانات نہیں ہیں، علم وحکمت کے گنج ہائے گراں مایہ ہیں- کاش ہمیں بھی چند موتی چننے کی سعادت نصیب ہو جائے!

حضرتِ مجددِ الف ثانی کے خطوط تین جلدوں میں ہم تک پہنچے ہیں- ''مکتوباتِ امامِ ربانی''، دفترِ اول تین سو تیرہ خطوں پر مشتمل ہے- اس میں چوبیس عریضے حضرت باقی باللہ کے نام ہیں اور بقیہ کے مخاطب دوسرے حضرات ہیں- یہ مجموعہ امامِ ربانی کی حیات (۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء) میں ہی مدوّن کر لیا گیا تھا- اس کے مرتّب شیخ کے مرید اور خلیفہ حضرت مولانا یار محمد بدخشی طالقانی ہیں-

مکتوبات کی دوسری جلد جسے دفترِ دوم کہا گیا ہے، ننانوے خطوط پر مشتمل ہے- فرزندِ امامِ ربانی خواجہ محمد معصوم کی فرمایش پر ۱۰۲۸ھ میں اس کی ترتیب عمل میں آئی- اس کے مرتّب مولانا عبدالحیٔ حصاری شادمانی ہیں- اس مجموعے کے مکتوب الیہم کی تعداد اکہتّر ہے- اس کے تین مکاتیب ۱۵، ۵۳، اور ۶۱ میں اجتماعی مخاطبت اختیار کی گئی ہے-

دفترِ سوم حضرتِ مجددِ الف ثانی کے خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی کا مرتّب کردہ ہے- اس میں اولاً ایک سو چودہ خطوط شامل کیے گئے تھے- بعد میں دس مکاتیب کا اضافہ ہوا اور اس طرح اس مجموعے کے خطوں کی تعداد ایک سو چوبیس ہو گئی- تینوں دفاتر میں شامل خطوں کی کل تعداد پانچ سو چھتّیس ہے-

آیئے، گنجینۂ مَعانی، مکاتیبِ امامِ ربّانی کے مطالعے سے آنکھیں روشن کریں- صفحات کی تحدید کے پیشِ نظر، اس مضمون میں اقتباسات کی غیر ضروری تسہیل سے گریز کیا جائے گا، خیال رکھا جائے گا کہ راقم امامِ ربانی کے ارشادات اور قارئین کے درمیان کم سے کم حائل ہو- معرفتِ توحید سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں-

معرفتِ توحید

حضرتِ مجددِ الف ثانی فرماتے ہیں کہ اثنائے راہ میں سالک جن معرفتوں سے سرشار ہوتا ہے، ان میں سے ایک توحیدِ وجودی ہے، دوسری توحیدِ شہودی-

توحیدِ وجودی سے مراد ہے: ''ایک موجود کو جاننا اور اس کے غیر کو نابود سمجھنا''- اور :

”توحیدِ شہودی ایک کو دیکھنا ہے، یعنی ایک کے سوا سالک کو کچھ مشہود نہیں ہوتا“-(۳)

امامِ ربانی کا بیان ہے کہ وہ خود بھی ایک عرصے تک توحیدِ وجودی سے سرشار رہے- اس عالم میں تجلّیِ ذاتی کے علوم و معارف اُن پر منکشف ہوئے- مدتوں بعد: ”ناگاہ حقِ تعالیٰ کی عنایتِ بے غایت دریچۂ غیب سے میدانِ ظہور میں آئی اور ... وہ پہلے علوم جو اتحاد اور وحدتِ وجود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونے لگے- ... اور یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ ... حقِ تعالیٰ کسی چیز سے متحد نہیں ہے- خدا خدا ہے اور عالم عالم- ... واجب ممکن کا عین اور قدیم حادث کا عین ہرگز نہیں ہو سکتا- ... عالم ہر چند صفاتی کمالات کا آئینہ اور اسمائے ظہورات کا جلوہ گاہ ہے- لیکن مظہر ظاہر کا عین اور ظِل اصل کا عین نہیں ہے، جیسے کہ توحیدِ وجودی والوں کا مسلک ہے“-(۴)

شیخ صوفی کے نام لکھے گئے اس مکتوب میں ایک مثال کے ذریعے مظہر اور ظاہر کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے، سلسلۂ کلام کو اس طرح دراز کیا گیا ہے:

”مثلاً کسی اہلِ فن نے چاہا کہ اپنے مختلف کمالات کو ظاہر کرے اور اپنی پوشیدہ خوبیوں کو واضح کرے- تو اس نے حروف اور آوازوں کو ایجاد کیا، اور ان حروف اور آوازوں کے آئینوں میں اپنے پوشیدہ کمالات کو ظاہر کیا- اس صورت میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ حروف اور آواز جو ان مخفی کمالات کے لیے آئینے اور مظہر ہیں، ان کمالات کا عین ہیں یا بالذات ان کمالات کو محیط ہیں- یا بالذات اُن کے قریب ہیں، یا ان کے ساتھ معیتِ ذاتی رکھتے ہیں بلکہ ان کے درمیان دالیت اور مدلولیت کی نسبت ہے- حروف اور آواز اُن کمالات پر صرف دلالت کرنے والے ہیں اور وہ کمالات اپنی محض غیر مقلد حالت پر ہیں- وہ نسبتیں جو پیدا ہوئی ہیں، وہمی اور خیالی ہیں- حقیقت میں ان نسبتوں سے کوئی ثابت نہیں- ... عالم اپنے صانع کے وجود کے لیے علامت اور اس کے اسمائی اور صفاتی کمالات کے ظہور کے لیے مظہر ہے- اور یہی علاقہ بعض عارضوں کے باعث بعض کے لیے وہمی احکام کا باعث ہو جاتا ہے-

بعض کو توحید کے مراقبوں کی کثرت ان احکام پر لے آتی ہے کیوں کہ ان مراقبوں کی صورت قوتِ متخیلہ میں نقش ہو جاتی ہے- اور بعض دوسروں کو توحید کا علم اور اس کا تکرار ان اَحکام کے ساتھ ایک قسم کا ذوق بخشتا ہے اور توحید کی یہ دونوں صورتیں معلول اور ضعیف ہیں اور دائرۂ علم میں داخل ہیں، حال کے ساتھ کچھ تعلق نہیں رکھتیں- اور بعض دوسروں کے لیے ان احکام کا منشا محبت کا غلبہ ہے- کیوں کہ محبوب کی محبت کے غلبے کے باعث محبوب کا غیر محب کی نظر سے دور ہو جاتا ہے اور محبوب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا- ... واجب تعالیٰ جو بے چوں اور بے چگون ہے، ہرگز چوں کے آئینوں میں نہیں سما سکتا- ... بے چوں کو دائرۂ چوں کے باہر ڈھونڈنا چاہیے اور

لامکانی کو مکان کے باہر تلاش کرنا چاہیے- جو کچھ آفاق و انفس میں دیکھا جاتا ہے، وہ حقِ تعالیٰ کے نشانات ہیں“-(۵)

لیکن یہ بحث اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی- صوفیاے کرام کے الگ الگ مشاہدات ہیں اور گوناگوں تجربات پر مبنی اقوال- ان کے درمیان تطابق اور اُن کی مناسب توجیہ بھی ضروری ہے- امامِ ربانی کو اس کا احساس ہے- چناں چہ وہ محولہ مکتوب میں مسئلے کے بعض دوسرے پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے ہیں:

”اگر کہیں کہ اکثر مشائخِ نقشبندیہ اور دوسرے سلسلے کے مشائخ کی عبارتوں میں صاف طور پر لکھا ہے جو وحدتِ وجود اور احاطہ اور قرب او رمعیتِ ذاتی اور کثرت میں وحدت کے مشاہدے اور کثرت میں احدیت کے مشاہدے پر دلالت کرتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال شہود و احوال کے اثنا میں اُن پر ظاہر ہوئے ہوں گے اور بعد ازاں اس مقام سے گزر گئے ہوں گے- جیسے کہ اس فقیر نے پیش تر اپنے حال کی نسبت لکھا ہے-

دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض کے ظاہر کو جو کثرت بیں ہے، باطن میں احدیت صرف کی طرف پوری نگرانی ہونے کے باوجود ان احکام اور اس شہود سے مشرف کرتے ہیں- گویا باطن میں احدیت کے نگراں ہوتے ہیں، اور بہ ظاہر کثرت میں مطلوب کے مشاہدہ کرنے والے جیسے کہ اس فقیر نے اس مکتوب کی ابتدا میں اپنے والدِ بزرگوار کے حال سے خبر دی ہے- اور اس جواب کی تحقیق مفصل طور پر اس رسالے میں لکھی گئی ہے جو وحدتِ وجود کے مراتب کی تحقیق میں لکھا ہے-

یہ نہیں کہا جائے کہ جب نفس امر میں بہت سے وجود ہوں اور قرب اور احاطہ ذاتیہ نہ ہو اور کثرت میں وحدت کا شہود واقع کے مطابق نہ ہو تو ان بزرگواروں کا حکم جھوٹا ہوگا- ... ہم جواب (میں) کہتے ہیں کہ ان بزرگواروں نے اپنے شہود کے اندازے کے موافق حکم کیا ہے جس طرح کوئی شخص یہ حکم کرے کہ میں نے زید کی صورت کو آئینے میں دیکھا ہے- یہ حکم بھی واقعے کے مطابق نہیں کیوں کہ آئینے میں اس صورت کو نہیں دیکھا ہے- کیوں کہ صورت آئینے میں بالکل نہیں ہے جو دیکھی جائے- اس شخص کو عام طور پر کاذب نہ کہیں گے اگرچہ واقعے اور نفس الامر کے مطابق نہیں ہے- ... ان حالات کے ظاہر کرنے سے ... مقصود یہ ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اگر فقیر نے وحدتِ وجود کو قبول کیا ہوا تھا تو وہ کشف سے تھا، نہ ازروے تقلید کے- اور اگر اب انکار ہے تو الہام کے سبب سے ہے- اور اِلہام میں انکار کی گنجایش نہیں- اگرچہ اِلہام غیر پر حجت نہیں ہے-

دوسرا جواب جھوٹ کا شبہ دور کرنے کے لیے یہ ہے کہ افرادِ عالم ایک دوسرے کے ساتھ بعض امور میں مشترک اور شریک ہیں اور بعض دوسرے امور میں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا-

اسی طرح ممکن کا واجب کے ساتھ بعض امورِ عارضی میں اشتراک ہے اگرچہ بالذّات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں- پس محبت کے غلبے کی وجہ سے وہ چیز جو بین الانبیاء ہوسکتی ہے، نظر سے پوشیدہ ہوجاتی ہے اور وہ چیز جس سے دونوں میں اشتراک ہے، نظر میں رہ جاتی ہے-

پس اس صورت میں اگر ایک دوسرے کے عین ہونے کا حکم دیں تو واقع کے مطابق ہوگا اور جھوٹ کی ہرگز مجال نہ رہے گی- احاطۂ ذاتی کی مانند اور باتوں کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیے''-(٦)

مذکورہ بالا اقتباس میں بر سبیلِ تذکرہ کشف اور الہام کی نوعیت بھی زیرِ بحث آ گئی ہے- بہ قولِ امام ربانی، کشف کی وجہ سے وہ شروع میں وحدتِ وجود کے قائل تھے اور پھر الہام کے نتیجے میں اس سے بے رغبتی پیدا ہوئی: ''اور الہام میں انکار کی گنجایش نہیں- اگرچہ الہام غیر پر حجت نہیں ہے''-

اس جگہ ذرا سا ٹھہر کر ہمیں تصوف کے اس روحانی تجربے پر غور کرنا چاہیے جسے کشف، الہام، القا وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے- اصلاً یہ سالک کے انفرادی باطنی تجربات ہیں جن کے ذریعے اس پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے- ان کے حصول کے ذرائع ہر صوفی کے لیے یکساں نہیں ہوتے- یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک صوفی اپنے کشف سے جس نتیجے پر پہنچے، دوسرے صوفی کے مشاہدات بھی اس معاملے میں اس کے مماثل ہوں- سالک کے لیے اپنے اس روحانی تجربے پر عمل درآمد کس حد تک ضروری ہے اس سوال کے جواب میں صوفیہ کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ کشف پر عمل کرنا یا دوسروں کو اس سے آگاہ کرنا صاحبِ کشف کی مرضی پر منحصر ہے- وہ چاہے تو اسے قبول کرے، لوگوں تک پہنچائے یا پھر سکوت اختیار کرے- اس کے برعکس بعض صوفیہ کا موقف یہ ہے کہ کشف اگر شریعت سے متغائر نہ ہو تو صاحبِ کشف کے لیے اسے اشارۂ غیبی اور عنایتِ الٰہی سمجھ کر تسلیم کرنا لازمی ہے-

ذاتی تجربہ ہونے کی وجہ سے صوفیہ نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ کشف میں خطا کا امکان ہے- ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ کشف فی نفسہٖ درست ہوتا ہے- البتہ اس کی تعبیر یا استنباطِ نتائج میں تسامح ہوسکتا ہے- بہر حال اس بات پر بزرگوں کا اتفاق ہے کہ کشف بھی حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے اور اسے طریقِ ولایت میں شمار کیا گیا ہے-

امامِ ربّانی کی رائے ہے کہ شیخِ اکبر محی الدین ابن عربی (متوفی دمشق، ٦٣٨ھ) سلوک کے سفر میں توحیدِ وجودی سے مشرف ہوئے اور اسی مقام پر اُنھوں نے قیام فرمایا- یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ذاتِ واحد کا اقرار کیا اور ماسوائے ذات کی نفی کی اور نظریۂ وحدت الوجود پیش کیا-

وحدتُ الوجود اور وحدت الشّہود تصوف کی دو شہرۂ آفاق اصطلاحیں ہیں- ان پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں- ربطِ کلام کے لیے بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ دنیاے تصوف میں ان

دونوں نظریات کو مقبولیت حاصل ہے- صوفیاے کرام کا ایک طبقہ ابن عربی کی فکر سے متاثر ہے تو دوسرا امامِ ربانی کے نظریۂ وحدتُ الشہود سے متفق ہے- امامِ ربّانی کن بنیادوں پر وحدتُ الشّہود کے قائل ہیں اور کیوں وہ وحدتُ الوجود کو درست نہیں جانتے، اسے سمجھنے کے لیے شیخ صوفی کے نام لکھا گیا محولہ خط بے حد اہم ہے، جس کا ہم گذشتہ صفحات میں مطالعہ کیا- مزید تشفّی کے لیے مکتوباتِ امام ربانی دفتر دوم، مکتوبِ اول (بہ نام شیخ عبدالعزیز جون پوری) سے رجوع کرتے ہیں:

''وجود ہر جز و کمال کا مبدء اور عدم ہر نقص و شرارت کا منشا ہے- وجود واجب جل شانہٗ کے لیے ثابت ہے اور عدم ممکن کے نصیب ہے- تاکہ جز و کمال حقِ تعالیٰ کی طرف عائد ہوں- اور تمام شر و نقص ممکن کی طرف راجع ہو- ممکن کے لیے وجود ثابت کرنا اور تمام جز و کمال کو اس کی طرف راجع کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فلک و ملک میں اس کو شریک بنانا ہے- اسی طرح ممکن کو واجب تعالیٰ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات و افعال کو حق تعالیٰ کے صفات و افعال کا عین بنانا بڑی بے ادبی اور حق تعالیٰ کے اسماء و صفات میں الحاد و شرک ہے-...

اکثر صوفیہ خاص کر ان میں سے اکثر متاخرین نے ممکن کو واجب تعالیٰ کا عین جانا ہے اور اس کے صفات و افعال کو حق تعالیٰ کے صفات و افعال کا عین خیال کیا ہے-...

یہ بزرگوار اگرچہ وجود کے شریک کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور دوئی سے بھاگتے ہیں- لیکن غیر وجود کو وجود جانتے اور نقائص کو کمالات سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذاتی نقص و شرارت کسی چیز میں نہیں ہے- اگر ہے تو نسبی اور اضافی ہے- مثلاً زہرِ قاتل انسان کی نسبت شرارت رکھتا ہے کیوں کہ اس کی زندگی کو دور کرتا ہے، جس حیوان میں وہ زہر پایا جاتا ہے، آبِ حیات اور تریاقِ نافع ہے- اس امر میں ان کا مقتدا ان کا اپنا کشف و شہود ہے- جس قدر کہ ان کو معلوم ہوا ہے، انھوں نے ظاہر کر دیا ہے''-(٧)

حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک شیخِ اکبر محی الدین ابن عربی کے مشاہدات کی بھی یہی نوعیت ہے- وہ اور اُن کے ہم نوا صوفیاے کرام اپنے شہود کے اندازے کے مطابق کثرت میں وحدت کی بات کرتے ہیں، ماسوائے ذاتِ حق کی نفی کرتے ہیں اور تمام اعیانِ ثابتہ/ اشیا و مخلوقات کو ذاتِ الٰہی کا ظل (سایہ) قرار دیتے ہیں:

''شیخ محی الدین اور اس کے متبعین فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے اسماء و صفات حق تعالیٰ کی عین ذات ہیں- اور نیز ایک دوسرے کے عین ہیں- مثلاً علم و قدرت جس طرح حق تعالیٰ کی ذات کے عین ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے بھی عین ہیں- اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تعدد و تکثر کا کوئی نام و نشان نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا تمائز و تبایُن ہے- حاصل کلام یہ کہ ان اسماء و

صفات اور شیون و اعتبارات نے حضرت علم میں اجمالی اور تفصیلی طور پر تمائز و تبایُن پیدا کیا ہے- اگر تمیز اجمالی ہے تو اس کو تعینِ اول سے تعبیر کرتے ہیں- اگر تفصیلی ہے تو اس کو تعینِ ثانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں-

تعینِ اول کو وحدت کہتے ہیں اور اسی کو حقیقت محمدی جانتے ہیں- اور تعینِ ثانی کو واحدیت کہتے ہیں اور اسی کو تمام ممکنات کے حقائق سمجھتے ہیں- اور ان حقائق ممکنات کو اعیانِ ثابتہ جانتے ہیں- یہ دو تعینِ علمی جن کو وحدت اور واحدیت کہتے ہیں، مرتبہ وجوب میں ثابت کرتے اور کہتے ہیں کہ ان اعیان نے وجودِ خارجی کی بو نہیں پائی- اور خارج میں احدیتِ مجردہ کے سوا کچھ موجود نہیں ہے- یہ کثرت جو دکھائی دیتی ہے، ان اعیانِ ثابتہ کا عکس ہے، جو ظاہر وجود کے آئینہ میں جس کے سوا خارج میں کچھ موجود نہیں، منعکس ہوا ہے- اور وجودِ تخیلی پیدا کیا ہے جس طرح کہ آئینے میں کسی شخص کی صورت منعکس ہو کر آئینے میں وجودِ تخیلی پیدا کر لے- اس عکس کا وجود خیال کے سوا کچھ ثابت نہیں اور نہ ہی آئینے میں کسی شے نے حلول کیا ہے اور نہ ہی اس آئینے پر کوئی چیز منقش ہوئی ہے- اگر کچھ منقش ہے تو تخیل میں ہے، جو صرف آئینہ میں وہمی طور پر ظاہر ہے- یہ متخیل اور متوہم عکس چوں کہ صنعتِ خداوندی ہونے کے باعث بڑا استحکام اور اثبات رکھتا ہے، اس لیے وہم و تخیل کے اٹھنے سے اٹھ نہیں سکتا- اور ثواب و عذابِ ابدی اس پر مترتب ہے- یہ کثرت جو خارج میں نمودار ہے، تین قسموں میں منقسم ہے-

قسمِ اول تعینِ روحی ہے- اور قسمِ دُوم تعینِ مثالی- اور قسمِ سوم تعینِ جسدی ہے جو عالمِ شہادت سے تعلق رکھتا ہے-

ان تینوں تعیّنوں کو تعیناتِ خارجیہ کہتے ہیں- اور مرتبہ امکان میں ثابت کرتے ہیں- تنزلاتِ خمسہ بھی ان ہی تعیناتِ پنجگانہ سے مراد ہے- ان تنزلاتِ خمسہ کو حضراتِ خمس بھی کہتے ہیں- چوں کہ حق تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء وصفات کے سوا جو عین ذات ہیں ان کے نزدیک خارج کا علم ثابت نہیں ہوا- اور انھوں نے صورتِ علمیہ کو اس صورت کا عین سمجھا ہے نہ اس کا شبہ و مثال- اور ایسے ہی اعیانِ ثابتہ کی صورتِ منعکسہ کو جو ظاہر وجود کے آئینہ میں نمودار ہوئی ہے، ان اعیان کا عین تصور کیا ہے نہ اس کی شبہ و مانند- اس لیے اتحاد کا حکم کیا ہے اور ہمہ اوست کہا ہے''-(۸)

فتوحاتِ مکّیہ اور فصوص الحکم کے مصنف کے نظریۂ وحدت الوجود پر روشنی ڈالتے ہوئے امامِ ربّانی مجددِ الف ثانی مزید لکھتے ہیں کہ:

''شیخ سے پہلے اس گروہ میں سے کسی نے ان علوم و اسرار کے ساتھ زبان نہیں کھولی، اور اس حدیث کو کسی نے اس طرح بیان نہیں کیا- اگرچہ توحید و اتحاد کی باتیں سُکر کے غلبوں میں

ان سے ظاہر ہوئی ہیں، اور انا الحق اور سبحانی کہا ہے، لیکن اتحاد کی وجہ اور توحید کا موجب کسی نے معلوم نہیں کیا- پس شیخ ہی اس گروہ میں سے متقدمین کی برہان اور متاخرین کی حجت ہے''-(۹)

شیخ محی الدین ابن عربی کے مشاہدات کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد امامِ ربانی اپنا نقطۂ نظر اِن لفظوں میں پیش فرماتے ہیں:

''میرے مخدوم واجب الوجود جلّ شانہٗ کے صفاتِ ثمانیہ جو اہلِ حق شکر اللہ تعالیٰ سعیہم کے نزدیک خارج میں موجود ہیں، حق تعالیٰ کی ذات سے خارج میں متمیز ہیں- اور وہ تمیز بھی ذات وصفات کی طرح بے چوں و بے چگون ہے- اسی طرح صفات بھی تمیز بیچونی کے ساتھ ایک دوسرے سے متمیز ہیں بلکہ تمیزِ بیچونی حضرتِ ذات تعالیٰ کے مرتبے میں بھی ثابت ہے- لِاَنَّــــهُ الْـوَاسِعُ الْمَجْهُوْلِ الْكَيْفِيَّةِ (کیوں کہ وہ ایسی وسعت کے ساتھ واسع یعنی اشیا کو گھیرنے والا ہے جس کی کیفیت معلوم نہیں)، وہ تمیز جو ہمارے فہم و ادراک میں آسکے، اس جنابِ پاک سے مسلوب ہے کیوں کہ تبعض اور تجزی (بعض بعض اور جز و جز و ہونا) اس جگہ متصور نہیں- اور تخیل و ترکیب کا اس بارگاہ میں دخل نہیں- اور حال و محل ہونے کی وہاں گنجایش نہیں- غرض جو ممکن کے صفات و اعراض ہیں، سب اس جنابِ پاک سے مسلوب ہیں- لَيْـسَ كَـمِثْلِهٖ شَئٌ فِى الذّات وَلا فِـى الـصِّفَاتِ وَلا فِى الافْعَالِ (ذات وصفات وافعال میں کوئی اس کی مانند نہیں)- اس بیچونی تمیز اور بے کیفی وسعت کے باوجود حق تعالیٰ کے اسماء وصفات نے خانہ علم میں بھی تفصیل و تمیز پیدا کی ہے- اور منعکس ہوئے ہیں- اور ہر صفت و اسم متمیزہ کے لیے مرتبہ علم میں ایک مقابل اور نقیض ہے- مثلاً مرتبہ علم میں صفت علم کا مقابل اور نقیض عدم علم ہے، جس کو جہل سے تعبیر کیا جاتا ہے- اور صفت قدرت کے مقابل عجز ہے جس کو عدمِ قدرت کہتے ہیں- علی ہذا القیاس- ان عدماتِ متقابلہ نے بھی حق تعالیٰ کے علم میں تفصیل و تمیز پیدا کی ہے- اور اپنے متقابلہ اسماء وصفات کے آئینے اور ان کے عکس کے مظہر بن گئی ہیں-

فقیر کے نزدیک وہ عدمات بمعہ اسماء وصفات کے، عکسوں کے حقائق ممکنات ہیں- خلاصہ یہ ہے کہ وہ عدمات ان ماہیات کے اصول و مَواد کی طرح ہیں اور وہ عکوس ان مواد میں حلول کی ہوئی صورتوں کی طرح - پس شیخ محی الدین کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ اسماء و صفات ہیں جو مرتبہ علم میں ایک دوسرے سے متمیز ہیں- اور فقیر کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ عدمات ہیں جو اسماء وصفات کی نقیضیں ہیں بمعہ اسماء وصفات کے عکسوں کے جو خانہ علم میں ان عدمات کے آئینوں میں ظاہر ہوئی ہیں اور ایک دوسرے سے باہم مل گئی ہیں- قادرِ مختار جل شانہ نے جب چاہا کہ ان ماہیاتِ ممتزجہ میں سے کسی ماہیت کو وجودِ ظلّی کے ساتھ جو حضرت وجود کا پرتو

ہے، متّصف کر کے موجود خارجی بنائے، تو اس ماہیتِ ممتزجہ پر حضرت وجود کا پرتو ڈال کر اس کو آثارِ خارجیہ کا مبدء بنایا- پس ممکن کا وجود علم و خارج میں اس کی باقی صفات کی طرح حضرت وجود اور اس کی کمالات تابع کا پرتو ہے- مثلاً ممکن کا علم واجب الوجود کے علم کا پرتو اور ظل ہے جو اپنے مقابل میں منعکس ہوا ہے اور ممکن کی قدرت بھی ایک ظل ہے، جو عجز میں جو اس کے مقابل ہے، منعکس ہوئی ہے- اسی طرح ممکن کا وجود حضرت وجود کا ظل ہے جو عدم کے آئینے میں جو اس کے مقابل ہے، منعکس ہوا ہے-... لیکن فقیر کے نزدیک شے کا ظل شے کا عین نہیں بلکہ اس کا شبح و مثال ہے- اور ایک کا دوسرے پر حمل کرنا ممتنع اور محال ہے- پس فقیر کے نزدیک ممکن واجب کا عین نہ ہوگا اور ممکن کا واجب پر حمل کرنا ثابت نہیں ہوگا کیوں کہ ممکن کی حقیقت عدم ہے- اور وہ عکس جو اسماء وصفات سے اس عدم میں منعکس ہوا ہے، وہ ان اسماء وصفات کا شبح و مثال ہے، نہ کہ ان کا عین- پس ہمہ اوست کہنا درست نہیں ہوگا- بلکہ ہمہ از اوست کہنا درست ہوگا''- (۱۰)

اس خط میں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے مابین فرق کی وضاحت کرتے ہوئے، مسئلہ زیرِ بحث کو اس طرح سمیٹا گیا ہے:

''شیخ محی الدین کے نزدیک عالم سب کا سب ان اسماء وصفات سے مراد ہے، جنھوں نے خانہ علم میں تمیز پیدا کر کے ظاہر وجود کے آئینے میں نمود و نمایش حاصل کی ہے اور فقیر کے نزدیک عالم ان عدمات سے مراد ہے جن میں حق تعالیٰ کے اسماء وصفات خانہ علم میں منعکس ہوئی ہیں- اور وہ عدمات بمعہ ان عکسوں کے حق تعالیٰ کے ایجاد سے وجودِ ظلّی کے ساتھ خارج میں موجود ہوئی ہیں- پس عالم میں خبث ذاتی اور شرارت جبلی ظاہر اور پیدا ہے- اور سب جز و کمال حق تعالیٰ کی پاک بارگاہ کی طرف راجع ہے- آیت کریمہ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ (جو تجھے بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے- اور جو تجھے برائی پہنچے وہ تیرے اپنے نفس سے ہے)، اس معرفت کی تائید کرتی ہے-

پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ عالم وجودِ ظلّی کے ساتھ خارج میں موجود ہے جس طرح کہ حق تعالیٰ وجودِ اصلی کے ساتھ بلکہ بہ ذاتِ خود خارج میں موجود ہے-

خلاصہ یہ ہے کہ عالم کا یہ خارج بھی وجود وصفات کی طرح حقِ تعالیٰ کے وجود کے خارج کا ظل ہے- پس عالم کو حق تعالیٰ کا عین نہیں کہہ سکتے-

اگر کہیں کہ شیخ محی الدین اور اس کے تابعین بھی عالم کو حق تعالیٰ کا ظل جانتے ہیں، پھر فرق کیا ہوا- تو میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اس ظلّی وجود کو صرف وہم ہی میں خیال کرتے ہیں- اور وجودِ خارجی کی بو تک بھی اس کے حق میں تجویز نہیں کرتے- غرض کثرتِ موہومہ کو وحدتِ وجود

کے ظل سے تعبیر کرتے ہیں- اور خارج میں واحد تعالیٰ ہی کو موجود جانتے ہیں-... پس ظل کے اصل پر حمل کرنے اور نہ کرنے کا باعث ظل کے لیے وجودِ خارجی کا ثابت کرنا اور نہ کرنا ہے- یہ لوگ چوں کہ ظل کے لیے وجود خارجی ثابت نہیں کرتے اس لیے اصل پر محمول کرتے ہیں- اور یہ فقیر چوں کہ ظل کو خارج میں موجود جانتا ہے- اس لیے اصل پر حمل کرنے کی جرات نہیں کرتا- ظل سے وجودِ اصلی کے نفی کرنے میں فقیر اور یہ لوگ شریک ہیں اور وجودِ ظلّی کے ثابت کرنے میں بھی متفق ہیں- لیکن یہ فقیر وجودِ ظلّی خارج میں ثابت کرتا ہے- اور یہ لوگ وجودِ ظلّی کو وہم و تخیل ہی سمجھتے ہیں اور خارج میں احدیت مجردہ کے سوا کچھ موجود نہیں جانتے اور صفاتِ ثمانیہ جن کا وجود اہل سنت و جماعت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آرا کے موافق خارج میں ثابت ہوا ہے، ان کو بھی علم میں ثابت نہیں کرتے-... حق تعالیٰ کو عالم کا عین کہنا اور اس کے ساتھ متحد جاننا بلکہ نسبت دینا بھی اس فقیر پر بہت گراں اور دشوار ہے''- (۱۱)

اس خط میں بھی وحدت الوجود کے نظریے کو رد کیا گیا ہے لیکن اختلاف کو کشف و شہود کے اجمالی ذکر تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ علمی انداز میں مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے، غور وخوض کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ توحید وجودی کے قائل صوفیائے کرام کا نقطۂ نظر کیا ہے اور خود مکتوب نگار کے موقف کی فکری بنیاد کیا ہے-

وحدتُ الوجود اور وحدتُ الشّہود کی بحث کو اب ہم چھوڑتے ہیں اور فنا و بقا کے مسئلے کو لیتے ہیں- یہ بھی تصوف کا ایک محبوب موضوع ہے- اسے سمجھنے کے لیے مکتوباتِ امامِ ربانی، دفترِ اول، مکتوب ۵۸ (بہ نام سید محمود) سے ایک اقتباس مستعار لیتے ہیں:

''یہ راہ جس کے طے کرنے کے ہم درپے ہیں، انسان کے سات لطیفوں کے موافق سب سات قدم ہیں- دو قدم عالمِ خلق میں ہیں، جن کا تعلق قالب اور نفس کے ساتھ ہے- اور پنج قدم عالمِ امر میں ہیں جو قلب و روح و سر و خفی و اخفیٰ کے ساتھ وابستہ ہیں- اور ان سات قدموں میں سے ہر ایک قدم میں دس ہزار پردے پھاڑنے پڑتے ہیں، خواہ وہ پردے نورانی ہوں یا ظلمانی-... اور پہلے قدم میں جو عالمِ امر میں لگاتے ہیں، تجلّیِ افعال ظاہر ہوتی ہے- اور دوسرے قدم پر تجلّیِ صفات اور تیسرے قدم پر تجلیاتِ ذاتیہ کا شروع آجاتا ہے- علیٰ ہذا القیاس درجوں کے تفاوت کے لحاظ سے ترقی ہوتی جاتی ہے-... اور ان ساتوں قدموں میں سے ہر ایک قدم پر اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے نزدیک ہوتا جاتا ہے- حتّیٰ کہ ان قدموں کے تمام ہونے تک قرب بھی پورا ہو جاتا ہے- پھر اس کے بعد فنا اور بقا سے مشرف ہوتے ہیں اور ولایتِ خاصہ کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں-

طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے مشائخ قدس سرہم نے برخلاف دوسرے سلسلوں کے مشائخ کے اس سیر کی ابتدا عالمِ امر سے اختیار کی ہے اور عالمِ خلق بھی اسی سیر کے ضمن میں طے کر لیتے ہیں''۔(۱۲)

مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ اول، مکتوب ۲۱ (بہ نام شیخ محمد مکی ابن حاجی قاری موسیٰ لاہوری) سے ماخوذ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے بھائی! جان لو۔ جب تک وہ موت جو موتِ معروف کے پہلے ہے اور اہل اللہ اسے فنا سے تعبیر کرتے ہیں، ثابت نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی جناب میں پہنچنا محال ہے''۔(۱۳)

مکتوباتِ امامِ ربانی، دفترِ اول، مکتوب ۳۰ (بہ نام شیخ نظام تھانیسری) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس خط میں شہودِ نفسی اور شہودِ صوری کے حوالے سے بعض دقیق مسائل بھی زیرِ بحث آئے ہیں اور مکتوب نگار کا نقطۂ نظر بھی:

''خواجہ نقشبند قدس سرّہ نے فرمایا ہے کہ اہل اللہ فنا و بقا کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے آپ میں دیکھتے ہیں اور جو کچھ پہچانتے ہیں، اپنے آپ میں پہچانتے ہیں۔ اور اُن کی حیرت اپنے وجود میں ہے۔... شہودِ نفسی سے کوئی شخص وہم میں نہ پڑ جائے۔ اور اس کو تجلّیِ صوری کے شہود کی طرح جو متجلی لہٗ کے نفس میں ہے، خیال نہ کرے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ تجلّیِ صوری جس قسم کی ہو، سیرِ آفاقی میں داخل ہے اور مرتبۂ علم الیقین میں حاصل ہے اور شہودِ نفسی مرتبۂ حق الیقین میں ہے جو مراتبِ کمال کا نہایت ہے۔ اور شہود کا لفظ اس مقام میں میدانِ عبارت کی تنگی کے باعث بولا گیا ہے ورنہ جیسے کہ ان کا مطلب بے چون و بے چگون ہے، اس مطلب کے ساتھ ان کی نسبت بھی بے شبہ و بے مانند ہے۔ چون کو بے چون کی طرف راہ نہیں ہے۔...

اور شہودِ انفسی اور شہودِ صوری مذکور کے باہم متحد ہونے کے وہم کا منشا دونوں مقاموں میں بقائے شخص کا حاصل ہونا ہے۔ کیوں کہ تجلّیِ صوری فنا کرنے والی نہیں ہے، اگرچہ قیود میں سے تھوڑی سی قید رفع کر دیتی ہے۔ لیکن فنا کی حد تک نہیں پہنچاتی۔ پس بقیہ وجود سالک کا اس تجلّی میں حاصل ہے۔ اور سیرِ انفسی خود پوری پوری فنا اور کامل بقا کے بعد ہے۔ پس اسی واسطے معرفت کی کمی کے باعث ان دونوں بقا کے درمیان فرق نہیں کر سکتے اور ناچار اتحاد کا حکم لگاتے ہیں۔ اگر معلوم کریں کہ بقائے ثانی ان کے نزدیک بقا باللہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ اور اس وجود کو وجودِ موہوبِ حقّانی یعنی خدا کا بخشا ہوا وجود کہتے ہیں، تو شاید اس وہم سے خلاص ہو جائیں۔

اس مضمون سے کوئی یہ نہ کہے کہ بقا باللہ اپنے آپ کو حقِ تعالیٰ کا عین معلوم کرنے سے مراد ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ مضمون اس قوم کی بعض عبارات میں مفہوم ہو بھی تو اس کا ہم جواب کہتے ہیں کہ یہ بقا جذبے کے مقام میں بعض کو اسی استغراق و نیستی کے بعد، جو فنا کے مشابہ ہے، حاصل

ہوتی ہے اور مشائخِ نقشبندیہ قدس سرہم اسے وجودِ عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ فنا سے پہلے ہے اور اس کے لیے زوال متصور ہے بلکہ واقع ہے۔ کبھی اس سے اس کو لے لیتے ہیں اور کبھی پھیر دیتے ہیں۔ اور وہ بقا جو فنائے کامل کے بعد ہے، زوال و خلل سے محفوظ ہے۔ ان کی فنا دائمی فنا ہے۔ اور عین بقا میں فانی اور عین فنا میں باقی ہیں۔ اور وہ فنا و بقا جو زوال پذیر ہیں، احوال و تلوینات میں سے ہیں۔ اور جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ ایسے نہیں۔

حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ وجودِ عدم وجودِ بشریت میں عود نہیں کرتا۔ پس بالضرور ان کا وقت دائمی ہوگا اور ان کا حال مدامی۔ بلکہ ان کے لیے نہ کوئی وقت ہے نہ حال۔ ان کا کار وقتوں کے پیدا کرنے والے کے ساتھ ہے۔ اور ان کا معاملہ احوال کے پھیرنے والے کے ساتھ۔ پس زوال کا قبول کرنا وقت و حال سے مخصوص ہے اور وہ جو وقت و حال سے گزر جائے، وہ زوال سے محفوظ ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ کوئی شخص گمان نہ کرے کہ وقت کا دوام اس وقت کے اثر از قسم تعیّن وغیرہ کے باقی رہنے کے اعتبار سے بیان کیا ہے۔ نہیں بلکہ دوام عین وقت کے لیے ہے اور ہمیشگی نفس حال کے لیے۔ اور ظن سے حق بات کوئی ثابت نہیں ہوتی''۔(۱۴)

تصوف کے نکات سے بھرپور درجِ ذیل اقتباس بھی اسی خط کا حصہ ہے اور اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں مقامِ عبدیت کے حصول میں عشق کے کردار، ولایت کے درجوں میں مقامِ عبدیت کی اہمیت، خدا اور بندے کے تعلق اور توحیدِ فعلی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

''عشق و محبت ... مقامِ عبودیت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ انسان خدائے تعالیٰ کا بندہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ماسوائے اللہ کی گرفتاری اور بندگی سے پورے طور پر خلاصی پا جائے اور عشق و محبت صرف اس انقطاع کا وسیلہ ہے۔ اسی واسطے مراتبِ ولایت میں سے نہایت کا مرتبہ مقامِ عبدیت ہے اور ولایت کے درجوں میں مقامِ عبدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ اس مقام میں اپنے مولا کے ساتھ اپنے لیے کوئی نسبت نہیں پاتا مگر بندے کی طرف سے احتیاج اور مولا کی طرف سے ازروئے ذات و صفت کے پوری پوری استغنا۔ یہ نہیں کہ اپنے آپ کو اس کی ذات کے ساتھ اور اپنی صفات کو اس کی صفات کے ساتھ اور اپنے افعال کو اس کے افعال کے ساتھ کسی وجہ سے مناسب جانے۔ ظلّیت کا اطلاق بھی من جملہ مناسبات سے ہے۔ اس سے بھی پاک و منزہ بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خالق اور اپنے آپ کو مخلوق جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہنے کی کچھ جرات نہیں کرتے۔

توحیدِ فعلی جو بعض بزرگواروں کو اثنائے راہ میں حاصل ہوتی ہے اور حقِ تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل نہیں پاتے۔ ... اس مضمون کو اس مثال سے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی شعبدہ باز پردے کے

پیچھے بیٹھ کر چند جمادی صورتوں کو حرکت میں لاتا ہے اور عجیب و غریب افعال ان میں ایجاد کرتا ہے تو وہ لوگ جو تیز نظر والے ہیں، جانتے ہیں کہ ان جمادی صورتوں میں ان افعال کا بنانے والا وہ پردہ نشیں شخص ہے۔ لیکن افعال کو اختیار کرنے والی وہی صورتیں ہیں۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ صورت متحرک ہے اور یہ نہیں کہتے کہ شعبدہ باز متحرک ہے''۔ (۱۵)

اس طویل اقتباس کی تشریح یا تسہیل کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سالک کے بعض احوال و مقامات کے بارے میں مکتوباتِ امامِ ربانی، دفترِ اول، مکتوب ۱۷۵ (بہ نام حافظ محمود) سے استفادہ کیا جائے:

''جاننا چاہیے کہ سالکوں کو خواہ وہ ابتدا میں ہوں، خواہ انتہا میں، احوال تلوینات سے چارہ نہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اگر وہ تلوین قلب پر ہے تو وہ سالک اربابِ قلوب میں سے ہے اور ابن الوقت کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر قلب تلوین سے نکل گیا اور احوال کی غلامی سے آزاد ہو کر مقامِ تمکین میں پہنچ گیا تو اس کے احوال متلونہ نفس پر وارد ہوتے ہیں جو مقامِ قلب میں اس کی خلافت میں بیٹھا ہے۔ یہ تلوین تمکین کے حاصل ہونے کے بعد ہے اور اس تلوین والے کو اگر ابوالوقت کہیں تو بجا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے نفس بھی تلوینات سے گزر گیا اور تمکین واطمینان کے مقام تک جا پہنچا تو اس وقت تلوینات کا وارد ہونا قالب پر ہے جو امورِ مختلفہ سے مرکب ہے۔ یہ تلوین دائمی ہے''۔ (۱۶)

اس خط کے ساتھ اگر مکتوباتِ امامِ ربانی، دفترِ اول کے مکتوب ۳۲ (بہ نام مرزا حسام الدین احمد) کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو سُلوک کے مقامات اور احوال کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی:

ہر مَقام کے لیے علوم و معارف جدا ہیں اور احوال و مواجید جدا۔ کسی مقام میں ذکر و توجہ مناسب ہے اور کسی مقام میں تلاوت اور نماز مناسب۔ کوئی مقام جذبے سے مخصوص ہے اور کوئی مقام سلوک کے مناسب۔ اور کسی مقام میں یہ دونوں دولتیں ملی ہوئی ہیں۔ اور کوئی مقام ایسا ہے جو جذبہ اور سلوک کی دونوں جہتوں سے جدا ہے۔ نہ جذبے کو اس سے علاقہ ہے اور نہ سلوک کو اس سے تعلق۔ یہ مقام نہایت عجیب ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اس مقام کے ساتھ ممتاز اور اس بڑی دولت سے مشرف ہیں۔ اس مقام والے کے لیے دوسرے مقامات والوں سے پورا پورا امتیاز ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم مشابہت رکھتے ہیں۔ برخلاف دوسرے مقامات والوں کے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، خواہ وہ مشابہت کسی وجہ سے ہو''۔ (۱۷)

المختصر، مقامِ ولایت اپنی جگہ لیکن وہ سُرورِ زندگی اور لذّتِ بندگی جو سرورِ کائنات رسولِ اکرم ﷺ کی رَفاقت کے طفیل اصحابِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہے، فہم و ادراک

سے بالا اور دوسرے امتیوں کے ہر مقام سے افضل و اعلیٰ ہے۔

سیر و سلوک کا مقصود نفسِ امّارہ کا تزکیہ ہے، تصوف کی اس عام تعریف سے ہم سبھی واقف ہیں لیکن یہ منزلِ اول ہے۔ ''دولتِ فنا'' اور ''محبتِ ذاتی'' سے سرشار ہونے والے مقربین خدائے واحد کے سوا کسی اور کے طلب گار نہیں ہوتے: ''اس مقام میں انعام وایلام برابر ہیں۔...اگر بہشت کو چاہتے ہیں تو اس لیے کہ اس کی رضا کا مقام ہے۔ اور اس کے طلب کرنے میں خدا کی مرضی ہے اور دوزخ سے پناہ اس واسطے مانگتے ہیں کہ حقِ تعالیٰ کے غضب کا مَقام ہے۔ نہ تو بہشت سے اُن کا مقصود نفس کی لذّت کا طلب کرنا ہوتا ہے اور نہ دوزخ سے پناہ مانگنا رنج و محنت کے باعث۔ کیوں کہ جو کچھ محبوب سے آئے، ان بزرگواروں کے نزدیک مرغوب اور عین مطلوب ہوتا ہے''۔ (۱۸)

میاں حاجی محمد لاہوری کو مخاطب کرتے ہوئے جو بات مندرجہ بالا سطور میں کہی گی ہے، اسی خیال کو مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ اول، مکتوب ۲۴، بہ نام محمد قلیج خاں میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:

''جب تک بندہ اپنے نفس کی مراد سے بالکل پاک نہ ہو جائے، حقِ تعالیٰ اس کی مراد نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی حقِ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں آسکتی ہے۔ اور یہ اعلیٰ دولت فنائے مطلق کے بعد جو تجلیِ ذاتی سے وابستہ ہے، ثابت و حاصل ہوتی ہے۔...پس جب یہ محبت جس کو محبتِ ذاتی سے تعبیر کرتے ہیں، حاصل ہو جائے تو اُس وقت محب کے نزدیک محبوب کا انعام اور ایلام یکساں معلوم ہوتا ہے۔ پس اس کو اس وقت اخلاصِ حقیقی حاصل ہو جاتا ہے اور خدا کی عبادت خاص اسی کے لیے کرتا ہے، نہ اپنے نفس کے لیے۔ یعنی انعام کی طلب اور رنج کے دفع کرنے کی غرض سے نہیں کرتا۔ کیوں کہ یہ دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں۔ اور یہ مرتبہ مقربین کا ہے۔...ابرار...اللہ تعالیٰ کی عبادت خوف و طمع کی نیت سے کرتے ہیں۔ پس ابرار کے حسنات ایک وجہ سے نیکیاں ہیں اور ایک وجہ سے برائیاں، اور مقربین کے حسنات خالص اور محض نیکیاں ہیں''۔ (۱۹)

اس خط میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ: ''مقربین میں سے بھی بعض لوگ بقائے کامل سے موصوف ہونے اور عالمِ اسباب کی طرف نزول کرنے کے بعد خوف و طمع کی نیت پر خدا کی عبادت کرتے ہیں لیکن ان کا خوف و طمع ان کے اپنے نفسوں کی طرف راجع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کی رضامندی کی طمع پر اور اس کے غضب سے ڈر کے مارے عبادت کرتے ہیں۔...جنت کو وہ اس واسطے طلب کرتے ہیں کہ وہ اس کی رضا کا مقام ہے۔...مقربین کے مرتبوں میں سے یہ رتبہ نہایت اعلیٰ ہے۔...اللہ تعالیٰ ہم کو سید البشر صلی اللہ وعلیٰ آلہ واتباعہ وسلم کے طفیل ان بزرگواروں کی محبت عطا فرمائے۔ کیوں کہ آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے اس کو محبت ہے''۔ (۲۰)

ظاہر ہے رسولِ عربی ﷺ کی محبت اصلِ ایمان ہے۔ سالک اسی دولت کو سینے سے لگا کر

مرشد کی رہنمائی میں منزلیں طے کرتا ہے-شریعت کی مشعل اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اعمال کی قوت اس کے سینے میں دل بن کر دھڑکتی ہے-اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ:

''جو کچھ ہم پر اور آپ پر لازم ہے وہ یہ ہے کہ اول اپنے عقاید کو کتاب وسنت کے موافق درست کریں-...اور دوسرے احکامِ شرعی از قسم حلال وحرام وفرض وواجب کا علم حاصل کرنا ہے-اور تیسرے اس علم کے موافق عمل کرنا-اور چوتھے تصفیہ وتزکیہ کا طریق جو صوفیاے کرام قدس سرہم سے مخصوص ہے-جب تک عقاید کو درست نہ کریں، احکامِ شرعیہ کا علم کچھ فائدہ نہیں دیتا-اور جب تک یہ دونوں متحقق نہ ہوں، عمل نفع نہیں دیتا، اور جب تک یہ تینوں حاصل نہ ہوں، تصفیہ اور تزکیہ کا حاصل ہونا محال ہے''-(۲۱)

مکتوباتِ امام ربانی، دفترِ اول سے ماخوذ جس خط (نمبر۱۵۷) کا اقتباس ابھی ہم نے پڑھا، اس کے مخاطب حکیم عبدالوہاب ہیں-اس کے ساتھ ایک اور مکتوب بہ نام شیخ نظام تھانیسری کے درجِ ذیل جملے بھی ذہن نشیں کر لیے جائیں تو شریعت اور طریقت کے رشتے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی:

''کسی شخص نے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ سے سوال کیا کہ سلوک سے مقصود کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ اجمالی معرفت تفصیلی ہو جائے اور استدلالی کشفی سے بدل جائے''-(۲۲)

ایک اور مکتوب (نمبر۴۱، بہ نام شیخ دَرویش) میں شریعت اور طریقت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

''زبان سے جھوٹ نہ بولنا شریعت ہے اور دل سے جھوٹ کا خطرہ دور کرنا طریقت اور حقیقت ہے''-(۲۳)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ''شریعت کے تین جزو ہیں-علم وعمل اور اخلاص-جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی-...طریقت اور حقیقت جن سے صوفیہ ممتاز ہیں، تیسرے جزو یعنی اِخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں''-(۲۴)

مکتوباتِ امامِ ربانی دفترِ اول کا مکتوب ۱۳ (بہ نام پیر ومرشد) بھی ملاحظہ ہو-اس میں شریعت اور طریقت پر اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے:

''باطن ظاہر کے کچھ مخالف نہیں ہے-...علما اور بزرگوں کے درمیان اسی قدر فرق ہے کہ علما از روے دلیل اور علم کے جان لیتے ہیں، اور یہ بزرگوار از روے کشف اور ذوق کے پا لیتے ہیں''-(۲۵)

اس لیے امامِ ربانی، مجددِ الف ثانی، شیخ احمد سرہندی قدس سرہ دفترِ دُوم میں خواجہ شرف الدین حسین کو مخاطب کرتے ہوئے نصیحت فرماتے ہیں:

''اے فرزند! فرصت اور فراغت کو غنیمت جاننا چاہیے-اور تمام اوقات ذکرِ الٰہی میں

مشغول رہنا چاہیے-جو عمل شریعتِ غرا کے موافق کیا جائے، ذکر ہی میں داخل ہے، اگرچہ خرید و فروخت ہو-پس تمام حرکات وسکون میں احکامِ شرعیہ کی رعایت کرنی چاہیے تاکہ سب کچھ ذکر ہو جائے-کیوں کہ ذکر سے مراد یہ ہے کہ غفلت دور ہو جائے-جب تمام افعال میں اوامر ونواہی کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس صورت میں بھی اوامر ونواہی کی غفلت دور ہو جاتی ہے اور دوامِ ذکرِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے-یہ دوامِ ذکر حضرتِ خواجگان کی یادداشت سے جدا ہے-وہ یادداشت صرف باطن تک ہی ہے اور اس دوامِ ذکر کا اثر ظاہر میں بھی ہے-اگرچہ دشوار ہے''-(۲۶)

راہ دشوار سہی، مگر آیئے، امامِ ربانی شیخ مجدد الف ثانی کے الفاظ مستعار لیتے ہوئے، بارگاہِ خداوندی میں دستِ دعا بلند کریں، اپنے لیے اور اُن سب کے لیے جو نجات کے آرزومند ہیں-خداوندا! ہم پر فضل فرما اور ہمیں توفیق دے کہ:

''بندگی کے وظیفوں کو بجا لائیں-شرعی حدود کی محافظت اور سنّتِ سنیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کریں-اور نیکیوں کے حاصل کرنے میں نیتوں کو درست رکھیں-اور اپنے باطنوں کو خالص اور اپنے ظاہروں کو سلامت رکھیں-اور اپنے عیبوں کو دیکھتے رہیں-اور گناہوں کے غلبے کا مشاہدہ کرتے رہیں-علام الغیوب کے انتقام سے ڈرتے رہیں-اور اپنی نیکیوں کو تھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں اگرچہ تھوڑی ہوں-اور خلقت کی قبولیت اور شہرت سے ڈرتے رہیں''-(۲۷)

حواشی

۱-جہاں گیر: تو زکِ جہاں گیری، جلدِ دُوم، انگریزی ترجمہ الیگزینڈر راجرس، اردو ترجمہ: اقبال حسین، ص ص ۸۷-۸۸، نئی دہلی، قومی کونسل براے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۶ء

۲-ایضاً، ص۱۵۱

۳-حضرتِ مجدد الف ثانی، مکتوب ۴۳-بہ نام شیخ فرید، مشمولہ مکتوباتِ امام ربانی، دفترِ اول (اردو ترجمہ: قاضی عالم الدین)، ص۱۶۲، حیدرآباد، اللجنۃ العلمیہ، چنچل گوڑہ، انڈیا، ب-ت

۴-مکتوب ۳۱-بہ نام شیخ صوفی، دفترِ اول، ص ص ۱۴۲-۱۴۳

۵-ایضاً، ص ص ۱۴۳-۱۴۴

۶-ایضاً، ص ص ۱۴۴-۱۴۵

۷-مکتوب ۱-بہ نام شیخ عبدالعزیز جون پوری، مشمولہ مکتوباتِ امامِ ربانی، دفترِ دوم، (اردو ترجمہ: قاضی عالم الدین)، ص۱۹، حیدرآباد، ب-ت

۸-ایضاً، ص ص ۲۰-۲۱

۹-ایضاً،ص۲۱
۱۰-ایضاً،ص ص۲۲-۲۳
۱۱-ایضاً،ص ص۲۳-۲۴
۱۲-مکتوب ۵۸-بہ نام سید محمود، دفترِ اول،ص۱۸۱
۱۳-مکتوب ۲۱-بہ نام شیخ محمد مکی ابن حاجی قاری موسیٰ لاہوری، دفترِ اول،ص۱۲۴
۱۴-مکتوب ۳۰-بہ نام شیخ نظام تھانیسری، دفترِ اول،ص ص۱۳۹-۱۴۰
۱۵-ایضاً،ص۱۴۰
۱۶-مکتوب ۱۷۵-بہ نام حافظ محمود، دفترِ اول،ص۳۰۱
۱۷-مکتوب ۳۲-بہ نام مرزا حسام الدین احمد، دفترِ اول،ص۱۴۶
۱۸-مکتوب ۳۵-بہ نام میاں حاجی محمد لاہوری، دفترِ اول،ص ص۱۵۲-۱۵۳
۱۹-مکتوب ۲۴-بہ نام محمد قلیج خاں، دفترِ اول،ص۱۳۱
۲۰-ایضاً،ص ص۱۳۱-۱۳۲
۲۱-مکتوب ۱۵۷-بہ نام حکیم عبدالوہاب، دفترِ اول،ص۲۷۸
۲۲-مکتوب ۳۰-بہ نام شیخ نظام تھانیسری، دفترِ اول،ص۱۴۰
۲۳-مکتوب ۴۱-بہ نام شیخ دَرویش، دفترِ اول،ص۱۵۹
۲۴-مکتوب بہ نام ملا حاجی محمد لاہوری، دفترِ اول،ص ص۱۵۳-۱۵۴
۲۵-مکتوب ۱۳-بہ نام پیرومرشد، دفترِ اول،ص ص۱۱۱-۱۱۲
۲۶-مکتوب بہ نام خواجہ شرف الدین حسین، دفترِ دوم،ص ص۷۰-۷۱
۲۷-مکتوب ۱۷۱-بہ نام ملا طاہر بدخشی، دفترِ اول،ص۲۹۶

○○○

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی

مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ: افکار کا تقابلی مطالعہ

حضرت مجدد الف ثانی (احمد بن عبد الاحد فاروقی ۱۴؍شوال ۹۷۱ھ؍۱۶؍مئی ۱۵۶۴-۲۸؍صفر ۱۰۳۴ھ؍۳۰نومبر ۱۶۲۴ءبعمر ۶۳ برس) اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (احمد بن عبد الرحیم فاروقی ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ؍۲۱؍فروری ۱۷۰۳ء-۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ؍۲۰؍اگست ۱۷۶۲ءبعمر ۶۳ برس) برصغیر پاک وہند کی دو عظیم ترین شخصیات تھیں اور جن کو صحیح معنوں میں عبقریات کہا جا سکتا ہے-ان دونوں میں بڑی مماثلتیں بھی تھیں- دونوں ہم نام تھے اور دونوں ہم نسب بھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم کے خاندان سے تھے اور ان کے جلال و جمال کے وارث بھی -دونوں بزرگوں کا مادری نسب اور وطن مالوف علوی اور مدینہ منورہ تھا-حضرت شاہ رضی اللہ عنہ کے مادری نسب کی تصریح سب نے کی ہے جبکہ حضرت مجدد کے مادری نسب کے بارے میں بالعموم سکوت پایا جاتا ہے- بہر حال دونوں عبقریات اہل سنت کی محبت سے سرشار تھے-ان دونوں عبقری شخصیات کا خاندان اصل وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آ کر ایک ہی خطہ پاک میں آباد ہوا-سرہند اور رہتک غیر منقسم پنجاب کے دو عظیم اسلامی مراکز تھے پھر دونوں نے دارالسلطنت دہلی کو اپنا وطن و مرکز بنایا-''حضرت مجددؒ'' اور ''حضرت شاہ'' کی تعلیم و تربیت اور نشو ونما میں بھی کافی مماثلت و مناسبت پائی جاتی ہے-اسی طرح ان کے افکار وخیالات، مزاج وموقف اور فکر ونظر میں بھی قریبی اشتراک ملتا ہے-علوم اسلامی میں مہارت بھی ایک جیسی تھی اور ان کی خدمات واصلاحات میں بھی اشتراک ومناسبت اور اتحاد واتفاق کے متعدد عناصر بھی یکساں رہتے ہیں، بایں ہمہ ان دونوں عبقریات کی اپنی شخصی، علمی، فکری اور اصلاحی جہات وحیثیات تھیں جو ان کو منفرد وممتاز بناتی ہیں-

(حضرت مجدد کے بنیادی مآخذ ہیں: مکتوبات امام ربانی، ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، چہارم-محمد عبدالشکور فاروقی: تذکرہ امام ربانی، شیخ محمد اکرام: رود کوثر، سید زوار حسین: حضرت مجدد الف ثانی، محمد منظور نعمانی: تذکرہ امام ربانی وغیرہ-حضرت شاہ کے اصل مآخذ ومراجع

ہیں: مختلف کتب حضرت شاہ، خاص طور سے انفاس العارفین، مکاتیب حضرت شاہ، تفہیمات الٰہیہ، جلبانی: لائف آف شاہ ولی اللہ اور شاہ ولی اللہ کی تعلیم، مناظر احسن گیلانی: تذکرہ شاہ ولی اللہ، عبید اللہ سندی: شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، محمد رحیم بخش: حیات ولی، ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، پنجم، جے ایم ایس بالیون: ریلیجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ، محمد یٰسین مظہر صدیقی: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، شاہ ولی اللہ کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ متعدد دیگر کتب۔)

حضرت مجدد کے کارہائے تجدید

حضرت مجدد کی عظیم خدمات کو بالعموم دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک قومی وملکی سطح ہے جس پر حضرت موصوف نے اپنے عہد کے دو مغل شہنشاہوں جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) اور نورالدین محمد جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷) کی دینی کج روی اور فکری وعملی بے راہ روی کے ملک وعوام پر اثرات بد کا ازالہ کیا-اور اسلام وشریعت کی گراں قدر خدمات انجام دیں-اپنے مکتوبات کے ذریعے بطور خاص بعض بڑے امرائے سلطنت کو بے دینی اور الحاد دور کرنے پر ابھارا اور مغل دربار میں موجود وموثر کج کلاہان دولت کے افکار واعمال پر روک لگانے اور صحیح اسلامی تعلیمات کی ترویج کی کوشش کی-انھوں نے مغل دربار میں اور اس کے زیر اثر عوام وخواص میں شیعی اثرات کی ترک تازی کو روکنے کے لیے رد روافض، رسالہ فی اثبات النبوۃ وغیرہ کی تالیف بھی کی اور مکتوبات میں خالص اہل سنت کے افکار وعقائد کی پرزور وپرخلوص سعی کی، رسول اللہ ﷺ، نبوت محمدی، صحابہ کرام، خلفائے راشدین بالخصوص خلفائے ثلاثہ (حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم) اور دوسرے موضوعات پر بڑی صراحت ووضاحت سے لکھا اور عوام وخواص کے ذہنوں سے شیعی جالے دور کیے-

حضرت مجدد کا دوسرا کارنامہ عالمی وآفاقی بتایا جاتا ہے اور اس کا تعلق اسلامی تصوف کی تطہیر اور شیرازہ بندی سے ہے، بیشتر مورخین ومحققین نے مبالغہ آمیز حد تک اصرار کیا ہے کہ حضرت مجدد نے تصوف وطریقت کو غیر اسلامی خس وخاشاک سے صاف کیا اور اسے اسلامی دین وشریعت کے مطابق بنایا-شریعت وطریقت کا فرق وربط واضح کیا اور مقبول خواص بنایا-

(ابوالکلام آزاد، تذکرہ: ۲۳۸) شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاسد وقت کی اصلاح وتجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا-صرف مجدد الف ثانی کا وجود گرامی ہی تن تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا-

(سید ابوالاعلی مودودی، تجدید واحیاء دین، ۸۷) ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اس

وقت بھی بہت سے حق پرست علما اور سچے صوفیہ موجود تھے مگر ان کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلے میں یکہ وتنہا احیائے دین کی جدوجہد کی-

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور متعدد دوسرے علما ومورخین نے حضرت مجدد کے تجدیدی کام کے ان دونوں پہلوؤں پر اسی طرح کی مبالغہ آمیزی کی ہے-ڈاکٹر انصاری نے دوسرے پہلو پر غلو کی تمام حدود پار کرلیں: ''تصوف کے تمام پہلوؤں کے ایک ساتھ جائزے کا کام شیخ مجدد سے پہلے کسی نے نہیں کیا اور نہ ان کے بعد کسی نے انجام دیا-یہ صرف انہیں کا کارنامہ ہے اور یہ غیر معمولی کام جب ان جیسا عظیم القدر صوفی انجام دے تو اس کا ایک ہی مقصد ہوگا-تصوف کی قرآن وسنت کی روشنی میں اصلاح اور تجدید-(مقالہ ''شیخ احمد سرہندی اور تصوف کی اصلاح وتجدید'' مشمولہ فکر اسلامی کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کی خدمات، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ۲۳؛ نیز خدمات مجدد کے دوسرے مقالات، جیسے ضیاء الدین اصلاحی، شیخ احمد سرہندی کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی غلط فہمیوں کا مسئلہ، ۱۱۰-۱۲۵؛ محمد رضی الاسلام ندوی، تصوف سرہندی کا تنقیدی مطالعہ (مولانا سید احمد عروج قادری کی تحریروں کی روشنی میں) ۱۲۶-۱۴۷، اور پروفیسر اختشام احمد ندوی اور ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی کے مقالات وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر ۱۴۸ و مابعد)

حضرت شاہ رحمہ اللہ کی بے مثال جامعیت

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بنیادی طور سے حضرت مجدد کے نقش بندی سلسلے سے وابستہ تھے اور مجددی بھی تھے، ان کا امتیاز البتہ یہ ہے کہ وہ تمام سلاسل طریقت وسلوک کے جامع تھے، قادری، سہروردی، چشتی کے علاوہ شاذلی اور دوسرے متعدد سلسلوں سے بھی کسب فیض کرتے تھے، ان کے مورخ وتحسین شناس تھے اور ان کے پارکھ اور ناقد بھی تھے، ان کی انفرادیت وشخصیت دونوں کی بنیادی صفت ان کی جامعیت تصوف وسلوک کے علاوہ علوم دین وشریعت میں بھی تھی، حضرت شاہ رحمہ اللہ کو تمام اکابر علما صوفیہ میں یہ مقام عالی نصیب ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کا ترجمہ وتحشیہ فارسی میں کیا جو ان کے عہد کی عوامی زبان بھی تھی اور خواص کی علمی وفکری زبان بھی-ان کی بنیادی دعوت قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے، اسے روح وقلب اور زبان وذہن میں پیوست کرنے کی تھی اور وہ تمام طبقات امت کو اس چشمہ ہدایت سے وابستہ کرنا چاہتے تھے، ان کی تحریک قرآنی نے ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد ان کے فرزندوں اور شاگردوں کے ذریعے اسلام کی بنیاد کو مقبول بنایا-اسلام وشریعت اور طریقت کے دوسرے توام سرچشمہ حدیث و سنت میں ان کی عظیم الشان تصانیف نادر وبے مثال ہیں-فن حدیث وسنت پر ان کی نظر مجتہدانہ

اور فکر مجددانہ تھی -مسوی ومصفی، ازالۃ الخفاء، اور حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتب لازوال ہیں-حضرت
مجدد کی مانند وہ صحابہ کرام اور خلفاے راشدین اور دوسرے تاریخی واسلامی موضوعات کے مولف
تھے مگر سب سے بڑھ کر قاموسی تھے-تاریخ اسلام اور تہذیب اسلامی کی جیسی خدمت اور پرورش
انہوں نے کی، وہ بہت عبقری علماوصوفیہ سے نہیں بن آئی ہے-حضرت مجدد بلاشبہ عظمت صحابہ اور
عدالت خلفاے راشدین میں ان کے پیشرو تھے مگر ان کی نگارشات اس موضوع پر بہت کم ہیں-
اسلامی تصوف وطریقت پر وہ حضرت مجدد کے پرتو ثانی سے بڑھ کر عظیم مولف جلیل القدر پارکھ
اور وسیع تر مجدد تھے-ولی اللٰہی سرمایہ تصنیف اتنا وقیع، وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ جس کے سامنے امامان
پیش کے کارنامے بقول شبلی ماند پڑ جاتے ہیں-(قرآنی تالیفات شاہ میں فتح الرحمٰن بترجمۃ
القرآن، الفوز الکبیر، فتح الخبیر وغیرہ کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ کے مباحث قرآنی شامل ہیں-حدیث
وسنت میں مسوی ومصفی شروح موطا (عربی وفارسی) کے ساتھ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری اور
متعدد دیگر رسالے ہیں ازالۃ الخفاء اور اس کا نقش اول قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، تاریخ
اسلامی، تاریخ خلافت وصحابہ کے علاوہ قاموس حدیث ہیں-فقہ اسلامی میں غایۃ الانصاف فی
بیان اسباب الاختلاف اور عقد الجید کے ساتھ ساتھ حجۃ اللہ البالغہ کے قسم دوم کے مباحث بھی
ہیں-سیرت نبوی پر ان کے مختلف فصول وابواب کے علاوہ نور العیون کا فارسی ترجمہ سرور المحزون
ایک یادگار اضافہ ہے-خاص تصوف وطریقت پر ان کے متعدد رسائل وکتب اور مباحث ہیں جیسے
القول الجمیل، انفاس العارفین، فیوض الحرمین، الطاف القدس، ہمعات، لمعات، سطعات،
ہوامع، تفہیمات الٰہیہ، الخیر الکثیر، البدور البازغہ وغیرہ-حضرت شاہ کا عظیم ترین کارنامہ حجۃ اللہ
البالغہ ہے جو حدیث وقرآن وطریقت کا قاموس ہے اور دین وشریعت کی تعبیر وتشریح کا خزینہ-
تفصیل کے لیے کتابچہ شخصیت وحکمت کا ایک تعارف)

حضرات مجدد وشاہ کی تجدید طریقت

احسان وطریقت اور تصوف وسلوک کی تجدید واصلاح اور تزکیہ وتطہیر میں دونوں عبقری
شخصیات کا اپنا اپنا امتیاز وتخصص ہے اور ان کی وجہ سے ان کی انفرادیت وعبقریت بھی ہے-اسی وجہ
سے ان میں اشتراک بھی ہے اور اختلاف بھی-یہ اختلاف تضاد وتصادم کے معنی نہیں رکھتا بلکہ وہ
تنوع اور رنگارنگی اور بوقلمونی کے وسیع ترین معانی وجہات رکھتا ہے-حضرت شاہ تاریخی اور زمانی
لحاظ سے حضرت مجدد کے خلف صالح تھے اور خلف صالح نے اپنے عظیم سلف سے بہت کچھ لیا تھا-
دوسرے پیشرو صوفیہ ومولفین کی مانند حضرت شاہ نے حضرت مجدد سے بھی خوشہ چینی کی تھی یا ان کی
تاثیر جذب کی تھی-وہ ان کے متعدد افکار وعقائد میں خاص اللہ تعالیٰ سبحانہ کی تجلی ذاتی اور اس کی

معرفت حاصل کرنے پر دوسرے صوفیہ کے علاوہ حضرت مجدد کے مکتوبات سے ایک خاصا طویل
اقتباس نقل کرتے ہیں اور حضرت مجدد کے فارسی بیان کی عربی شرح اپنی تفہیم میں بیان کرتے
ہیں-(تفہیمات الٰہیہ: ۲/۴۳ تفہیم: ۲۳ میں مکتوبات الشیخ احمد السہر ندی کا اقتباس شیخ اکبر کے
حوالے اور اپنی کتب سے بھی دیتے ہیں) ایک دوسری تفہیم میں حضرت شاہ نے متعدد مسائل
تصوف سے بحث کی ہے جن میں ایمان، شرح صدر، قرب نوافل، حکمت قرب فرائض، قرب
ملکوت، دورۃ الکمال کی شرح وتفسیر کرتے ہوئے اپنے مقام عالی کا ذکر کیا ہے اور بیان حکمت و
تاویل احادیث کے علم کی بنا پر اپنے آپ کو نائب حضرت یوسف علیہ السلام قرار دیا ہے-اسی بحث
میں حضرت مجدد کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے مقام ارہاص پر فائز اور ان پر نور نبوت کے
مجمل نزول وشرف کا ذکر کیا ہے-(۲/۷۸: **ثم وجد الشیخ احمد السهرندی وکان
إرهاصا بظهور عیسی علیه السلام فالتمع علیه نور النبوة علی اجماله**) یہ اصلا
متعدد اکابر صوفیہ کے مقامات عالیہ کا بیان ہے جو حکمت کے ضمن میں آیا ہے-تفہیمات الٰہیہ کی جلد
دوم کی تفہیم: ۲۴۳ آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ رومی کے استفسار کے جواب میں شیخ اکبر کے نظریہ
وحدۃ الوجود اور شیخ مجدد کے نظریہ وحدۃ الشہود پر حضرت شاہ کی بحث پیش کرتی ہے اور ان دونوں کی
تطبیق کی سعی شاہ بیان کرتی ہے (۲/۲۸۴-۲۶۱: نادر مکتوبات حضرت شاہ، اردو ترجمہ ۲/۲۳۹ و
مابعد میں مذکورہ بالا مکتوب مدنی کا حوالہ دیا ہے اور مختصر بحث کی ہے-) نادر مکتوبات میں ہی ایک
میں حضرت شاہ نے خلت کے مقامات کے بارے میں حضرت مجدد پر بعض اعتراضات وشبہات کا
جواب لکھا ہے اور مکتوب ربانی: ۹۴ کی عبارت وشرح حضرت مجدد کو پیش کیا ہے اور خود بھی تمام
اشکالات کا جواب لکھ کر حضرت مجدد کا دفاع کیا ہے-(۲/۳۰۳ ومابعد: مکتوب: ۸۴، حضرت شاہ
نے حضرت مجدد کے افکار ونظریات کی ترجمانی، تشریح اور مدافعت دوسرے مقامات پر بھی کی ہے)

فکر شاہ میں مقام مجدد

حضرت شاہ نے حضرت مجدد کے مقام خلت اور اس کے واسطے سے مقام خلت محمدی کی
حکیمانہ شرح کی ہے-اس میں حضرت مجدد کے بارے میں حضرت شاہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں
نقل کرنے کے لائق ہے کہ اس سے دونوں کے مقامات کا مطلب ومعنی سمجھ میں آتا ہے اور اسی
کے ساتھ حضرت مجدد کے تجدیدی کارنامے اور اصلاح طریقت کی حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے-
''پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہزار سال کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جو بعض
اعتبارات سے گزشتہ فیوض کا اجمال ہے، مثلا قلب، روح اور سر وغیرہ کے حالات (احوال) نے
مجمل ہو کر جمعیت ظاہر کر لی اور یہ دورۂ دیگر بعض اعتبارات سے گزشتہ فیوض کی تفصیل ہے-مثلا حجر

بحت (بہت اصل میں ہے) اور انانیت کبری کے مسائل اس دور میں گذشتہ زمانوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی ہیں- المختصر حضرت شیخ مجدد اس دورہ کی بنیادی شخصیت ہیں اور اس دورہ کے بہت سے خصوصی معارف ہیں جو حضرت مجدد کی زبان سے رمز وایما کے طور پر نکلے ہیں- شیخ مجدد راس دورہ کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے ہاتھ پر بہت سے نیچریت اور بدعت کے جنگلوں میں بھٹکنے والوں نے خلاصی پائی ہے- تعظیم حضرت مجدد حضرت مدور ادوار (اللہ تعالیٰ) اور مکون کائنات (اللہ تعالیٰ) کی تعظیم ہے اور نعمت شیخ کا شکرادا کرنا ان کے مفیض (اللہ تعالیٰ) کی نعمت کا شکرادا کرنا ہے-

یہ فقیر (ولی اللہ) ان اکثر معارف کا تصدیق کنندہ ہے جن کو حضرت شیخ مجدد نے آغاز دورہ کے زمانے میں تحریر فرمایا ہے مثلا توحید شہودی کی طرف ان کا اشارہ کرنا، اگرچہ حضرت مجدد نے اس مضمون میں رمز وایما سے تجاوز نہیں کیا اور بات کو بالکل کھول کر بیان نہیں کیا ہے مثلا معارف اجمالیہ میں علمائے اہل سنت جنھوں نے معارف اجمالیہ کو تقلید انبیاء سے اخذ کیا ہے، ان علمائے اہل سنت کی حقانیت کا اعتراف کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کے معارف تحقیقات صوفیہ کے مخالف نہیں ہیں...... یہ ہے وہ کلام جو فقیر کے نزدیک حضرت مجدد کے معارف کی شرح میں متعین ہوا ہے، حضرت مجدد کی غرض وغایت آنحضرت ﷺ کے لیے اول امر میں بغیر توسط کے اصل خلت کا ثابت کرنا ہے اور بنی آدم پر فیضان خلت میں اپنے توسط کا اثبات کرنا ہے، بایں معنی کہ آنحضرت ﷺ کے توسط سے ہزار سال کے بعد لوگوں نے اس خلت سے حصہ پایا اور اس بات سے کوئی خدشہ اور مضائقہ لازم نہیں آتا اس لیے اضافی فضیلتیں مثلا آنحضرت ﷺ کا مقتدا ومتبوع ہونا مخلوق کے توسط سے متحقق ہوا ہے، عجم کے فتح ہونے کے بعد......'' (نادر مکتوبات ۲/۷ ۳۰-۳۰۸)

مقامات مجدد وشاہ

بعض محققین اور قدیم صوفیہ کا خیال ہے کہ تصوف وطریقت براہ راست مقام فنا وبقا سے وابستہ ہے اور اس مقام کے حصول کے لیے تمام صوفیہ کوشش کرتے ہیں بلکہ ان ہی کے سلسلے میں اپنی دنیا ترک کرتے اور جان کھپا دیتے ہیں- حضرت مجدد نے ایک مقام پر اس کا اظہار یوں کیا ہے: تصوف عبارت از فنا وبقا است'' ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری اسی تعریف پر بس ہی نہیں کرتے بلکہ عظیم ترین صوفیہ شیخ جنید بغدادی (م ۲۹۷/ھ ۹۰۹ء) ابوبکر شبلی (م ۳۳۴ھ/ ۹۴۶ء) اور ابوعلی جوز جانی (م تیسری/نویں صدی) سے سند لاتے ہیں (مقالہ مذکورہ بالا، ۱۶، بحوالہ مکتوب امام ربانی ۱۳۵ اور مکتوب ۹۷، قشیری: رسالہ قشیریہ ۱۵۵ ومابعد، جامی: نفحات الانس، ۴ نیز مجددین امت اور تصوف میں مقالہ حضرت مجدد پر)

بلاشبہ مقامات میں ایک مقام فنا وبقا بھی ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے مقامات بھی ہیں

جیسے مقامات جمع، جمع الجمع، الفرق بعد الجمع اور آخر کار کلی فرق جب صوفی کو ادراک ہو جاتا ہے کہ اس کی ذات ووجود، اللہ کی ذات ووجود سے بالکل الگ ہے اور وہ یہ ہوش وحواس تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ عبد ہے، محض عبد، (بندہ خالص) اور اللہ تعالیٰ معبود ہے اور مالک وخالق کل، اسی بنا پر حضرت مجدد نے سلوک وطریقت اور تصوف کی منتہا ومقصد مقام عبدیت کا حصول بتایا ہے- حضرات صوفیہ کرام نے اسی بنا پر مقام عبدیت سے دوسرے مقامات سلوک کی طرف صعود کرنے اور ان کے روحانی تجربات سے گزرنے کے بعد واپس مقام عبدیت پر لوٹ آنے کو اصل غایت قرار دیا ہے- ان تجارب روحانی سے صوفیہ کو مقام عبدیت کا روحانی اور ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے (ڈاکٹر محمد عبدالحق: تصوف اور شریعت، اول ودوم، اردو ترجمہ، مفتی محمد مشتاق تجاروی، دہلی ۲۰۰۱ء ۲۰۰۵ء، بالترتیب، اول میں مولف کی تحقیقات ہیں اور دوم میں مکتوبات امام ربانی، افکار مجدد کے اردو تراجم- موخر الذکر کی پہلی بحث: تصوف کی حقیقت میں یہی اظہار ہے بحوالہ مکتوب: ۳۰ ۱ اول)

دونوں حضرات مجدد وشاہ نے اپنے روحانی تجربات اور مقامات کی سیر وسلوک کے دوران اپنے اپنے مقامات کو پہچانا تھا اور ان میں سے بعض مقامات سے ان کا گزر ہوا تھا جیسے حضرت مجدد کو مقام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر فائز ہونے کا تجربہ ہوا تھا- حضرت مجدد نے اسی طرح کے اور بعض مقامات کا ذکر فرمایا ہے، جیسے مقام خلت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند خلیل اللہ ہونے کا، ان میں سب سے اہم ان کا مقام مجدد الف ثانی کا ہے اور وہ تجربہ کے بعد شعوری بھی ہے اور اس کو وہ اصل مقام گردانتے ہیں- ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے ایک مکتوب ربانی سے دعوی کیا ہے کہ حضرت مجدد خود کو ایک ولی سے بڑھ کر ایک مجدد سمجھتے تھے جو الف ثانی (سنہ ہجری کے ہزارہ دوم) میں کار تجدید کے لیے مبعوث کیے گئے تھے- (تصوف اور شریعت ۱/۹۳ نیز دوسرے صفحات)

مجدد الف ثانی کا نظریہ

حضرت مجدد بلاشبہ مجدد الف ثانی کے مقام ولقب سے معروف ہیں اور تمام علما ومفکرین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے- مولانا محمد عبدالشکور فاروقی نے اس کی توجیہ بھی کی ہے- حضرت کا مجدد الف ثانی ہونا بھی ایک بڑی چیز ہے- آپ سے پہلے صدی کے مجدد ہوا کرتے تھے، الف کا مجدد کوئی نہیں ہوا- الف ثانی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا اور الف اول میں خود ذات اقدس واطہر سید البشر ﷺ کی موجود تھی- آپ سے پہلے جس قدر مجدد صدیوں کے گزرے ہیں کوئی مجدد دین کے تمام شعبوں کا مجدد نہیں ہوا بلکہ خاص خاص شعبوں کے مجدد ہوتے رہے ہیں- یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدد مجدد نظر آتے ہیں- کوئی علم حدیث کا، کوئی فقہ کا پھر اس میں بھی کوئی حنفی فقہ کا مجدد ہے

کوئی شافعی کا، کوئی علم کلام کا مجدد ہے اور کوئی سلوک واحسان کا لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لیے مخصوص رکھی کہ آپ دین کے تمام شعبوں کے مجدد ہیں- مولانا فاروقی نے مقام مجددیت پر مزید بحث کی ہے (تذکرہ مجدد الف ثانی میں شامل مضمون فاروقی بعنوان امام ربانی، ۲۸۲: مجدد الف ثانی کا خیال ودعوی حدیث مجدد کے برخلاف ہے اور مولانا فاروقی کا حاشیہ وبیان محض مدلل مداحی ہے- واقعہ یہ ہے کہ حضرت مجدد نے شہنشاہ اکبر کے ہزارہ دوم الف ثانی میں اسلام کی جگہ نئے دین، دین الٰہی کے توڑ میں رکھا تھا، حضرت شیخ سرہندی بلاشبہ مجدد تھے مگر تمام دین کے شعبوں کے نہ تھے اور نہ پورے ہزارہ دوم/ الف ثانی کے- اپنے دور صدی کے مجدد تھے-)

حضرت شاہ کی مجددیت

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے لیے مقام مجدد سے مشرف ہونے کی صراحت خوب کی مگر دوسروں نے انہیں مجدد نہیں مانا- انھوں نے بہر حال تفہیم :۱۳، میں اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو ملت مصطفویہ کے لیے مجدد بنائے جانے کا ذکر کیا ہے اور خود کو مراد لیا ہے- (۱/ ۳۷، ۳۸) البتہ انھوں نے اپنے لیے متعدد مقامات کا ذکر کیا ہے، جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے علم وحکمت اور خدمات کی بنا پر نوازا تھا- ان میں مقام حکمت وشرح وتاویل احادیث کے لحاظ سے نائب حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر اوپر ایک تفہیم کے حوالے سے آچکا- دورۂ ایمان کے مناصب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا ایک منصب مجددیت ہے اور مشہور حدیث: **يبعث الله في أمتي بعد كل مائة رجلا يجدد لها دينها.** بیان کر کے مجدد کے اوصاف وشروط اور علوم کا ذکر کیا ہے اور آخر میں دورۂ حکمت کے تمام ہونے پر اپنے آپ کو خلعت مجددیت سے مشرف ہونے کی صراحت کی ہے: **ولما تمت بي دورة الحكمة ألبسني الله سبحانه خلعة المجددية** (۱/۵۴) متعدد دوسری تفہیمات میں اور بعض دوسری نگارشات میں بھی حضرت شاہ نے اپنے لیے متعدد مقامات ومناصب کا ذکر کیا ہے، جیسے مجددین واوصیا، وارثین انبیا ہوتے ہیں- اور یہ فقیر وصی ہے- (۱/ ۱۱۰) مجددیت اور بعض دیگر مقامات حضرت شاہ (۱/ ۱۳۳ و مابعد) دورۂ آخرہ کے ناطق وحکیم، قائد وزعیم (۱/ ۱۶۹)، قائم دورۂ آخر الزمان، نائب رسول اکرم ﷺ، امام طریقت وسلوک، فاتح وکاشف علوم، مبشر و محدّث، مجتہد وشارح، مستجاب الدعوات، ولی اللہ، قطب الدین وغیرہ دوسرے مقامات ہیں- (تفہیمات ۲/ ۱۳، ۲۴-۲۵، مثل حضرت ابن عباس بوجہ فقاہت دین، ۵۹، ۶۰-۱۱۲، ۱۴۵، ۱۷۲، ۱۷۸ و مابعد، حضرت شاہ بلاشبہ مجدد وقت تھے اور ان کا عظیم ترین مجددوں میں شمار ہونا چاہیے- اس موضوع پر ابھی تک تحقیقی مقالہ باقی ہے-

مقامات کا فیضان

تمام صوفیہ کرام اور بالخصوص حضرت مجدد وحضرت شاہ کا پختہ ایقان ہے کہ مقام کا فیضان عطیہ الٰہی ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے اور متعدد صوفیہ بعض مقامات تک پہونچ کر رہ گئے جیسے شیخ حلاج (حسین بن منصور حلاج م ۳۰۹ھ/ ۹۲۲ء) مقام فنا وبقا یا مقام جمع میں ٹھہر گئے اور اس سے نکل نہ سکے- حضرت مجدد کے خیال میں حضرت ابویزید بسطامی اپنی عظمتوں کے باوجود مقام شہود سے آگے نہیں جا سکے اور سبحانی کی تنگنائے سے باہر قدم نہیں نکال سکے- اسی بنا پر ان پر سکر کا غلبہ ہوا اور وہ انا الحق کہہ بیٹھے- شطحیات صوفیہ دراصل اسی غلبۂ سکر کی بنا پر ہوتے ہیں- حضرت مجدد کا بیان ہے کہ فنا اور بقا کا حاصل حیرت ہے، علم نہیں- (تصوف اور شریعت ۲/ ۱۹، ۲۰-۶۵ نیز ۷۸ وغیرہ) شیخ جنید بغدادی سے لے کر حضرت شاہ تک اور بعد کے دوسرے اکابر صوفیہ وعلما کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سکر پر صحو کو فضیلت حاصل ہے اور صوفیہ اور سالکین کا کمال یہی ہے کہ وہ سکر کے حال سے نکل کر صحو کے حال میں آجائے- حضرت ابوبکر شبلی حضرت ابوحمزہ صاحب شیخ جنید بغدادی وغیرہ شروع میں صاحب سکر تھے اور بعد میں صاحب صحو بن گئے- (مذکورہ بالا ۱/ ۱۸۲-۱۸۳) حضرت شاہ نے اور دوسرے متقدمین صوفیہ اور علما نے بھی اصحاب صحو صوفیہ کے مقامات عالیہ کا ذکر کیا ہے-

اسی سے متعلق دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے سالکوں اور صوفیوں کو کوئی مقام ہی نہیں نصیب ہوا- لہذا یہ دعوی کہ تصوف فنا وبقا سے عبارت ہے صحیح نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ اسے خاص صوفیہ کے بارے میں جزوی طور سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔ ایک تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی صوفی کو اپنے مقام کا علم وادراک، اس کے کشف یا الہام جیسے ذرائع سے ہوتا ہے- یہ ذریعہ علم پکا نہیں ہے- اس میں خطا وصحت دونوں کا امکان ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ کشف صوفی کے لیے بھی واجب نہیں، دوسروں کے لیے کیوں کر ہو سکتا ہے، حضرت مجدد تو کشف صوفی میں خطا کے امکان کا اعلان واقرار کرتے ہیں، البتہ حضرت شاہ نے الہام وکشف کو صحیح ہی سمجھا ہے لیکن وہ بھی اس کے صوفی کے لیے واجب ہونے کے قائل نہیں، البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کسی صوفی کو اپنے کشف والہام پر یقین تام ہو تو اسے اس پر ضرور یقین کرنا اور عمل کرنا چاہیے- (حضرات مجدد وشاہ کے روحانی تجربات اور مختلف مقامات پر ملاحظہ ہو بالترتیب مکتوبات امام ربانی، تصوف اور شریعت ۱/ ۳۴-۳۷ و مابعد)

حضرت مجدد نے بالآخر مقام عبدیت پر اپنے فائز ہونے کو عنایت الٰہی کہا ہے اور اس سے قبل کے تمام مقامات ظلیت، وجودی وغیرہ کو تنزل قرار دیا ہے حضرت مجدد کے مقامات سے متعلق بیانات ان کے ذاتی تجربات پر زیادہ مبنی ہیں جب کہ حضرت شاہ کے بیانات تحقیقی وعلمی ہیں-

(حضرت شاہ، حجة الله البالغه ۲/۸۸-۱۰۱ باب المقامات والاحوال، اعلم ان للاحسان ثمرات تحصل بعد حصوله وهي المقامات والاحوال." ان دونوں کا تعلق عقل سے ہے جسے یقین کہا جاتا ہے- اور یقین سے توحید، اخلاص، توکل، شکر، انس، صدیقیت محدثیت وغیرہ جنم لیتے ہیں- ان کی تفصیل وتشریح کے بعد قلب سے متعلق مقامات میں جمع اول ہے، پھر شہید وحواری ہیں جو انبیا کے ساتھ مخصوص ہیں- دوسرے مقامات کا ذکر کرنے کے بعد صراحت کی ہے کہ وہ سب عنایت الٰہی سے ہی عطا ہوتے ہیں-)

علم کے ذرائع شریعت وطریقت

تمام علما، محققین، صوفیہ اور سالکین کا یہ پختہ عقیدہ اور معروف نظریہ ہے کہ علم کے دو ذرائع ہیں: ایک وحی کا ذریعہ جو انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے اور بالکل یقینی ہے، ذرا بھی مشکوک نہیں کہ قطعی الثبوت ہے- وہ انبیاے کرام اور وحی کے حاملین عالی مقام کے لیے بھی اسی طرح واجب العمل ہے جس طرح ان کی امتوں کے لیے- حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے اور دوسرے تمام اکابر صوفیہ نے بھی صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ تمام غیبی حقائق جیسے ذات وصفات الٰہی، ملائکہ وملا اعلیٰ واسفل، جنات وشیاطین، جنت ودوزخ اور دوسرے عالم ملکوت کے حقائق کا قطعی علم صرف وحی رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہے جس میں خطا کا کوئی امکان نہیں جبکہ صوفیہ کے کشف والہام اور وجدان وتجربہ کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم اتنا قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے اور اس میں خطا کے امکانات بھی موجود ہیں، غلطی اور خطا کا امکان کشف ووجدان اور الہام میں بھی ہے اور اس کی تعبیر وتفہیم میں بھی-

دوسرا پہلو یہ بھی اہم ہے کہ ایک حقیقت غیبی کے بارے میں دو سے زیادہ صوفیہ کے کشف والہام اور وجدان مختلف ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں اور وہ متضاد بھی ہو سکتے ہیں- حضرت مجدد نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ عقائد اور غیبی امور وحقائق کے بارے میں اہل سنت کے علما وفقہاء اور متکلمین وحی رسالت کی کسی تعبیر وتشریح پر متفق ہوں تو تمام صوفیہ کا کشف ووجدان نہ اس کی تردید کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کا بدل بن سکتا ہے- اسی کے ساتھ حضرت مجدد اور حضرت شاہ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ کشف ووجدان صوفی کو وحی رسالت یا دوسرے الفاظ میں دین وشریعت کی میزان میں پرکھا جائے گا- ان کے مطابق ہوگا تو صحیح ہوگا، ورنہ صحت وصواب کے دائرے سے خارج، حضرت مجدد نے علوم شرعیہ سے ان کے سر موتجاوز کرنے کو سکر کہا ہے اور وہ غلبۂ حال ہے اور معیار نہیں بلکہ وہ الحاد وزندقہ ہے- حضرت مجدد کے ہمنوا اور ہم خیال حضرت شاہ بھی ہیں اور کشف و وجدان صوفی کو ہی نہیں تمام ذرائع علم طریقت وتصوف کو صریح علوم شریعت ودین کے ماتحت قرار

دیتے ہیں، البتہ وہ بعض نئی تشریحات بھی کرتے ہیں (مکتوبات امام ربانی ۱/۱۰۰: مکتوب ۳۱-۱/۲۷ مکتوب: ۱۱۲ وغیرہ، تصوف اور شریعت ۱/۹۱ و مابعد نیز جلد دوم حضرت شاہ حجة الله البالغہ ۱/۵۰-۵۸: مبحث السعادة؛ تصوف اور شریعت مذکورہ بالا میں حضرت شاہ کے افکار سے موازنہ)

حقائق غیبی اور عقائد ہی کے باب میں نہیں احکام واعمال شریعت ودین کے باب میں دونوں عبقری صوفیہ اور امامان عقیدہ رکھتے اور اس کا اعلان کرتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے تعین و استنباط اور ان پر عمل واطلاق کے باب میں صرف وحی رسالت ہی قطعی اور ناگزیر ذریعہ علم ہے اور وجدان اور الہام وکشف صوفیہ کا اس میں کوئی کردار نہیں- ارکان اسلام اور دوسرے منصوص اعمال شریعت کا تعین صرف رسول اکرم ﷺ اپنی وحی کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور وہ صاحب وحی ﷺ سمیت سب کے لیے واجب ولازم ہیں، کسی چیز کے حلال وحرام، مسنون ومندوب، مکروہ و مبغوض ہونے کا فیصلہ وجدان والہام صوفیہ نہیں کرسکتے، اسی بنا پر حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے وضاحت کی ہے کہ ارباب ولایت خاصہ یعنی صوفیہ کرام اور عام مومن ومسلمان نہ صرف وحی رسالت کے پابند ہیں بلکہ وہ مجتہدوں کی تقلید کے لیے بھی مجبور ہیں اور اس باب تقلید وتعمیل میں اصحاب ولایت اور عام اہل ایمان برابر برابر مقتدی اور تابع کا درجہ رکھتے ہیں- حضرت مجدد و حضرت شاہ نے عقائد واعمال شریعت اور دوسرے واضح احکام وحی واجتہاد کے دائرے سے باہر صرف ان امور ومعاملات میں کشف ووجدان اور الہام کی عمل داری مانی ہے جن میں شریعت و دین کے واضح احکام نہیں ملتے- حضرت شاہ نے حجة الله البالغہ میں بالخصوص اور دوسری تصانیف میں بالعموم ان تمام ذرائع علم سے بحث کی ہے اور قطعی علوم کے ذرائع وحی رسالت واجماع مجتہدین وعلما اور ظنی علوم کے ذرائع کشف والہام اور وجدان سے بحث کی ہے- (مکتوبات امام ربانی ۲/۱۰۴ مکتوب: ۵۵: الہام مثبت حل وحرمت نبود وکشف ارباب باطن اثبات فرض وسنت نہ نماید، ارباب ولایت خاصہ باعامہ مومناں در تقلید مجتہدان برابر اند- ہمعات، ۱/۱۸۳-۱۸۹ و مابعد، سلوک الی اللہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرعی احکام واوامر کی پابندی پر اس کا انحصار ہے علما، انبیاے کرام کے وارث اور تبلیغ ودعوت الی اللہ کے پابند ہیں اور غفلت وکوتاہی کرنے پر قابل مواخذہ، سلوک الی اللہ کی یہی وہ قسم ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بڑی وضاحت کی گئی ہے- دوسری قسم عالی مزاج اور عالی طبیعتیں اپنی افتاد فطرت سے اسے حاصل کرلیتے ہیں اور ان کا اللہ تعالیٰ خود متکفل ہوتا ہے فیوض الحرمین اردو ۱۲۹ میں قرب الٰہی کے دو طریقوں طریقہ نبوت اور طریقہ طریقت پر بحث کی ہے جو ہمعات کی مانند ہے- التفہیمات الالٰہیہ: ۲/۲۷: لان الطرق الموصلة الى الله سبحانه على قسمين: قسم اثبته الوحي او

معارف الانبیا وقسم اثبته معارف الاولیاء ،کل ما اوحاه الله سبحانه من الطاعات فانها من جنس الفرض وکلما الهم الله سبحانه اولیائه من الطرق الموصلة فانه نفل ای لیس من جنس الفرض وزیادة.

طریق نبوت اور طریق ولایت

متقدمین صوفیہ کی مانند حضرت مجدد اور حضرت شاہ نے سیر الی اللہ یا سلوک کے دو طریقے بتائے ہیں- متعدد صوفیہ نے سلوک وتصوف اور طریقت کے مقصود ومنتہا کے بارے میں مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں، وہ اصلاً تو تقرب الی اللہ ہے لیکن اس کو بیان میں نئی نئی اشکال دی گئی ہیں- صوفیہ کی ساری تگ ودو اور جد وجہد اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ حقائق غیبیہ کی غایت جان کر معرفت حق حاصل کر لے اور اسی کے ذریعہ تقرب پا لے- دوسری تعبیر یہ ہے کہ سلوک کی آخری انتہا یہ ہے کہ توحید الٰہی کا حصول ہی نہیں، اس کی معرفت وحقیقت جان لے، ذات واجب الوجود اور ذات واحد میں فنا واستغراق بلکہ اپنی ذات میں فنا اور ذات واحد میں بقا اس کا مقصود ہے- حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے ان مقامات کو تسلیم کیا ہے اور سلوک کے منتہا ومقصود کو بھی، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ یہ سب عارضی اور گزران کے مقامات ہیں- حضرت مجدد نے وضاحت کی ہے کہ طریق ولایت کی غایت صرف عبودیت کا حصول وایقان اور اس کی تکمیل وتجربہ ہے- یہی مقصود طریق نبوت کا بھی ہے کہ بندے اپنے آپ کو عبد اور اپنے مالک وخالق اور ذات واحد کو معبود واِلٰہ مان لیں اور اسی پر ایقان وایمان رکھیں- ایمان واعمال کی منزلوں سے یہ پختہ ہو جاتا ہے-

بلاشبہ طریق ولایت کے سالکوں کو فنا وبقا اور جمع واتحاد اور فرق بعد الجمع وغیرہ کی منزلوں سے گزر کر اور تجربات کر کے مقام عبدیت کا مقصود ہاتھ لگتا ہے جب کہ طریق نبوت پر عمل کرنے والوں کو یہ روحانی تجربات نہیں ہوتے اور ان منزلوں سے نہیں گزرنا پڑا- طریق ولایت کے سالکین جب اپنی آخری منزل عبدیت پر پہونچتے ہیں تو ان کو اپنے اس علم پر تجربات سے یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وراء الوراء ہے اور اس کی ذات وصفات کسی میں بھی مخلوق یا صوفی شریک نہیں- انھیں اپنی بندگی، عبودیت کی اصالت وحقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے اور وہ تمام اتحاد و وحدت کے دعووں سے تائب ہو جاتے ہیں (مذکورہ بالا مباحث حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات وہمعات و فیوض ،الحرمین اور مکتوبات امام ربانی، تصوف اور شریعت کے مختلف ابواب مذکورہ بالا-)

حضرت شاہ نے طریق ولایت اور طریق نبوت پر اور ان کے فرق وصواب پر مختلف کتابوں میں بحث کی ہے- حضرت شاہ نے اس کے لیے سعادتین (دو سعادتوں) کے حصول کے دو طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے حجۃ اللہ البالغہ میں اس حصول سعادت پر پورا ایک باب ہے: مبحث

السعادة جس میں متعدد مباحث ہیں اور بڑے قیمتی ہیں- حقیقی سعادت یہ ہے کہ انسان کی بہیمی طاقت اس کے نفس ناطق کی پیرو ہو جائے اور خواہش عقل کے تابع ہو- یعنی بہیمیہ پر ملکوتیہ کا غلبہ ہو جائے، سعادت حقیقی کے حصول میں افراد وطبقات بنی نوع انسانی مختلف درجات کے ہوتے ہیں، تکمیل سعادت صرف عبادات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے- ان کے حصول کے دو ذریعہ ہیں ایک اصلاح ارتفاقات سے ہوتی ہے جو امور دنیا سے متعلق ہے اور آخرت کی سعادت کے لیے اصلاح نفس ضروری ہے-

دوسرا طریقہ ''ائمہ مفہمون'' کا ہے جو ریاست دین ودنیا کے امام ہیں اور اصحاب الیمین ہیں- اس ساری تفصیل وبحث کا خلاصہ یہ ہے کہ طریق نبوت سے ہی یہ سعادت ملتی ہے او وہ یقینی ہے اور دوسرا طریقہ صوفیہ اور ولایت کا طریقہ ہے جس میں حصول سعادت ممکن ہے لیکن وہ خطرات سے بھی پر ہے فیوض الحرمین میں طریق نبوت وطریق ولایت پر بحث کر کے بتاتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات والا صفات طریق نبوت کا عنوان تھی اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاے کرام سے زیادہ آپ ﷺ کو اپنی خاص عنایات کا مرکز بنایا تا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ قرب الٰہی کا فیض عام اور یقینی ہو جب کہ حضرت شاہ کو اپنے کشف وعلم دونوں سے معلوم ہوا کہ دوسرا طریق ولایت اگر چہ صحیح ہے تاہم وہ رسول اکرم ﷺ کے نزدیک نہ عالی مرتبہ ہے اور نہ پسندیدہ- ظاہر ہے کہ ظنی طریق کے مقابل قطعی طریق ہی بہتر ہوگا- ہمعات میں حضرت شاہ نے سلوک الی اللہ کی دو قسمیں کی ہیں اول شرعی احکام واوامر کی پابندی کرنے پر اس کا انحصار ہے علما انبیاء کرام کے وارثین ہیں اور قرآن مجید وحدیث وسنت اور تشریحات علما میں اس طریق کی وضاحت کی گئی ہے دوم عالی مزاج وطبیعت افراد اپنی افتاد فطرت سے حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کا خود متکفل اور والی وکارساز بن جاتا ہے- (حجۃ اللہ البالغہ ۱/۵۰-۵۵ ومابعد فیوض الحرمین مذکورہ بالا، ہمعات اردو ترجمہ، ۱۸۳-۱۹۳: اس بحث میں صدیقین سابقین اولین شہداء راسخین مطہرین و صالحین وغیرہ کی تقسیمات اصحاب یمین کے بنیادی طبقہ کی ہیں جو قرآنی اصطلاح ہے اور طریق نبوت ووحی سے ثابت ہے- دوسری تقسیم طبقہ اولیاء اللہ کا ہے اور ان کے طبقات ہیں- یہ کامل طبقات ہیں ان کے علاوہ دوسرے دو طبقات ناقص نفوس والوں کے ہیں-)

حضرت شاہ کا نظریۂ الوان تصوف

اکابر محققین صوفیہ میں حضرت شاہ واحد ومنفرد صاحب نظر ہیں جنھوں نے تصوف کے چہار رنگ کا نظریہ پیش کیا ہے انھوں نے دوسرے متعدد تذکرہ نگار اور مورخ صاحبان طریقت کی طرح تصوف وطریقت کی اجمالی تاریخ اور ان کے سلاسل کی تہذیب بھی لکھی، مشہور ومقبول

سلسلوں اوران کے اکابر کے اعمال واشغال طریقت کا فرق بتایا اوران کے مشترک نکات واقدار اجاگر کیے چہاررنگہائے تصوف کا نظریہ شاہ ان سب پر مستزاد ہے جو پوری تاریخ وتہذیب طریقت کے امتیازات بتاتا ہے- اسے حضرت شاہ نے مختلف ناموں سے پکارا ہے: وہ دورات طریقت بھی ہیں اوراَدوار تصوف بھی اورالوان طریقت بھی، وہ رسول اللہ ﷺاور صحابہ کرام کے عہد میمون اور عہد شریعت سے شروع ہوکر شیخ اکبر کے نظریہ ورنگ تصوف پر تمام ہوتے ہیں- ان میں اولین رنگ دورہ اورلون طریقت عہد نبوی ودور صحابہ اوران کے عظیم جانشینوں اور پیرووں کے درمیان رنگ جماتا رہا- حضرت شاہ نے اسے لون و رنگ تصوف ضرور کہا ہے مگر اصلا وہ دورہ شریعت اور رنگ دین اورلون اسلام ہے- ہمعات میں اس کا اور دوسرے الوان طریقت کا مفصل ذکر کیا ہے- اولین رنگ کا بیان حضرت شاہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے صحابہ کرام کے زمانے میں اور بعد کی چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی- ان لوگوں کو باطنی زندگی اور روحانی ارتقاء کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل میں ہی مل جاتے تھے چناں چہ ان بزرگوں کا احسان یہ تھا- (یعنی حاصل تصوف یہ تھا) کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے- ذکر وتلاوت کرتے تھے روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے صدقہ اور زکوۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سر نیچے کیے بحر تفکر میں غرق نظر آتا، یہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر واذکار کے سوا اور کسی ذریعے سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے تھے- بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے ہیں ان کو ذکر اذکار اور نماز میں لذت ملتی، قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہوتے، اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالاتے، ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوئی تھی- ان میں سے کوئی شخص نہ بیہوش ہوتا نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑتا، نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ زبان سے نکالتا، یہ بزرگ تجلیات استتار اور تصوف کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے، کشف وکرامات ان سے بہت کم ظاہر ہوئے اور سرمستی اور بے خودی کی کیفیت بھی شاذ ونادر ہی ان پر طاری ہوتی، اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصدا نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا- بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات، خوارق اور سرمستی وبے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں- یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی رسائی ان تک نہ ہوسکتی- قصہ مختصر اس دور میں جسے تصوف واحسان کا پہلا دور کہنا چاہیئے اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا-

(ہمعات اردو ترجمہ محمد سرور، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۹۹ء، مکتبہ رحمانیہ دیوبند، ۱۹۶۹:

۷۰-۷۷- ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری، مذکورہ بالا، ۵۹-۶۰ کا ترجمہ مختلف ہے- مقالہ خاکسار تصوف وطریقت کے چہار رنگ کا نظریہ شاہ ولی اللہ پیش کردہ تصوف پر سیمینار، شعبہ ہندی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مارچ، ۲۰۱۰ء)

حضرت شاہ نے اس بیان میں بعد کی صوفیانہ اصطلاحات خوب استعمال کی ہیں اور اسے تصوف بھی کہا ہے لیکن یہ واضح ہے کہ وہ قرآنی وحدیثی احسان تھا اور بعد کے رنگ ہائے تصوف و طریقت سے اس کا ذرا بھی تعلق نہیں تھا، ارتباط وتعلق تھا بھی تو وہ صرف دین وشریعت کی بالادستی برتری اور ہمہ گیری اور وجوب وفرضیت کا کہ جس کے بغیر نہ ظاہری ایمان واسلام ہے اور نہ باطنی رنگ وطریقت- شریعت ودین ہی اس دور میں سب کچھ تھے اور اسی سے باطنی وروحانی ارتقا ملتا تھا- حضرت شاہ نے اسی وجہ سے اسے ایک مقام پر پیشیں دورۂ شریعت قرار دیا ہے جو عوام و خواص دونوں کے لیے تھا-

دوسرے ادوار بالترتیب ۲- حضرت جنید بغدادی یا ان کے متصلا پیشتر زمانے سے، ۳- حضرات ابوالحسن خرقانی وابوسعید ابوالخیر کے عہد سے اور ۴- حضرت شاہ نے تمام اکابر صوفیہ اور سارے سلاسل تصوف کو طریقہ جنیدیہ کا پابند متبع اور پیروکار قرار دیا ہے دوسرا دور/دورہ/رنگ تصوف ریاضات شاقہ کا ہے تیسرا جذب وتوجہ وفکر ومراقبہ اور چوتھا حقائق غیبیہ کی تلاش یا وحدۃ الوجود کا-

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان ادوار، دورات اور رنگ ہائے تصوف کی تقسیم وتعریف سے خاص امتیاز حاصل کیا جو دوسرے اکابر اور بالخصوص حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے- موخر الذکر کا سارا تصوف وطریقت خواص واہل کمال کا ہے- حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اولین دورۂ شریعت کے ذریعہ عوام وخواص دونوں کو طریقت اور باطنی طہارت کے حصول کا طریقہ بتایا ہے- ان کا یہ بیان ہر دور/دورہ کے آغاز میں آتا ہے کہ عام مسلمان اور عام اہل کمال تو صرف اولین رنگ شریعت پر ٹھہرے رہے اور دوسرے اعلیٰ یا اہل کمال نے دوسرا، تیسرا یا چوتھا رنگ اختیار کیا جو ان کی رنگ طبیعت سے میل کھایا اور ان کے دل کو بھا گیا- ان دوراتِ تصوف کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے/دور کے بعد دوسرے ادوار ودورات میں بھی جاری رہے اور اس طرح دورۂ شریعت یا اولین رنگ طریقت ہمیشہ برقرار رہا اور وہی تمام اہل ایمان کا وظیفہ حیات اور طریقہ روحانیت بھی رہا-

بہر حال حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف وطریقت کے نہ صرف امتیازات کو واضح کیا بلکہ عملی وفکری تصوف کے بنیادی اقدار کو پیش کیا- ان کا یہ امتیاز بے مثال بھی ہے اور صحیح اسلامی طریقت کا بیان بھی اور اس باب میں وہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک مقام آگے ہیں-

(مترجم ہمعات محمد سرور اور ڈاکٹر محمد عبدالحق وغیرہ متعدد اہل قلم کو حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے بیان دورۂ اولین سے یہ غلطی لگی کہ حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ صحابہ کرام کے دور میں بھی تصوف کا اثبات کر رہے ہیں۔ یہ ایک عام غلط فہمی بھی ہے، حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ نے متعدد بیانات میں صراحت کی ہے کہ تصوف بعد کا ارتقاء ہے)

اصلاً تصوف وطریقت کے دو بنیادی خانے ہیں اور ان دونوں کو بالعموم خلط ملط کر دیا جاتا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

ایک خاص عملی تصوف ہے جس کی بنیادی تعلیمات یا اعمال واشغال کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور بعض تجرباتِ صوفیہ پر مبنی ہیں۔ حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے علاوہ دوسرے تمام اکابر صوفیہ کا فیصلہ ہے کہ جو تجرباتِ صوفیہ اور اعمالِ طریقت کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہیں، ان کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے اور ان کی ترویج واشاعت کرنے میں کوئی قباحت ہے اور نہ دقت۔ اور جو اعمال تصوف اور تجرباتِ صوفیہ خلاف شریعت ودین ہیں وہ قطعی مردود ہیں اور ان کو خیال وعمل دونوں سے خارج کر دینا چاہیے۔ دوسرا خانۂ تصوف خالص فلسفیانہ ہے جو حقائق غیبیہ کا پتہ لگانا چاہتا ہے۔ وہ فلسفیانہ افکار کی بنا پر تصوف میں در آیا ہے، حضرات مجدد علیہ الرحمہ وشاہ علیہ الرحمہ ہی نہیں بہت سے محققینِ صوفیہ اور اکابر علما اس رنگِ تصوف کے نہ صرف عاشق ہیں بلکہ اسی میں رنگ گئے ہیں۔ مکتوبات امام ربانی علیہ الرحمہ اور حضرت شاہ علیہ الرحمہ کی کتب ورسائل تصوف ان فلسفیانہ افکار ومباحث سے بھرے پڑے ہیں۔ اور ان میں مقامات کی بحث، ذات الٰہی اور اس کی صفات پر فکر اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات اہم ترین ہیں۔ (سید عروج احمد قادری، تصوف سرہندی کا مطالعہ، مرتبہ محمد رضی الاسلام ندوی، مشمول فکر اسلام کے فروغ میں ..... ۱۲۶-۱۴۷)

وحدۃ الوجود/ وحدۃ الشہود

بالعموم شیخ اکبر ابن عربی کو اس نظریہ وحدۃ الوجود کا بانی مبانی کہا جاتا ہے حالانکہ وہ پہلے سے موجود تھا۔ شیخ اکبر علیہ الرحمہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وحدۃ الوجود کے نظریہ وفلسفہ کو اپنی کتابوں۔ فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم۔ میں زیادہ منقح کیا اور اس کی تفصیل وتشریح کر کے اس کے تمام اجزا ومبادی کو اس طرح مرتب کر دیا کہ وہ ایک مستقل فلسفہ بن گیا۔ حضرت شاہ علیہ رحمتہ نے اس بنا پر چوتھے رنگِ تصوف کے آغاز وارتقاء کا سہرا ان کے سر باندھا ہے اور حضرت مجدد بھی اسی کے قائل ہیں۔ ہمعات اور بعض دوسری نگارشات میں حضرت شاہ علیہ رحمتہ نے وحدۃ الوجود کی مختصر اور سمجھ میں آنے والی تشریح کی ہے جو یہ ہے: ,,اللہ کی ذات واجب الوجود ہے۔ یہ محسوس کائنات جو ظہور

پذیر ہوئی اس کو سمجھانے کے لیے اہلِ طریقت نے پانچ تنزّلات مانے ہیں: ۱۔ ایک ذات احد کا درجہ ہے۔ ۲۔ اس سے دوسرا تنزل وحدانیت میں ہوا۔ ۳۔ تیسرا تنزل ارواح کا ہے۔ ۴۔ چوتھا عالم مثال اور ۵۔ پانچواں تنزل عالمِ اجسام کا...... مسئلہ وحدۃ الوجود میں اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وجود کے یہ مختلف مراتب حقیقتاً ایک وحدت ہیں یا محض دیکھنے میں ایک نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے تنزلاتِ خمسہ اور وحدۃ الوجود کے یہ معاملات بے حد نازک اور دقیق ہیں اس لیے سالک کو ابتدائے سلوک میں ان سے بچنا لازمی ہے۔ حضرت شاہ علیہ رحمتہ نے اس سے وابستہ دوسرے مسائلِ تصوف جیسے توحید وجودی، توحید شہودی، توحید افعالی اور توحید صفاتی، بقول ڈاکٹر انصاری تصوف کی کتابوں میں لفظ توحید چار معنوں میں استعمال ہوا ہے: اول اللہ کی وحدانیت، دوم خارجی وداخلی تعمیر، ذات الٰہی کے ساتھ جمع واتحاد اور مکاشفات وتجربات کی حقیقت کی فلسفیانہ تشکیل وغیرہ پر بحث کی ہے اور فلاسفہ کے نظریہ وحدتِ وجود سے اختلاف کر کے اہلِ طریقت کے فلسفہ وحدۃ الوجود کے مبادی بتائے ہیں۔ حضرت شاہ علیہ رحمتہ اور ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم علیہ الرحمہ اور متعدد پیش روصوفیہ ومحقق نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور اسے برحق مانتے ہیں ۔جس طرح بعد کے متعدد علما اسلام اور محققین صوفیہ نے اس کو اسلامی یا صوفی نظریہ سمجھا ہے اور اس کی تشریحات کی ہیں۔ مولانا عبدالسلام خاں کا مختصر بیان یہ ہے کہ ابن عربی کے نزدیک واقع میں صرف ذاتِ باری کا وجود اصلی اور ذاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی ہستی اصلی اور ذاتی نہیں، باقی تمام چیزیں اس معنی میں موجود ہیں کہ وہ ذاتِ باری کے آثار اور پرتو ہیں، ذات باری سے علیحدہ ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔ (ہمعات، ۵۲، ۵۶، ۷۸، ۸۹، ۱۱۸، ۱۲۵، ۱۳۰، ۱۳۱ وغیرہ۔)

مولانا عبدالسلام خاں، ابن عربی کا نظریہ وحدۃ وجود، نقوش قرآن نمبر۔۴ لاہور ۲۲۷۔ ۲۷۰۔ اس کے علاوہ متعدد دوسرے مقالات بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، تصوف اور شریعت ۱/۱۳۳۔۱۳۴ ومابعد باب چہارم وحدۃ الشہود پر ہے: ابن سبعین (م۶۷۹/۱۲۸۰) عبدالکریم جیلی (م۶۷۶/۱۲۷۸) وغیرہ نے وحدۃ الوجود پر اپنے نظریات پیش کیے۔ پھر ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود پیش کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس پر حضرت مجدد علیہ رحمتہ کا نقد لکھا ہے۔ حضرت مجدد علیہ رحمتہ کا نظریہ مکتوبات میں مختلف مقامات پر ہے: ۱/۶۵۰، ۹۴، ۳۴۴، ۲۳۸۔۲۳۸ وغیرہ۔ ۲/۸۴۵، ۸۵۳ وغیرہ۔

شیخ مجدد علیہ رحمتہ کو وحدۃ الوجود کے بعض اقدار وجہات سے اختلاف تھا لہٰذا انھوں نے اپنا نظریہ وحدۃ الشہود پیش کیا۔ جس طرح حضرت شیخ اکبر علیہ رحمتہ نظریۂ وحدۃ الوجود پر امام ابن تیمیہ اور اشعری عالم امام سعدالدین تفتازانی (م۷۹۳/۱۳۹۱) اور عظیم صوفی شیخ علاء الدولہ سمنانی

(۱۳۳۶/۷۳۶) نے اس پر نقد شدید کر کے اس کو مسترد کر دیا تھا- تاہم بہت سے صوفیہ اور علما نے وحدۃ الوجود پر ان تنقیدات کے باوجود اسے قبول کیا اور اس کی شروح وتفسیرات لکھیں- شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کا نظریہ وحدۃ الشہود بھی خالص نیا نظریہ نہیں ہے- اس کے مباحث پہلے بھی رہے ہیں، حضرت مجدد علیہ رحمتہ نے اس کو مرتب کر دیا ہے- حضرت مجدد علیہ رحمتہ کی تنقیدوں اور نکتہ چینیوں کو نقل کرنے کا یہاں موقعہ نہیں، صرف بنیادی فرق بیان کرنا کافی ہوگا کہ وہ سمجھ میں آسکے- پانچ تنقیدات ہیں: ۱- اسلامی تصور توحید کے منافی ہے- ۲- اسلام کے متعدد اصولوں سے متصادم ہے کہ یہ نظریہ کائنات کو اللہ کا عین قرار دیتا ہے- ۳- وہ موضوعی (Subjective) ہے- ۴- تاریخ تصوف میں نئی چیز ہے- ۵- فنا کے حصول کے لیے وحدۃ الوجود کی قطعاً ضرورت نہیں ان کے خیال میں اللہ کا وجود ہے اور وہ ایک ہی وجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح اور حقیقی معنوں میں اصلی ایک ہے اور وہ اللہ ہے اور یہ کائنات جو اللہ سے الگ وجود رکھتی ہے اس کا کوئی اصلی وجود نہیں، یہ محض ظلی وجود ہے-" یعنی کائنات اللہ سے الگ ہے جبکہ وحدۃ الوجود میں اسے اللہ کا عین بھی بعض اعتبارات سے سمجھا جاتا ہے حضرت مجدد نے ظلی وجود پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے متعدد شارحین میں ہمارے معاصر اہل قلم ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری ہیں جن کے مضامین اور کتابوں میں اس کی تفصیل ملتی ہے ان کا اور ان کے دوسرے ہمنواؤں کا خیال ہے کہ حضرت مجدد کا نظریہ وحدۃ الشہود زیادہ صحیح بھی اور اسلامی بھی اور عقلی بھی ہے۔ حضرت شاہ نے اپنے مکتوب مدنی میں اس پر بحث کر کے دونوں نظریات میں تطبیق دی ہے وہ بحث بھی کافی فلسفیانہ اور دقیق ہے اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ نظریہ وحدۃ الوجود اور نظریہ وحدۃ الشہود میں صرف لفظی فرق ونزاع ہے ورنہ دونوں ایک ہے- معاصرین حضرت شاہ میں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۱۹۵/۱۱۸۰) اور ان کے مرید شاہ غلام یحییٰ (م ۱۱۹۰/۱۱۷۶) نے حضرت شاہ پر نقد کیا ہے، دوسرے ناقدین حضرت شاہ بالخصوص ڈاکٹر موصوف نے حضرت شاہ پر غیر اسلامی افکار کو ترویج دینے کا مجرم قرار دیا ہے کہ ان کے سبب حضرت مجدد کے صحیح ترین اسلامی نظریہ میں پھر غیر اسلامی خس وخاشاک شامل ہوگیا اور اذہان کو خراب کر گیا، حقیقت یہ ہے کہ نظریہ وحدۃ الوجود ہو یا وحدۃ الشہود دونوں اسی وقت تک اسلامی اور صحیح ہیں جب تک وہ اللہ کی ذات کو وراء الوراء سمجھتے ہیں اور اس کے وجود کو اصلی وذاتی اور کائنات کو موجود مانتے ہیں جو ذات الٰہی سے الگ ہے اور اس پر منحصر ہے کہ وہ قیوم ہے (ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، مقالہ شیخ احمد سرہندی کا نظریہ وحدۃ الشہود، قرآن نمبر نقوش ۴: ۲۷۱-۲۹۹، نیز کتاب مذکورہ بالا مکتوب مدنی ر تفہیمات الٰہیہ: تفہیم: ۳۴، مذکورہ بالا مکتوب مدنی اردو ترجمہ سید عروج احمد قادری، مذکورہ بالا میں مکتوبات امام ربانی اور نظریہ وحدۃ الشہود دونوں پر نقد ہے کہ وہ خالص فلسفیانہ مباحث ہیں)

حرف تنقید

اسلامی شریعت وطریقت کے دو عظیم ترین شارحین کرام کی تحریروں پر تنقید کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے لیکن یہ بڑی بات بہت سے بڑے منہوں نے بھی نکالی ہے اور اسلام کا حکم صداقت کہ وہ مسلم ومومن کو سچ بات کہنے کا حق ہی نہیں فرض قرار دیتا ہے کیونکہ ہمارے اکابر اسی وقت تک اور ان ہی معاملات میں اکابر ہیں جب تک وہ کتاب وسنت کے پابند ہیں، دین وشریعت کے واضح جادہ اور صراط مستقیم سے ذرا سا بھی انحراف ان کی بزرگی تسلیم کرنے کے باوجود نقد کو دعوت دیتا ہے، حضرت مجدد اور حضرت شاہ اور ان کی کتابیں ہمارے لیے سرمایہ سعادت ہیں مگر ان کے غیر اسلامی افکار سے اختلاف ہے انکار نہیں کیا جا سکتا- (حضرت مجدد کے متعدد افکار پر ان کے معاصر عالم اور صوفی شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی نے متعدد تنقیدیں کی تھیں- ان پر متعدد اہل علم نے بحث کی ہے، جیسے مولانا آزاد، عبدالشکور لکھنوی، شیخ محمد اکرام، مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ- مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون اسی پر ہے- طرف داران حضرت مجدد کا دعویٰ ہے کہ شیخ عبدالحق نے حضرت مجدد کے جوابات کے بعد رجوع کر لیا تھا مگر شیخ اکرام کا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے رجوع نہیں کیا تھا-)

مکتوبات امام ربانی کے بارے میں یہ تجزیہ صحیح ہے کہ ان کے تین بڑے حصے ہیں: ایک میں کتاب وسنت کی پیروی کی ترغیب وترویج پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بات بہ اصرار دہرائی گئی ہے کہ طریقت شریعت کے تابع ہے اور حقیقت یا تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے- دوسرے حصہ/خانہ میں حضرت مجدد کے وہ خطوط ومراسلات اور خطابات ہیں جو معاصر امرائے حکومت کو بھیجے گئے تھے اور جن میں دین وشریعت کی ترویج وترجیح پر ان کو ابھارا گیا تھا اور بدعات کے سدباب کے لیے کہا گیا تھا- (ملاحظہ ہو مضمون ظفر الاسلام شیخ احمد سرہندی اور اہل حکومت میں شریعت کی ترویج مشمولہ فکر اسلامی کے فروغ میں......۹۴۶۳)

تیسرا حصہ فلسفیانہ تصوف کے لیے مخصوص ہے اور مکتوبات کا بڑا حصہ اسی فلسفیانہ تصوف کے مضامین پر ہی مشتمل ہے (سید عروج احمد قادری مذکورہ بالا) حضرت شاہ کے رسائل ونگارشات تصوف میں بھی یہی تقسیم جزوی ترمیم کے ساتھ کی جاسکتی ہے، ایک خالص اسلامی اور علمی تصوف ہے جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے یا تجربات صوفیہ پر، جو مخالف شریعت پر نہیں مبنی ہے، اور انھیں سے مستفاد ہے ان میں سے بیشتر مباحث خالص فلسفیانہ تصوف سے متعلق ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ سب اسلامی ہیں- دونوں بزرگان شریعت وطریقت تصوف پر شریعت ودین کی بالادستی تسلیم کرتے ہیں اور طریقت سے شریعت کو الگ نہیں کرتے لیکن ان دونوں کے

ہاں شریعت اور طریقت میں دین اسلام کی تقسیم بہر حال ملتی ہے خواہ وہ ظاہر و باطن کی اصطلاح رکھتی ہو یا کچھ اور علمائے ظواہر اور فقہائے اسلام پر یہ الزام ہے کہ وہ صرف دین کا چھلکا لیتے ہیں اور مغز چھوڑ دیتے ہیں جو صاحبان طریقت پیش کرتے ہیں -ظاہر (ظہر) دین اور باطن (بطن) دین کے تصور نے قرآن مجید کی آیات کریمہ بھی ظہر وبطن کا خیال پیدا کیا، لغوی اور لسانی اعتبار سے قرآنی متن کے معانی کو ظہر قرآن کا نام دیا جاتا ہے، اور اس کے اندورن میں مستور معانی کو بطن کے ذریعہ نکالا جاتا ہے اسی سے اشاری تفسیر صوفیہ کا چلن ہوا جس نے کتاب اللہ کو ہدایت وشریعت کے صحیفہ کی جگہ صحیفہ طریقت بنا دیا کہ مفسر صوفیہ کرام میں شیخ عبداللہ تستری، امام قشیری، شیخ علاء الدین علی مہائمی اور متعدد دوسرے صوفیہ نے اسی طرح اشاری تفاسیر لکھی ہیں حضرت شاہ کے ترجمہ وحواشی قرآن مجید میں صوفیانہ باطنی تفسیر کی آلائش نہیں ملتی ہے اور وہ خالص علمائے قرآن کی تفسیر ہے، حضرت مجدد کے ہاں کامل تفسیر وترجمہ نہیں ہے تاہم ان کی تشریحات میں سے متعدد میں باطنی واشاری تفسیر کے نمونے موجود ہیں، آیات محکمات کی تاویل اور آیات متشابہات کی تفسیر کے باب میں بھی حضرت مجدد نے صوفی طریق بالخصوص موخرالذکر کے باب میں اختیار کیا ہے، محکمات اگرچہ امہات کتاب ہیں لیکن متشابہات ، جوان امہات کتاب کے نتائج وثمرات ہیں، اصل مقاصد کتاب ہیں -امہات کے ان نتائج کے حصول کے لیے وسائل زیادہ نہیں ہیں، پس کتاب اللہ کا مغز متشابہات ہیں، اور محکمات کتاب اس مغز کا چھلکا ہیں -یہ متشابہات ہی ہیں جو رمز واشارے میں اصل کو بیان کرتی اور اس مرتبہ کی حقیقت معاملہ کی نشاندہی کرتی ہیں -بخلاف محکمات، متشابہات حقائق ہیں، اور محکمات ان حقائق کے لیے بمنزلہ صور واشکال ہیں -عالم راسخ وہ ہوتا ہے جو مغز کے چھلکے کے ساتھ جمع کر سکتا ہے اور حقیقت کو صورت میں اتار سکتا ہے، علمائے قشر (چھلکے کے علما) چھلکے پر خوش ہیں اور انھوں نے محکمات پر اکتفا کر لیا ہے -یہ صرف ایک نمونہ تاویل ہے -ایسے نمونے ان کی تفسیر میں بہت ہیں جن کو ایک نوجوان محقق نے جمع کر کے تحقیق کی ہے اگرچہ وہ زیادہ تر تنقیدی نہیں -تحسینی اور مداحی ہے، پھر بھی انھوں نے بعض مقامات پر حضرت مجدد کی تفسیر کو جمہور علما کے خلاف بتایا ہے جیسے بقرہ ،۱۰۰ وغیرہ کی بعض تفسیرات مجددی، مگر صاحبان فکر ونظر نے ان پر سخت گرفت کی ہے اور حضرت مجدد کے ان صوفیانہ اشارات ولطائف پر صحیح طور سے نقد کیا ہے -حضرت شاہ نے محکمات ومتشابہات کے باب میں اپنا دامن تصوف بھی اشاری چھینٹوں سے پاک وصاف رکھا ہے (مکتوبات امام ربانی ،مکتوب ،۲۷۶، ار۳۵۷ ،سید عروج احمد قادری، مذکورہ بالا، کا اس پر نقد ہے: ۱۳۳-۱۳۵ حضرت مجدد الف ثانی کی تفسیری فقہی خدمات، تحقیقی مقالہ غیر مطبوعہ ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس، متشابہات پر بحث ۱۱۶ و

مابعد خاص کر ۱۱۸-۱۱۹، آیات کا ظاہر و باطن :۱۱۹-۱۲۰ بحوالہ دفتر سوم :مکتوب :۱۱۸، آیات قرآنی میں سے متعدد پر تفسیر اشاری یا فکر مجددی کے اثرات کے لیے ملاحظہ ہو: بقرۃ ۱۱۱: شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن جس میں ظلیت اور حقیقت محمدیہ کی اصطلاحات ہیں بقرۃ :۱۱۳: شب قدر اس ماہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہے -یہ رات مغز ہے اور یہ ماہ مبارک اس کے لیے چھلکے کے مانند ہے بقرۃ :۱۲۳: کنتم خیر امة اس امت محمدیہ کو تجلی ذاتی کی خصوصیت حاصل ہے بحوالہ مکتوب :۲۴۸: سورۂ بقرہ :۱۳۲ میں میراث صوری عالم خلق سے تعلق رکھتی ہے اور میراث معنوی عالم امر سے، اتباع ر متابعت نبوی میں بھی درجات بتائے ہیں، جن میں ایک درجہ ولایت بھی ہے)۔

حدیث شریف کی تشریح وتاویل حضرات مجدد وشاہ دونوں کے ہاں محدثانہ بھی ملتی ہے اور صوفیانہ بھی، حضرت مجدد نے کسی خاص کتاب حدیث کی شرح لکھی ہے اور نہ اس کی تدوین کی ہے البتہ اپنے مکتوبات میں متعدد احادیث کی تفسیر کی ہے، ڈاکٹر ھمایوں عباس کی تحقیق ہے کہ مکتوبات میں کم وبیش تین سو احادیث کے حوالے بعض مقامات پر نہایت عمدہ تشریح کے ساتھ ملتے ہیں، متن حدیث کی تدوین کے لحاظ سے حضرت مجدد کا ایک ''مجموعہ اربعین'' ضرور ملتا ہے جو بالعموم صوفیہ علما مرتب کرتے تھے -ڈاکٹر موصوف نے متعدد علمائے احناف کے حوالے سے حضرت مجدد کے فن حدیث میں بلند مقام اور ان کی شروح کی رفعت کا ذکر کیا ہے اور معارف حدیث کے عنوان سے حضرت مجدد کی بعض تفسیرات وتشریحات بھی کتابی صورت میں جمع کر دی ہیں جو تقابلی مطالعہ کی راہ دکھاتی ہیں، حضرت شاہ کو عبقری محدث تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان کے مباحث حدیث اور معارف سنت معتبر وثقہ نہیں گراں قدر بھی ہیں -مسوی، مصفی اور بعض دوسری کتب جیسے ازالہ الخفاء ،قرۃ العینین وغیرہ میں ان کی تشریحات ومباحث خالص محدثانہ ہیں لیکن کتب رسائل تصوف میں اور مکاتیب میں بہت سی احادیث کی صوفیانہ شرح کی ہے جس کو خاکسار نے مرتب کر دیا ہے -ان دونوں عبقری امامان نقشبندیہ کی صوفیانہ شرح حدیث کا ایک تقابلی مطالعہ تو ایک تحقیقی مقالہ کا موضوع ہے، صرف ایک مختصر جائزہ یہاں کافی ہے -ان دونوں کے تقابلی مطالعہ سے متعدد دلچسپ نکات وامور سامنے آتے ہیں:

۱-متعدد احادیث کی دونوں نے صوفیانہ شرح کی ہے جیسے إن اللـه خلق آدم على صورته ،كنت نبيا و آدم بين الماء و الطين (حقیقت احمدی ر عالم امر وغیرہ) الا ان فی الجسد مضغة الخ ،المرء مع من أحب ،وغیرہ

ان میں سے بعض احادیث محدثین کے نزدیک غیر معتبر ہیں اور سقیم روایات ہیں لیکن ان کو دونوں نے صحیح احادیث مانا ہے جیسے الایام ایام الله و العباد عباد الله ،حب الدنيا راس

كل خطيئة ،خلقت من نور الله (دفتر سوم مکتوب:۱۰۰: موضوع روایت ہے) **لی مع الله وقت لایسعنی فیه ملک مقرب ولا نبی مرسل** (دفتر اول: مکتوب:۹۹-۵-۱۷ وغیرہ، **كنت كنزا مخفیا** الخ وغیرہ۔

۲-دونوں بزرگوں نے احادیث شریفہ میں سے بعض کے ضمن میں اکابر صوفیہ کے اقوال سے بھی استناد کیا ہے جیسے حدیث قلب میں حضرت شاہ کا حوالہ حضرت جنید بغدادی، **حق المسلم علی المسلم خمس** میں حضرت مجدد کا استدلال حضرت خواجہ نقشبند سے وغیرہ-

حضرات مجدد و شاہ نے متعدد احادیث کی شرح میں بھی نہایت دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کی ہے اور عظیم معانی کی ترسیل کی ہے جیسے حدیث قرطاس کی شرح حضرت مجدد اور حدیث اسبال ازار کی شرح حضرت شاہ **کلمتان خفیفتان علی اللسان** وغیرہ

حضرت شاہ نے بالخصوص ایک سے زیادہ احادیث کو جمع کر کے مجموعہ سے بلند و جمیل معانی اور احکام کا استنباط کیا ہے، جیسے **من قال لااله الا الله دخل الجنة** کی شرح مجدد (دفتر دوم، مکتوب:۳۷) حدیث قلب کی شرح شاہ (لطائف القدس، ۴۹، ۵۷)

(ہمایوں عباس، حضرت مجدد الف ثانی اور معارف حدیث، لاہور ۲۰۰۸ء

(محمد یسین مظہر صدیقی، شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شرح حدیث، پھلت ۲۰۰۸ء)

مقام نبوت

اکابر صوفیہ بالخصوص محققین کا ایک محبوب موضوع رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور اسی سے وابستہ مقام نبوت ہے، وحدۃ الوجودی صوفیہ کی فکر میں مقام نبوت کو بڑا مرتبہ حاصل ہے اور دوسرے قدیم و متاخر صوفیہ بھی اس پر کلام کو ضروری سمجھتے ہیں ،علماے اسلام اور قرآنیات و حدیثیات کے ماہرین کتاب و سنت کی تشریحات کر کے اپنے مباحث کو قابل فہم بنا دیتے ہیں جبکہ صوفیائے کرام فلسفیانہ افکار و اصطلاحات کے ذریعہ ان کو پیچیدہ ، نا قابل فہم اور فلسفیانہ فکر میں ڈھال دیتے ہیں، حضرات مجدد و شاہ دونوں نے بیشتر مقامات پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور مقام نبوت کو کتاب و سنت سے زیادہ فلسفہ کے قریب کیا ہے، دونوں بزرگوں کے مباحث میں بہر حال مفسرین و محدثین اور متکلمین اسلام کے طریق بحث و استدلال بھی کافی حد تک ملتا ہے، حضرت مجدد نے نبی کی تعریف متکلمین کے اسلوب پر کی ہے اور انتخاب نبی کی تشریح قرآنی آیات و احادیث کے ذریعہ کی ہے جبکہ نبوت کی حقیقت کی بحث میں فلسفہ کی آمیزش ہے، نبوت سے مراد وہ قرب الٰہی ہے جس میں ظلیت کی آمیزش نہیں اس کا عروج حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور نزول خلق کی طرف- اثبات نبوت، معجزات نبوت اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقامات پر عام

بحث کے علاوہ خاص رسول اکرم ﷺ کے مقام نبوت پر بحث حضرت مجدد بیشتر مقامات فلسفیانہ ہے اور قابل نقد بھی ہے، جیسے عنصری و مادی پیدائش کے علاوہ حق تعالیٰ کے نور سے پیدائش کا خیال ، بشریت محمدی کا تصور ہجرت ظاہری و باطنی اور وصال محمدی وغیرہ (عبد الحق انصاری -تصوف اور شریعت ۱/۱۱۴-۱۱۹ و مابعد: نبی اور نبوت: حضرت مجدد نے نبی کو بھی ولی بنا دیا ہے اور حکیم ترمذی، امام غزالی، ابن عربی وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔

حضرت شاہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب **حقیقة النبوة وخواصه** کے علاوہ تاویل الاحادیث ،تفہیمات وغیرہ میں فلسفیانہ بحث زیادہ کی ہے۔ الٰہی انتخاب رسول ،اس کی حکمت ،بعثت رسول کی حکمت الہیہ ،سابق انبیاء پر فضیلت ،ختم نبوت اور دوسرے مباحث میں ملاء اعلی ،مفہمون ، مفہمیت محمد ﷺ ،نفس ناطقہ وغیرہ کی پسندیدہ اصطلاحات شاہ کا عمل دخل قرآن و حدیث سے زیادہ ہے اصل نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت دو جانب سے معرض وجود میں آتی ہے (نبی) قبول کرنے والے کے نفس ناطقہ کی طرف سے جب اس کا نفس ناطقہ مقام مفہمیت حاصل کر لیتا ہے اور دوسری اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔ بعثت ختم نبوت کے بعد بھی اجزائے نبوت کا سلسلہ جاری ہے، اور اس سے مراد مفہمیت ہے- کیونکہ مفہمین پر سب نبوت کے ہی انوار ،اشباح اور تمثیلیں طاری ہوتی ہیں، دونوں بزرگوں کے مباحث مقام نبوت میں بہت سی مشترکہ اقدار وصفات ہیں اور ان پر نقد و استدراک بھی کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے (حضرت مجدد، اثبات النبوۃ مختلف صفحات، مکتوبات کے دفاتر، مفصل بحث کے لیے ہمایوں عباس، مقام نبوت، مجدد کے افکار، لاہور ۲۰۰۹ء شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ۱/۸۵، ۸۶، تاویل الاحادیث، ۷۷ وغیرہ ہمعات ،۱۸۰-۱۹۵ و مابعد ،تفہیمات: ۲۸، ۱۰۱، ۱۳۵ وغیرہ)

اذکار و وظائف

اعمال و اشغال طریقت میں سب سے زیادہ زور اذکار و وظائف پر دیا جاتا ہے اور وہ تمام صوفی سلسلوں میں اہم ترین ہے، امام غزالی اور ان کے شیخ کے ہاں یہ افراط تک ملتی ہے کہ وہ ذکر کی جگہ تلاوت قرآن کو بھی منع کرتے تھے جبکہ حضرت شاہ تلاوت کو افضل ذکر قرار دیتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود اور معبود حقیقی سے بندہ اور سالک کا راست تعلق ہو جاتا ہے، یاد الٰہی ،قلب و نظر میں اس کا دوام روح و بدن میں اس کی سرایت ہی غیر اللہ سے بیگانہ اور دنیا سے مبرا کرتی ہے، نقشبندی سلسلہ میں ذکر الٰہی کے دوام کو یادداشت سے یاد کیا جاتا ہے، حضرت شاہ نے عربی زبان میں بھی اسی فارسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے کہ ان کے فکر و نظر میں اس کا عربی بدل نہیں ہے، خواجہ نقشبندی سے اس کی تعریف و اہمیت منقول ہے،

دوسرے سلاسل سے نقشبندیہ کا اختلاف ذکر جہری اور ذکر خفی پر ہے، خواجہ نقشبند کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ذکر جہری کو مکروہ سمجھتے تھے اس لیے نقشبندی حضرات صوفیہ اور سالکین ذکر خفی کو ترجیح دیتے ہیں اور ذکر جلی سے اجتناب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور حنفی فقہاء ذکر جہری کو غیر مسنون سمجھتے تھے اسی لیے خواجہ نقشبند نے اس کی ممانعت کی، بسا اوقات اس باب میں افراط وتفریط کا رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی راست زد سنت وحدیث پر پڑی ہے، حضرت مجدد ذکر قلبی کے قائل تھے اور بعض دوسرے صوفیہ بھی جس میں زبان کو حرکت دینا ممنوع ہے کہ ذکر قلب کا کام ہے، ذکر لسانی سے ذکر قلبی تک پہنچنا بلاشبہ ایک اہم شغل وریاضت ہے کہ ذکر الٰہی دلوں کے نہاں خانہ میں پیوست ہو جائے مگر ذکر لسانی کے بغیر ذکر قلبی محال نہیں تو مشکل ہے اور وہ ریاضت ومشقت کے خاصے لمبے مرحلے کے بعد نصیب ہوتا ہے، حضرت شاہ نے نقشبندی خیال کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذکر جلی ممنوع ہے اور نہ مکروہ ، وہ خالص مسنون چیز ہے مگر ذکر میں وہ زبان وآواز کی بلندئ آہنگ کو روکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر ہے لہذا زور وشور سے ذکر کرنا خلاف سنت ہے، اسی طرح مختلف سلسلوں کے اکابر اور ان کے عظیم شیوخ نے مختلف اذکار ووظائف کو اپنے تجربات کی بنا پر اختیار کیا ہے بلاشبہ تمام صوفیہ کرام مسنون اذکار اور قرآنی وظائف کی تاثیر واہمیت کا اعتراف کرتے اور ان ہی کو تجویز کرتے ہیں -حضرت مجدد کے تجویز کردہ اور ادووظائف کو ڈاکٹر ہمایوں عباس نے اپنی کتاب ''معارف حدیث'' کے اواخر میں جمع کر دیا ہے کہ وہ بھی خدمت حدیث ہے، لیکن بعض ایسے اذکار ووظائف بھی ہیں جو غیر مسنون ہیں اور مخالف کتاب وسنت نہیں، ان کی ادائیگی میں کوئی قباحت نہیں، اسی طرح حضرت مجدد اور حضرت شاہ اور دوسرے اکابر نے بھی خاص مقاصد حاصل کرنے کے لیے بھی بعض اوراد ووظائف کو اپنے تجربہ سے تجویز کیا ہے -(مکتوبات امام ربانی ،مکتوب :۲۳۱، ۱/۲۴۶ نیز ۱/۲۷۰ مکتوب، ۲۶۶: کھانے پر زور سے بسملہ پڑھنے پر خواجہ باقی باللہ نے ایک مرید کو سرزنش کی تھی ،حضرت مجدد اسے بدعت منکر کہتے ہیں، عروج احمد قادری نے تمام مسنون اذکار کے ذکر لسانی ہونے کا ذکر کیا ہے -شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ۱/۳۴ وغیرہ ،ہمعات ۱۱۶، الطاف القدس ۵۹: ذکر وتلاوت دوام عبودیت کے لیے، القول الجمیل: ذکر نقشبندیہ)

کلمۂ اختتام

تصوف وطریقت کے مباحث بہت ہیں اور ان کے اعمال واشغال اور افکار ونظریات بھی کافی ہیں- ان میں نقشبندی اعمال واشغال اور اوراد ووظائف کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ وہ کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہیں، بنیادی طور سے حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں

نقشبندی تھے اگر چہ دوسرے سلاسل سے بھی خاص کر موخر الذکر وابستہ تھے- حضرات مجدد اور شاہ میں بالعموم تمام اہم مسائل تصوف اور مباحث طریقت میں اتفاق واتحاد ملتا ہے کہ ایک سرچشمہ سے نکلے تھے- بعض معاملات ومسائل میں ان دونوں کا اختلاف اختلاف تنوع ہے کہ وہ دونوں ایک ہی اصل کی دوصورتیں اختیار کرتے ہیں، حضرت شاہ نے اسی بنا پر بعض اہم اور نازک مسائل وافکار میں حضرت مجدد کے خیالات کی تشریح کی ہے اور شبہات کا ازالہ کیا ہے- بعض دوسرے معاملات طریقت میں حضرت شاہ کے بیانات وتشریحات حضرت مجدد کی فکر پر اضافات ہیں- چند ایک ایسے معاملات بھی ہیں جن میں دونوں کے خیالات ونظریات ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں- ان میں بالعموم حضرت شاہ کے افکار ونظریات اور تشریحات وتعبیرات زیادہ حقیقی اور صحیح ہیں- جبکہ حضرت مجدد کے افکار بھی صوفیانہ ہیں- دونوں نے ذوق ووجدان سے کام زیادہ لیا ہے -عملی تصوف میں بیشتر افکار وتعلیمات مجدد وشاہ کتاب وسنت کے مطابق ہیں، دونوں عظیم علمائے اسلام میں بھی سرفہرست تھے، طریقت وتصوف میں ان دونوں اکابر سلسلہ اور نقشبندی مجددین کے تسامحات کو تعبیر وتشریح اور تفہیم کی خطا کہا جا سکتا ہے جیسے مفسرین ومحدثین ،فقہاء ومتکلمین اور دوسرے علمائے اسلام میں سے ہر ایک نے کی ہیں- وہ مجتہدین کی خطائیں ہیں اور باعث اجر بھی لیکن اسی کے ساتھ جن معاملات طریقت اور مسائل تصوف میں کتاب وسنت کے جادے سے انحراف نظر آئے ان سے اجتناب ضروری ہی نہیں، ان پر نقد بھی ضروری ہے کہ وہ تمام تر بزرگی کے باوجود بہر حال مجتہدین ومجددین تھے اور اماماں معصومین نہ تھے، حضرت مجدد کی فکر طریقت اور کار تجدید کا سب سے اہم اور زندہ جاوید پہلو ترویج شریعت اور رد بدعت ہے اور خاص کر اقتدار کی گلیوں میں، اس کی موجودہ دور میں خاص کر اسلامی ممالک میں زیادہ ضرورت ہے کہ صاحبان اقتدار کے علاوہ علمائے دین واہل طریق بھی کجرو بن گئے ہیں- حضرت شاہ کے طریقہ میں شریعت وطریقت کی جو تطبیق وہم آہنگی خاص کر کتاب وسنت سے وابستگی کی دعوت ملتی ہے وہ تمام عوام وخواص کے لیے یکساں مفید ہے اور غالبا علوم اسلامیہ میں ان کی خدمات اور طریقت میں ان کے تجدیدی کارنامے تابندہ تر ہیں-

○○○

مولانا ابرار رضا مصباحی

مجدد الف ثانی اوران کے چند ممتاز خلفا

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ (ولادت: ۹۷۱ھ وفات: ۱۰۳۴ھ) گیارہویں صدی ہجری کی ایک عظیم علمی وروحانی اور عبقری وانقلابی شخصیت ہیں، انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور ہمہ گیر کوششوں سے دینی ومذہبی، ذہنی وفکری، اور علمی وروحانی تمام میدانوں میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا، عہد اکبری میں پھیلی ہوئی غیر شرعی بدعات وخرافات اوران کی ترویج وتشہیر کا حکمت وبصیرت سے سد باب کر کے ایوان بادشاہت میں ایک ہل چل مچا دیا، تعلیمات اسلام اوراحکام شرع کا مثبت طور پر احیاواشاعت اوران کی ترقی وتوسیع کر کے ایک تاریخی اورنا قابل فراموش کارنامہ انجام دیا۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ مشرقی پنجاب میں ضلع انبالہ کے ایک گاؤں سرہند میں پیدا ہوئے-آپ کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی قدس سرہ (متوفی ۱۰۰۷ھ) تھے، جو ایک جید عالم دین، بڑے عابد وعارف اور حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہ کے فرزند ارجمند وخلیفہ حضرت شیخ رکن الدین علیہ الرحمہ کے اجلہ خلفا میں تھے (مشائخ نقش بندیہ، ص: ۴۸۳/نزہۃ الخواطر ص: ۲۱۱، ج ۵)

آپ نے اپنی تعلیم وتربیت کی تحصیل وتکمیل والد گرامی اور دیگر علمائے روزگار ومشائخ کبار کی صحبت میں رہ کر فرمائی اور سترہ سال کی مدت میں تمام علوم معقولہ ومنقولہ سے فارغ ہو کر درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔آپ کا تدریسی زمانہ آگرہ میں گزرا جہاں آپ نے ہزاروں تشنگان وطالبان علوم کو عرصے تک اپنے چشمۂ علمی سے سیراب فرمایا۔اس کے بعد آپ شیخ سلطان جو اکبر بادشاہ کے خاص مصاحبوں میں سے تھے، کی دختر نیک اختر سے نکاح کر کے رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔اس کے بعد آپ کو ایک روحانی رشتۂ (معرفت الٰہی) سے بھی وابستہ ہونے کی ایک شدید ضرورت اور تڑپ پیدا ہوئی۔چنانچہ حضرت مجدد قدس سرہ اپنے والد گرامی قدس سرہ

کی ہی خدمت وصحبت میں سلوک ومعرفت کی منازل طے کرنا شروع کیا اور جلد ہی باطنی کمالات وترقیات سے مالا مال ہوگئے۔آپ کی روحانی استعداد وترقی کو دیکھ کر والد مخدوم نے مختلف سلاسل مبارک کی اجازت وخلافت سے نواز کر خرقہ بھی عنایت فرمایا اور ساتھ ہی اپنا قایم مقام اور جانشین مقرر فرما کر چند دنوں کے بعد ہی آخرت کے لیے کوچ کر گئے۔

اس کے بعد مزید علوم طریقت وحقیقت کو حاصل کرنے کے لیے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ (متوفی ۱۰۱۲ھ) کی صحبت وتربیت کو اختیار فرمایا۔ان کی خدمت میں رہ کر بڑی تیزی سے منازل سلوک وتصوف طے کر کے بلند درجات ومراتب پر فائز ہوئے اور ساتھ ہی اجازت وخلافت کی عظیم نعمت سے بھی بہرہ مند ہوئے۔اس کے بعد مرشد کامل کے حکم وارشاد کے مطابق آپ وطن مالوف سرہند تشریف لے آئے اور سالکوں اور طالبوں کی تربیت ظاہری وباطنی اور دینی امور کی تجدید وتوسیع میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

آپ نے ہزاروں شائقین معرفت وسلوک کو اپنے چشمۂ فیض ومعرفت سے شادکام فرمایا اور ساتھ ہی ملک وسماج میں درآئیں برائیوں اور خرابیوں کا اپنی علمی وروحانی حکمت وبصیرت اور انتہائی دوراندیشی وبے باکی سے قلع قمع کر کے سب کا خاتمہ کیا اور ایک دینی وعلمی اور خوش گوار ماحول قائم کیا۔آپ نے اپنی وسیع روحانی وتجدیدی مصروفیات اور ہجوم افکار کے باوجود کچھ نادر ونایاب اور قیمتی نقوش قلم بھی چھوڑے ہیں جو آپ کے مکتوبات عالیہ اور رسائل نافعہ ہیں آپ کی جملہ تخلیقات وتصنیفات میں مکتوبات کو ایک خاص اور امتیازی مقام حاصل ہے جو بلاشبہ شریعت وطریقت اور حقیقت ومعرفت کی معلومات کے لیے ایک بیش بہا اور راہ نما ذخیرہ ہے اور طالبان شریعت وطریقت کی روحانی سیرابی کے لیے ایک منبع ومرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کی ذات بابرکت سے سلسلۂ نقش بندیہ کو کافی عروج وفروغ حاصل ہوا ہے جس کا واضح ثبوت ملک وبیرون ملک میں پھیلے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مریدین وخلفا اور ان کی دینی وعلمی خدمات کے اثرات ہیں۔

آپ نے ان کے ذہن وفکر، کردار وعمل اور ظاہر وباطن کی ایسی عمدہ تطہیر وتربیت اور بے مثال تزکیہ کا فریضہ انجام دیا کہ سلوک میں اعلی درجات تک پہنچ گئے اور آپ کے نقوش قدم پہ چلتے ہوئے انہوں نے بھی دعوتی وتبلیغی اور علمی وروحانی سطحوں پہ قابل رشک کارنامے انجام دیے ہیں اور آپ کی تجدیدی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے گرامی کا سلسلہ خواہ وہ بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ، کافی وسیع ہے۔تقریباً دنیا کے تمام گوشوں میں ان کی جلوہ باریاں ہیں، جس کا اندازہ آپ

کے ایک مشہور مرید وخلیفہ حضرت شیخ محمد ہاشم کشمی قدس سرہ کے اس قول سے بخوبی کیا جاسکتا ہے
''بعض حضرات نے محض اتفاقیہ ملاقاتوں میں انکشاف کیا کہ ان کو حضرت مجدد سے خلافت واجازت حاصل ہے'' (مشائخ نقشبندیہ ص: ۵۴۲)

لیکن میں اپنے علم ومطالعے کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے عظام میں سے جن میں آپ کی اولاد امجاد اور ملک وبیرون ملک کے علماومشائخ شامل ہیں صرف چند اسمائے مبارکہ کے تعارفی حالات کو ذیل میں مختصراً ذکر کرنے پر ہی اکتفا کررہا ہوں۔

۱۔حضرت خواجہ محمد صادق سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد قدس سرہ کے فرزند کلاں ہیں ۱۰۰۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، تعلیم وتربیت اپنے جد امجد حضرت شیخ عبدالاحد قدس سرہ، سے حاصل فرمائی، صغر سنی ہی میں فارغ ہوکر جامع علوم وفنون ہوئے اور درس وتدریس میں مشغول ہوئے۔

آپ انتہائی ذہین وفطین اور زہد وتقوی کے پیکر تھے۔آپ کے والد مکرم حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد (حضرت شیخ عبدالاحد قدس سرہ) فرمایا کرتے تھے کہ:
''تمہارا یہ لڑکا مجھ سے حقائق ومعارف کی ایسی ایسی عجیب باتیں دریافت کرتا ہے کہ ان کا جواب مشکل سے بن پڑتا ہے'' (از جہان امام ربانی، اقلیم چہارم ص ۴۷۱)۔

آپ کی علمی بصیرت وجولانیت کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ایک مکتوب میں آپ کے وصال فرمانے کے بعد ذکر کرتے ہیں کہ:
''علوم عقلیہ ونقلیہ کے درس وتدریس کو بے حد کمال پر پہنچا دیا تھا حتی کہ اس کے شاگرد بیضاوی وشرح مواقف اور اسی قسم کی منتہی کتابیں پڑھاتے ہیں'' (ایضاً ص: ۴۷۳)۔

آپ اپنے والد گرامی کے ہمراہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت اقدس میں پہنچے اور ان سے مراقبہ، ذکر اور جذبہ ونسبت کی برکات وعنایات سے مشرف ہوئے اور وہ کمالات ومقامات حاصل ہوئے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ آپ کو دیرینہ سالکوں کے مقابلے میں پیش فرماتے تھے (تلخیص از نزہۃ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۴)۔

اس کے بعد حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ اپنے والد گرامی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے فیض تربیت سے بھی مرتبۂ فضل وکمال کو پہنچے اور ''الولد سر لابیہ'' کے پورے مصداق ثابت ہوئے۔آپ نے بہت کم عمر پائی لیکن جتنی بھی میسر ہوئی اس کا بھرپور استعمال فرمایا۔

حضرت مجدد قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:
''فرزند مرحوم (خواجہ محمد صادق) اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور رحمت تھے۔ چوبیس سال کی

عمر میں وہ کچھ پایا کہ بہت کم لوگوں نے پایا'' (ایضاً)۔

آپ ۲۴ رسال کی ہی عمر میں سرہند شریف میں بعارضۂ طاعون ۱۰۲۵ھ کو وصال فرماکر عالم فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائے، مزار مبارک سرہند شریف ہی میں مرجع خاص وعام ہے۔

۲۔حضرت خواجہ محمد سعید سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے دوسرے فرزند ارجمند ہیں۔آپ صلاح وتقوی اور علم وبزرگی میں اپنے برادر کبیر حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ کے عکس جمیل تھے۔ ولایت وعرفان اور فضیلت وبزرگی کے آثار پیشانی ہی سے نمایاں تھے۔

آپ کی پیدائش ۱۰۰۵ھ میں ہوئی۔اپنے والد گرامی، برادر کلاں اور حضرت شیخ طاہر لاہوری (متوفی ۱۰۴۰ھ) سے علوم ظاہری کی تحصیل فرمائی اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ بعدہ درس وتدریس میں مصروف ہوئے۔آپ نے کچھ قیمتی قلمی یادگاریں بھی چھوڑیں ہیں۔ مشکوٰۃ اور حاشیۂ خیالی پر آپ نے بہت ہی جامع اور وقیع حاشیہ رقم فرمایا ہے اور رفع سبابہ پر ایک عمدہ رسالہ بھی ہے علاوہ ازیں آپ کے کچھ گراں قدر مکتوبات ہیں جو حقائق ومعارف کا ایک بحر ذخار ہے (نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۳۶۵ وجہان امام ربانی اقلیم چہارم ص: ۴۷۳)۔

اس کے بعد علوم باطنی حضرت مجدد قدس سرہ سے حاصل کیا اور انہیں کی تربیت وصحبت میں درجۂ کمال کو پہنچے اور خلافت واجازت کے مجاز قرار پائے، حسب ارشاد والد ومرشد مسند ارشاد پر بیٹھ کر طالبین ومترشدین کی تربیت ظاہری وباطنی میں ہمہ تن متوجہ ہوئے اور ان کو اپنے فیوض وبرکات سے اعلیٰ مقامات وترقیات پہ فائز فرمایا۔آپ کی وفات ۱۰۷۰ھ میں ہوئی، مزار مبارک سرہند شریف میں واقع ہے۔

۳۔حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے تیسرے فرزند دل بند ہیں۔آپ بڑے جامع کمالات وبرکات اور گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ملک وبیرون ملک میں آپ کے علم وفضل اور ولایت وبزرگی کا خوب شہرہ ہے۔آپ کی ولادت باسعادت ۱۱رشوال المکرم ۱۰۰۷ھ رمئی ۱۵۹۹ء میں بستی ملک حیدر میں ہوئی۔ یہ بستی سرہند سے دو میل (خام) کے فاصلہ پر واقع ہے۔
(مشائخ نقشبندیہ ص: ۵۵۹)۔

آپ فطری طور پر فہم واستعداد کی خوبیوں سے آراستہ اور ولی کامل تھے'' آپ نے تین سال کی عمر میں کلمۂ توحید سے متعلق بات شروع کردی تھی اور درودیوار اور گل وگلزار میں سے ہر چیز

پر جب اس کی نظر پڑتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ ’’یہ میں ہوں اور وہ میں ہوں‘‘ (ایضاً ص:۵۶۱)۔

آپ نے جملہ مروجہ علوم وفنون کو سولہ سال کی قلیل مدت میں مکمل فرمایا، آپ کے اساتذۂ کرام میں والد محترم، برادر مکرم اور حضرت علامہ شیخ طاہر لاہوری رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر علما ومشائخ سے بھی استفادہ فرمایا ہے، اور تین ماہ کی مختصر مدت میں حفظ قرآن کی دولت سے بھی آپ مالا مال ہوئے۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد درس وتدریس کے مشغلے سے بھی وابستہ ہوئے۔ آپ نے تفسیر بیضاوی، ہدایہ، عضدی وغیرہ جیسی منتہی اور اہم کتابوں کا درس دیا۔

اب اس کے بعد آپ علوم معرفت وطریقت کی تحصیل وتکمیل میں مصروف ہوئے اور انہیں کی صحبت وتربیت میں رہ کر چند دنوں ہی میں تمام منازل سلوک طے کیا، اس کے بعد حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو خلافت واجازت عطا کر کے اپنا امین وجانشین مقرر فرمایا اور اس دار فانی سے کوچ فرما کر عالم جاودانی کے مسافر ہو گئے۔

حضرت خواجہ معصوم مسند ارشاد پر متمکن ہو کر رشد وہدایت اور اصلاح وتزکیہ کا قابل قدر اور بیش بہا کارنامہ انجام دیا اور سلسلۂ نقش بندیہ کی ترقی وتوسیع میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

آپ کا سلسلۂ بیعت کافی ہمہ گیر تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں آپ کے مریدین ومتوسلین اور کثیر تعداد میں خلفائے گرامی ہیں۔ شیخ محمد باقر لاہوری، حافظ محسن سیالکوٹی، شاہ حسین عشاق اورنگ آبادی، خواجہ محمد حنیف کابلی وغیرہ جیسے نادر روزگار افراد آپ ہی کے اصحاب اجازت وخلافت ہیں۔

آپ کی تحریری خدمات میں مکتوبات کی تین ضخیم جلدیں اور کئی اہم رسائل شامل ہیں۔ ۶/ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ میں آپ نے وصال فرمایا، مزار اقدس سرہند شریف میں واقع ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ جس طرح عالم علوم عقلیات ونقلیات اور جامع کمالات ظاہری وباطنی تھے اسی طرح آپ کی اولاد امجاد بھی علوم ومعانی اور حقائق ومعارف کے بہت بڑے شناور اور راز آشنا تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ اپنے ایک مخلص مرید کو صاحبزادگان والاتبار کے مقامات رفیعہ سے روشناس کراتے ہوئے فرمایا:

’’فرزندان ایشاں کہ اطفال اسرار الٰہی اند استعداد ہائے عجب دارند بالجملہ شجرہ طیبہ اند، انبتہا اللہ نباتاً حسناً‘‘۔

ترجمہ: حضرت مجدد الف ثانی کے تمام فرزند اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں اور عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شجرۂ طیبہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ پروان چڑھائے۔ (جہان امام ربانی، اقلیم چہارم، ص:۴۷۴)

۴- حضرت خواجہ میر محمد نعمانی کشمی قدس سرہ

آپ بڑے علمی جاہ وجلال اور بلند روحانی مرتبہ وکمال والے تھے۔ آپ کی ولادت وپیدائش ۹۷۷ھ میں بدخشاں میں ہوئی، آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد ماجد حضرت سید شمس الدین یحییٰ علیہ الرحمہ جو بدخشاں اور ماوراء النہر کے مشائخ ومشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے، نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ عالم خواب میں دیکھا کہ ارشاد فرما رہے ہیں:

’’تمہارے ہاں ایک فرزند سعادت مند پیدا ہوگا، اس کا نام ہمارے نام پر ’’نعمان‘‘ رکھنا۔ چنانچہ آپ کا یہی نام رکھا گیا (نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۴۲۵)۔

اپنی تعلیم وتربیت اپنے ہی ملک کے علما کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے حاصل کی۔ پھر عنفوان شباب میں آپ حضرت عارف حق آگاہ شیخ امیر عبداللہ عشقی بلخی قدس سرہ کے پاس بلخ پہنچے اور بیعت وارادت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے اور بعض درویشوں وبزرگوں سے اذکار کی تعلیم حاصل کر کے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے الطاف وانعامات بے پایاں کو دیکھ کر طریقۂ نقش بندیہ میں منسلک ہوئے۔ اس کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ نے جب حضرت مجدد قدس سرہ کو بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی تو اپنے تمام اصحاب ارادت کی تربیت انہیں کے ذمہ سپرد فرمائی اور آپ سے بھی ارشاد فرمایا کہ ’’تم ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنا‘‘۔

چنانچہ آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے حلقۂ تربیت وتزکیہ میں شامل ہوئے اور ایک عرصہ تک آستانۂ عالیہ میں رہ کر انعامات ونوازشات سے سرفراز ہوئے اور حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو اجازت وتعلیم طریقت مرحمت فرما کر طالبین معرفت کی رہ نمائی کے لیے برہانپور روانہ کیا۔

حضرت مجدد قدس سرہ کو آپ سے حد درجہ کی محبت وشفقت تھی یہاں تک کہ ایک مرتبہ ان کو ضعف عارض ہونے کی وجہ سے حضرات خواجگان نقشبندیہ کی امانت ونعمت کو کسی اہل ومخلص کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت اس بار کا متحمل سوائے اپنے بڑے فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ اور آپ کی ذات بابرکات کے کسی کو نہیں پایا تھا۔ آپ کی وفات ۱۰۵۸ھ میں ہوئی۔

۵- حضرت شیخ حمید بنگالی قدس سرہ

آپ علم وفضل، زہد وورع اور فکر وبصیرت کے جامع تھے اور اس کے ساتھ سنت رسول کے بھی سخت پابند تھے۔ آپ کی پیدائش وپرداخت صوبۂ بنگال کے ضلع بردوان میں ایک منگل کوٹ نامی شہر میں ہوئی۔ حصول تعلیم وتربیت کے لیے آپ لاہور تشریف لے گئے اور تکمیل کے

بعد واپسی میں آگرہ قیام کیا، وہیں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے بیعت بھی ہوئے اور تقریباً دو سال ان کی خدمت عالی جاہ میں رہے اور احوال عجیبہ، مقامات غریبہ اور درجات رفیعہ سے مالا مال ہوئے، ساتھ ہی تعلیم طریقت و معرفت کی اجازت وخلافت بھی حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو عنایت فرمائی اور شہر بنگال کی طرف رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ وہاں آپ نے مجددی فیوض و برکات کا گوہر خوب لٹایا۔ آپ کا وصال مبارک ۱۰۵۰ھ میں ہوا۔ مزار پر انوار شہر منگل ضلع بردوان میں ہوا۔ (نزہۃ الخواطر، ج:۵، ص:۱۵۱)

۶-حضرت شیخ طاہر حنفی لاہوری قدس سرہ

آپ بڑے عالم وفاضل اور یکتائے روزگار اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ونشو ونما لاہور میں ہوئی اور تعلیم وتربیت اور حفظ قرآن کی تحصیل وتکمیل بھی یہیں سے ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم سلوک کے حصول کے لیے حضرت شیخ اسکندر عماد کیتھلی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کی، بعدہ حضرت شیخ عبدالاحد بن زین العابدین سرہندی قدس سرہ سے بھی استفادہ کرکے فیض یاب ہوئے اور پھر بعد میں نادر روزگار حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی کی خدمت وصحبت کو اپنے اوپر لازم کرلیا اور ایک عرصہ تک وہاں رہے اور ان کی نظر کیمیا اثر سے درجۂ کمال کو پہنچ کر اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے۔ پھر بحکم شیخ ومرشد لوگوں کی ہدایت وتربیت کے لیے لاہور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر طالبان حق کی حقیقت ومعرفت کی طرف عمدہ راہ نمائی فرمائی اور اپنے فیوض وکمالات سے مخلوق خدا کو حظ وافر پہنچایا، وصال مبارک ۱۰۴۰ھ میں ہوا۔ روضۂ انور لاہور میں مرجع خلائق ہے۔

(نزہۃ الخواطر، ج:۵، ص:۴۱۲)

۷-حضرت شیخ آدم بنوری قدس سرہ العزیز

آپ علوم ظاہری اور علوم باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے اور بڑی برگزیدہ شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کی ولادت مبارکہ سرہند کے مضافات میں ایک بنور نامی گاؤں میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی حضرت اسماعیل بن بھوہ قدس سرہ کو آپ کی نیک بختی وسعادت مندی کے بارے میں حضرت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت فرمائی تھی۔ (نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۳)

آپ امی بزرگ تھے، علوم باطنی سے اپنے قلب وباطن کو جلا بخشنے کے لیے حضرت حاجی خضر خاں افغانی قدس سرہ کی بارگاہ میں پہنچے جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ تھے یہاں دو سال ان کی خدمت میں رہے لیکن انہوں نے جب آپ کے طلب معرفت کو ملاحظہ فرمایا کہ آپ کی یہ روحانی تشنگی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے تو انہوں نے راہ سلوک کی تکمیل کے لیے

اپنے شیخ ومرشد کی طرف ایما واشارہ کیا چنانچہ آپ حضرت شیخ احمد فاروقی قدس سرہ کی خدمت عالی جاہ میں باریاب ہوئے اور ان کی توجہ خاص سے تمام باطنی مقامات ودرجات کے حصول میں کامیاب ہوکر شاد کام ہوئے۔ اس کے بعد حضرت شیخ ومرشد قدس سرہ نے آپ کو اجازت وخلافت سے بھی بہرہ ور فرمایا۔

اجازت کے بعد آپ خدمت انسانیت اور دعوت وارشاد میں مصروف ہوئے۔ آپ کی شان وشوکت ولایت اور مقام ومرتبہ سے متاثر ہوکر خلق خدا ایک بڑی تعداد میں دامن رشد وہدایت سے وابستہ ہوئی یہاں تک کہا جاتا ہے کہ چار لاکھ مریدین اور ایک ہزار خلفا آپ کی تربیت وصحبت یافتہ تھے۔ (نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۳، مخلصا)

اس کے بعد آپ مع اہل وعیال اور اصحاب حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہیں مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ آپ کا وصال پُر ملال ۱۰۵۳ھ میں ہوا۔ مزار قدس جنت البقیع میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قبر انور کے قریب واقع ہے۔

۸-حضرت شیخ عبدالحکیم سیالکوٹی قدس سرہ

آپ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم وفقیہ، محدث ومفسر، محقق ومدقق اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت بقول بختاور خاں ۹۸۹ھ میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ علوم معقولہ ومنقولہ کی تحصیل سیالکوٹ ہی میں حضرت شیخ کمال الدین کشمیری قدس سرہ سے فرما کر اپنے معاصرین میں ممتاز اور فائق ہوئے۔

جب آپ کے فضل وکمال کا شہرہ بادشاہ وقت شاہجہاں نے سنا تو انہوں نے آپ کو دو مرتبہ چاندی سے وزن کرکے انعام واکرام سے نوازا جس میں ہر مرتبہ چھ ہزار روپے آئے اور یہ آپ کو حاصل ہوئے اور ساتھ ہی انہوں نے (شاہجہاں سیالکوٹ میں سوا لاکھ روپے کی جاگیر بھی آپ کو عطا کی۔ (از حدائق الحنفیہ ص:۴۳۵ ونزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۲۲۹)۔

آپ نے پوری حیات طیبہ کو درس وتدریس اور تصنیف وتحقیق کے لیے وقف کردیا تھا مختلف موضوعات وفنون پر طبع آزمائی کرکے آپ نے قابل قدر اور قیمتی تخلیقات وتحریرات پیش فرمائیں جن میں آپ کی علمی وتحقیقی جولانیت کی جلوہ سامانیاں نظر آرہی ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند کتابیں درج ذیل ہیں۔

حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح عقائد دوانی، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ مطالع، حاشیہ مراح الارواح وغیرہ۔

آپ نے علوم وکمالات باطنی اپنے عہد کے مختلف مشائخ کرام سے حاصل کیے اور پھر

بعد میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کی صحبت وتربیت میں رہ کر بلند مقامات ودرجات پر فائز ہوئے اور خلافت واجازت کی دولتوں سے نوازے گئے۔

حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو ''آفتاب پنجاب'' کے مبارک لقب سے ملقب فرما کر آپ کی علمیت وفضیلت کو اجاگر کیا اور آپ ہی نے حضرت مجدد قدس سرہ کو ''مجدد الف ثانی'' کے خطاب نایاب سے یاد کیا تھا۔ (حدائق الحنفیہ ص:۴۳۵ ملخصا)

۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ میں آپ کا وصال ہوا، مزار انور سیالکوٹ میں زیارت گاہ انام ہے۔

۹۔ حضرت خواجہ محمد ہاشم کشمی قدس سرہ

آپ بدخشاں کے ایک گاؤں کشم میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت کا کام وہیں انجام پایا پھر باطنی کشش آپ کو ہندوستان کے شہر برہان پور کھینچ لائی۔ یہاں حضرت خواجہ میر محمد نعمان کشمی قدس سرہ کی صحبت اختیار کر کے ان سے اخذ طریقت کیا پھر یہاں سے ۱۰۳۱ھ میں سرزمین سرہند تشریف لائے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی خدمت مبارکہ میں پہنچے اور وہاں کافی عرصے تک رہ کر الطاف وعنایات سے نوازے گئے۔ اس کے بعد آپ کو خلافت واجازت بھی عطا ہوئی۔

(تلخیص از جہان امام ربانی اقلیم چہارم ۴۸۱-۴۸۰ ونزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۴۲۶)۔

آپ ایک صاحب تصنیف بزرگ بھی تھے۔ مشائخ نقش بندیہ قدست اسرارہم کے احوال وآثار اور خدمات اور کارناموں پر آپ نے بڑی زبردست اور قیمتی قلمی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ زبدۃ المقامات وغیرہ آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ آپ کا وصال شہر برہان پور میں ہوا۔

(نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۴۳۶)

۱۰۔ حضرت شیخ بدرالدین سرہندی قدس سرہ

آپ ایک بلند پایہ عالم وفاضل اور بڑے زہد وتقویٰ والے تھے۔ آپ کی پیدائش سرہند میں ہوئی۔ علوم وفنون کی تحصیل حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی اور حضرت خواجہ محمد صادق بن شیخ احمد قدس سرہما العزیز سے فرمائی۔ بیعت وارادت بھی حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی قدس سرہ ہی سے حاصل ہے اور اس کے ساتھ خلافت واجازت کی نعمتوں سے بھی مشرف ہیں۔ تصنیف وتالیف کے میدان میں آپ کا گراں قدر کام ہے۔ چند قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

حضرات القدس، کرامات اولیا، مجمع الاولیا، سنوات الاتقیا فی وفیات المشائخ وغیرہ (ماخوذ وملخص نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۱۰۱)

۱۱۔ حضرت شیخ کریم الدین باباحسن ابدالی قدس سرہ

آپ صاحب تصرف وخوارق اور بلند احوال وجذبات والے تھے۔ ایک عمدہ شاعر تھے

کریمی تخلص اختیار فرماتے تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت ''حسن ابدال'' نامی ایک مقام میں ہوئی جو کابل اور لاہور کے درمیان ایک شہر ہے۔ (نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۳۴۱)۔

آپ عالم جوانی میں لاہور تشریف لائے اور علوم ظاہری کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ سرہند آئے اور حضرت مجدد قدس سرہ کی خدمت عالیہ میں باریاب ہوئے۔ انہوں نے آپ کو کمال محبت اور غایت شفقت کے ساتھ ذکر ومراقبہ کی تعلیم سے روشناس کرایا۔ آپ وہاں مدتوں تک زیر تربیت رہے یہاں تک کہ حضرت مجدد قدس سرہ کی صحبت بابرکت اور نظر کیمیا اثر سے آپ سے بلندیاں اور ترقیاں ظاہر ہونے لگیں تو انہوں نے آپ کو مطلق خلافت بھی عطا فرمائی اور اس کے بعد آپ خدمت انسانیت اور تعلیم طریقت ومعرفت میں منہمک ہو گئے۔ کثیر تعداد میں لوگ آپ کے حق پرست ہاتھ پر تائب ہو کر داخل سلسلۂ نقش بندیہ ہوئے اور گوہر مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔

(ملخص از جہان امام ربانی اقلیم چہارم ص:۵۰۵ ونزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۳۴۱)

۱۲۔ حضرت شیخ احمد دیبنی قدس سرہ

آپ طریقت ومعرفت کے جامع اور علم وعمل کے ایک عظیم پیکر تھے۔ آپ کی ولادت دیبن (دیوبند) سہارن پور میں ہوئی۔ تعلیم وتربیت حضرت شیخ احمد فاروقی ودیگر علمائے کرام سے حاصل کی۔ پھر وہاں سے آپ برہان پور آ کر حضرت شیخ محمد بن فضل اللہ قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور ان کی خدمت میں ایک طویل عمر گزار کر خلافت سے سعادت مند ہوئے اور اپنے شہر لوٹ آئے۔

اس کے بعد جب آپ آگرہ پہنچے تو اس وقت وہیں حضرت مجدد قدس سرہ بھی جلوہ فرما تھے۔ ان کی روحانی کشش نے آپ کو اپنی طرف مائل کیا اور آپ چند دن انہیں کی صحبت اقدس میں رہ کر طریقۂ عالیہ نقش بندیہ اختیار کیا۔ پھر اس کے بعد آپ حضرت شیخ نعمان بن شمس الدین برہان پوری کی صحبت وتربیت میں رہ کر سرہند آئے تو حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو خلافت عنایت کر کے آگرہ میں قیام کی اجازت دی۔ یہاں آپ سے کثیر لوگ فیض یاب ہوئے۔ پھر یہاں سے آپ بنگال گئے جہاں آپ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر ج:۵، ص:۷۹ و جہان امام ربانی اقلیم چہارم، ص:۵۰۳)

۱۳۔ حضرت شیخ عبدالہادی بدایونی قدس سرہ

آپ بدایوں کے تھے۔ سلوک وتصوف کی تعلیم حضرت شیخ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت مبارکہ میں رہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تربیت باطنی کے حصول کے لیے حضرت مجدد قدس

سرہ کی بارگاہ مقدسہ میں آئے اور ان کی صحبت وخدمت میں رہ کر خلافت سے سرفراز کیے گئے اور
پھر بحکم مرشد کامل آپ اپنے وطن کی طرف رخصت ہوئے-
تاریخ وصال ۹ رشعبان المعظم ۱۰۴۱ھ ہے اور مزار مبارک خرم شاں کے تکیہ میں ہے-
(جہان امام ربانی، اقلیم چہارم، ص: ۵۰۸)

۱۴- حضرت شیخ احمد برکی قدس سرہ

آپ برک کے رہنے والے تھے اور وہاں کے عظیم علما میں سے شمار ہوتے تھے- جب
آپ نے حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے فضل وکمال کا شہرہ سنا تو ادب واخلاص کے ساتھ ان کی
خدمت میں حاضر ہوئے - ایک عرصے تک وہاں رہ کر توجہات وعنایات سے سرفراز ہوئے اور
پروانۂ اجازت وخلافت حاصل کر کے اپنے وطن تشریف لائے اور شیخ کے ارشاد کے مطابق کار
اصلاح وتزکیہ میں مشغول ہوئے -۱۰۲۶ھ میں آپ کا وصال ہوا-
(ملخص از جہان امام ربانی، اقلیم چہارم، ص: ۴۹۳، ۹۴)

۱۵- حضرت شیخ بدیع الدین سہارن پوری قدس سرہ

آپ کی ولادت سہارن پور میں ہوئی- والد ماجد کا نام حضرت شیخ رفیع الدین بن عبد
الستار انصاری تھا- علوم وفنون اپنے اور دوسرے شہر کے علما وفضلا سے حاصل کیے اور پھر بعد میں
حضرت مجدد قدس سرہ کے پاس بھی کتب درسیہ مثلاً توضیح وتلویح وغیرہ کی تعلیم لی اور انہیں کے دست
حق پرست پر بیعت سے شرف یاب ہوئے اور شیخ ومرشد کی توجہ خاص سے اپنے باطن کو روشن ومنور
کیا اور جب ان کے پاس ایک لمبی مدت تک صحبت وتربیت میں رہ کر بہت سے کمالات وبرکات
سے مالا مال ہوئے تو حضرت شیخ مجدد قدس سرہ نے آپ کو تعلیم طریقت وارشاد کی اجازت عنایت
فرمائی- اس کے بعد آپ اپنے وطن مالوف سہارن پور تشریف لائے اور یہیں طالبین معرفت و
حقیقت کی اصلاح وتربیت میں مصروف ہو گئے- آپ کا وصال ۱۰۴۲ھ میں ہوا-
(ملخص نزہۃ الخواطر: ۱۰۲/۵، وجہان امام ربانی اقلیم چہارم)

۱۶- حضرت شیخ نور محمد پٹنی قدس سرہ

آپ بڑے معروف عالم وفقیہ اور صاحب فضل وکمال تھے- آپ نے علوم رسمی وظاہری
اپنے عہد کے علما وفضلا سے مکمل کرنے کے بعد سلوک وتصوف اور علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور
ہندوستان کے بہت سے درویشوں کے پاس حاضری دی لیکن آپ کو کہیں بھی تسکین روح حاصل نہ
ہوئی- آخر کار امام معرفت وحقیقت حضرت شیخ مجدد قدس سرہ کے پاس آئے- صحبت وتربیت میں
رہے اور بیعت وارشاد سے شرف یاب ہوئے- اس کے بعد ایک مدت تک اپنے شیخ کامل کی تربیت

میں رہے- مرشد گرامی نے مراتب وکمالات کی بلندی دیکھ کر اجازت وخلافت عنایت فرمائی اور دین
ومذہب کی تبلیغ وتوسیع کے لیے آپ کو شہر پٹنہ روانہ فرمایا- آپ نے وہاں پہنچ کر مستقل سکونت اختیار
کی اور دریائے گنگا کے کنارے ایک جھونپڑی قائم کر کے ایک مسجد کی تعمیر فرمائی، جس کو آپ نے
دعوت وارشاد کا ایک اہم مرکز بنایا اور یہیں سے سالکین وطالبین کی ہدایت وتربیت فرماتے رہے-
(ملخصاً نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۴۶۳ وجہان امام ربانی، اقلیم چہارم، ص:
۴۸۷، ۸۸)

۱۷- حضرت شیخ عبد الحی حنفی حصاری قدس سرہ

آپ ایک عالم کبیر اور صاحب مقام صوفی تھے- زہد وتقویٰ اور شریعت پر استقامت کے
معاملے میں اپنے زمانے میں فائق تھے- آپ حصار شادمان، جو اصفہان کے مضافات میں سے
ہے، کے باشندے تھے- وہاں سے ہندوستان تشریف لائے اور حضرت مجدد قدس سرہ کے خدمت
عالیہ میں حاضر ہو کر ان کے دست حق پرست پر بیعت کی- ایک طویل مدت تک خدمت میں رہ کر
دریائے فیوض سے اپنا دامن مراد بھر لیا اور وہاں سے مرشد گرامی کی توجہ سے اہم مقامات وترقیات
سے ہم کنار ہوئے-

اس کے بعد حضرت شیخ قدس سرہ نے آپ کو پروانۂ خلافت اور تعلیم طریقت کی اجازت
دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا جہاں پہلے ہی سے آپ کے ایک برادر طریقت اور حضرت شیخ نور محمد پٹنی
قدس سرہ رشد وہدایت اور دعوت وتبلیغ کی خدمت انجام دے رہے تھے- اب آپ کے وجود مسعود
سے شہر پٹنہ قران السعدین کی مانند ہو گیا- چنانچہ حضرت مجدد قدس سرہ ایک مخلص کو تحریر کرتے
ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"مولانا عبد الحی اور شیخ نور محمد کے شہر پٹنہ میں رہنے کی وجہ سے یہ شہر قران السعدین کی
مانند ہے-" (ص: ۴۹۷، اقلیم چہارم) آپ کا وصال ۱۰۷۰ھ میں ہوا-

مذکورہ بالا تحریر حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے چند معروف وممتاز خلفا کا اجمالی تعارف
ہے- ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے اصحاب اجازت وخلافت ہیں لیکن یہاں ان کے تفصیلی حالات
وواقعات سے قلت وقت اور خوف طوالت کی وجہ سے گریز کیا گیا ہے تاہم جن خلفا کے اسمائے مبارکہ
دوران مطالعہ دریافت ہوئے ہیں، وہ درج ذیل ہیں-

(۱) خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ کلاں (۲) خواجہ عبد اللہ عرف خواجہ خورد (۳) خواجہ محمد صادق
کابلی (۴) شیخ مزمل (۵) شیخ یوسف سمرقندی (۶) شیخ سلیم بنوری (۷) مولانا امان اللہ فقیہ (۸)
شیخ عبد الرحیم برکی (۹) سید باقر سارنگ پوری (۱۰) خواجہ محمد صدیق کشمی (۱۱) شیخ عبد الکریم (۱۲)

حافظ محمود لاہوری (۱۳) مولانا عبدالغفور سمرقندی (۱۴) خواجہ محمد اشرف کابلی (۱۵) حافظ محمود گجراتی (۱۶) سید محبّ اللہ مانک پوری (۱۷) شیخ عثمان یمنی (۱۸) شیخ محمد بہاری (۱۹) شیخ یار محمد قدیم طالقانی (۲۰) شیخ عبدالحی شادمانی (۳۱) مولانا عبدالواحد لاہوری (۲۲) شیخ سلیم گجراتی (۲۳) شیخ داؤد سالکی (۲۴) شیخ محمد حرمی (۲۵) مولانا حاجی محمد حرمی (۲۶) مولانا فرخ حسین ہروی (۲۶) شیخ یوسف برکی (۲۷) حاجی خضر خاں افغانی (۲۸) شیخ حسن برکی (۲۹) شیخ عبد العزیز نحوی حنبلی (۳) شیخ علی مالکی (۳۱) مولانا حمید احمدی (۳۲) مولانا عبدالمؤمن لاہوری (۳۳) مولانا غازی نو گجراتی (۳۴) صوفی قربان قدیم (۳۵) صوفی قربان جدید (۳۶) شیخ زین العابدین تبریزی ثم المکی الشافعی (۳۷) مولانا ہاشم خادم (۳۸) حاجی حسین (۳۹) شیخ یوسف برکی (۴۰) مولانا محمد صالح کولابی (۴۱) شیخ طاہر بدخشی (۴۲) شیخ حامد بہاری (۴۳) مولانا قاسم علی (۴۴) سلیم خان لشکری (۴۵) سید علی بن عبدالقادر طبری (۴۶) شیخ احمد حنفی استنبولی (۴۷) مولانا امان اللہ لاہوری (۴۸) مولانا یار محمد جدید بخشی طالقانی (۴۹) شیخ عبدالعزیز نجوی مغربی مالکی (۵۰) شیخ احمد برکی وغیرہم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم۔

بہرحال حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفا نے اپنی کوششوں سے اسلام کے زریں پیغام اور احکامات کی اشاعت وتوسیع میں حصہ لے کر قابل قدر اور لائق فخر کارنامہ انجام دیا ہے اور پورے عالم اسلام کو طاعت الٰہی، محبت رسول، آداب شیخ، حسن خلق، خدمت انسانیت اور طلب معرفت کا لائق تقلید درس دیا ہے۔ ان کی انہیں عمدہ تعلیمات اور بے لوث خدمات کی وجہ سے آج ان کی علمیت وشخصیت، ولایت وعظمت، فکر وتدبر اور صلاحیت وبصیرت کا خوب شہرہ وتذکرہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے نیک نام کی زندگی کے نقوش خدمات سے یہ حقیقت واضح طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ ان کے فکر وشعور میں بلندی، افعال وکردار کی اصلاح، خدمت دین کا جذبہ غرض کہ علمی وعملی اور روحانی زندگیوں میں انقلاب کا سبب ان کے مرشد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ہی جامع کمالات ذات ہے جن کی تعلیم وتربیت سے شرف یاب ہوکر یہ حضرات دنیا کی عمدہ نعمتوں اور آخرت کی سرمدی سعادتوں سے بہرہ مند ہوئے۔ آج حالات کا شدید تقاضا ہے کہ ہم مادیت ونفسانیت اور دنیوی لذات وخواہشات سے باہر آئیں ورنہ نفس پرستی کے جنون میں مبتلا ہوکر سعادت دارین سے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑ سکتا ہے۔

○○○

پیمانہ

شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شرح حدیث

تالیف: پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
ناشر: حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت (مظفر نگر، یوپی)
صفحات: ۲۲۹، قیمت: ۱۰۰ روپئے، سال اشاعت: ۲۰۰۸ء

زیر نظر کتاب معروف اسکالر پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی تالیف ہے، جن کی علمی دنیا میں اپنی شناخت ہے، اسلامیات اور بالخصوص ولی اللّٰہی افکار ومسائل ان کے مطالعہ وتحقیق کے موضوع ہیں، یہ کتاب اس پہلو سے اہم ہے کہ اس میں شاہ صاحب کے صوفیانہ افکار بھی ہیں اور محدثانہ عظمت بھی اور اس طرح یہ کتاب اہل تصوف اور اہل حدیث دونوں کی نہ صرف دل چسپی کی چیز ہے بلکہ دونوں گروہ کو شاہ صاحب کی شخصیت پر جمع بھی کرتی ہے، یہ کتاب افکار شاہ کی اشاعت بھی ہے اور خدمت حدیث وتصوف بھی۔

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اہل تصوف واہل حدیث اور محبان شاہ ولی اللہ سب کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ایسے صوفی تھے جن کا تصوف حدیث سے ثابت ہے اور ایسے محدث تھے جن کی حدیث دانی، رموز تصوف کی تہیں کھولتی تھی، صدیقی صاحب نے بڑی محنت وجان فشانی سے حضرت شاہ کی کتابوں اور مکتوبات میں بکھری احادیث کی صوفیانہ تشریحات کو جمع کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر احادیث کی صوفیانہ تشریحات کو جمع کی ہیں، اگر مزید کوشش کی جائے تو اس جہت سے ابھی مزید کام ہوسکتا ہے۔

جن احادیث کی صوفیانہ تشریحات جمع کی گئی ہیں ان میں حدیث ''کنت کنزاً مخفیاً ، حدیث تخلیق عقل، حدیث الارواح جنود مجندة، ماراٴہ المومن حسنا فھو عند اللہ حسن، شامل ہیں۔ یہ تمام شروحات محدث ولی اللہ کو تسلیم کرنے اور صوفی ولی اللہ کا انکار کرنے والوں کے لیے دعوت فکر ہیں۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت شاہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے حضرت حسن بصری کی سماعت کا محدثانہ اصول کے مطابق انکار کرتے ہیں جب کہ صوفیانہ اجماع کے مطابق سماعت کے قائل ہیں اور اس اجماع کو وہ باوزن تسلیم کرتے ہیں، عصر حاضر بلاشبہ اس طرز فکر کا داعی ہے۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اپنی اس علمی کاوش کے لیے بے پناہ قابل مبارک باد ہیں۔

○○○

امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا)

تصنیف: فصیح اکمل

ناشر: ۱۴۱- پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

صفحات: ۹۴، قیمت: ۱۰۰ روپئے، سال اشاعت: ۲۰۱۱ء

سید فصیح اکمل قادری اردو نعت وغزل کے ایک معتبر شاعر ہیں، آپ شاہ جہانپور کے حضرت مولانا سید انوار حسین قادری کے صاحب زادے ہیں جو اہل سنت کے ایک بڑے عالم اور خطیب تھے۔ بیک وقت علما ومشائخ، ادبا وشعرا سے آپ کے روابط رہے ہیں، بزرگوں سے عقیدت آپ کے رگ وپے میں ہے، شعر وشاعری اور ادب وزبان دانی بھی آپ کی وراثت ہے۔ پیش نظر کتاب ''امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا) آپ کی خوش عقیدگی، قادر الکلامی، زبان دانی اور فصاحت وبلاغت کی ایک مثال ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ فصیح اکمل صاحب نے جن تاریخی حوالوں سے امیر خسرو کے اوراق حیات جمع کیے ہیں، ان پر انہیں خود اعتماد نہیں ہے۔ انہیں اعتراف ہے کہ:

''اس وقت تک پروفیسر ممتاز حسین کی کتاب ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری'' شائع نہیں ہوئی تھی، اس کتاب نے بڑے بڑے چغادری محققوں کا پول کھول دیا ہے، افسوس ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا وقت کم وبیش وہی ہے جو میرے اوپیرا کا، اس لیے جہاں پوری دنیا نے اب تک بہت سے حقائق سے چشم پوشی کی ہے، اس اوپیرا میں اور سہی۔''

اوپیرا ادب کی ایک صنف ہے، اس کا تعلق بیک وقت ادب، شعر اور اسٹیج سے ہے، امیر خسرو پر یہ پہلا میوزیکل اوپیرا ہے جسے شاعر نے بڑے خلوص، محبت اور دل جمعی سے لکھا ہے، لیکن افسوس کہ یہ اب تک اسٹیج نہیں ہوسکا۔ پوری کتاب کو میں ایک یا دو نشست میں پڑھ گیا اور محبت، عقیدت، شعریت اور تصوف کا حظ اٹھایا۔

کاش یہ اوپیرا اسٹیج ہوجائے تو پھر اس کے نظارے کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔ شعر وادب اور تاریخ وفن سے وابستہ افراد کو اس سمت توجہ کرنی چاہیے۔ اوپیرا کی زبان وبیان، اسلوب وآہنگ اور ترتیب وتالیف بے حد خوش گوار اور دل چسپ ہے۔ بعض اشعار مجھے بے حد پسند آئے، جن میں شعریت بھی ہے اور فلسفۂ حیات بھی۔ فصیح اکمل صاحب کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے میوزیکل اوپیرا کے فارم میں حیات خسرو کے چند خوب صورت گوشوں سے ہمیں متعارف کرایا۔

○○○

انوار مخدوم (سہ ماہی مجلّہ)

ایڈیٹر: ڈاکٹر کفیل احمد

ناشر: مکتبہ شرف، خانقاہ معظم حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد منیری، بہار شریف

شمارہ خصوصی، صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۱۰۰ روپئے

حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری قدس سرہ (۶۶۱/۱۲۶۳-۸۲ے/۱۳۸۱) کی ذات گرامی کا شمار ہندوستان کے ان مشائخ صوفیہ میں ہوتا ہے جو باطنی احوال ومقامات میں شرف ومنزلت رکھنے کے ساتھ ساتھ علم ظاہری میں بھی تبحر رکھتے تھے- ان کے معاصرین سے لے کر آج تک تمام صوفیہ نے ان کی عظمتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے بہت استفادہ کیا ہے- خصوصاً ان کے مکتوبات کو تصوف کی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے- نویں صدی ہجری کی جامع شریعت وطریقت شخصیت حضرت مخدوم شیخ سعد خیر آبادی (۹۲۲ء) قدس سرہ نے بھی رسالہ مکیہ کی شرح مجمع السلوک میں آپ کے اور آپ کے رسائل کے بہت حوالے دیے ہیں- ان ساری عظمتوں کے باوجود حضرت مخدوم جہاں کی شخصیت پر علمی انداز میں ابھی تک کوئی خاص کام نہیں ہوسکا ہے- اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے آپ کی شخصیت پر تین روزہ سمینار ۲۲ تا ۲۴ر نومبر ۲۰۱۱ء منعقد ہوا اور اسی موقع پر انوار مخدوم سہ ماہی کے خصوصی شمارے کی اشاعت ہوئی-

یہ خصوصی شمارہ چہار لسانی ہے- رسالے کا بڑا حصہ اردو مقالوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۲۱ر ہے جب کہ عربی اور فارسی میں ایک ایک اور انگلش میں تین مقالے ہیں- اس کے علاوہ سات منقبتیں ہیں اور آغاز میں ایک اداریہ ہے- مقالے سبھی گراں قدر ہیں، خصوصیت کے ساتھ اردو زبان میں جو مقالات ہیں وہ حضرت مخدوم جہاں کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں- ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مخدوم کو علوم حدیث، علوم تفسیر میں بالخصوص کیسی گہرائی حاصل تھی اور اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو صوفیہ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ تحصیل علم کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اسے حجاب راہ قرار دیتے ہیں- البتہ حضرت مخدوم اور عشق الٰہی کے عنوان سے تحریر کردہ مقالے میں صفحہ ۲۲ سے ۳۲ تک اور صفحہ ۳۳ سے ۴۵ مکرر اور خلط ملط شائع ہوگیا ہے- اس کی وجہ سے مقالہ عمدہ ہونے کے باوجود بے وقعت ہوکر رہ گیا ہے- فارسی مقالے میں پروف کی متعدد غلطیاں ہیں، مجموعی طور پر یہ شمارہ اچھا ہے لیکن ادارتی بورڈ نے اگر اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھائی ہوتی تو مخدوم جہاں کی شخصیت پر مشتمل یہ شمارہ اور نکھر کر سامنے آتا-

○○○

جانشین خواجہ غریب نواز

مصنف: پروفیسر غلام یحییٰ انجم

ناشر: کتب خانہ امجدیہ، مٹیا محل، جامع مسجد، نئی دہلی-٦

صفحات: ١٧٦، قیمت: ٥٠ روپئے، سال اشاعت: ٢٠١٠ء

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں کی برکت سے آج ہندوستان فردوس اسلامی بنا ہوا ہے- آپ کے بعد آپ کے خلفا نے اس ملک پر اپنی نوازشات کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصیت کے ساتھ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تک تو اس ملک کو چشتیت کے ابر نیساں نے اس قدر فیض یاب کیا کہ کشور ہند لہلہا اٹھا- انہیں عظیم شخصیات میں ایک نام جانشین خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (٥٦٨-٦٣٤) کا بھی ہے- آپ کے احوال وکوائف پر محققانہ انداز میں تقریباً نا کے برابر کام ہوا ہے، جب کہ ایسی شخصیات کی سیرت وسوانح کو عمدہ انداز میں پیش کرنا جہاں ایک بڑا علمی کام ہے وہیں نسل نو کے لیے رہنمائی کا بھی ذریعہ ہے-

باعث مسرت ہے کہ خواجہ موصوف کی سوانح پر پروفیسر غلام یحیٰ انجم صاحب نے مختلف قدیم کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمدہ اور سادہ انداز میں اپنے بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کر دیا ہے- حضرت خواجہ غریب نواز کے اس عظیم جانشین سے متعلق مختلف معلومات کا یہ اچھا ذخیرہ ہے جو قاری کو صرف ایک کتاب کے مطالعے سے حاصل ہو جاتا ہے- زبان آسان اور علمی ہے- اہل علم اور عام قارئین دونوں کے لیے یکساں طور پر کارآمد ہے- یوں تو پوری کتاب ہی لائق مطالعہ ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ریاضات ومجاہدات کے ضمن میں توکل، توبہ واستغفار اور درود پاک کی کثرت سے متعلق جو آپ کے معمولات کو ذکر کیا گیا ہے وہ سالکین وطالبین کے لیے جہاں توشۂ ہدایت ہے وہیں ان لوگوں کے چہروں پر زناٹے دار طمانچہ بھی جو اس طرح کے مشائخ کی طرف اپنی نسبت تو کرتے ہیں لیکن ان کے معمولات کو اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش نہیں کرتے- یوں ہی ارشادات وتعلیمات والا حصہ بھی مسافران راہ طریقت کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے-

کتاب کی پیش کش بالجملہ اچھی ہے، البتہ ہمارے خیال میں سوانحی کتابوں کی ترتیب وتنظیم اس طرز پر ہو کہ معلومات تو وہی پرانی ہوں لیکن پیش کش میں جدت ہو، معلومات میں اصالت ہو لیکن پیش کش میں عصریت ہو- اس طرح اسلوب موثر ہوگا اور لوگ تصوف کی طرف مائل ہوں گے-

○○○

تذکرۂ صابریہ

مصنف وناشر: شاہ محمد انور علی سہیل فریدی

مطبع: اسلامک ونڈرس بیورو

صفحات: ١٥٢، قیمت: ١٥٠ روپئے، سال اشاعت: ٢٠١١ء

تذکرہ نویسی کی روایت بہت قدیم ہے- اس سے جہاں لوگوں کے احوال صفحات کے سینے میں محفوظ ہو جاتے ہیں وہیں خصوصاً صالحین کے تذکروں سے آنے والی نسلیں روشنی حاصل کرتی ہیں- حضرت سید صابر علی معروف بہ میاں صابر بخش دہلوی تیرہویں صدی ہجری کے چشتی صابری بزرگ ہیں- آپ کا مزار دریا گنج دہلی میں ہے- آپ زنجان کے سادات سے ہیں اور آپ کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی رضا کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے- آپ کے احوال وکوائف، نسبی شجرہ اور سلاسل طریقت کو اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور سلسلۂ طریقت کے مشائخ کے بھی مختصر احوال درج کیے گئے ہیں- آپ کے ہم عصر مشائخ دہلی کے اسما ذکر کر کے ان کے احوال بھی اختصار وایجاز کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں- خلفا کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کے بعد ہونے والے سجادہ نشینان درگاہ کی تفصیل بھی دی گئی ہے- آغاز کتاب میں مظہر علی فریدی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن مصباحی کے کہے ہوئے سال طباعت سے متعلق قطعات تاریخ ہیں، اور خواجہ حسن ثانی نظامی نے تعارفی کلمات لکھے ہیں- پروف کی کچھ فاش غلطیاں ہیں- کتاب کی ترتیب پر از سر نو محنت کر کے اس کو اور بہتر اور مفید بنایا جا سکتا ہے-

بالجملہ سوانحی حیثیت سے کتاب اہم ہے اور خصوصیت کے ساتھ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے احوال سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں دل چسپی کا سامان ہے-

○○○

مکتوبات

مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی (صاحب سجادہ: خانقاہ رشیدیہ، جون پور، یوپی)

خدا کرے آپ بخیر ہوں! میں ادھر کافی دنوں سے علیل چل رہا ہوں- آپ کے سوالات کو موصول ہوئے بہت دن ہوئے، مگر جواب کی طرف توجہ کرنے کا موقع میسر نہیں آیا- اب جب کہ ۱۰/۱۱ اکتوبر کی تاریخ قریب آچکی تو فکر لاحق ہوئی مگر کچھ نہ کچھ عوائق وموانع درپیش رہے- عزیزی مولوی ابرار سلمہ سے میں نے کہا تھا کہ ہوسکے تو آپ ہی میری طرف سے جواب مرتب کردیجیے مگر انھوں نے اپنے طور پر صرف چند سوالات ہی کے جوابات مرتب کیے، باقی میرے حوالے کردیے- بالآخر مجھے ہی مجبور ہونا پڑا- آپ کے سوالات کافی معیاری ہیں اور اس معیار پر میرے جوابات نہیں ہیں مگر مجھ سے جو ہوسکا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے- میں خانقاہ رشیدیہ کا ادنیٰ خادم ضرور ہوں، مگر میں اپنے کو تعارف کے قابل نہیں سمجھتا- عزیزی مولوی ابرار سلمہٗ کے اصرار پھر آپ کی خواہش پر یہ چند حروف حوالۂ قلم کردیے-

شمس الرحمن فاروقی (الہٰ آباد، یوپی)

کتابی سلسلہ ''الاحسان'' شمارہ ۲ ملا، شکریہ! میں نے شمارہ جگہ جگہ سے دیکھا اور اسے بہت دل چسپ پایا- تصوف اور طریقت کے موضوع پر یہ رسالہ خوب ہے- شروع میں کچھ شعری تخلیقات شامل کر کے آپ نے ایک ادبی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے- ڈاکٹر کوثر مظہری کی فارسی غزل موضوع کے لحاظ سے ٹھیک ہے اگرچہ زبان ناپختہ ہے اور موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پا رہی ہے- خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا خط ابن سینا کے نام بہت دل چسپ اور سبق آموز ہے-

مولانا عبدالمبین نعمانی کا مضمون یقیناً اصلاحی ہے- بے شک حسد اور کینہ ہمارے معاشرے کی تباہی کا سامان ہیں- نعمانی صاحب نے اس سلسلے میں کثرت سے احادیث یکجا کردی ہیں لیکن سمجھنے والے اور خود کو راستی پر لگانے والے کے لیے ایک ہی کافی ہے- شہباز احمد (سبھاش چند) کی داستان حیات بہت متاثر کن ہے اور مسرت بخش بھی- سچ ہے، اللہ جسے چاہے اپنی طرف بلالے؛ اور یہ بھی سچ ہے کہ حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ مدظلہٗ جیسے صاحبان تصرف اب بھی موجود ہیں- تحقیق وتنقید اور حاصل مطالعہ کے ذیل میں اکثر مضامین بہت معیاری ہیں- خسرو کی شخصیت اور صوفیانہ شاعری پر اچھی معلومات اس رسالے میں فراہم کی گئی ہے، لیکن ولی پر مضمون تشنۂ توضیح معلوم ہوتا ہے-

تصوف کے موضوع پر یوں تو خانقاہوں سے مضامین اکثر منظر عام پر آتے رہے ہیں لیکن اس موضوع پر یہ رسالہ بہت ہی جامع ہے- اس بہترین رسالے کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں- میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کے ہمت وحوصلے کو تقویت دے-

میں نے حضرت شیخ کی مثنوی دیکھی- جگہ جگہ ان فارسی شعرا کی یاد آئی جو مغلوب الحال
اور مغلوب المعرفت رہا کرتے تھے- ان کے اشعار میں حلاوت و پاکیزگی بلا کی ہے- زبان بھی
مجموعی حیثیت سے بہت پاکیزہ اور بامزہ ہے، لیکن آخر میں بطور شرح جو مضامین بیان کیے گئے ہیں
وہ نہ ہوتے تو بہتر تھا؛ کیوں کہ جو لوگ قائل ہیں وہ قائل رہیں گے اور جو قائل نہیں ہیں وہ فضول
مذہبی بحث میں مبتلا ہو جائیں گے- میرا خیال ہے کہ پروفیسر مسعود علوی اور ذیشان صاحب کی
انتہائی عالمانہ تحریروں کو الگ سے شائع کیا جائے اور مثنوی اپنی جگہ پر برقرار رہے- مجھے یقین ہے
کہ یہ دونوں کتابیں بہت کامیاب ہوں گی-

آخر میں یہ کہنا ہے کہ میرے ذہن میں کچھ اڑتی اڑتی سی خبر حضرت شیخ کے بارے میں
تھی، لیکن میں ان کے عارفانہ کمالات سے بالکل بے خبر تھا- خدا کا شکر ہے کہ اب میں ان سے
کچھ واقف تو ہو گیا- ان شاء اللہ کبھی زیارت کا شرف بھی حاصل کروں گا- ان کی خدمت میں سلام
شوق عرض کیجیے-

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (سابق صدر: ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

بیکراں اور ہمہ گیر رحمت الٰہی سے امید واثق ہے کہ آپ سب بہمہ وجوہ بخیر ہوں گے اور
ساتھ ہی دعا ہے کہ ہمیشہ بخیر رہیں- حسب الحکم حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رحمۃ اللہ
علیہ کے افکار کے تقابلی مطالعہ پر مقالہ حاضر خدمت ہے، باقی ''تو دانی حساب کم و بیش را''-

تصوف پر خاص تحقیقی اور علمی مجلّہ ''الاحسان'' جاری کر کے آپ سب نے ایک بڑا کام کیا،
کہ وہ ایک خاص موضوع ہے- اس سے بڑا کام آپ نے یہ کیا ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے اہل قلم
کو دعوت ہی نہیں دی، ان کی نگارشات کو شائع بھی کیا- تصوف و طریقت کے باب میں افراط
وتفریط کا رویہ نیا نہیں ہے اور نہ اچھوتا- دوسرے اسلامی علوم فنون کے معاملے میں بھی کج روی ملتی
ہے- طریقت اسی وقت مسئلہ بنتی ہے جب اسے شریعت کا بدل قرار دے دیا جاتا ہے یا اسے
شریعت کا یا دین کا مغز بتایا جاتا ہے- شریعت و طریقت کا اصل ارتباط یہ ہے کہ شریعت کل ہے اور
طریقت اس کا اک جز اور وہ بھی شرعی قواعد اور دینی قوانین سے مشروط- حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ
کے الفاظ میں شریعت کے باب میں دنیا میں بھی مواخذہ ہوگا اور آخرت میں بھی- تمام اکابر صوفیۂ
کرام کا اس پر اتفاق ہے-

الاحسان کا دوسرا شمارہ نقش اول سے بھی بہتر ہے، اگر چہ اس میں کتابت و پروف ریڈنگ
کی غلطیاں زیادہ ہیں- مقالات اور انتخابات اور ان کے عناوین اور سرخیاں بھی بہت معیاری،
جاذب اور دل کش ہیں کہ بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی- حضرت ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے

اپنے کلام عالی مقام کے علاوہ ان پر بعض نگارشات عمدہ ہیں لیکن ابھی ان پر زیادہ وقیع کام کی
ضرورت ہے- فقیہ، متکلم اور صوفی کے درجات میں حضرت شیخ صفوی نے بڑے پتے کی بات کہی
ہے کہ معصوم تو صرف انبیا علیہم السلام ہیں اور باقی سب قابل نقد- حسد و کینہ کی تباہ کاریاں ہی تو اصلاً
اس امت مرحومہ کی بربادی کی ذمہ دار ہیں اور حضرات صوفیہ نے اسلامی مفکرین کی طرح ان کا
علاج کیا ہے- مولانا عبد المبین نعمانی نے دونوں نقاط نظر کا خوب احاطہ کیا ہے- جناب شہباز احمد
(سہاش چند سابق) کا معمول چشتی مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ ہے اور اہل طریقت کے لیے
بھی ایک سبق، کہ اصل اسلام سے وابستگی ہے، جسے انھوں نے خدا کی طرف واپسی سے تعبیر کیا ہے-

مختصر اور تنقیدی مضامین میں مولانا یٰسین اختر مصباحی، پروفیسر اختر الواسع اور مولانا
مبارک حسین مصباحی وغیرہ کے مضامین تاثراتی زیادہ ہیں- تحقیقی مضامین میں شیخ ابن تیمیہ کا نقد
تصوف، مسائل تصوف احادیث کی روشنی میں اور کشف المحجوب کا مطالعہ خاصے دلچسپ ہیں- ابن
تیمیہ پر ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری کا مضمون بہت قابل قدر ہے، اسے بھی شائع کرنا چاہیے تا کہ
دونوں اطراف تحسین و تنقید سامنے آجائیں- حاصل مطالعہ کے تحت مضامین اچھے ہیں، لیکن بعض
میں افراط و تفریط خاصا ہے- پروفیسر مسعود انور علوی سے ذاتی واقفیت ہے اور ان سے محبت بھی،
لیکن ان کے صوفی افکار میں غلو اور بسا اوقات کرامات و خوارق وغیرہ پر حد سے زیادہ زور شیفتگی کا
نتیجہ لگتا ہے- شریعت سے وابستگی اور اخلاص کے وعدے تو سب کو ہیں لیکن اس پر عمل اصل کسوٹی
ہے- خانقاہ کاظمیہ قلندریہ پر مضمون تحقیقی ہے- مضمون نگار اور مضمون دونوں کا حوالہ دیے بغیر عرض
ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا نظریہ فاسد اور گم راہ کن نہیں بلکہ غیر
اسلامی ہے- بلاشبہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے غیبی امور سے آگاہی بخشی تھی اور نبوت محمدی اس
کی ہی ایک عمدہ مثال ہے، تاہم قرآن کریم کے اعلان کے مطابق آپ عالم الغیب نہ تھے- عالم
الغیب والشہادۃ صرف اللہ تعالیٰ ہے- اس لیے صاحب موصوف کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ ''ما کان
و ما یکون'' کے عالم الغیب تھے، سراسر غلط ہے- ایسی ہی غلو آمیز باتوں نے تصوف و طریقت
کے بارے میں اہل ظاہر کو سخت باتیں کہنے کا موقع دیا ہے-

کتابوں پر تبصرے بھی عمدہ ہیں- ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری کی کتاب ''مجدد دین امت اور
تصوف'' پر آپ کا تبصرہ متوازن ہے- خاک سار نے بھی اس پر تبصرہ لکھا تھا جو اردو بک ریویو میں
چھپا تھا- جی چاہتا ہے کہ ''حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی صوفیانہ شرح حدیث'' پر آپ ایک تبصرے
چھاپیں اور خاک سار کو احسان مند بنائیں-

مکتوبات میں بھی بعض عمدہ تبصرے آئے ہیں اور بعض صرف تحسینی ہیں- مولانا عبد المبین

نعمانی کا مکتوب دل چسپ بھی ہے اور اہم بھی- فروغ احمد اعظمی مصباحی کا مکتوب بھی خاصا اہم ہے اور متوازن بھی- شمیم طارق صاحب ادیب وصحافی کے ساتھ عمدہ شخص ہیں اور صاحب نظر بھی- ان کی بعض آرا بہت چشم کشا ہیں- جناب صادق رضا مصباحی سے شکوہ نہیں کہ وہ مجھے تصوف کے مخالفین میں سمجھتے ہیں- میرا مسئلہ یہ ہے کہ اہل ظاہر اور سخت قسم کے اصلاحی علما مجھے تصوف زدہ بتاتے ہیں اور اہل تصوف مخالف تصوف وطریقت- دراصل بقول مشتاق یوسفی ''بیچ سڑک پر چلنے پر راہی دونوں طرف کی زد میں آجاتا ہے-'' میں اس اعتراف واعلان میں باک نہیں سمجھتا کہ شریعت پر خالص عمل ہی طریقت تک لے جاتا ہے، لہٰذا حضرات صوفیہ نے اسی کی ترکیب سکھائی ہے- البتہ جس نے اور جب شریعت ودین کے جادہ سے ذرا بھی انحراف کیا اس نے اسی قدر طریقت کا بیڑا غرق کیا- اسلامی تصوف کی اصطلاح پر کچھ لوگ ہنستے ہیں اور رواجی تصوف اس سے مراد لیتے ہیں- میں اسلامی تصوف کا قائل نہیں اس پر عامل بھی ہوں- البتہ کتاب وسنت سے فکری، نظری اور عملی اختلاف سے اتفاق نہیں کرتا خواہ کسی نے کیا ہو- اسلامی تصوف وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے اور جن سے صوفیہ نے بھی اخذ کیا ہے- آپ کے حکم کی بناپر تبصرہ طویل ہوگیا- معذرت کروں طوالت کی یا اظہار مسرت کروں تعمیل ارشاد کی؟ ایک اور مشکل آگئی ہے سامنے-

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی (شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد)

خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں کے علمی ودعوتی سلسلہ کتاب مجلّہ الاحسان کا دوسرا شمارہ پیش نظر ہے- قلب ونظر کی حالت دگر ہے- جیسے صحرا میں بھٹکنے والے کو کوئی شجر سایہ دار مل جائے، جیسے تشنگی سے جاں بلب کو جام لبالب میسر ہوجائے، جیسے ناامیدی کے اندھیرے میں غلطاں وپیچاں کو امید کی کوئی کرن نظر آجائے اور جیسے کسی ڈوبتے ہوئے کو کوئی سہارا مل جائے- مجلّہ صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے ایک علمی وتحقیقی مجلّے کے شایان شان ہے-

ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنی گفتگو کا آغاز خانقاہ عارفیہ کے مسند نشین کے تئیں اپنے اظہار تشکر وامتنان سے نہ کریں، جنھوں نے ہوا کے رخ پر عزیمت کا یہ چراغ جلانے کی کوشش کی ہے جب کہ ہر چہار سو رخصت کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں- ہمارا یہ یقین ہے کہ آنے والا وقت تصوف کا ہے- شدت پسندی کی ڈوبتی ہوئی نبض سست سے سست تر ہوتی جارہی ہے- دہشت گردی وشدت پسندی سے بیزار مسلمانوں کی نئی نسل ایک متبادل کی تلاش میں ہے اور وہ متبادل تصوف کے سوا کچھ نہیں ہے، جس پر بدقسمتی سے تحریفات وتوہمات کا غبار چھایا ہوا ہے، جس نے روحانیت کی اس دولت کو عامۃ الناس کی نظروں سے محجوب کر رکھا ہے- آج کشف محجوب کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی تصوف کی طرف لوگوں کی واپسی ہوسکے- آج تصوف کے تزکیے کی

ضرورت ہے تاکہ مادہ پرستی کی آلودگیوں میں گرفتار قلوب کا تزکیہ کیا جاسکے اور تصوف کے تزکیے کے اس عمل سے جتنی جلدی عہدہ برآ ہوا جاسکے اتنا ہی اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر ہے- آج ہماری دنیا کے دو سب سے زیادہ مہلک امراض مادہ پرستی اور شدت پسندی ہیں اور تصوف ان دونوں امراض کا ماہر ہے، بلکہ تیسرے بڑے گروہ یعنی نفس پرستوں اور بے عملوں کے لیے بھی یہ ایک مفید دوا ہے- مشرق ومغرب میں تصوف کے واپسی کی آہٹ محسوس کی جارہی ہے- شاید کاتب تقدیر نے ہندوستان جنت نشان میں تصوف کے عہد نو کے لیے تمہید اور راہ ہمواری کا اعزاز خانقاہ عارفیہ کے لیے مختص کردیا ہے- ''**ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**'' اس سبقت و مبادرت کے لیے میں مجلّہ الاحسان کے مدیر، مرتبین، معاونین اور ان کے مربی وہادی صاحب سجادہ داعی اسلام شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دامت فیوضہ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حضرت والا کی توجیہات وتوجہات کا یہ سلسلہ دراز رہے گا-

الاحسان کے مرتبین ومعاونین سے مجھے کسی قدر شناسائی حاصل ہے- یہ تمام افراد نوجوانوں کے جوش وخروش اور بوڑھوں کے حکمت وتدبر سے آراستہ ہیں- ان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اصالت اور عصریت دونوں کے جامع ہیں اور دعاۃ و مصلحین کا یہی بہترین رخت سفر ہے- فکر میں اصالت اور پیش کش میں عصریت کامیابی کی ضمانت ہے- فکر کا غیر اصیل ہونا جس قدر نقصان دہ ہے، پیش کش کا غیر عصری ہونا بھی اتنا ہی ضرر رساں ہے- بلاشبہ مجلّہ الاحسان موضوع اور ہدف کی اصالت اور تقدیم وپیش کش کی عصریت کا ایک حسین امتزاج ہے- ان شاء اللہ تعالیٰ ''**إلی التصوف من جدید**'' کی مہم میں یہ مجلّہ ایک سنگ میل ثابت ہوگا-

جس روحانی قیادت اور عملی ادارت کے سائے میں یہ مجلّہ نکل رہا ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ یہ نہ صرف لوگوں کے لئے حقیقی اور عملی تصوف کی بازیافت میں مددگار ہوگا بلکہ بہتوں کے شکوک وشبہات کو دور کرنے میں بھی معاون ہوگا- یہ مجلّہ علوم اور فلسفۂ تصوف کے بجائے تصوف کے اعمال واخلاق پر مرکوز رہے گا- لوگوں کو ہرانے کے بجائے انہیں جیتنے کی سمت پیش قدمی کرے گا اور علوم تزکیہ کے بجائے احوال تزکیہ کو زیادہ اہمیت دے گا؛ کیوں کہ تصوف کا مقصود علم تزکیہ حاصل کرنا نہیں بلکہ حالت تزکیہ حاصل کرنا ہے اور دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، جیسے کہ علم صحت اور حالت صحت میں ہوتا ہے- علم صحت امراض سے محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں ہے بلکہ حالت صحت مطلوب ہوتی ہے- اسی لیے قرآن مجید میں **یعلمھم التزکیۃ** (تزکیہ سکھاتے ہیں) یا **یعطیھم علم التزکیۃ** (علم تزکیہ عطا کرتے ہیں) کے بجائے **یزکیھم** فرمایا گیا یعنی ان کا تزکیہ فرماتے ہیں- صوفی وہ ہے جو حالت تزکیہ رکھے یا اس کے لیے کوشاں ہو- علم تزکیہ رکھنے والا یا حاصل

کرنے والا صوفی نہیں متصوف ہوتا ہے- ایک تیسرا بھی ہوتا ہے جس کے پاس نہ علم تزکیہ ہوتا ہے اور نہ حالت تزکیہ ہوتی ہے، جنھیں مستصوف یا متمصوف کہا جا سکتا ہے- آج درگاہی نظام میں یہی تیسرا عنصر غالب ہے- ان تینوں طبقات کو صوفیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: صوفی صاحب ''وصول'' ہوتا ہے، متصوف صاحب ''اصول'' ہوتا ہے جب کہ مستصوف محض فضول ہوتا ہے-

مجلّے کا سرورق بے حد جاذب نظر اور صوفیانہ ہے جو روایتی اثرات سے پوری طرح پاک وصاف ہے- علمی وتحقیقی مجلّات کا سرورق ایسا ہی ہونا چاہیے- پیشانی پر مرقوم مترجم آیت قرآنی بے حد معنی خیز اور مجلّے کے اہداف ومقاصد سے بے حد ہم آہنگ ہے- تصوف کی ایک عہد ساز شخصیت حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر رحمہ اللہ کے نام اس عدد کا انتساب بھی بے حساب معنویت کا حامل ہے- یہ مجلّے کے ہمہ گیر اور آفاقی اہداف کی بھی نشان دہی کرتا ہے اور عہد سازی کے عزم پر بھی دلالت کرتا ہے-

مجلّے کے مشتملات کا ہمہ جہتی تنوع خواہ مضامین کے اعتبار سے ہو، خواہ مضمون نگاروں کے لحاظ سے ہو یا پھر ذیلی عناوین کی حیثیت سے ہو، بے حد خوب ہے- ذیلی عناوین کا تعین مجلس ادارت کے حسن ذوق اور تعمق نظر کی دلیل ہے- اتنے سارے عناوین کے تحت مقالے لکھوانا اور ان کے لیے مناسب افراد تلاش کرنا اور مضمون لکھنے کے لیے انھیں آمادہ کرنا، یہ سب جوے شیر لانے سے کم نہیں ہے-

بادہ وساغر کا ہر جام طویل مقالوں سے بہتر ہے- احوال میں ابتدائیہ اور واردات دونوں ہی حسب حال ہیں- ابتدائیہ میں مدیر محترم نے شمارے کی پیش کش بے حد سادہ اور پُر وقار انداز میں کی ہے- یہی علمی مجلّات کا حقیقی رنگ وآہنگ ہوتا ہے- واردات میں موجودہ دور کی فکری کشاکش کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور معاصر تصوف کو درپیش مسائل کی بڑی درست نشان دہی کی گئی ہے- انھوں نے اپنی اس حقیقت بیانی کو ''تخیلاتی'' قرار دے کر غالبا صرف اپنی تواضع کا اظہار کیا ہے- صاحب واردات عزیز القدر ذیشان احمد مصباحی کے فکر وقلم سے مستقبل میں کافی امیدیں کی جا سکتی ہیں-

امریکا اور یوروپ سے حذر وتخویف (ڈارنا) دراصل شدت پسندوں کی اعلامی پالیسی کا حصہ ہے- دوسروں سے خوف اور نفرت دلا کر ہی یہ اپنے ہم نواؤں میں اضافہ کرتے ہیں- امریکی خطرات کا مبالغہ آمیز ذکر اور قوم کی ہلاکت وبربادی اور پستی ومہجوری کے لیے ہمیشہ مغرب کو مورد الزام قرار دینا نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ اپنی نا اہلیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف وتدارک سے فرار بھی ہے- شدت پسندوں اور بعض قوم پرستوں کے پروپگنڈے کے زیر اثر ہمارا یہ مزاج بنتا جا رہا ہے کہ ہم اپنے تمام مسائل کے لیے امریکا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور ''ما أصابکم من

مصيبة فبما كسبت أيديكم '' کے قرآنی اصل کو فراموش کر دیتے ہیں- شدت پسند حضرات امریکا اور مغرب کے لیے ایسے ایسے تصرفات کا اثبات کرتے ہیں جو وہ انبیاے کرام اور اولیا کے لیے بھی نہیں مانتے- اس منفی سوچ کا خاتمہ ہونا چاہیے- یہاں کسی کی صفائی مقصود نہیں ہے، بلکہ قرار واقعی صورت حال کو پیش کرنا مطلوب ہے- ہماری توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہو- ہم خود اپنی مظلومیت کے ذمہ دار ہیں اور ہماری شکست خوردگی کی قابلیت ہماری پستی ومہجوری کا اولین سبب ہے اور اسی شکست خوردگی کی قابلیت کا علاج ہماری پہلی ضرورت ہے- جیسا کہ مالک بن نبی نے کہا ہے کہ پہلے استعماریت کی قابلیت کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے پھر کوئی مستعمر اور نو آباد کار پیدا ہوتا ہے- لہٰذا استعمار کے لیے استعماریت کی قابلیت پہلے اور مستعمر بعد میں ذمہ دار ہوتا ہے-

اہل تصوف کو کسی قوم یا جغرافیائی خطے کے تئیں معاندانہ نقطۂ نظر نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ سب کی اصلاح وہدایت ہمارا مقصد ہونا چاہیے- خیال رہے کہ بحیثیت مجموعی امریکا ایک ایسی قوم ہے جس کی دنیا اچھی اور آخرت خراب ہے- شدت پسند یہ چاہتے ہیں کہ آخرت کی طرح ان کی دنیا بھی خراب ہو جائے اور ہمارا مطمح فکر وعمل یہ ہونا چاہیے کہ ان کی دنیا کی طرح ان کی آخرت بھی اچھی ہو جائے- ظاہر ہے کہ امریکا کی آخرت کا اچھا ہونا اس کی دنیا خراب ہونے سے اچھا ہے- اسلام کے لیے بھی اور انسانیت کے لیے بھی- تصوف انسانیت سے نفرت کے بجائے اس کے لیے نفع بخش بننے کی تعلیم دیتا ہے اور اللہ کی زمین پر یہی استقرار واستمرار کا ذریعہ ہے- وأما ما ينفع الناس فيمكث في الارض.

بادۂ کہنہ کے دونوں جام سرور آگیں ہیں- بادہ کی تو خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ جس قدر کہنہ ہوا اتنا ہی سرور بخش ہوتا ہے- ''صوفیہ کے اعتقادی واصولی مسائل'' میں ترجمہ کسی قدر لفظی ہونے کے باوجود خوب ہے- شیخ الرئیس اور شیخ الصوفیہ کے درمیان مکاتبت بھی صوفی ادب کا حصہ ہے، اگرچہ اس کا وجود اور اس کے مشتملات دونوں مختلف فیہ ہیں-

باب تذکیر مجلّے کی روح اور عملی تصوف کا آئینہ دار ہے- شیخ مدظلہ العالی کے افادات جنھیں مجیب الرحمٰن علیمی نے ''فقیہ، متکلم اور صوفی کے درجات'' کے عنوان سے بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے، بے حد روح پرور اور ایمان افروز ہے- ان افادات کا حاصل وہی ہے جسے خود ایک بڑے صوفی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ''الصوفي اكثر من فقيه، فالفقيه من وقف عند الاقوال والصوفي اكثر من عابد إذ العابد من وقف عند الأعمال وأما الصوفي فهو من جمع بينهما فأثمر الأحوال'' چوں کہ صاحب احوال یعنی صوفی اقوال و اعمال دونوں کا جامع ہوتا ہے لہٰذا اس کا درجہ دونوں سے سوا ہوتا ہے- اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا

ہے کہ معرفت الٰہی کا درجہ احکام الٰہی کی معرفت سے بڑا ہوتا ہے۔ تصوف کی تو ایک تعریف ہی کی گئی ہے کہ: ''علم یعرف به فقه المعرفة'' یعنی تصوف ایسا علم ہے جس سے معرفت الٰہی کی فقہ کو جانا جاتا ہے یا حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت امام اہل سنت احمد ابن حنبل کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے بشر حافی کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''اللہ کی شریعت کی معرفت مجھے بشر سے زیادہ ہے لیکن اللہ کی معرفت بشر کو مجھ سے زیادہ ہے۔ صوفی اور غیر صوفی میں وہی فرق ہوتا ہے جو عارف بالغایہ اور عارف بالوسیلہ میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مجرد عالم کی بات کی جا رہی ہے، ورنہ بے شمار عالم اعلیٰ درجے کے صوفی بھی ہوئے ہیں۔ یہ ایک دلبرانہ تحریر ہے۔ علیمی صاحب نے اس صوفی فکر کو صوفی اسلوب میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس باب میں مولانا عبد المبین نعمانی کا مقالہ بھی نہایت دل پذیر ہے اور یقین افروز ہے۔ اس قسم کی اصلاحی و تذکیری تحریروں کا ہر شمارے میں ہونا ضروری ہے بلکہ کیا ہی خوب ہو اگر مقالہ نگار جیسے عالم باعمل اور علم و تصوف کے جامع ہی اس بات کی ذمہ داری قبول فرمالیں تاکہ تذکیر و تاثیر دونوں جمع رہیں۔

تحقیق و تنقید کا پہلا مقالہ محض تاثراتی ہے اگرچہ مقالہ نگار ایک بلند پایہ محقق اور قلم کار ہیں۔ اس مقالے کا عنوان ہے: ''تصوف۔ ایک انقلاب کی ضرورت'' اول وہلہ میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مراد تصوف میں انقلاب کی ضرورت ہے یا تصوف کے ذریعے انقلاب کی ضرورت ہے، مگر اس مختصر اور جامع مقالے کو پڑھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مقالہ نگار کا مقصود دونوں ہیں۔ وہ تصوف میں بھی انقلاب لانا چاہتے ہیں اور پھر تصوف کے ذریعے بے سمتی کا شکار اور تلاش حق میں سرگرداں دنیا میں بھی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

اس باب میں اگلا مقالہ مشہور اسلامی اسکالر، صاحب تصانیف کثیرہ، نقوش ایوارڈ سمیت متعدد علمی اور تحقیقی ایوارڈ یافتہ، بین الاقوامی شہرت کے حامل مصنف پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کا ہے۔ راقم السطور ان کا باضابطہ شاگرد تو نہیں ہے لیکن ان سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا اور خود کو ان کے زمرۂ شاگرداں میں سمجھتا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے: ''تصوف کی اجمالی تاریخ'' راقم السطور کو اس مقالے کے بیشتر نکات کو براہ راست موصوف سے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

حضرت حسن بصری اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ملاقات، تناقل اذن و خرقہ پوشی کی روایت، صوفیہ کے اعمال و اشغال اور طرقیت وغیرہ تصوف کے حاشی اور ثانوی مسائل ہیں، جنہیں مستشرقین و متصوفین و مترسمین بالتصوف وغیرہ نے ہوا دی ہے، صمیم تصوف سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں اور نہ ان کے اثبات و نفی سے تصوف پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے تصوف و طریقت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق کو روایتی خیال اور بے اصل قرار دیا ہے اور اس مفہوم کو نصف درجن سے زائد بار مختلف اسلوب اور پیرائے میں بیان کیا ہے، علی سبیل المثال فرماتے ہیں کہ:

''روایتی نقطۂ نظر کے حاملین کرام تصوف کے استناد و اعتبار کے لیے اس کا رشتہ قرآن وسنت سے جوڑتے ہیں'' (ص/۷۰)۔

''مشہور و عام روایتی خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس طریقت کی بنیاد ڈالی'' (ص:۷۰)۔

''ذات نبوی سے مسلسل اور غیر منقطع سلسلہ کی خاطر یہ خیال بھی پروان چڑھایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابۂ کرام کو خاص علم طریقت عطا کیا'' (ص:۷۰)۔

''تصوف و طریقت کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے وابستگی اور ان کی ذات و خدمات کو سرچشمہ بنانے کی کوشش دراصل اس کو اسلامی رنگ دینے اور معتبر و مستند بنانے کی عام طبقاتی کوششوں کا ایک حصہ ہے'' (ص:۷۵)۔

یہ اور ان جیسی متعدد عبارتوں کے ذریعے اس بات کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم سے تصوف و طریقت کی نسبت روایتی، فرضی اور غیر تحقیقی ہے جب کہ مقالہ نگار کے نزدیک علما و محققین کے خیال میں ایسا نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''محققین علماء و محدثین اور صوفیہ بھی تاریخی حقائق و شواہد کے تناظر میں طریقت کے آغاز وارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں تو دوسری صورت نظر آتی ہے'' (ص:۷۰)۔

مزید فرماتے ہیں کہ:

''بیشتر محققین صوفیہ و علما کے مطابق تصوف و طریقت کا عہد نبوی اور عہد صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں وجود نہ تھا، وہ دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل کا ایک علمی، فکری اور تجربی ارتقا ہے۔'' (ص:۷۶)

''محققین کا ایک روایتی خیال سے پورا اتفاق نہیں ہے'' (ص:۷۱)۔

یہ تمام اقوال نہ صرف اسی مقالے میں مندرج حقائق سے ناآہنگ ہیں بلکہ تصوف اور علم تصوف میں فرق نہ کرنے کی دلیل بھی ہیں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے پھر ایک تقسیم فرمائی ہے (ص:۷۱) لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہ تقسیم سابق کی طرح محققین و غیر محققین کے مابین ہے یا پھر محققین کی دو قسمیں ہیں، اور اگر محققین کی تقسیم ہے تو یہ روایتی خیال سے مکمل اختلاف رکھنے والے محققین کی ہے یا پورا اتفاق نہ رکھنے والوں کی ہے۔ بہر کیف! اس تقسیم کے بعد رسالہ قشیریہ سے

ایک طویل اقتباس دیا گیا ہے اور غالباً اس بات کی دلیل کے طور پر کہ تصوف وطریقت کا آغاز تبع تابعین کے بعد ہوا، اگر چہ نہ اقتباس سے قبل مقالہ نگار نے اس کی کوئی وضاحت کی ہے اور نہ اقتباس شدہ عبارت میں اس کا ذکر ہے، برخلاف اس کے رسالہ قشیریہ میں تصوف کا آغاز یا اس کی تاریخ موضوع ہی نہیں ہے بلکہ اس میں صوفی کے تسمیہ کے آغاز کا بیان کیا جارہا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے عہد میں تصوف تھا اور وہ حضرات اسے برتتے بھی تھے لیکن نسبت صحابیت اور تابعیت کی عظمت وجلالت کے سبب انہیں صوفی نہیں کہا گیا-

امام قشیری فرماتے ہیں:

''اعلموا، رحمکم الله تعالیٰ، أن المسلمین بعد رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یسموا افاضلهم فی عصرهم بتسمیة علم سوی صحبة رسول الله صلی الله علیه وسلم إذ لافضیلة فوقها، فقیل لهم صحابة.

ولما أدرکهم اهل العصر الثانی سمی من صحب الصحابة: التابعین ورأوا فی ذلک أشرف سمة ثم قیل لمن بعدهم اتباع التابعین ثم اختلف الناس وتباینت المراتب فقیل لخواص الناس ممن لهم شدة العنایة بأمر الدین: الزهاد والعباد ثم ظهرت البدع وحصل التداعی بین کل الفرق فکل فریق ادعو ان فیهم زهادا''۔

رسالہ قشیریہ کی یہ وہ عبارت ہے جس کا ترجمہ مقالہ نگار نے درج کیا ہے- اصل عبارت کو پڑھنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس میں تصوف کے آغاز وارتقا کی بات ہی نہیں ہو رہی، بلکہ اس میں وہی بات کی جارہی ہے جو ابھی ذکر کی گئی- علاوہ ازیں ترجمے میں کافی حذف و اضافہ بھی ہے اور سب سے اہم یہ ہے کہ اگر رسالہ قشیریہ کی عبارت سے دو اگلی سطروں کا ترجمہ بھی کر دیا جاتا تو بات پوری طرح سے واضح ہو جاتی- چنانچہ امام قشیری فرماتے ہیں کہ جب ہر ایک فرقہ یہ دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں تو:

''فانفرد خواص اهل السنة المراعون أنفاسهم مع الله تعالیٰ، المحافظون قلوبهم عن طوارق الغفله باسم ''التصوف، واشتهر هذا الاسم لهٰؤلاء الأکابر قبل المأتین من الهجرة.''

(یعنی وہ خواص اہل سنت جو اللہ کے ساتھ اپنے انفاس کا پاس رکھنے والے تھے اور جو اسباب غفلت سے اپنے دلوں کی حفاظت کرنے والے تھے، تصوف کے نام سے علاحدہ ہو گئے- دوسری صدی ہجری سے قبل ہی ان بزرگوں کے لیے یہ نام مشہور ہو گیا تھا-)

اس آخری فقرے سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہاں تصوف وطریقت کے آغاز کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ امام قشیری ان تسمیات ومصطلحات کے استعمال کے آغاز وابتدا کے بارے میں گفتگو فرمارہے ہیں-

تصوف کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے اس پر کم از کم سبھی صوفیہ کا، محققین ہوں یا غیر محققین، کلی اتفاق ہے- ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے محدث مغرب شیخ محمد صدیق غماری رحمہ اللہ ایک استفتا کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

أما أول من أسس الطریقة فلتعلم أن الطریقة أسسها الوحی السماوی فی جملة ما أسس من الدین المحمدی، إذ هی بلاشک مقام الإحسان الذی هو أحد أرکان الدین الثلاثة التی جعلها النبی صلی الله علیه وسلم، بعد أن بینها واحدا واحدا، دینا''۔

(رہا یہ سوال کہ تصوف کی بنیاد کس نے ڈالی تو جان لو کہ اس کی بنیاد وحی آسمانی سے ہے جیسا کہ دین محمدی میں جو کچھ ہے سب کی بنیاد وحی الٰہی نے ڈالی ہے- بلاشبہ تصوف وہی ہے جسے حدیث شریف میں احسان کہا گیا ہے اور یہ دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے (حدیث جبریل میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کو ایک ایک کر کے ذکر کرنے کے بعد دین قرار دیا ہے-)

اس ضمن میں مقالہ نگار نے شیخ ہجویری کی ایک عبارت نقل کی ہے جسے یوں ترجمہ کیا ہے:
''صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی''، یعنی یہ عبارت بھی رسالہ قشیریہ کی عبارت کی مانند مقصود کے خلاف ہے-

اس کے بعد محترم پروفیسر صاحب نے ''ہر شخص'' کے عموم کو مبالغہ آمیز محسوس کیا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ: ''یہ حقیقت ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام کے اکابر خواص میں تو بلاشبہ یہ حقیقت موجود تھی اور عوام کی اکثریت بھی اس سے خالی نہیں تھی-'' (ص:۷۲)

اگر مؤخر الذکر اقتباس خود مقالہ نگار کا ہے تو یہ بذات خود ایک طرفگی ہے اور صراحتاً ان دعووں سے متصادم ہے جن میں خیر القرون میں تصوف کے وجود کو روایتی اور غیر تحقیقی قرار دیا گیا ہے-

تیسرا حوالہ عوارف المعارف کا ہے جس کی کوئی عبارت تو نہیں دی گئی ہے البتہ ان کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ: وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف اور طریقت کا سلسلہ دراصل دوسری صدی ہجری یا نویں صدی عیسوی کے بعد ہی ہوا تھا'' (ص:۷۲)۔

جب کہ عوارف المعارف میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے، جہاں سے یہ مفہوم لیا گیا ہے وہ کتاب

کا باب اول ہے اور اس کا نام ہی ہے: ''**الباب الاول فی ذکر منشأ علوم الصوفیة**'' یعنی اس میں تصوف وطریقت کی نہیں بلکہ ان کے علوم ومصطلحات کی بات کی جا رہی ہے۔

مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ: ''اور ابو ہاشم صوفی کو شیخ شہاب الدین سہروردی نے اولین صوفی قرار دیا ہے'' (ص:۷۱)۔ جب کہ صاحب العوارف نے یہ کہا ہے کہ انہیں سب سے پہلے صوفی کہا گیا ہے، یعنی صوفی کی اصطلاح سب سے پہلے ان کے لیے استعمال کی گئی اور اس بات کو بہت سے صوفیہ اور اصحاب سیر نے بیان کیا ہے۔

دراصل تصوف کے آغاز کو لے کر یہ سارا ابہام اور ساری غلط فہمی تصوف اور علم تصوف میں امتیاز نہ کرنے کے سبب ہے۔ تصوف الگ چیز ہے اور علم تصوف الگ چیز ہے۔ علما وصوفیہ دوسری صدی یا اس کے تھوڑا پہلے یا بعد سے جس چیز کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں وہ علم تصوف ہے، تصوف نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی آسمانی سے جسے نسبت دیتے ہیں وہ تصوف ہے علم تصوف نہیں ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام کو علم تصوف کی ضرورت نہیں تھی جیسے انہیں علم حدیث، علم کلام، علم تفسیر اور علم اصول فقہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی مثال تو اس خالص عربی جیسی تھی جو بغیر نحو وصرف وبلاغت کے ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہو اور شعر وخطابت کی قدرت رکھتا ہو، لیکن جب قرون اولیٰ کے بعد لوگوں میں بگاڑ پیدا ہونے لگا تو دوسرے علوم کی طرح علم تصوف کی تالیف و تدوین کا کام کیا گیا۔ اسی بات کو ابن خلدون اپنے مقدمے میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''**وهذا العلم – يعنى التصوف – من العلوم الشرعية الحادثة فى الملة وأصله ان طريقة هولاء القوم لم تزل عند سلف الأمة وكبارها من الصحابة والتابعين ومن بعدهم طريقة الحق والهداية**''

(یہ علم تصوف امت میں پیدا ہونے والے شرعی علوم میں سے ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ صوفیۂ کرام کا طریقہ صحابہ وتابعین وغیرہ اسلاف اکابرین امت کا طریقہ ہے اور جو ان کے بعد آئے ان کا طریقہ ہے اور یہ طریقہ حق وہدایت کا طریقہ ہے۔)

مختصر یہ کہ اس مقالے میں متعدد مقامات پر اس دعوے کا ذکر کیا گیا ہے کہ تصوف و طریقت عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں تھے لیکن ایک بھی قطعی الدلالت ثبوت نہیں ہے۔

ایک مقام پر مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

''صوفیہ کرام نے قرآن مجید کی آیات کریمہ کی من چاہی تاویلات وتشریحات کر کے ان کو طریقت پر چسپاں کیا حالاں کہ وہ شریعت ودین کی جان وروح ہیں اور ان کا تصوف وطریقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' (ص:۷۵)

ایسا کام کرنے والے نہ صوفیہ ہو سکتے ہیں اور نہ کرام، چوں کہ اس بھاری بھرکم الزام کے لئے کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے بالخصوص کوئی معین دلیل نہیں دی گئی ہے لہٰذا اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں کہ: ''**سبحان اللّٰه! هذا بهتان عظيم.**'' زہد وتقویٰ اور خشیت وانابت وغیرہ نفس کے جن احوال کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے صوفیہ نے ان میں کیسی اور کون سی من چاہی تاویل کی ہے اور تصوف نے انہیں دین سے کب الگ کیا ہے۔ دراصل یہ شبہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ تصوف دین سے الگ اور ایک خارجی عنصر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تصوف فقہ وکلام کی طرح دین کا ایک حصہ ہے جس طرح علم فقہ اسلام کی اور علم کلام ایمان کی شرح وتفسیر کرتا ہے ویسے ہی علم تصوف احسان کے شرح وبیان کا کام کرتا ہے اور تینوں کا مستدل اور مستند کتاب وسنت ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ آیات احکام دین کا اٹوٹ حصہ ہیں اور فقہاے کرام نے من چاہی تاویلات کر کے اسے فقہ اور اصول فقہ پر چسپاں کر دیا تھا۔

تصوف بطور احسان، دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے، لہٰذا اسے اسی طور پر دیکھنا چاہیے جب کہ کچھ لوگ اسے دین اسلام کے متوازی ایک فکری نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور رہے بنام تصوف پیش کیے جانے والے کچھ فلسفیانہ افکار ونظریات یا جاہلانہ اعمال واشغال جن میں سے بعض کی طرف خود محترم مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے تو تصوف ان درآمد افکار واعمال سے اتنا ہی بری ہے جتنا فقہاے حیل سے علم فقہ اور وضاعین حدیث سے علم حدیث شریف۔

مقالے میں پیش کیا گیا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ:

''اس باب میں محدثین اور علماے دین کا یہ متفقہ فیصلہ اور اجماع کلی یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو دین وشریعت اور طریقت وانابت کا کوئی مخصوص علم نہ تو سکھایا اور نہ ہی ان کو اعمال بتائے۔'' (ص:۷٦)۔

جب کہ اس سلسلے میں کوئی مختلف فیہ فیصلہ اور جزئی اجماع بھی نہیں اور صحیح بخاری میں موجود حضرت ابو ہریرہ کی اس حدیث کی موجودگی میں کوئی ایسا فیصلہ اور اجماع کیسے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

''**حفظت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وعائين من العلم فأما أحدهما فبثثته وأما الأخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم**۔''

حضرت حسن بصری اور امام علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات کو مقالے میں اس طور پر پیش کیا گیا ہے جیسے یہ محض بے بنیاد اور بے اصل بات ہو اور دونوں کی ملاقات نہ ہونا کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت ہو، حتیٰ کہ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو ''صوفیانہ طرفگی'' کا شکار قرار دیا

گیا ہے- غالباً فاضل مقالہ نگار نے قائلین لقا کے دلائل و براہین کو ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ کم از کم انہیں عدم لقا کا یقین باقی نہ رہتا- چوں کہ شاہ صاحب دونوں کے دلائل سے باخبر تھے لہٰذا انہوں نے محدثین کے اختلاف کے بجائے صوفیہ کے اجماع کو اختیار کیا- علاوہ ازیں اثبات ہمیشہ نفی پر مقدم ہوتا ہے اور پھر محدثین کے نزدیک لقا ثابت نہیں ہے، اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ عدم لقا ثابت ہوگیا؛ کیوں کہ عدم دلیل کبھی بھی دلیل عدم نہیں ہوتا- اس کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت پڑتی ہے- اور عدم لقا محدثین کے نزدیک ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے- متعدد محدثین نے صراحت کے ساتھ اس لقا کو ثابت کیا ہے اور متعدد نے خرقہ پہن کر اور پہنا کر اس کا عملی اقرار کیا ہے- جلال الدین سیوطی کے رسالے **اتحاف الخرقة** میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے- حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی حدیثی تحقیق کو بالائے طاق نہیں رکھا ہے، انہوں نے محدثین کی رائے کو پیش کیا لیکن اسے قبول نہیں کیا، جیسا کہ امام سیوطی اور امام سخاوی وغیرہ نے کیا ہے ورنہ ان پر عملی منافقت کا الزام عائد ہوگا، جو کسی طرح بھی حضرت شاہ صاحب کے شایان شان نہیں ہے-

مقالہ نگار نے دوسری صدی کے صوفیہ کا سب سے بڑا وصف زہد کو بتایا ہے اور پھر اس کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے:

''جو ترک کسب پر اکساتا ہے اور وہ زہد، صحابہ کرام اور تابعین کے زہد سے قطعی مختلف تھا-'' (ص:۷۸)

جب کہ ابن جوزی نے اس عہد کے صوفیہ کے مجاہدانہ کارناموں کے ذکر کے لیے اپنی کتاب **صفة الصفوة** میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں اس دور کے صوفیہ کے جہاد کا تفصیلی ذکر ہے- طبقات الصوفیہ اور رسالہ قشیریہ کے مطالعے سے اس دور کے اکثر صوفیہ کے کسب وحرفت کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اس قسم کا اطلاق خلاف واقعہ ہے-

صوفیہ کی خانقاہوں، زاویوں اور رباطوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار رباط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وہ اصلاً جہاد کی سرگرمیوں کا مرکز تھا بعد میں صوفیہ کرام نے خاص طور پر عرب ممالک وامصار میں اپنی خانقاہوں کے لئے اس اصطلاح کو اپنا لیا-'' (ص:۸۰)

اس بیان میں پہلی بات تو یہ قابل وضاحت ہے کہ رباط سرحدی چوکیوں کو کہتے ہیں جہاں نظامی یا رضا کار مجاہد نگرانی کا کام انجام دیا کرتے تھے- یہ چوکیاں عموماً عارضی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں، لہٰذا اس میں سب سے نمایاں چیز گھوڑے باندھنے کی جگہ ہوا کرتی تھی اور اسی مناسبت سے انہیں رباط کا نام دیا گیا- بعد میں ان چوکیوں کے مقاصد میں تنوع پیدا ہوتا گیا- یہ بات بھی

تاریخی حقائق سے میل نہیں کھاتی ہے کہ صوفیہ نے رباط کا لفظ اپنی خانقاہوں کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خانقاہیں رباطیں ہی تھیں، جہاں صوفیہ نے جہاد کے عظیم ثواب کے حصول کے لیے رہنا شروع کیا تھا- یہاں انہیں جہاد بالنفس کے مواقع بھی ملتے تھے اور عبادت وریاضت کے لیے خلوت بھی میسر ہوتی تھی- حضرت ابراہیم ادہم کا وصال ایک ایسی ہی رباط میں ہوا تھا- امام شاذلی کے سوانح نگاروں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ آپ ایک زمانے تک صبح سے شام تک رضا کارانہ طور پر اسکندریہ میں واقع ایک رباط میں گزارا کرتے تھے جو صلیبی حملہ آوروں کی نگرانی کے لیے بنائی گئی تھی- مغرب عربی کے مرابطین صوفیہ کے جہادی کارنامے اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے-

بعد میں اسلامی سرحدیں بدل گئیں اور بہت سی رباطیں مستقل طور پر خانقاہیں بن گئیں، مگر رباط کا نام باقی رہا جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی- دراصل اس لفظ کو باقی رکھنے میں ایک لفظی مناسبت بھی کارفرما تھی اور وہ یہ کہ ربیط عربی زبان میں زاہد کو کہتے ہیں، المعجم الوسیط میں اس کے تحت ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ: ''**إن ربيط بني اسرائيل قال: زين الحكيم الصمت**''-

ان تمام علمی بحثوں کے بعد فاضل مقالہ نگار نے پوری کشادہ دلی اور علمی وسعت نظری کے ساتھ لکھا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، چنانچہ خود صراحت فرماتے ہیں کہ:

''اس کے تمام بنیادی افکار اصلا اسلامی تعلیمات ہیں اور ان کی تشریح وتفصیل اور تعبیر قرآن مجید، سنت نبوی اور تعامل سلف میں ملتی ہے-'' (ص:۸۲) تصوف کے بارے میں مقالہ نگار کا مندرجہ بالا حکم ''**وختامه مسک**'' جیسا ہے اور یہی تصوف کے بارے میں بنیادی حقیقت ہے- باقی رہے فروعی مسائل تو اس میں اختلاف کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی اور فروعات میں ''سب کچھ صحیح ہے'' اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا- اور اس سے کوئی علم مستثنیٰ نہیں ہے، حدیث و تفسیر ہو یا فقہ وکلام-

وکی پیڈیا سے ماخوذ مضمون بظاہر معلومات کا ایک خزانہ ہے لیکن یہ افکار پریشاں نہ تصوف کی تفہیم کے لیے کارآمد ہیں اور نہ تقریب کے لیے، بلکہ اس قسم کے مضامین عام قاری کو پراگندہ خیالی اور تصوف بیزاری کی سوغات ہی دیتے ہیں- اس طرح کے مضامین مجلّے میں شامل کیے جاسکتے ہیں، لیکن انہیں مناسب تعلیقات وحواشی کے ساتھ شائع کیا جائے- تمام مخالفات کی تصحیح یا ان کا تحشیہ ضروری نہیں ہے البتہ ان میں جو ''جنایات'' کے قبیل سے ہیں ان پر حاشیہ ضرور ہونا چاہیے- میں اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں- مقالے کی ایک عبارت ہے:

''تصوف میں بلند درجہ پر تسلیم کیے جانے والے ایک صوفی جلال الدین رومی نے خود اس

بات کا تذکرہ کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" (ص:۸۹)

یہ ایک بے حد گمراہ کن اور غلط فہمی پیدا کرنے والا بیان ہے۔ حوالے میں صرف انگریزی میں "جلال الدین رومی" لکھا ہے۔ یہ بیان جملۃً وتفصیلاً غلط ہے۔ صاحب الدر المختار امام حصکفی مشہور صوفی ابوعلی دقاق سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"أنا أخذت هذه الطريقة من ابی القاسم النصرا باذی، وقا ل أبو القاسم: انا أخذتها من الشبلی، وهو من السری السقطی، وهو من معروف الکرخی وهو من داؤد الطائی وهو أخذ العلم والطريقة من أبی حنيفة رضی الله عنه."

ایسے جلیل القدر صوفیہ نے امام اعظم سے طریقت کا حصول کیا ہے جن میں سے ہر ایک کا درجہ رومی سے بڑا ہے۔ یقین ہے کہ جلال الدین رومی کی طرف اس قول کی نسبت تدلیس اور دسیسہ کاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بھلا ان سے یہ واضح حقیقت کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ خود تصوف اور مسائل تصوف کے بارے میں امام اعظم کے اقوال فقہ وتصوف کی کتابوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ امام حصکفی کے مذکور بالا قول پر حاشیہ لگاتے ہوئے امام شامی اپنے حاشیہ درمختار میں لکھتے ہیں کہ: "امام ابوحنیفہ میدان تصوف کے شہسوار ہیں۔ علم تصوف کی بنا علم وعمل اور تزکیے پر ہے اور سلف صالحین نے عام طور پر انہیں ان اوصاف سے متصف کیا ہے۔ احمد ابن حنبل فرماتے ہیں: وہ علم، ورع، زہد اور ایثار آخرت کی اس منزل پر تھے جسے کوئی نہیں پا سکتا۔ انہیں کوڑوں سے مارا گیا کہ وہ قضا کو قبول کرلیں لیکن انہوں نے منصب قاضی کو قبول نہیں کیا۔ عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہ سے زیادہ کوئی اس بات کا حق دار نہیں ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، اس لیے کہ وہ ایک متقی و پرہیز گار امام اور بے مثل عالم وفقیہ تھے۔ انھوں نے نظر وفکر اور ذہانت وتقویٰ سے علم کو اس طرح کھولا ہے کہ دوسرا کوئی نہیں کھول سکتا۔ ایک شخص نے امام ثوری سے کہا کہ وہ ابوحنیفہ کے پاس سے آرہا ہے تو امام ثوری نے فرمایا کہ: تو اہل زمین میں سے سب سے زیادہ عبادت گزار کے پاس سے آرہا ہے"۔

امام شافعی کے بارے میں بھی ایسی بہت سی علمی شہادتیں مشہور ومعروف ہیں۔ آپ کا یہ قول بے حد متداول ہے کہ "مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں: ترک تکلف، مخلوق کے ساتھ لطف و نرمی اور اہل تصوف کے طریقے کا اتباع۔" اور ان دونوں اماموں کی پوری زندگی بھی ہمیں تصوف کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔

عزیز القدر مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کا مضمون: "شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف - ایک مطالعہ" ان کے عمیق مطالعے اور گہری تحقیق کا نتیجہ ہے جس میں علمی تحقیق کے تقاضوں کی پوری رعایت ملتی

ہے۔ اس میں ایک انتہائی مختلف فیہ شخصیت کا ایک خاص موضوع کے حوالے سے مکمل غیر جانب دارانہ اور معروضی مطالعہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس تحقیقی مقالے کے ذریعے جماعتی سطح پر ایک خوش رسمی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اپنے متعدد تحفظات کے باوجود میری نظر میں یہ مقالہ مجلّہ الاحسان کے اس شمارے کے لیے قلادۂ عقد (Pendent) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس مقالے کے مشتملات میں کوئی نیا انکشاف ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک ایسی شخصیت کے ایجابی پہلو کو پیش کیا گیا ہے جو مقالہ نگار کا مرجع عقیدت نہیں ہے۔ یہ مقالہ مدلل مداحی، مدلل تنقیص اور مصادرۂ مطلوب کے روایتی اسالیب سے ہٹ کر ایک نئے راستے کی بنا ڈالنے کی کوشش ہے، جس میں اپنوں کی کم زوریوں کا اظہار ہوا اور دوسروں کی خوبیوں کا اقرار ہوا اور تحقیق غیر جانب دار ہو۔ ان کا یہ علمی مقالہ بحث وتحقیق پر ان کی قدرت، وسعت اطلاع، عمق تفکیر اور تواضع وامانت علمی وغیرہ جیسی مطلوب علمی صفات کا غماز ہے۔

صفحہ ۱۱۲ پر صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ابن تیمیہ کے عقیدے کی وضاحت نہیں ہوسکی ہے اور نہ اشاعرہ کا موقف واضح کیا گیا ہے، بلکہ پورے بیان میں ایک قسم کا ابہام ہے۔ عقیدۂ تجسیم سے ان کی براءت کے لیے ان کے شاگرد رشید ابن کثیر کے اقوال پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ابن تیمیہ تجسیم کی طرف مائل نہیں بلکہ اس کے قائل ہیں اور آج پوری دنیا میں یہ عقیدہ رکھنے والے انہیں اپنا پیش رو اور امام مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ عبداللہ ہرری رحمہ اللہ کی کتاب الدرر السنیۃ کو دیکھا جاسکتا ہے جس میں ابن تیمیہ کے تجسیمی عقیدے کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اس مضمون کی تیاری کے دوران ہی ڈاکٹر عبدالمعز صدر شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے ایک دل چسپ قصہ سنایا کہ عربی ادب کی ایک کلاس میں نصوص پڑھاتے وقت انھوں نے آیت "**وهو الذی فی السماء إله وفی الأرض إله وهو الحكيم العليم**" کی تشریح بیان کی۔ کلاس کے بعد ایک طالبہ ان کے چیمبر میں آئی اور بولی کہ آپ نے جو بتایا ہے وہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ تو صرف عرش پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ میں نے وہ بتایا ہے جو قرآن میں ہے تو اس نے کہا کہ قرآن کا ترجمہ وتشریح ایسی ہونی چاہیے جو اس عقیدے سے ہم آہنگ ہو کہ اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا کہ عرش کہاں ہے تو اس نے زبان اور اشارے دونوں سے بتایا کہ اوپر ہے۔

لطف یہ ہے کہ وہ طالبہ کلاس کے کم زور طلبہ میں سے ایک ہے۔ یہ سب ابن تیمیہ کے تجسیمی عقائد کے آثار ونتائج ہیں۔

مقالے کا ایک عنوان ہے: "شیخ ابن تیمیہ ناقد تصوف یا مخالف تصوف" اگرچہ نقد و

مخالفت مانعۃ الجمع حقائق نہیں ہے لیکن مقالہ نگار نے اس عنوان کے تحت جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابن تیمیہ کو تصوف کا مخالف سمجھنا خلاف واقعہ ہے اور ''مخدوش فکر'' ہے اور اس طرح بیک جنبش قلم محققین اہل سنت کی کثرت کاثرہ اور صوفیہ کی غالبیت عظمیٰ کی فکر کو مخدوش قرار دے دیا گیا، جن میں مشائخ ازہر بھی ہیں، محدثین مغرب عربی بھی ہیں، محققین شام وعراق ویمن بھی ہیں، جن کے نزدیک شیخ ابن تیمیہ مخالف تصوف تھے- ان کے تصوف مخالف ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دنیا اور تاریخ کی سب سے بڑی تصوف مخالف تحریک یعنی سلفی تحریک کے بانی مبانی ہیں یا کم از کم یہ تحریک انہیں اپنا سب سے بڑا پیش رو مانتی ہے-

شیخ ابن تیمیہ کو سلفی فکر کے اساطین جیسے شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی، شیخ رشید رضا، شیخ ابن باز، سفر حوالی، مقبل الوادعی، شیخ محمد سرور وغیرہ اور سلفی جہاد کے چمپین جیسے جہیمان، بن لادن، ظواہری اور ڈاکٹر امام عبدالعزیز وغیرہ ہم سے بہتر جانتے ہیں بلکہ یہ سب انہیں کے بالواسطہ شاگرد اور ان کے افکار وعقائد کے علم بردار ہیں-

سوال یہ ہے کہ اگر ابن تیمیہ کے یہاں تصوف اتنا واضح ہے تو ان کے متبعین میں اس کی اتنی شدید مخالفت کیوں ہے؟ دراصل ان کے مخالفین وموافقین دونوں ان کی فکر میں تدریج کے قائل ہیں، چنانچہ ہم ان کے بہت سے ایسے معاصرین کو جانتے ہیں جنہوں نے ابتدا میں ان کی بہت تعریف وتوصیف کی لیکن ان کے اجتہادات وتفردات پر مطلع ہونے کے بعد ان سے براءت کا اظہار کر دیا اور ان کے بارے میں اپنی سابقہ آرا سے رجوع کر لیا- ان کے متبعین بھی اپنی فکر کی بنیاد شیخ کی آخری عمر کی فکر پر ڈالتے ہیں جس کی ان کے معاصر علما نے زبردست مخالفت کی تھی- شیخ کے وہ تمام اقوال جو تصوف کے اقوال واحوال ورجال کی حمایت میں لگتے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ان کی ابتدائی عمر سے ہے- اس تاویل کو ان کے متبعین بھی پیش کرتے ہیں اور مخالفین بھی-

رہا ان کی تحریروں میں تصوف کے بعض عناصر کا پایا جانا تو محض اس کی بنیاد پر انہیں مخالفین تصوف کی صف سے باہر نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ یہ بات مقررات علمیہ اور ثوابت منطقیہ کا حصہ ہے کہ ہر نظریے اور فکر میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اس کے لیے مابہ الامتیاز ہوتے ہیں اور یہی عناصر اس فکر یا نظریے کا قوام ہوتے ہیں جن سے اس کا حجر الزاویہ تشکیل پاتا ہے، اور کچھ دوسرے ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اس میں اور دوسرے افکار ونظریات میں مشترک ہوتے ہیں- اب کوئی اس فکر کا حامی ہے یا مخالف اس کا تعین مشترک عناصر کی حمایت یا مخالفت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں مابہ الامتیاز عناصر کی حمایت یا مخالفت کی بنیاد پر ہوتا ہے جو اس فکر کا خاصہ ہوتے ہیں- شیخ نے تصوف کے جن عناصر کا اپنے ابتدائی دور میں ذکر خیر کیا ہے وہ سب تصوف کے مشترکہ عناصر ہیں،

اور رہے تصوف کے مابہ الامتیاز عناصر تو شیخ نے ہر دور میں ان کی مخالفت کی ہے- یہ صرف حامیان تصوف کا موقف نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی سلفی جماعتیں اپنے تمام آپسی تناقض وتعارض واختلاف واقتتال (باہمی قتل وغارت گری) کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ ابن تیمیہ تصوف مخالف تھے، بلکہ تصوف مخالفت کو وہ شیخ ابن تیمیہ کی کلاہ افتخار کا ایک اہم نگینہ تصور کرتی ہیں-

عالم عرب میں اور خاص کر برصغیر ہند وپاک میں ایسی متعدد شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے فکری اور اس سے زیادہ اجتماعی ضرورتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر تصوف اور شیخ ابن تیمیہ میں مصالحت کرانے کی کوشش کی ہے- ان میں سے کچھ ایسی ہیں جو صوفی القلب اور تیمی العقل ہیں اور کچھ قلب ونظر دونوں اعتبار سے تیمی ہیں-

مقالے کا یہ جملہ کہ شیخ ابن تیمیہ نے ''فلسفہ، منطق اور علم کلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی'' ایک مبالغہ آمیز تعبیر ہے جو شیخ کے مداحین ومعتقدین میں بے حد مقبول ومتداول ہے- واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ ومنطق کے خلاف شیخ ابن تیمیہ کی کوششیں قابل ذکر ہیں اور انہیں اس ضمن میں کافی کامیابی بھی حاصل ہوئی، لیکن نہ فلسفہ ختم ہوا اور نہ منطق کی بساط الٹ سکی، اور رہا علم کلام تو اسے فلسفہ ومنطق کی صف میں رکھنا اور اس فن شریف کے ساتھ ان کے جیسا معاملہ کرنا ایک تعزیری گناہ جیسا ہے- شرح مواقف، شرح عقائد عضدی، خیالی، صدرا، شمس بازغہ، افق المبین، تسویہ، حواشی ملا عبدالحکیم اور رسائل میر زاہد کی موجودگی میں کون عقل مند مذکورہ بالا جملے کی صداقت پر یقین کرے گا- یہ سب سنگریزے نہیں قدیم علوم عقلیہ کے قلعے ہیں-

مقالہ نگار نے شیخ ابن تیمیہ کی تنقید تصوف کا بے حد عالمانہ ومحققانہ جائزہ لیا ہے اور ان کی تنقید کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے- ان کی آرا سے اختلاف بھی کیا ہے- مقالے کا یہ حصہ علمی محاکمے کا ایک عمدہ نمونہ ہے- البتہ جہاں انھوں نے تصوف کے پانچ فلسفیانہ نکات پر شیخ ابن تیمیہ کی تنقید کا ذکر کیا ہے وہاں انھوں نے پہلا نکتہ توحید الوہیت اور توحید ربوبیت کو قرار دیا ہے جس سے واضح طور پر لگتا ہے کہ یہ تقسیم اہل تصوف نے کی ہے جب کہ دنیا جانتی ہے کہ توحید کی تقسیم شیخ ابن تیمیہ کے ان تفردات میں سے ہے جس پر ان کی اور ان کے متبعین ومتاثرین کی فکر کی پوری عمارت کھڑی ہے- وہی اس تقسیم کے موجد وبانی ہیں اور بقول امام زاہد کوثری ان سے پہلے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک امت میں کسی نے بھی توحید کی یہ تقسیم نہیں کی ہے جو محض ایک بدعت سیئہ ہے اور اس کے لیے ان کے مدافعین کی جانب سے پیش کیے جانے والے سارے عذر ''بدتر از گناہ'' کی مثال ہیں- بہرکیف! توحید کی تقسیم کو لے کر مقالے میں خاصہ خلط مبحث ہے اور اس تقسیم کے حوالے سے شیخ ابن تیمیہ کے مخاطب صرف صوفیہ نہیں ہیں بلکہ پوری امت ہے اور اس کے

سارے طبقات ہیں۔

مقالے میں شیخ ابن تیمیہ کے ذاتی کمالات اوران کی علمی رفعت وبلندی کا جس کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف وذکر کیا گیا ہے، وہ علمی مقالہ نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے۔ روایت سے انحراف پر مبنی اس تحریر پر مقالہ نگار لائق مبارک باد ہیں۔

مقالہ میں صادر کئی ایک احکام منطقی تخلخل پر مبنی ہیں جن میں تحدید ودقت کی کمی ہے اور اس کے سبب ان سے ایک مبہم اور غیر واضح صورت حال سامنے آتی ہے۔ پھر اس پر استثناءات کی کثرت مستزاد ہے جو ابہام کی اس چادر کو اور بھی دبیز بنا دیتی ہے۔

یہ بات بھی محل نظر ہے کہ تصوف ''عمومی ظاہرہ ہونے کے سبب کوئی اس پر تنقید کی جرأت نہیں کر پار ہا تھا جب کہ ابن تیمیہ سے پہلے بہت سارے علمانے یہ کام ان سے زیادہ بڑے پیمانے پر انجام دیا ہے۔ بھلا اس ضمن میں امام غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمات کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ شیخ ابن جوزی جیسے ''ناقد'' تصوف بھی شیخ ابن تیمیہ سے پہلے ہی تھے۔

مقالہ نگار کے مندرجہ ذیل فقرے اور اس کی ترتیب واسلوب اور تیور سب نظر ثانی کے متقاضی ہیں۔

''تصوف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ بدعات، مشرکوں کے مشابہ رسوم ورواج، قبور سے حد درجہ تعلق، خدا سے بے خوفی اور صاحب مزار سے خوف وخشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزا، بزرگوں کے ساتھ الوہیت والے معاملات، مشاہد ومزارات کی زیارتوں میں حج بیت اللہ جیسا معاملہ، مساجد کی ویرانی اور مزارات پر رونق واہتمام کے مظاہر کو فروغ ملا، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔'' (ص:۱۴۲)۔

اس میں پہلے مخالفین تصوف کے ٹکسالی الزامات کو تصوف کے لیے تفصیل کے ساتھ انہیں کے اسلوب ومصطلحات وترکیبات کے ساتھ ثابت کیا گیا اور پھر غور کرنے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ یہ سب تصوف کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ اگر کسی سنی عالم وقلم کار کو اس انکشاف کے لیے غور وفکر کی ضرورت پیش آئے تو یہ بڑے فکر کی بات ہے اور لطف کی بات یہ ہے اس غور وفکر کے بعد بھی جو انکشاف ہوا وہ پوری طرح سے درست نہیں ہوا، کیوں کہ یہ کرشمہ سازیاں غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ کی نہیں بلکہ غیر تصوف اور غیر صوفیہ کی ہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ جیسی اصطلاحیں معاندین تصوف کی اختراع ہیں بالخصوص وہ گروہ جو نہ تصوف کو دل سے قبول کر سکتا اور نہ کھل کر اس کی مخالفت کر پاتا ہے۔ جس طرح غیر اسلامی حدیث، غیر اسلامی تفسیر اور غیر اسلامی فقہ کا وجود نہیں ہے، ویسے ہی غیر اسلامی تصوف بھی کوئی چیز نہیں ہے۔

اور جس طرح محدثین، مفسرین وفقہا ومفتیان کے لیے گمراہ کی صفت استعمال نہیں کی جاتی اسی طرح صوفیہ کے لیے بھی اس کا استعمال غیر معقول ومقبول ہے۔ تصوف صرف اسلامی ہوتا ہے اور صوفی صرف وہی ہوتا ہے جو ہدایت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

خاتمے میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کا تعلق ناقدین تصوف کے اولین گروہ سے ہے۔ واضح رہے کہ ناقد کا اطلاق بسا اوقات مصلح اور محاسب پر بھی کیا جاتا ہے اور کبھی معارض و مخالف پر بھی ہوتا ہے۔ گروہ اول میں سیدی جنید بغدادی، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ احمد زروق اور شیخ سرہندی وغیرہ شامل ہیں، شیخ ابن تیمیہ کو ان لوگوں کی صف میں شمار کرنا تصوف اور ان نفوس قدسیہ دونوں کی حق تلفی ہے، اور ناقدین کے دوسرے گروہ میں شیخ ابن جوزی، شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی اور سید قطب وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شیخ ابن تیمیہ ناقدین کی دوسری قسم سے زیادہ قریب ہیں اور یہ حضرات بھی شیخ کی فکر سے بے حد قریب ہیں، نہ صرف باب تصوف میں بلکہ عقائد وافکار کے تمام ابواب میں، خواہ ان کا تعلق ذات وصفات الٰہیہ سے ہو، عظمت ومقام نبوت سے ہو، اہل بیت کی شان وعظمت سے ہو، اشعریت سے بغاوت سے ہو یا تقلید کی عداوت سے ہو۔

واضح رہے کہ اس تعلیق کے ذریعے صرف شیخ ابن تیمیہ کے تصوف کی نفی مقصود ہے، باقی رہے ان کے دوسرے محامد ومناقب وخصائل واطوار تو وہ فی الوقت ہمارا موضوع نہیں ہیں اور وہ بلاشک وشبہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کا تقویٰ مشہور ومعروف ہے۔ ان کی کثرت علم وفضل پر اعیان علما کی شہادت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب تحقیق وتنقید کے باقی مضامین بھی معلومات افزا اور مفید ہیں۔ حاصل مطالعہ کے تحت جن کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ ہیں شیخ محمد غزالی کی کتاب ''**الجانب العاطفی من الاسلام**'' امام عبدالحلیم محمود کی تصنیف ''**التفکیر الفلسفی فی الاسلام**'' شیخ یوسف رفاعی کی کتاب ''**الصوفیة والتصوف فی ضوء الکتاب والسنة**'' مولانا محمد احمد مصباحی صاحب کی تصنیف ''امام احمد رضا اور تصوف'' اور پروفیسر طاہر القادری صاحب کی کتاب ''حقیقت تصوف'' شیخ فتح اللہ گولن کے افکار پر مشتمل ایک مقالہ بھی اس باب میں شامل ہے۔ کتابوں میں اول الذکر کتاب کو چھوڑ کر باقی سب کتابوں کے مصنفین فکراً وعملاً صوفی شخصیات ہیں۔ ان میں امام اکبر شیخ عبدالحلیم محمود کی ذات اسلامیان ہند میں کم معروف ہے لیکن یہ ذات ایسی مجمع البحرین ذات تھی جو شریعت وطریقت دونوں میں منصب امامت پر فائز تھی۔ مؤخر الذکر چاروں کتابوں پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے البتہ شیخ محمد غزالی جو جماعت اخوان مسلمون سے متعلق ایک معروف داعی ومصنف تھے

ان کی یہ کتاب اس قسم کی ہے جیسے جماعت اسلامی ہند کی شائع کردہ جناب عروج قادری صاحب کی کتاب ''اسلامی تصوف'' ہے- اس کتاب کو ''خذ ما صفا ودع ما کدر '' کے طور پر لینا چاہیے- اخوانی فکر عموماً افکار کا ملغوبہ ہوتی ہے، علاوہ ازیں اس کتاب کو ''میکدۂ تصوف کا بادۂ کہنہ در جام نو'' تسلیم کرنے میں شدید تأمل ہے- کتاب کے پہلے ایڈیشن کو بہت پہلے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اس میں شیخ ابن تیمیہ کے ''تصوف'' ہی کی بازگشت سنائی پڑتی ہے- البتہ اس کتاب کا اسلوب بیان اور طرز نگارش شیخ غزالی کی دوسری تمام کتابوں کی طرح بے حد دل کش اور مؤثر ہے- مولانا ذیشان احمد مصباحی نے بڑے عالمانہ انداز میں اس کتاب کا حاصل پیش کیا ہے، البتہ ایک مقام پر شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری جیسے بلند پایہ صوفی اور عارف کو ابن تیمیہ کا ''معاصر اور حریف صوفی'' لکھا گیا ہے، اتنی جلیل القدر شخصیت کے ذکر کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے-

شناسائی کے تحت پروفیسر علوی صاحب کا انٹرویو بے حد معلومات افزا اور پُر مغز ہے- محبّ گرامی مجیب الرحمٰن علیمی کا مقالہ ''خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری: تاریخ اور کارنامے'' ایک طرح سے علوی صاحب کے انٹرویو کا تکملہ ہے، جس میں برصغیر کی ایک معروف ومعتبر خانقاہ کا بے حد علمی اور دل نشیں پیرائے میں تعارف کرایا گیا ہے-

صوفی ادب میں شامل تینوں مقالے خوب ہیں اور ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ تینوں مقالے ادب کی تعلیم وتدریس سے وابستہ مؤقر حضرات کے قلم سے نکلے ہیں-

بحث ونظر میں پروفیسر اختر الواسع صاحب نے اپنے مختصر سے پیغام میں غیر اسلامی روحانیت کے سب سے نمایاں وصف کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سب بھول بھلیوں میں گم ہے- یہ پیغام مختصر ہونے کے باوجود بے حد جامع ہے، جب کہ اس باب کے دوسرے مضمون میں، جسے مولانا مبارک حسین صاحب نے تحریر کیا ہے، اسلامی روحانیت یا تصوف کے سب سے بڑے اور نمایاں وصف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم-

زاویہ مجدد تصوف حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کے نام ہے- اس میں شامل تمام مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں- ہندوستانی تناظر میں یہ بہت اہم ہیں کیوں کہ یہاں تصوف کی اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر شخصیت کے بارے میں کم ہی جانا جاتا ہے- اس باب میں شامل مقالے آنحضرت کی شخصیت، فضائل اور کارناموں کا مختصر مگر جامع احاطہ کرتے ہیں-

پیمانے کا سلسلہ بہت عمدہ ہے لیکن اس میں صرف وصفی اور توصیفی مطالعہ نہیں ہونا چاہیے ''عیبش نیز بگو'' کے لیے بھی جگہ ہونی چاہیے اور کتاب کی پیش کش پر بھی تبصرہ ہونا چاہیے-

''مکتوبات'' کے آسمان پر جیسے جیسے ماہ ونجوم نظر آرہے ہیں وہ اس علمی مجلّے کی کامیابی کی

دلیل اور مجلس ادارت کے شعبۂ رابطہ عامہ کے حرکت وعمل کے غماز ہیں-

آخر میں ایک بار پھر دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس عظیم عمل سے وابستہ تمامی حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں- میں نے یہ تبصرہ بے حد مصروفیت اور ہجوم کار کے درمیان لکھا ہے- تمام مضامین کو بالاستیعاب پڑھ بھی نہیں سکا ہوں- جلد بازی میں کچھ متجاوز احکام بھی صادر ہو سکتے ہیں اور کسی کی حق تلفی بھی ہو سکتی ہے، جس کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں- علاوہ ازیں یہ مضمون بغیر کسی علمی حوالے کے لکھا گیا ہے اور محض ایک تاثراتی مضمون ہے، جس میں اخلاص کے سوا ہر چیز میں کمی اور نقص کا احتمال ہے-

(شمارۂ اول پر ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی صاحب کا وہ مکتوب جو تاخیر سے موصول ہونے کے سبب دوسرے شمارے میں شامل نہیں کیا جا سکا تھا، اسے پیش نظر تیسرے شمارے میں ذیل میں شامل کیا جا رہا ہے- (ادارہ)

''الاحسان'' باصرہ نواز ہوا- **احسن اللہ الیک** -عہد حاضر کے خانۂ انوری یعنی تصوف پر علمی وتحقیقی کتابی سلسلے کا آغاز بشارت خیر کی مانند ہے- اس سبقت ومبادرت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد قبول فرمایئے- مجلّہ صوری اور معنوی خوبیوں کا حسین مرقع ہے- اس کی ضخامت نیز گنبد ومینار سے خالی اس کے سرورق کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور فرحت بھی- اپنی معنوی خوبیوں سے قطع نظر اس کا ظاہر بھی علمی کتب ومجلّات کے شایان شان ہے- ''**و انه یقری العیون جمالا**'' عالم گیریت اور اصرافیت کے اس عہد میں پیش کش کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے- آج ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے ظاہر سے ہی متعین ہوتی ہے- تصوف کو اگرچہ صرف باطن سے سروکار ہے، لیکن پیش کش میں عصرانیت اس کے منافی نہیں ہے- خلق خدا کی خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے کہ ہم اپنی پیش کش کو حتی الامکان ایسا بنائیں جو لوگوں کے لیے مانوس اور زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو-

مجلّے کے تمام مضامین علمی نوعیت کے ہیں- ان مضامین کے بعض مشتملات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن پیش کش سبھی کی عمدہ ہے- اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے اور اسی رنگ وآہنگ میں جاری رہنا چاہیے- ہمارا یقین مصمم اور عقیدۂ محکم ہے کہ اسلام وسنیت کا احیا وعروج تصوف کے احیا وعروج سے وابستہ ہے اور یہ کام اہل خانقاہ ہی حسب دل خواہ انجام دے سکتے ہیں- اس کام کا پہلا مرحلہ ذہنی وفکری تیاری کا مرحلہ ہے جس کی جانب آپ نے اس مجلّے کے ساتھ پیش قدمی کر دی ہے- ذہن سازی کا یہ مرحلہ بے حد ہمت شکن اور جاں گسل ہے- یہ مرحلہ فکری تعمیر کی خشت اول ہے جسے تحت وفوق ہر دو دباؤ کو برداشت کرتے ہوئے اعتدال واستوا پر قائم رہنا ہے-

اس کام میں اعدا اور ادعیا دونوں سے پنجہ آزمائی کرنا پڑے گا- آپ کو اغیار کی سنگ باری سے کعبۂ تصوف کی حفاظت بھی کرنا ہے اور قوم کے ذوق آزری سے بھی نبرد آزما ہونا ہے- نہ بتوں

کے رہنے سے کعبے کی طہارت کم ہوتی ہے اور نہ کعبے میں رہنے سے بتوں کی نجاست کم ہوتی ہے- دونوں محاذوں پر یکساں توجہ اور محنت کی ضرورت ہے- لیکن "الی التصوف من جدید" کی اس مہم میں ہمارا اسلوب ومنہج بھی صوفیانہ ہونا چاہیے، مناظرانہ اور معاندانہ نہیں ہونا چاہیے، ناصحانہ ہونا چاہیے، جارحانہ نہیں ہونا چاہیے، جس میں تنفیر کے بجائے تبشیر اور تعسیر کے بجائے تیسیر ہو اور جو "کل کبد رطبة" سے محبت اور شفقت پر قائم ہو-

وفقکم الله و سدد خطاکم و شد عضدکم و جزاکم عن التصوف و اهله خیرا-

ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد (صدر شعبۂ اردو وفارسی، ویر کنور سنگھ یونی ورسٹی، آرا، بہار)

عزیزی محترم رومی سلمہٗ (مقیم گورکھ پور) کے معرفت "الاحسان" کتابی سلسلہ-۲ ملا- اسے دیکھا، پڑھا، پڑھ کر خوشی ہوئی، جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں- اس میں تصوف کو کشف و کرامات سے باہر نکال کر اس کے رموز و اسرار اور اصول و مسائل سے بحث کی گئی ہے، جو وقت کی ضرورت بھی ہے اور منکرین تصوف کی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی- ۴۰۸ صفحات پر مشتمل "الاحسان" کے تقریباً تمام مضامین اچھے ہیں، خصوصاً ضیاء الرحمٰن کا مضمون "شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف: ایک مطالعہ"- کم پڑھے لکھے لوگ تو اسے پڑھ کر چونک جائیں گے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بات یہی صحیح ہے- ہاں! خواجہ ابوسعید ابوالخیر کی رباعیاں محققین کی نظر میں شروع ہی سے مشکوک رہی ہیں، جس طرح خواجۂ خواجگان معین الملۃ والدین حضرت خواجہ معین الدین سنجری چشتی کا فارسی دیوان-

صاحب سجادہ خانقاہ عارفیہ کی خدمت میں خاک سار کا سلام پیش کر دیجیے گا- امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا-

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، یوپی)

میں علی گڑھ سے مسلسل باہر رہا اور ابھی بھی پابہ رکاب ہوں- چوں کہ آپ کی طرح آپ کی خواہش بھی ہمیں عزیز ہے، اس لیے "الاحسان" کے لیے مضمون ارسال کر رہا ہوں- "الاحسان" کا پیش نظر شمارہ ہر لحاظ سے معیاری ہے، امید ہے کہ تازہ شمارہ بھی حسب سابق ہوگا- علمی حلقوں میں اس رسالے نے بہت تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے- اس کے لیے آپ سب لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں-

ڈاکٹر شاہد پرویز (ریجنل ڈائرکٹر (دہلی): مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

الاحسان کا دوسرا شمارہ موصول ہوا، شکریہ! میں نے اس کو جستہ جستہ مطالعہ کیا- اس میں مضامین کا تنوع اور رنگارنگی دیکھ کر ارباب ادارہ کی ذہنی وسعت کا اندازہ ہوا- صوفیہ اور تصوف کے

حوالے سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے جس میں تحقیقی وعلمی اور عصری انداز میں مسائل کی تفہیم کی گئی ہے- پیش کش عمدہ ہے- منظومات کے کالم میں ڈاکٹر کوثر مظہری کی شاعری پسند آئی- آج کے زمانے میں فارسی زبان میں اس طرح کی شاعری بہر حال غنیمت ہے- رسالے میں صوفی ادب کے کالم کے مضامین پسند آئے، لیکن تشنگی کا احساس باقی رہا- اس کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے- رسالے میں گھنی کمپوزنگ کی وجہ سے مجھے قراءت کرنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا- دو سطروں کے درمیان مزید فاصلے کی ضرورت ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو- علمی مقالات کے مطالعے سے تصوف کے نئے گوشوں سے واقفیت حاصل ہوئی- رسالہ مجموعی اعتبار سے مجھے بہت پسند آیا-

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی (لین' سی'، حمزہ کالونی، دہرہ معافی، علی گڑھ، یو. پی)

حسب ارشاد "حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات" پر مشتمل مقالہ پیش خدمت ہے- خدا کرے کہ آپ کی توقع کے مطابق ہو- عہد اکبری وجہاں گیری میں شش جہتی بگاڑ اور آپ کی شش جہتی جد و جہد اور مساعی جمیلہ کا مختصر تجزیہ، یقیناً دونوں پر روشنی ڈالتا ہے اور حضرت والا کی تجدیدی خدمات کو ظاہر کرتا ہے- اب یہ آپ حضرات پر منحصر ہے کہ مقالہ آپ کے بلند معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ بہر حال وصول یابی اور گراں قدر رائے سے سرفراز فرمائیں تو ممنون ہوں گا- خانقاہ شریف میں سب کو سلام مسنون پیش فرما دیں-

محمد بدر الدین فریدی (خدابخش لائبریری، پٹنہ (بہار)

جناب والا کے توسط سے "الاحسان" کے دونوں شمارے ایک ساتھ ہم دست ہوئے- اس کے لیے بہت شکریہ! اس کے ذریعے اچھی اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں- اللہ تعالیٰ اس رسالہ کی عمر دراز فرمائے- آمین! ان دونوں شماروں پر مشترکہ طور پر چند باتیں پیش خدمت ہیں- اگر مناسب معلوم ہو تو شامل اشاعت فرما لیجیے، ورنہ کوئی بات نہیں-

قرآنی آیات کی نقل میں رسم الخط قرآنی اور عبارات وحوالہ جات کی تصحیح کا خصوصی دھیان رکھیے- باقی اردو عبارتیں تو لوگ سیاق وسباق سے ملا کر درست کر لیں گے اور صحیح طور پر پڑھ لیں گے- مطلب یہ ہے کہ پروف پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے- سردست قرآنی آیات کے تعلق سے مندرجہ ذیل تصحیح نامہ شامل اشاعت کر لیجیے-

الاحسان- جلد۱- صفحہ۳۹ **یحیا** بجائے **یحیٰ** آ گیا ہے اس میں قرآنی رسم الخط کی پابندی کی جائے-

جلد۱، صفحہ۴۶ پر النور ۲۴/ ۱۵ کی جگہ پر النور۱۴۲/ ۵۱ ہو گیا ہے- اس حوالے کو درست کر دیا جائے-

۱/۴۸ کا نوا بجائے کانو-

۱/۸۸ یتلوا بجائے یتلو

۱/۱۲۹ ذائقة الموت درست ہے-

۱/۱۷۷ یطعمنی درست ہے-

۱/۲۸۲ سورہ انعام میں آیت کا حوالہ ۱۲۵ کی جگہ ۱۲۶ ہونا چاہیے-

الاحسان جلد۲/صفحہ ۱۲۱ آمنوا وعملوا بجائے آمنو وعملو

۲/۱۶۳ یعلمھم بجائے یعلیھم

۲/۲۲۸ دونوں آیتوں کے حوالے درست کیے جائیں-

۲/۲۳۰ عبادنا آتیناہ بجائے عبادناو آتیناہ ساتھ ہی حوالہ میں آیت نمبر ۹۵ درج ہے جسے ۶۵ کیا جائے-

۲/۲۳۹ اطیعوا بجائے اطیعو

۲/۳۵۳ یتلوا بجائے یتلو

۲/۳۰۸ برحمتہ بجائے برحمہ

۲/۳۶۱ تامرون بالمعروف بجائے تامرون الناس بالمعروف

یہ چند تصحیحات بطور مثال عرض ہیں-

☆ جلد ا میں زاویہ کے تحت امام غزالی کی تاریخی خدمات پر خصوصی گوشہ بہت خوب ہے- تحقیق وتنقید کے ذیل میں آٹھوں مضامین بہت عمدہ اور دعوت فکر دینے والے ہیں- مولانا امام الدین صاحب نے اپنا مضمون ''مشائخ کے شطحیات وہفوات: ایک علمی جائزہ'' بڑی کاوش سے لکھا ہے- مضمون میں مذکور حضرت منصور حلاج کے تعلق سے منصور القرامطی، ابومحمد مشعوذ الحلاج اور حضرت حسین بن منصور الحلاج کے حالات وکوائف متمیز کردیے جائیں تو کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ جائے گا- آئندہ شماروں میں کبھی حضرت منصور حلاج کو بھی اپنے زاویہ میں جگہ دیجیے-

بحث ونظر کے تحت پروفیسر اختر الواسع نے بڑی مبرہن بات کہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تصوف کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے اور آج بھی ہے- مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب نے بڑا رونا رویا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ مروج طریقۂ سجادگی میں عمدگی ودرستگی لانے کے طریقے پر غور وفکر کیا جائے- مولانا مصباحی صاحب چاہتے ہیں کہ مریدین ومتوسلین میں سے کوئی سجادگی پر بٹھادیا جائے، ایسا فی زمانہ ناممکنات میں سے ہے- میری سمجھ یہ ہے کہ ''الولد سر لابیہ'' کو پیش نظر رکھا جائے تو وراثتاً سجادگی میں کوئی قباحت نہیں ہے- پھر یہ کہ ''بایھم

اقتدیتم اھتدیتم'' سے انسلاک کے طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر عمل کرلیا گیا تو اس میں بھی خیر ہی کا پہلو نکلے گا- ان شاء اللہ- اس ضمن میں اصل بات یہ ہے کہ وارثین میں سجادگی حاصل کرنے کے جو حربے اور طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ غلط ہیں- جیسا کہ آپ کو خود بھی معلوم ہے کہ زیب سجادہ نے اپنی اولاد میں اپنے بعد سجادگی کے لیے کسی اور کی تربیت وتعلیم کی اور ان کے وصال کے بعد وارثین میں سے کسی اور نے اپنا حق جتایا یہاں تک کہ کورٹ اور کچہری تک کا سہارا لے کر سجادگی پر قبضہ جمالیا- یہ طریقے مذموم ہیں- یہ سب خرابیاں اس وجہ سے در آئی ہیں کہ ہم نے اوراد ووظائف اور مشاغل کو چھوڑ کر صرف مراسم کو اپنالیا اور اسی کو تصوف سمجھ لیا-

مولانا فیضان المصطفیٰ صاحب نے اپنے مضمون ''تصوف کا نام رہ گیا ہے اور روح نکل چکی ہے''- میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، تجربات ومشاہدات کے عین مطابق ہیں، لیکن چند نام نہاد صوفیوں کے کرتوت سے حکم کلی لگانا اور یہ کہہ دینا کہ تصوف کی روح نکل گئی گویا وہ ناپید ہے، درست نہیں- اس میں اصلاح کے لیے ترکیبیں سوچیے، یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ ''اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے-'' دیکھیے جسم جو عناصر کا مجموعہ ہے، اس میں جب عوارض لاحق ہوتے ہیں تو اس کے دفعیہ کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں- صحیح تشخیص کی جاتی ہے اور حسب حال معالجے کے ذریعے عوارض دور کردیے جاتے ہیں- کیا ایسا ممکن نہیں کہ ذہنی اور فکری عوارض کے لیے بھی علاج کے طریقے پر غور وفکر کیا جائے- الحمدللہ! خانقاہ عارفیہ سید سراواں، الہ آباد کے زیب سجادہ مکرمی قبلہ شاہ ابوسعید احسان اللہ صفوی مدظلہ العالی نے ''الاحسان'' کی شکل میں فکری عوارض کے لیے نسخہ لکھنا شروع کردیا ہے- ہمیں امید ہے کہ اس کے مندرجات کے مطالعے سے صحیح اسلامی فکر اور ہمارے اسلاف میں رائج تصوف کو رواج ملے گا-

☆ جلد ۲ میں برادرم مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کا مضمون ''شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف'' بڑا وقیع ہے- اس میں ان کی بڑی کاوش کو دخل ہے- میں صرف سردست ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ انھوں نے ابن تیمیہ کے تعلق سے صفحہ ۱۱۱ پر طبیعت میں حدت وشدت، فرط ذکاوت اور سیمابیت کا ذکر کیا ہے- مگر ''اول من خالف سواد الامة ھو ابن تیمیہ'' کو نظر انداز کردیا ہے- اسی طرح دینی علوم ومعارف کے حاملین اور مقلدین ومتبعین مسالک کی آرا سے ہٹ کر جن پر جانب داری کا الزام نہیں لگایا جاسکتا، خالص معروضی شخص ابن بطوطہ جن پر مسلکی جانب داری کا الزام بڑا دشوار ہے، نے اپنے سفرنامے میں دمشق کا حال بیان کرتے ہوئے ابن تیمیہ کے تعلق سے لکھا ہے کہ ''ولکن فی عقلہ شیئاً'' (لیکن ان کا دماغ ہی پھرا ہوا تھا-) اب ایسے شخص کو خواہ مخواہ گھسیٹ کر لے آئیں- علیمی صاحب نے نتائج بھی بڑے حیرت انگیز اخذ

کیے ہیں اور اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کی کہ نقد سے اگر شخصیت مجروح ہو تو کیا کیا جائے جب کہ حال یہ ہے کہ ابن تیمیہ سے سوا دامت ہی مجروح ہے- تصوف شرعی اور تصوف غیر شرعی کی اصطلاح ہمارے اہل علم بھی استعمال کرنے لگے ہیں جس کے لیے مستشرقین کوشاں رہے ہیں- ارے بھائی شرعی نہیں ہے تو وہ تصوف ہی نہیں ہے، وہ از قبیل رہبانیت وغیرہ سے ہے- اس عنوان پر لکھنے کے لیے برادرم ضیاء الرحمٰن صاحب خصوصی مبارک باد کے مستحق ہیں-

زاویہ کے تحت خواجہ ابوسعید ابوالخیر پر مضامین اچھے ہیں- اس شمارے کا پیمانہ بھی بھرپور ہے- اس طرح کے علمی مجلّے کی فی زمانہ سخت ضرورت تھی- اس ضرورت کی تکمیل کے لیے حضرت قبلہ شاہ ابوسعید احسان اللہ صفوی مدظلہ العالی اور آپ تمام حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں-

ڈاکٹر کوثر مظہری (شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

'الاحسان'' کا کتابی سلسلہ-۲- نظر نواز ہوا- پہلے شمارے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہوگا- اس شمارے کے مشمولات (شعری ونثری) پر الگ الگ گفتگو نہیں کرسکتا- بس یہ عرض کرنا ہے کہ اس پر تصوف کے نام نہاد (معذرت کے ساتھ) سجادگی کا عکس نہیں ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے اس مجلّے کا مزاج ومیلان تحقیقی وعلمی ہے، بلکہ ایک طرح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مواد ومعیار کی پیش کش کچھ ایسی ہے کہ کوئی شخص آسانی سے اس پر حرف نہیں رکھ سکتا-

اس رسالے میں بیشتر لکھنے والے وہ ہیں جن کی نگاہیں دینی ودنیوی دونوں علوم پر ہیں، کچھ نام لینے میں حرج نہیں؛ جیسے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عقیل ہاشمی، پروفیسر مسعود انور علوی، ڈاکٹر شمیم منعمی، جناب ذیشان احمد مصباحی، ڈاکٹر شہزاد انجم وغیرہ- ان کے علاوہ بھی دوسرے اسلامی اسکالرز کی ایک ایسی ٹیم آپ کے پاس ہے جو عصری علوم اور تقاضے سے بہرہ مند ہیں-

زیر نظر شمارے میں شیخ ابوسعید ابوالخیر پر آپ نے بہت ہی سیر حاصل اور علمی گوشہ شائع کیا ہے- اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ صفحات نعمت غیر مترقبہ کے برابر ہیں- مولانا جلال الدین رومی پر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے منظوم مقالہ تحریر فرمایا ہے اور یہ کام یعنی منظوم مقالہ میری دانست میں صرف طرزی صاحب نے ہی انجام دیا ہے- انھوں نے اردو کے بھی کئی مایۂ ناز ادیب وشاعر پر منظوم مقالے تحریر کیے ہیں- ان کی قادر الکلامی کی تو سب نے داد دی ہے- اسی حصے میں امیر خسرو پر پروفیسر مسعود انور علوی کا خوب صورت اور تجزیاتی مقالہ ہے- پروفیسر عقیل ہاشمی نے ولی کے تصوف پر روشنی ڈالی ہے- یہ موضوع تو تقریباً ہر ایک یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا حصہ ہے- میں نے بھی اس موضوع کی طرف ایم اے کے طالب علموں کی توجہ دلائی ہے-

آپ نے ''بادہ وساغر'' میں میری فارسی غزل شائع کی اس کے لیے شکر گزار ہوں- مجھے اس زبان میں درک نہیں لیکن پتہ نہیں کس گھڑی میں یہ غزل ہوگئی- تقریباً ۱۸ سال پہلے کی غزل ہے- حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو اچھا لگتا ہے- خدا کرے الاحسان صفحۂ دل پر علمی احسانات کی بارش کرتا رہے-

مفتی الطاف حسین رضوی (خانقاہ سبحانیہ شیخن پورہ، کمہینا، لکھیم پور، کھیری، یوپی)

علم تصوف پر جامع مجلّہ ''الاحسان'' کا دوسرا شمارہ نظر نواز ہوا- اپنے تمام مشمولات کے لحاظ سے خوب ہے اور تمام ابواب اسم بامسمّٰی ہیں- محبّ گرامی مولانا مجیب الرحمٰن علیمی، کی تحقیقی اور معلوماتی تحریر ''خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری: تاریخ اور کارنامے'' بطور خاص پسند آئی- بلاشبہ ''الاحسان''، تسکین قلب ونظر کا سامان اور شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید محمدی صفوی دام ظلہ کے حال وقال کا مظہر ہے-

فقیر غفرلہ بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہے کہ مولائے کریم حضرت کا سایۂ عاطفت تادیر قائم رکھے اور دین وسنیت کی بیش از بیش خدمات لے اور ''الاحسان'' کو مقبول عام بنائے- (آمین)

مولانا محمد شہروز مصباحی (رضا مسجد، شریفہ روڈ، ممبرا، تھانہ، مہاراشٹر)

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں کوشامبی الہ آباد کا کتابی سلسلہ ''الاحسان'' کا دوسرا شمارہ جس کا میں مشتاق تھا، پہلے شمارہ کی طرح مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کے توسط سے باصرہ نواز ہوا- فہرست پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی مضامین پڑھ ڈالے- تصوف کے اسرار ورموز کو جس حسن وخوبی سے علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کے لیے مرتبین اور معاونین سب دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قابل مبارک باد ہیں-

ہندوستانی خانقاہوں سے نکلنے والے رسالے عموماً صاحب خانقاہ، سجادگان، خلفا، مریدین اور متوسلین کی منقبت خوانی اور چند اِدھر اُدھر کے گھسے پٹے مضامین پر مشتمل ہوا کرتے ہیں- مگر اللہ کے فضل اور سرپرستِ مجلّہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کی علم دوستی کی وجہ سے ''الاحسان'' اپنی مثال آپ ہے- جملہ مشمولات گراں قدر ہیں- خصوصاً مولانا عبد المبین نعمانی کا ''حسد وکینہ کی تباہ کاریاں''، مولانا ذیشان احمد مصباحی کی ''واردات'' مولانا رفعت رضا نوری وطیب فرقانی کا ''حاصل مطالعہ'' مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کے قلم سے خانقاہ کاظمیہ قلندریہ کاکوری کا تاریخی تعارف اور مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کا مضمون ''شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف- ایک مطالعہ'' میرے لیے دل چسپ رہے-

ان میں مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کا مضمون تو میں نے بقول بیکن فرانسیسی خوب چبا چبا کر

پڑھا اور بہت حد تک ہضم کرنے کی بھی کوشش کی ؛ کیوں کہ شیخ ابن تیمیہ جیسے ناقد تصوف کو حامی تصوف ثابت کرنا عام ذہن میں ایک ٹیڑھی کھیر ہے، مگر مولانا علیمی کی ذکاوت ذہنی کہیے یا وسعت علمی، بہر حال انہوں نے اس ٹیڑھی کھیر کو میٹھی کھیر بنا دیا ہے- اگر میں کہہ دوں کہ پورے مجلّے میں مولانا کی تحریر کو جسم میں قلب کی حیثیت حاصل ہے تو بہت سارے لوگ میری تائید میں اٹھ کھڑے ہوں گے- اللہ تعالیٰ انہیں اور زور قلم عطا فرمائے-

مولانا ساجد رضا مصباحی (استاذ: جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، اوریا، یوپی)

''الاحسان'' کے دوسرے شمارے کے مطالعے کے بعد ہمیں اس اعتراف میں کوئی تأمل نہیں کہ اس کا نقشِ ثانی نقش اول سے بہتر ہے- تصوف کے موضوع پر تسلسل کے ساتھ اس قدر معیاری علمی و تحقیقی مجلّے کی اشاعت آپ ہی لوگوں کا حصہ ہے- درحقیقت یہ ساری بہاریں حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ کے دم قدم سے ہے، جنہوں نے سید سراواں کو عملی اور نظریاتی تصوف کا حسین سنگم بنا دیا ہے- مادہ پرستی کے اس دور میں تصوف و روحانیت کا جو پاکیزہ ماحول سید سراواں میں قائم ہے، کم از کم وہ میرے لیے باعث حیرت ہے-

اس بار محترم ضیاء الرحمٰن علیمی کا مقالہ 'شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف: ایک مطالعہ' احباب کی محفلوں میں موضوع بحث رہا- موصوف نے اپنے اس طویل تحقیقی مقالے میں ابن تیمیہ کی علمی حیثیت اور معتقدات و معمولات وغیرہ کو پیش کرنے کے بعد تصوف کے تعلق سے ان کے نقد و نظر کا جائزہ مالہ و ما علیہ کے ساتھ خالص علمی و تحقیقی اسلوب میں پیش کیا ہے، جو بہر حال قابل تحسین ہے- کیا مولانا کا مضمون صرف اس لیے مسترد کر دیا جائے گا کہ اس میں ابن تیمیہ کا نام آ گیا؟؟

'حاصل مطالعہ' کا اضافہ ایک اچھا قدم ہے- 'شناسائی' کے تحت پروفیسر مسعود انور علوی کا انٹرویو اور مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کی تحریر پسند آئی- 'صوفی ادب' کے تحت پروفیسر مسعود انور علوی کی تحریر نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا- 'مکتوبات' کے کالم میں اہل علم و دانش کے حوصلہ افزا تاثرات ''الاحسان'' کی مقبولیت کی دلیل ہیں- دعا ہے کہ 'الاحسان' تسلسل کے ساتھ قارئین کو سیراب کرتا رہے اور حضور ابو میاں کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے- (آمین)

مولانا طفیل احمد مصباحی (سب ایڈیٹر: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)

تصوف، مباحث تصوف اور متعلقات تصوف پر علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلّہ ''الاحسان'' کے دو شمارے فردوس نگاہ بنے- جملہ مضامین قابل قدر اور معلومات افزا ہیں- عصر حاضر میں تصوف کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے- آج جب کہ مادیت کے تیز و تند سیلاب میں اخلاقی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہتی جا رہی ہیں، حق کی متلاشی روحیں چشمۂ صافی کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھ

رہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اغیار کے لگائے گئے الزامات سے ''گدلے تصوف'' کو پاک کر کے ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس ''چشمۂ صافی'' کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ تشنگانِ باطن اس سے دوبارہ سیراب ہو سکیں-

ہماری جماعت میں دینی رسالوں کی کمی نہیں مگر خاص تصوف پر اس قسم کا علمی و تحقیقی رسالہ دیکھنے کو نہیں ملتا- حالات کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے خالص تصوف کے موضوع پر آپ حضرات نے یہ سال نامہ جاری کر کے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ کا حق ادا کیا ہے- اس جرأت رندانہ کو ہم سلام کرتے ہیں- سرزمین ہند میں صوفیۂ کرام نے تصوف کا چراغ روشن کر کے تاریک دلوں کو ضیا بخشی مگر افسوس! غیروں کی عیاری اور اپنوں کی غفلت شعاری سے تصوف کی لو مدھم پڑ گئی- شمع تصوف کی اس فخریہ پیش کش پر میں آپ کی پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں-

مولانا مظہر حسین علیمی (معاون مدیر: ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی)

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلّہ ''الاحسان'' نے اپنے نقش اول ہی سے اہل علم و دانش کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا- خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے اور نقش ثانی کے بہ شدت منتظر دکھائی پڑے- **فالحمدلله علیٰ ذلک!**

دراصل الاحسان کی کامیاب اشاعت میں شیخ طریقت حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی زیدت محاسنہ کا سوز و گداز اور خلوص پنہاں ہے- حضرت موصوف سے مجھے دوبار ملنے کا شرف حاصل ہوا- آپ کے اندر وہ تمام باتیں پائیں جو ایک پیر کامل کی خصوصیات ہیں- حضرت کی نصیحتیں براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور آپ کے پند و مواعظ سن کر نہ جانے کتنے پتھر دل انسان تائب ہو چکے ہیں بلکہ اب تک سیکڑوں افراد نے کفر و شرک کا قلادہ اتار پھینکا ہے- الاحسان کے مرتبین پر بھی حضرت موصوف کا خصوصی کرم ہے جس کی بدولت یہ حضرات اس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں-

حسب سابق الاحسان کا دوسرا شمارہ بھی دستاویزی حیثیت کا حامل رہا- اس بار بھی ''بادہ و ساغر'' میں اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس میں دو رباعی، ایک مناجات اور چار غزلیں شامل ہیں- حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کی دونوں رباعیوں کا ترجمہ کیا گیا ہے، اگر ڈاکٹر کوثر مظہری صاحب کی غزل کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہوتا تو استفادہ عام ہو جاتا- بادہ کہنہ میں ''خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا خط ابن سینا کے نام'' سے پہلی بار واقفیت ہوئی- تذکیر کے کالم میں افادات حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ اور حضرت مولانا عبدالمبین نعمانی صاحب قبلہ کا مضمون پسند آیا- نعمانی صاحب قبلہ کا مضمون اس لائق ہے کہ باضابطہ اسے کتابی شکل میں شائع کر کے عوام الناس تک پہنچایا جائے-

تحقیق وتنقید کے کالم میں اس بار آٹھ مختصر ومطول تحریریں شائع ہوئی ہیں-سارے مضامین عمدہ ہیں مگر مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کی تحریر بڑی وقیع، محققانہ وفاضلانہ اور جرأت مندانہ تحریر ہے-

حاصل مطالعہ کے تحت لکھنے والوں نے بڑی عرق ریزی سے مختلف شخصیات کے نظریات تصوف کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں-مولانا منظر الاسلام ازہری نے ''امام عبدالحلیم محمود اور تصوف'' کے عنوان پر خوب صورت مضمون قلم بند کیا ہے مگر موصوف کے اس مختصر مضمون میں مکرر اغلاط سے صرف نظر تقریباً چار درجن املا کی غلطیاں موجود ہیں جو بہر حال ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہیں-غالباً مولانا موصوف کا مضمون آخری مرحلے میں دستیاب ہوا ہوگا اور مرتبین نے قلت وقت کے سبب من وعن شائع کر دیا ہوگا-

'بحث ونظر' کے مضامین مختصر مگر جامع اور مفید ہیں-اسی طرح شناسائی میں مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کا مضمون ''خانقاہ کاظمیہ کاکوری: تاریخ اور کارنامے'' اس لائق ہے کہ اسے کتابی صورت میں شائع کر کے عام کیا جائے، اس لیے کہ اس خانقاہ کی خدمات بھی پردۂ خفا میں ہیں-زاویہ کے تحت لکھے گئے مضامین بھی اچھے ہیں-پیمانہ کے تحت اس بار ایسی نو کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو تصوف یا صوفیہ سے ہی متعلق ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا-اللہ رب العزت الاحسان کی ادارتی ٹیم کو شاد وآباد رکھے اور ہم سب کو دین متین کی بیش بہا خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے-آمین-امیر سنی دعوت اسلامی حضرت حافظ وقاری مولانا محمد شاکر نوری رضوی دامت برکاتہم الاحسان کے مرتبین اور معاونین کو سلام ودعا پیش کرتے ہیں-

محمد اسلم رضا قادری (باسنی، ناگور، راجستھان)

ہندوستان کی زرخیز زمین الہ آباد کے اُفق سے اٹھنے والا یہ علمی اور تحقیقی مجلّہ بے شک ایک نیک اور قابل تقلید کاوش ہے، جسے وقت کی اہم ضرورت بھی کہا جا سکتا ہے اور زنگ آلود قلوب کے واسطے سامان تسکین بھی-یہ تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کا ذریعہ کیوں نہ ہو جب کہ تصوف تو حقیقت و معرفت کے جام سے مشام جاں کو معطر کرتا ہے اور تصوف نام ہی ظاہر وباطن کی صفائی وستھرائی کا ہے-حضرت قاضی زکریا انصاری (المتوفی: ۹۲۹ھ) لکھتے ہیں: **التصوف علم تعرف به احوال تزكية النفوس وتصفية الاخلاق وتعمير الظاهر والباطن لنيل السعادة الابدية**-(شرح الرسالۃ القشیریہ ص: ۷)

تصوف پراگندہ ماحول کو لطیف ونظیف بناتا ہے-کدورتوں اور نفرتوں کی جڑوں کو کاٹتا ہے-اوصاف وکمالات اور اتباع شریعت وسنت کا پیکر محسوس بناتا ہے-طریقۂ زندگی اور سلیقۂ بندگی بتاتا ہے-اس کے باوجود بھی اگر کوئی اس پاکیزہ اسلامی تصوف کو دین سے ایک جدا راہ تصور

کرے تو وہ ضرور مجرم اور ناسمجھ ہے-اس لیے ایسے نازک حالات میں آپ حضرات کا اسلامی تصوف کو دعوتی اور تحقیقی انداز میں جدید اسلوب کے ساتھ پیش کرنا قابل مبارک باد اور لائق تحسین کارنامہ ہے، جسے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا-خداوند قدوس ہم سب کو شریعت مطہرہ اور سنت مصطفیٰ ﷺ پر عمل کی توفیق عطا فرمائے-آمین-

مولانا محمد آفتاب مصباحی (رکن: تنظیم بیدار فاؤنڈیشن ویشالی، بہار)

میرے پیش نظر ''الاحسان کا دوسرا شمارہ'' ہے، جو محترم مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کی عنایت اور محترم مولانا مجیب الرحمٰن علیمی کے توسط سے مجھے حاصل ہوا-''نقاش نقش ثانی بہتر کشد از اول'' کے مصداق یہ شمارہ سرورق، کاغذ، طباعت نیز علمی، تحقیقی اور صوفی ادبی نگارشات ہر جہت سے پہلے شمارے سے زیادہ معیاری ہے-

پہلے شمارے نے ہی اتنا گرویدہ کر لیا تھا کہ دوسرا شمارہ جیسے ہی ملا موقع پاتے ہی دو تین بار بڑی دل چسپی سے پڑھا مگر شوق پیہم کی خلش اب تک نہیں گئی تھی کہ چار بار پانچ بار بلکہ گیارہ بار مطالعہ کیا اور گلشن تصوف کے ان مختلف پھولوں، ان کی رنگتوں اور خوشبوؤں سے یک بارگی متعارف ہوا جن سے شاید برسوں کی خاک روبی اور سیکڑوں دروازوں کی جاروب کشی کے بعد بھی بمشکل متعارف ہو پاتا-مگر پڑھتے پڑھتے ایک دو جگہ نظر ٹھہر گئی جسے میں اپنی فہم ناقص کی یا عدم توجہ کا باعث شمار کرتا ہوں، مثلاً مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی صاحب کا مضمون اگرچہ نہایت تحقیقی اور معیار تحقیق پر پوری طرح منطبق ہے مگر اسے پڑھ کر بہت سے اہل علم اس شک میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں مولانا موصوف شیخ ابن تیمیہ کے مداح تو نہیں ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ مولانا موصوف سے شیخ ابن تیمیہ کی مدحت کا تصور ہرگز نہیں کیا جا سکتا بلکہ انھوں نے اپنے مضمون کے ذریعے شیخ کو ''منکر تصوف'' کی بجائے ''ناقد تصوف'' ثابت کرنے کی کوشش کی ہے-ہاں! اگر مولانا موصوف اپنے مضمون کے شروع میں اس طرح کی عبارت بڑھا دیتے یا نوٹ لگا دیتے کہ ''شیخ ابن تیمیہ کے غیر اسلامی نظریات سے نہ مجھے اتفاق ہے نہ میں اس کا حمایتی ہوں بلکہ صرف موضوع تصوف پر ان کے نظریات کو پیش کرنا مقصود ہے'' تو شاید اہل علم تشویش میں مبتلا نہ ہوتے-بالجملہ ایسے وقت میں جب کہ دنیا مادی پریشانیوں سے دوچار ہو کر گمراہیوں کے قعر مذلت میں گرا چاہتی ہے، آپ نے تصوف کا مشعل جلا کر ہدایت ونجات کی راہ دکھائی ہے، اس پر ہم رندان تصوف آپ کے بے حد شکر گزار ہیں-

○○○

اس شمارے کے خاص قلم کار

- مفتی عبیدالرحمٰن رشیدی، خانقاہ رشیدیہ، جون پور، یوپی9472894394
- مولانا عبدالمبین نعمانی، المجمع الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ9838189592
- مفتی محمد نظام الدین رضوی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ9450119650
- پروفیسر اختر الواسع، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی9810541045
- پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، شعبۂ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ05713295609
- پروفیسر بدیع الدین صابری، شعبۂ عربی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد9949351984
- پروفیسر عبدالحمید اکبر، شعبۂ عربی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ 9844231934
- ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ9808364501
- ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ9634368012
- ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی، فتح پور، یوپی9412562751
- مولانا کوثر امام قادری، دارالعلوم قدوسیہ، پرسونی بازار، مہراج گنج، یوپی9838086342
- مولانا وارث مظہری، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی9990529353
- ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، شعبۂ اسلامک اسڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی9910702673
- مولانا ارشاد عالم نعمانی، دارالقلم، قادری مسجد، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی9555584637
- مولانا ساجد رضا مصباحی، جامعہ صمدیہ، پھپھوند، اوریا، یوپی9258273739
- مولانا طفیل احمد مصباحی، ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی8896768649

''الاحسان'' حاصل کرنے کے پتے

☆ مکتبہ امام اعظم، ۲/۴۲۵ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-۶ رابطہ نمبر:9560054375
☆ رضوی کتاب گھر، ۴۲۳، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی011-23264524
☆ دکن ٹریڈرس، ۲۳-۲-۳۷۸، مغل پورہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش) 040-24521777
☆ نیو سلور بک ایجنسی، ۱۴، محمد علی بلڈنگ، محمد علی روڈ، ممبئی022-23478970
☆ رضا اکیڈمی، نزد رضا جامع مسجد، ۱/۶۵، داسو بابو بگان، کمرہٹی، کولکاتا9433210940
☆ امدادیہ بک ڈپو، جامع مسجد گیٹ، ہزاری باغ، جھارکھنڈ9835523993
☆ نوری کتاب گھر، سید سادات مسجد، بماپور، ہبلی، کرناٹک9343109363
☆ برکاتی بک ڈپو، عمران گیسٹ ہاؤس کمپلیکس، خواجہ بازار کے پیچھے، چھوٹا روضہ، گلبرگہ 9739752587
☆ تاج بک ڈپو، مومن پورہ، ناگ پور، مہاراشٹر